شریعت و طریقت

مولانا عبدالرحمن کیلانی رحمہ اللہ

مکتبۃ السلام۔ سٹریٹ ۲۰ وسن پورہ لاہور

ملّتِ عشق از ہمہ ملّت جُداست
عاشقاں را مذہب و ملّت خُداست

شریعت و طریقت

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ

مکتبۃ السلام۔ سٹریٹ ۲۰ وسن پورہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب: شریعت وطریقت

مصنف: مولانا عبدالرحمان کیلانی ؒ

طبع ہفتم: جنوری 2006

تعداد: 1100

زیرسرپرستی: ڈاکٹر حبیب الرحمان کیلانی

زیراہتمام: پروفیسر نجیب الرحمان کیلانی فون: 7844157

ناشر: ڈاکٹر حافظ شفیق الرحمان کیلانی۔انجینئر حافظ عتیق الرحمان کیلانی

مطبع: انٹرنیشنل دارالسلام پرنٹنگ پریس لاہور فون: 7232400

قیمت: 200 روپے

ناشر: مکتبة السلام سٹریٹ نمبر 20، وسن پورہ لاہور

فون: 7844157-7280943

ڈسٹری بیوٹر

دارُالسّلام
کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور
لندن • ہیوسٹن • نیو یارک



ہیڈ آفس ومرکزی شوروم 36 - لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور

فون: 711 1023 , 711 0081 , 723 2400 , 724 0024 فیکس: 735 4072

E-mail: darussalampk@hotmail.com Website: www.dar-us-salam.com

شوروم اردو بازار اقرأ سنٹر غزنی سٹریٹ' اردو بازار لاہور فون: 712 0054 فیکس: 732 0703

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب شریعت و طریقت کے ابتدائی مضامین، جو وحدت الوجود، وحدت الشہود اور حلول سے متعلق تھے جب ترجمان الحدیث ۱۹۸۱ء کی مختلف اشاعتوں میں شائع ہوئے تو اسی وقت سے یہ تقاضے شروع ہو گئے تھے کہ ان مضامین کو چھاپ کر جلد از جلد منظرِ عام پر لائیے۔ چنانچہ اس کتاب کا مسودہ مکمل کرنے کے بعد اس کی بٹر پیپر پر کتابت بھی کروالی گئی۔ پھر جب یہ کتابت شدہ کاپیاں چند مقتدر علمائے کرام کے پاس برائے تبصرہ و تنقید بھیجی گئیں تو اس کے مندرجات کو تو بہت سراہا گیا مگر ساتھ ہی اس بات پر زور دیا گیا کہ اس کتاب کی کتابت اس کتاب کے شایانِ شان نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کتاب کسی بہترین کاتب سے لکھوا کر آرٹ پیپر پر شائع کی جانی چاہیئے۔

ایک رائے یہ بھی تھی کہ سرِ دست اسے جُوں کا توں شائع کر دیا جائے۔ اور ایسا اہتمام دوسرے ایڈیشن کے وقت کر لیا جائے۔ پورے دو سال اسی کشمکش میں گزر گئے۔ کاپیاں جوں کی توں پڑی رہیں۔ بالآخر یہی طے پایا کہ از سرِ نو کتابت کروائی جائے جس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کتاب میں چند مفید اضافے کرنے کا موقع مل گیا تاہم ایک طویل عرصہ مسودہ پر نظرِ ثانی اور اس کی کتابت میں لگ گیا۔ دریں اثناء احباب کی طرف سے اشاعت کے لیے تقاضے بھی ہوتے رہے۔ زیادہ خطوط اس قسم کے تھے۔ کہ اگر کتاب چھپ چکی ہے تو فوراً بھیج دی جائے۔ مگر میرے پاس سوائے خاموشی کے اس کا کچھ جواب نہ تھا۔ اور آج سات سال بعد بفضلہٖ تعالیٰ اس کتاب کی اشاعت کے سب مراحل طے ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

اس کتاب میں مشہور و معروف مشائخ عظام اور بزرگانِ دین کا ذکر اکثر و بیشتر مقامات پر آیا ہے۔ اور ان کے اقوال و افعال پر، جو کتاب و سنت کے خلاف تھے، تنقید بھی کی گئی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم بزرگانِ کرام اور ان کی کرامات کے سرے سے قائل ہی نہیں، بلکہ ہماری مخالفت تو صرف وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے کتاب و سنت سے ٹکراؤ شروع ہوتا ہے اور یہ دونوں مقامات میں نظری بھی اور عملی بھی۔ اور یہ اعتراضات صرف ہمیں ہی نہیں۔ دین طریقت کے بعض عقیدت مندوں نے بھی ان کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ نظریاتی اختلاف تو اتحادِ ثلاثہ (وحدت الوجود، شہود اور حلول) سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق مشہور متصوف عبدالکریم جیلی (م ۸۱۱ھ) مصنف "انسان کامل" کے مترجم مولانا فضل میراں یوں رقمطراز ہیں کہ:

"اکثر صوفیہ کرام کے حقائق و معارف مسئلہ وحدت الوجود کے متعلق ہوتے ہیں اور اس مسئلہ نے خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے۔ صوفیہ کے اس قسم کے علوم سے اکثر اہلِ نفس و ہوا دلیر ہو کر شرعی قیود سے نکل گئے ہیں۔ اول وہ شخص جس نے دلائلِ عقلیہ اور براہینِ نقلیہ سے اس مسئلہ کے متعلق گفتگو کی ہے۔ وہ محی الدین ابنِ عربی ہیں، جنہوں نے علاوہ مکشوفات کے عقلی تصرف کو بھی اس میں دخل دیا ہے، مصنف، انسان کامل کے علوم اسی قبیل سے ہیں۔۔۔ علمائے ظاہر جب دیکھتے ہیں کہ ایسے علوم جن میں عابد و معبود

کی ایک ہی حقیقت ہے تکلیفِ شرعی کو بالکل ساقط کر دیتے ہیں اور جو آیات واحادیث بطور شواہد کے حقائق وجودیہ کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں ان میں سے اکثر ایسی ہوتی ہیں جو خالی از تکلفات نہیں ہوتیں تو اکثر علمائے کرام صوفیہ سے بد اعتقاد ہو جاتے ہیں...... ان رموز صوفیہ کے علوم کے مواطن ماخذ اور سرچشمے علوم نبوت کے مواطن اور سرچشمے سے جدا گانہ ہیں ۔شرعی علوم بھی بطریق اعتبار و اشارہ ان کی تائید کرتے ہیں نہ کہ بطریق تفسیر و فحوائے کلام اور یہ شرعی علوم کی ایک اعجازی خاصیت ہے سو رہ شریعت کی راہ اور ہے اور ان صوفیوں کی راہ اور، جو مسائل ۔ وحدت الوجود ، بقا و فنا ، لطائف کائنہ عظمت کی تہذیب و ترتیب میں اپنی تصنیفات چھوڑ گئے ہیں " (مقدمہ از مترجم انسان کامل ص ۱۰۰۹)

اور عملی لحاظ سے اختلاف یہ ہے کہ ان بزرگوں کے عقیدت مندوں نے ان کی طرف بے سروپا باتیں اور مہیب قسم کی کرامتیں منسوب کر کے ان کی ذات کو مشکوک اور ان کے کردار کو مجروح کر دیا ہے حتیٰ کہ دین طریقت کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے موضوعات تک سے بھی دریغ نہیں کیا گیا ۔ اس قسم کے من گھڑت قصوں اور خود تراشیدہ کرامات سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے جناب پروفیسر حبیب اللہ صاحب تاریخ مشائخ چشت کے تعارف میں یوں رقمطراز ہیں۔ کہ :-

" لیکن اس کتاب (خزینۃ الاصفیاء مصنفہ غلام سرور قادری لاہوری) کا بڑا نقص یہ تھا کہ مصنف نے عقائد کا سہارا لے کر ان تمام اصولِ اسناد کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا جو علمائے اسلام کی نظر میں علم وحکمت کی روح سمجھے جاتے رہے ہیں۔ تنقیدی اصولوں سے چشم پوشی کر کے محض عقائد پر علم کی عمارت تعمیر کرنا نا سمجھی نہیں تو کیا ہے ؟ اس قسم کی تحریریں متضاد افکار کا مجموعہ بن کے رہ جاتی ہیں اور بالآخر ان کا نتیجہ بدعقیدگی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے ۔صاحب خزینۃ الاصفیاء نے اپنی کتاب میں ہیبت ناک قسم کی کرامات کی تفصیل دی ہے جن کو پڑھ کر انسانی عقل وخرد کو شرم آجاتی ہے" (تاریخ مشائخ چشت زیر عنوان تعارف از پروفیسر حبیب اللہ ص۱۰)

پھر ان ہیبت ناک قسم کی کرامات ذکر کرنے میں مفتی غلام سرور صاحب منفرد نہیں ، اکثر تذکرہ نگاروں کا یہی حال ہے ۔اور یہی وہ صورت حال ہے جس نے مجھے اس کتاب کی تصنیف پر آمادہ کیا ۔ گویا جو کام ان بزرگوں کے بہی خواہوں نے ان کی عظمت کو اجاگر کرنے کے لیے کیا تھا ۔اسی کام سے ان بزرگوں سے بدعقیدگی کی صورت پیدا ہونے لگی ۔

اگرچہ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ مشائخ حق کے ادب واحترام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے ۔تاہم اگر کہیں لغزش ہو گئی ہو ۔ تو اسے بشری تقاضا پر محمول کیا جائے ۔

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ ۔ آمین

عبدالرحمٰن کیلانی دارالسلام ۔ وسن پورہ ۔ لاہور
اکتوبر ۱۹۸۸ء

برائے مہربانی یہ کتاب خریدئے اور دوستوں کو ہدیہ کیجئے ۔

فہرست

باب (۱)

دینِ طریقت یا رہبانیت

ایک آفاقی مذہب

جسم اور رُوح کے اتّصال کا نام زندگی ہے۔ ہر جاندار میں یہ دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں، لیکن انسان اور دوسرے جانداروں میں فرق یہ ہے کہ اسے عقل وشعور اور خیر وشر میں تمیز کی صلاحیت سے بھی نوازا گیا ہے، اسی عقل وشعور ہی کا کرشمہ ہے کہ عقلمند انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ اس کائنات میں اپنا مقام متعین کرے کہ وہ کس حیثیت سے اس کائنات میں زندگی گزار رہا ہے۔ اپنے مقام کی اس تشخیص پر اس کی زندگی اور اعمال وافعال کا انحصار ہوتا ہے۔

لیکن انسان کی عقل محدود ہے۔ زندگی میں بے شمار ایسے مسائل سامنے آتے ہیں جن میں اکثر عقل بھٹک جاتی ہے۔ مثلاً اس کائنات کی ابتداء کیسے ہوئی؛ وہ دُنیا میں کس حیثیت سے آیا ہے؟ مرنے کے بعد کیا رُوح بھی فنا ہو جائے گی؟ اور اگر ایسا نہیں تو پھر اس کی آئندہ زندگی کس طرح کی ہوگی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا عقل کی کسوٹی پر تجربہ ومشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔

پھر ہر انسان کی عقل کا معیار بھی الگ الگ ہے۔ کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو ہر وقت اسی قسم کے سوالات پر غور وفکر کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ کچھ دوسرے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں صرف کھانے پینے اور سونے سے غرض ہوتی ہے۔ ان مسائل کی طرف بھول کر بھی کبھی نہیں سوچتے۔ پھر یہ بات بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان کی سوچ پر اس کے ماحول کی گہری چھاپ ہوتی ہے، لہٰذا یہ بھی ضروری نہیں کہ اس

محدود دائرہ میں ہر عقلمند کی عقل ایک ہی جیسا نتیجہ اخذ کرے۔

بلاشبہ دین کے انتخاب کے معاملہ میں عقل کو ایک مقام حاصل ہے اس کے اصول و مبادیات کی جانچ اور تحقیق میں ہر انسان خود مختار ہے۔ چاہے تو اسے قبول کرے، چاہے تو رد کرے، لیکن دین کے اصول، عقائد و احکام کو عقل کے حوالہ نہیں کیا گیا، بلکہ عقل کو وحی کے تابع کر کے غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ خالقِ کائنات نے اپنے خاص فضل و کرم سے انبیاء پر وحی نازل فرما کر انسان کو کائنات میں اس کے صحیح مقام کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ بالفاظِ دیگر کسی نبی کی صداقت تک پہنچنے کی حد تک تو انسان اپنی عقل سے کام لینے میں مختار ہے۔ لیکن کسی نبی پر ایمان لانے کے بعد اسے یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ اس کی ہر ہر جزء کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھے، بلکہ اب نبی کی رہنمائی ہی واجب ہوتی ہے۔ اسی چیز کا نام دین ہے۔

خدا کا پیغامِ ہدایت

اللہ نے جب انسان کو دنیا پر اتارا، تو جہاں اس کی بھوک، پیاس اور صنفی خواہشات کی تکمیل کے لئے خوراک، پانی اور اس کے جوڑے کا انتظام کیا وہاں اس کی روحانی اور اخلاقی تمناؤں کی تکمیل کے لئے ایک واضح نظامِ ہدایت بھی عطا فرمایا۔ چنانچہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام جہاں پہلے انسان تھے، جو دنیا میں تشریف لائے۔ وہاں وہ پہلے نبی بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کی جنت میں رہائش اور وہاں سے نکلنے کا قصہ بیان کر کے حضرت آدم علیہ السلام اور اولادِ آدم علیہ السلام سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ	پھر تمہیں میری طرف سے راہِ ہدایت پہنچے گی، تو
تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ	جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے اُن پر نہ کچھ
وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲:۳۸)	خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

پھر جس طرح انسان کو عقل و شعور سے نوازا گیا ہے۔ وجدان سے بھی سرفراز کیا گیا ہے جسے قلبی کیفیت بھی کہتے ہیں۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو عقل کی کسوٹی پر تجربہ و مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن انسان کا دل اس کی صحت پر شہادت دیتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد کی زندگی کے ثبوت میں نیند کو بطورِ تمثیل پیش کیا ہے۔ کیونکہ ان دونوں میں بہت سی باتیں بطورِ قدرِ مشترک پائی جاتی ہیں۔ اور ساتھ ہی انسان کو یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ جو خدا انسان کو نیند کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔ وہ بھلا مرنے کے بعد زندگی کیوں نہیں عطا کر سکتا۔ یہ تمثیل عقل اور تجربہ کی کسوٹی پر پوری نہ اترنے کے باوجود بھی انسان کے دل میں

جاگزیں ہو جاتی ہے۔ اِس قلبی کیفیت کا نام وجدان ہے۔ وحی الٰہی میں عقل و خرد اور وجدان دونوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔

مذاہبِ عالم میں جب بھی کبھی بگاڑ پیدا ہوا ہے۔ انہی دو چیزوں ـــ عقل اور وجدان ـــ کے استعمال میں افراط و تفریط سے ہوا ہے۔ عقل نے جب وحی الٰہی میں بے جا تنقید و مداخلت کی اور اسے کلام اور فلسفہ کی سان پر چڑھایا، تو اس سے کیا گل کھلے اور کتنے فرقے وجود میں آئے۔ اس مضمون میں یہ تفصیل خارج از بحث ہے۔ سرِدست ہم اس بگاڑ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جو وجدان کے استعمال میں افراط و تفریط سے پیدا ہوتے ہیں۔

ایمان بالغیب

تمام انبیاء کرام پر جو مختلف ادوار و اوقات میں وحی نازل ہوتی رہی، اس کے اُصول و مبادیات ہمیشہ ایک ہی رہے ہیں اور ان کا بنیادی تصور "ایمان بالغیب" ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

۱ بن دیکھے خدا پر ایمان لانا اور یہ سمجھنا کہ وہی اس کائنات کا خالق و مالک اور رازق ہے اور وہ صرف ایک ہی ہستی ہو سکتی ہے۔

۲ بن دیکھے مرنے کے بعد کی زندگی، جنت اور دوزخ پر ایمان لانا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ ہر انسان کو مرنے کے بعد اُس کے اچھے یا بُرے اعمال کی جزا و سزا ضرور ملے گی اور اُن کے اعمال کے لحاظ سے اِن کا ٹھکانا جنت یا دوزخ ہوگا۔

۳ بن دیکھے اس بات پر ایمان لانا کہ نبی پر اللہ تعالٰی کی طرف سے فرشتہ نازل ہوتا ہے جو اللہ کی طرف سے بندوں کے لئے وحی یا پیغامِ ہدایت لاتا ہے اگرچہ نبی ان ہی کا ایک فرد ہوتا ہے۔

انسان اور دیگر موجودات میں دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ انسان کے علاوہ باقی تمام موجودات اللہ کے طبعی قوانین کی پابند ہیں۔ سورج، چاند، زمین، آسمان، پانی، آگ، ہوا، بادل وغیرہ کے لئے جو طبعی قانون اللہ نے مقرر فرما دئیے ہیں۔ کوئی چیز بھی ان سے سرِ مو تجاوز نہیں کر سکتی، لیکن انسان طبعی لحاظ سے تو طبعی اُمور کا پابند ہے۔ وہ چاہے بھی تو بڑھاپے کے بعد جوانی کو واپس نہیں لا سکتا، نہ ہی اپنی موت کو روک سکتا ہے۔ وہ کھانے پینے کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتا، یہ اور اس جیسے دوسرے بے شمار مسائل ایسے ہیں جن میں انسان مجبور محض اور طبعی اُمور کے آگے بے بس ہوتا ہے، لیکن خیر و شر میں سے کسی ایک کے انتخاب پر اسے کچھ اختیار بھی دیا گیا ہے۔ وحی الٰہی یا خُدا کی طرف سے نازل شدہ ہدایت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان ایسے اختیاری امور میں بھی خود

کو، دوسری تمام موجودات کی طرح، خدا کی منشاء و مرضی کے تابع بنا دے تاکہ اس کی ذات بھی کائنات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ ایمان بالغیب اس معاملہ میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔

خدا اگر چاہتا تو۔ کائنات کی دوسری اشیاء کی طرح۔ انسان اور اپنے درمیان سے غیب کے یہ پردے ہٹا بھی سکتا تھا۔ لیکن اس طرح انسان کی اطاعت اختیاری نہ رہتی، بلکہ دوسری اشیاء کی طرح اضطراری قسم کی ہوتی۔ اور انسان کی پیدائش اور اس دنیا کے دارالامتحان ہونے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ ایمان بالغیب اور وحی الٰہی کا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کے مادی اور روحانی تقاضوں میں کچھ اس قسم کا حسین امتزاج پیدا کر دیتا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر انسان روحانی منازل طے کرتا ہوا دنیا اور آخرت کی کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد وہ ان تمام چیزوں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتا ہے۔ جن پر وہ مرنے سے پہلے بن دیکھے ایمان لایا تھا۔

رہبانیت کی ابتداء

تاریخ مذاہب کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مذاہب میں جب بھی بگاڑ پیدا ہوتا ہے، تو اس کی ابتداء ہمیشہ مقدس اور نیک آرزوؤں سے ہوئی۔ اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے لئے بھلائی کے تصور سے کبھی سیر نہیں ہوتا اور اس بھلائی کو جلد از جلد حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے سوچا کہ جو باتیں ہم آخرت میں مشاہدہ کریں گے۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح ان چیزوں کا پورا یا تھوڑا بہت مشاہدہ اس دنیا میں بھی ہو جائے، تو کیا ہی بہتر ہو گا؟ اس طرح اس نے ان غیب کے پردوں کو دور کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دیں اس نے یہ بھی سوچا کہ اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کا جسم اور اس کے مادی تقاضے ہیں۔ لہٰذا جب تک ان سے چھٹکارا حاصل نہ کیا جائے روحانی منازل طے کرنا ناممکن ہے۔ یہی فکر رہبانیت یا دینِ طریقت کی بنیاد ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وَ رَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ	اور انہوں نے لذات سے کنارہ کشی کی خود ایک نئی بات نکالی، جس کا ہم نے ان کو حکم نہیں دیا تھا مگر انہوں نے (اپنے خیال کے مطابق) خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے (آپ ہی ایسا) کر لیا تھا۔ پھر جیسا اس کو نباہنا چاہئے تھا، نباہ بھی نہ سکے۔ پھر جو لوگ ان میں سے ایمان لائے

وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ‎ ان کو ہم نے ان کا اجر دیا اور ان میں سے زیادہ نافرمان

(۵۷/۲۷) ‎ ہیں۔ (ترجمہ فتح محمد جالندھری)

مندرجہ بالا آیت سے اس دینِ طریقت کی بہت سی باتوں پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ لذات کو ترک کرنا وحی الٰہی کے مطابق نہیں، بلکہ ایک بدعت ہے۔

۲۔ ان کے اپنے خیال کے مطابق وہ اللہ کی خوشنودی چاہتے تھے۔ حالانکہ اگر فی الواقع خدا کی خوشنودی کا طریقہ ہوتا، تو ضرور وحی میں مذکور ہوتا۔ تاہم اُن کا ابتدائی ارادہ نیکی وخیر پر محمول تھا۔

۳۔ نصاریٰ سے بہت پہلے یہود نے بھی یہ روش اختیار کی تھی۔

۴۔ پھر یہ لوگ اپنے ابتدائی ارادوں پر قائم نہ رہے اور مختلف راہوں پر بھٹکنے لگے۔

۵۔ یہ کئی گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ تو ایمان پر قائم رہا اور اسے اس کا اجر ملے گا، لیکن زیادہ تر یہ لوگ نافرمان ہی تھے۔

دنیوی تعلقات سے بیزاری

ان لوگوں کا نظریہ تھا کہ روحانیت کے اس راستے میں حائل سنگِ گراں ہمارا مادی جسم ہے۔ لہٰذا اس جسم کو مضمحل اور کمزور بنانے کے لئے طرح طرح کے عذاب دیئے جانے لگے۔ کم سے کم کھانا پینا، جس سے صرف روح اور جسم کا تعلق باقی رہے۔ اور کم سے کم سونا، دنیوی لذات جن سے فائدہ اٹھانے کا خدا نے انہیں حق دیا تھا، اس سے کنارہ کشی کرنا۔ شدید سردی میں ننگے بدن باہر رات گزارنا، کہیں شدید گرمی میں کسی ایک ہی جگہ کھڑے رہنا، چُپ کا روزہ رکھنا، کیچڑ میں پڑے رہنا اور اس طرح کی کئی دوسری صورتیں مادی جسم کو کمزور کرنے اور اذیت دینے کے لئے انہوں نے ایجاد کر لی تھیں حتیٰ کہ تاریخ میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ یہ راہب اپنے جسم پر خود زخم کر لیتے۔ پھر اس میں کیڑے پڑ جاتے اور اگر کوئی کیڑا گر جاتا، تو اٹھا کر اُسے پھر اپنے جسم پر چمٹا دیتے اور کہتے کہ یہ جسم تمہاری خوراک ہے۔ تم اس سے کیوں محروم ہوتے ہو۔ گویا اپنی جان سے دشمنی اُن کا پہلا اُصول تھا۔ لہٰذا جسم کی تعذیب اور اس کے تقاضوں کی تکذیب کے ذریعہ وہ اپنے جسم کو تحلیل کرنے میں مصروف ہو گئے۔

ان لوگوں کا دوسرا اقدام دنیا والوں سے قطع تعلق تھا۔ یہ لوگ اپنے لئے کوئی گوشۂ تنہائی منتخب کر

---

[۱] جیسے یہ لوگ چہار ترک کی تعلیم دیتے ہیں۔ ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ اکل ونوم اور ترکِ خواہشِ نفس۔

بیٹھتے یا پھر کسی جنگل کی راہ لیتے۔ ان کے خیال کے مطابق اِن کے رشتہ دار اور دوسرے معاشرتی تعلقات رکھنے والے دوست احباب بھی اس راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھے۔ لہٰذا دنیا و مافیہا سے الگ ہو کر کسی جنگل میں ایک کٹیا بنا کر گیان دھیان میں مصروف ہو جاتے۔ دنیوی علائق میں سے ان لوگوں کو سب سے زیادہ دشمنی عورت سے تھی۔ تاریخ میں ایسے دلدوز واقعات بھی ملتے ہیں کہ کوئی مامتا کی ماری ماں اپنے ایسے ہی بیٹوں کو جنگل میں دیکھنے گئی، لیکن بیٹوں نے اس کی ملاقات سے انکار کر دیا۔ وہ انہیں صرف ایک نظر دیکھنے اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے لئے ترستی اور التجائیں کرتی رہی، لیکن ان سنگدل راہبوں نے اس کی التجا کو ذرہ بھر وقعت نہ دی اور اُسے ناکام واپس آنا پڑا۔

تاریخ تو پھر تاریخ ہے جس میں کذب کا احتمال موجود ہوتا ہے۔ ہمیں بخاری و مسلم دونوں میں ایک مرفوع حدیث بھی ایسی ملتی ہے جو اس موضوع سے پوری مطابقت رکھتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابن جریج ایک راہب تھا جس نے اسی طرح جنگل میں کٹیا بنا رکھی تھی۔ مامتا کی ماری اس کی ماں اس سے ملنے آئی۔ اور اسے پکارا لیکن راہب مذکور گیان دھیان میں مصروف رہا۔ دل میں یہ ضرور سوچا کہ الٰہی ادھر تیری عبادت میں مصروف ہوں۔ دوسری طرف ماں پکار رہی ہے، کروں تو کیا کروں؟ بالآخر اس کے دل نے یہی فیصلہ کیا کہ گیان دھیان میں مصروف رہے اور ماں کی اس آرزو کی پرواہ نہ کرے۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے کوئی بات نہ کی اور اپنی عبادت میں لگا رہا۔ دوسرے دن پھر اس کی ماں آئی۔ پھر بھی اس نے حسبِ سابق اپنی ماں کی پکار کو در خورِ اعتنا نہ سمجھا۔ تیسری بار پھر ایسا ہی واقعہ ہوا تو اب اس کی ماں کو اتنا قلق ہوا کہ اس کے منہ سے اپنے اس درویش بیٹے کے حق میں بے اختیار یہ بددعا نکل گئی کہ "یا الٰہی! جب تک میرا یہ بیٹا کسی فاحشہ عورت کا منہ نہ دیکھ لے اسے موت نہ آئے۔" بھلا مامتا کی ماری دکھیاری ماں کے منہ سے نکلی ہوئی آہ رائیگاں کیسے جا سکتی تھی؟ ابن جریج اپنی عبادت اور خدا ترسی میں اتنا مشہور تھا کہ بنی اسرائیل کے اکثر لوگ اس سے حسد کرنے لگے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ ابن جریج پر ایسا الزام لگے جس سے اُس کا یہ بلند مقام چھن جائے اور اسی غرض سے خفیہ مشورے بھی ہونے لگے تو ایک بدنام زمانہ فاحشہ عورت نے، جو حسن و جمال میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھی اس "خدمت" کو سر انجام دینے کا ذمہ لیا اور اسی غرض سے اپنے آپ کو ابنِ جریج پر پیش کر دیا۔ جسے ابن جریج نے رد کر دیا۔ اب یہ فاحشہ عورت اور بھی سیخ پا ہو گئی اور اس "بے آبروئی" کا انتقام لینے پر اتر آئی۔ اب اُس نے اپنے آپ کو ایک چرواہے پر پیش کیا جس سے اُس کو حمل ہو گیا اور جب بچہ پیدا ہوا، تو لوگوں کے پوچھنے پر اس نے یہ مشہور کر دیا کہ یہ حمل

ابن جریج راہب سے ہوا تھا۔ بس پھر کیا تھا، لوگ دوڑے آئے۔ ابن جریج کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا اور اُس کی کٹیا کو منہدم کر دیا۔ ابن جریج نے اس مار دھاڑ کی وجہ پوچھی تو لوگوں نے سارا ماجرا بتلا دیا۔ ابن جریج نے کہا کہ تھوڑی دیر ٹھہرو۔ لوگ رُک گئے تو اُس نے وضو کیا اور عبادت میں مشغول ہوا اور اللہ سے بصد گریہ وزاری اپنی بریت کی دُعا کی، جو اللہ نے قبول فرمائی۔ وہ عبادت سے فارغ ہو کر لوگوں کے پاس آیا۔ وہ فاحشہ عورت بمعہ بچہ موجود تھی۔ ابن جریج نے اس بچہ کے پیٹ میں کچوکا دے کر کہا کہ بتا تیرا باپ کون ہے؟ بچہ بول اٹھا کہ فلاں چرواہا ہے۔ تب جا کر لوگوں نے ابن جریج کا پیچھا چھوڑا۔ ان میں سے بعض اس سے معافی مانگنے لگے اور کہنے لگے کہ اگر کہو تو تمہیں سونے کی کٹیا بنا دیں، لیکن ابن جریج نے کہا کہ "بس مجھے ویسی ہی مٹی کی کٹیا بنا دو۔" (مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تقدیم بر الوالدین۔۔۔)

اس طویل حدیث میں ایسے تین بچوں کا ذکر ہے جنہوں نے ماں کی گود میں کلام کیا۔ جن میں سے ایک یہی ابن جریج راہب تھا۔ امام مُسلم نے اس حدیث کو "والدین سے حسن سلوک" کے باب میں ذکر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ شرعی احکام کے مقابلہ میں ایسی رہبانیت گناہ ہے۔ حدیث میں اس مذکورہ واقعہ سے اس دَور کے طریقِ رہبانیت پر پوری روشنی پڑتی ہے۔

بیوی کا معاملہ اس سے بھی زیادہ نازک تھا، کیونکہ نکاح سے اور بیوی کی موجودگی میں انسان کو بہت زیادہ معاشی اور معاشرتی ذمہ داریاں آپڑتی ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ متاہل زندگی سے سخت نفرت کرتے تھے، گو ان کو رہبانیت کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہ دیا تھا۔ تاہم انہیں رہبانیت کی زندگی کی فضیلت کے لئے کچھ اشارے ضرور مل گئے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود شادی نہ کی۔ ان کی زندگی کے جن چند سالوں کے واقعات پر جو روشنی پڑتی ہے وہ یہی ہے کہ انہوں نے تبلیغ کے سلسلہ میں گھوم پھر کر مجرّدانہ زندگی گزار دی تھی۔ پھر عیسائیوں میں نکاح ثانی کی بھی گنجائش نہ تھی اور یہودیوں نے رہبانیت کا تصور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اُن چالیس دنوں سے لیا جو انہوں نے تورات ملنے سے قبل کوہِ طور کے دامن میں گوشہ نشینی کی حالت میں گزارے تھے۔

یہ تو یہود و نصاریٰ کی بات تھی۔ اب ہندوستان کی طرف آیئے۔ ہندومت کے راہنماؤں[1] نے انسان کی

---

[1] اہلِ ہند کو خدائی راہنمائی ملی تھی یا نہیں۔ اس سوال کے متعلق قرآن کریم سے اتنا جواب تو ملتا ہے کہ:

اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (۳۵:۲۴) اور کوئی امت نہیں، مگر اس میں ڈرانے والا گزر چکا ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

زندگی کو سو سال قرار دیا اور اُس کے چار حصے کیئے گئے جن میں آخری چوتھا حصہ یا ۲۵ سال رہبانیت (گیان دھیان) کے لیئے مختص کیئے گئے تھے اور بُدھ مت تو خالصتاً اسی راہبانہ زندگی کی تعلیم دیتا ہے۔ اِس مذہب کے بانی مہاتما بُدھ ــ جو ایک شہزادہ تھا ــ نے دُنیا کی بے ثباتی اور اس کے ہنگاموں سے راہِ فرار اختیار کر کے راہبانہ زندگی بسر کی، تا آنکہ اس کو وہ روشنی ملی، جس کی تلاش میں وہ نکلا تھا۔ بعد ازاں اُس نے ہندوؤں سے علیحدہ بُدھ مَت کی بنیاد ڈالی۔ اس مذہب کی تعلیم ہی یہ ہے کہ انسان کی مکتی یا نجات کی واحد صُورت یہ ہے کہ وہ راہبانہ زندگی گزارے۔ ایسے راہبوں کو وہ اپنی زبان میں بھکشو کہتے تھے۔

غیب کے پردے

غیب کے جس قدر پردے ہٹانے کی ضرورت تھی، وہ تو اللہ تعالیٰ نے خود ہی ہٹا دیئے تھے۔ وحی کے ذریعہ تمام انبیاء کو یہ اطلاع دی جاتی رہی کہ اس کائنات کا خالق و مالک صرف ایک ہی مقتدر ہستی ہو سکتی ہے جو تمام کائنات کا اِلٰہ اور معبُود ہے۔ باقی تمام مخلوق اس کی مطیعِ فرمان اور عاجز بندے ہیں۔ وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ماضی کے حقائق کا بھی انکشاف کیا اور قیامت اور اُخروی زندگی کا بھی۔ جزا و سزا کے قانون کا، اور اس بات کا بھی کہ مرنے کے بعد انسان کے ساتھ کیا کچھ ہونے والا ہے۔ یہ سب غیب کی باتیں تھیں جو اللہ تعالیٰ نے خود ہی بتلا دیں اور اس نظامِ کائنات یا انسان اور خدا کے درمیان ایسے غیب کے پردے خود ہی اٹھا دیئے تھے۔ جن کی انسان کو دنیوی اور اخروی زندگی میں کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لیے ضرورت تھی اور جن کے انکشاف میں انسان کی عقل یا وجدان گمراہ ہو سکتے تھے۔ اس سے زیادہ پردہ اٹھانے سے چونکہ اس دار الامتحان کا نظام مختل ہو سکتا تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے مصلحتاً ان پردوں کو قائم رکھا۔ اُس نے انبیاء کو صرف اتنا ہی علمِ غیب عطا فرمایا، جتنا انسان کی نجات کے لئے ضروری تھا۔

مگر چونکہ ایسے رہبان یا گیانی یا صوفی قِسم کے لوگوں کا سب سے پہلا ہدف یہی غیب کے پردے ہوتے ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایسے افعال کو ایسی بدعت قرار دیا۔ جس کے متعلق انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں ملا تھا۔ احادیثِ نبویؐ میں بھی اس رہبانیت یا دینِ طریقت اور اس کے طریق غلو فی العبادات کو ناپسند کیا گیا اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تُشَدِّدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ فَاِنَّ ‏ ‏ اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کیونکہ ایک قوم نے اپنی جانوں پر سختی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) لیکن یہ بات کہ ہندوستانی مذہبی راہنمائی الواقع پیغمبر تھے۔ وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پھر حضور اکرم کی تعلیمات اور شریعت کے علاوہ تمام انبیاء کی کُتب میں چونکہ ہمیشہ سے رد و بدل ہوتا رہا ہے۔ لہٰذا ہم اس معاملہ میں حضور اکرم صلعم کے ارشاد کے مطابق نہ تو ان کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ تکذیب۔

قَوْمًا يُشَدِّدُوا عَلَىٰٓ اَنْفُسِهِمْ	کی تو پھر اللہ نے بھی ان پر سختی کی (یعنی ان کا ایجاد کردہ عبادت ہی اُن کی جانچ کے لئے مقرر کر دیا) اس قوم کا بقایا
فَشَدَّدَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ فَتِلْكَ بَقَايَاهُمْ	
فِي الصَّوَامِعِ وَالدِّيَارِ وَرَهْبَانِيَّةَ نِ	گرجوں اور خانقاہوں میں ہے (پھر آپ نے یہ آیت پڑھی)
ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ	رہبانیت کو اُنہوں نے خود ہی ایجاد کر لیا تھا۔ جس کا ہم نے
(ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الحسد)	انہیں حکم نہیں دیا تھا۔

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ وَلَنْ يُشَادَّ	بلاشبہ دین آسان ہے کوئی شخص دین میں (اپنے آپ پر)
الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهُ فَسَدِّدُوا وَ	سختی نہ کرے کہ وہ عمل اسے (بعد میں) عاجز کر دے۔ پس
قَارِبُوا وَاَبْشِرُوا وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ	ہر عمل ٹھیک طرح بجا لاؤ اور میانہ روی اختیار کرو اور
وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ	خوش ہو جاؤ اور صبح و شام اور آخری رات کے کچھ حصہ میں
(مشکوٰۃ، کتاب الصلوٰۃ، باب القصد فی العمل)	اللہ سے مدد طلب کرتے رہو۔

لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کا ایک طبقہ اس میدان میں گھس گیا۔ وہ بھی اس راہبانہ زندگی کے جواز کے لئے یہ دلیل پیش کرنے لگا کہ حضور اکرم نے بعثت سے چند ماہ پیشتر غار حرا میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور وہیں آپ پر وحی نازل ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ زمانہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے کا ہے۔ جو شریعت کا حصہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں جب آپ نے ترکِ رہبانیت سے متعلق مندرجہ بالا واضح حکم دے دیا۔ تو پھر اس کے بعد اس واقعہ سے استدلال کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ پھر کچھ لوگوں نے زہد اور فقر کے متعلق آیات و احادیث کو غلط سلط معنی پہنائے اور ان صفات میں انتہا درجہ کا غلو اور کھینچا تانی کر کے رہبانیت کی راہ ہموار کر لی۔

رہبانیت کا طریق کار

ان لوگوں کا طریقِ کار یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا کام علم توجہ اور علمِ استحضارِ رُوح (سپر یچولزم (SPIRTUALISM)) سے شروع کرتے ہیں۔ جس طرح ایک مسمریزم کا ماہر عامل معمول پر اپنی توجہ ڈال کر اس کی رُوح کو حاضر کرتا اور اس سے کئی طرح کی خبریں حاصل کرتا ہے یا ایک جن نکالنے والا کچھ آیاتِ قرآنی یا جنتر منتر پڑھ کر جنوں کو حاضر کرتا ہے اور ان کاموں کے لئے پہلے چلہ کشی اور ریاضت کی جاتی ہے۔ بعینہٖ یہی طریق ان لوگوں نے اختیار کیا۔ ایسے اعمال و افعال سے تین چیزیں بنیادی حیثیت

رکھتی ہیں۔

(۱) پیکرِ محسوس، جو غیب کے پردہ میں نہ ہو، جیسے مسمریزم کرنے والے عامل کے سامنے معمول ہوتا ہے اور جن نکالنے والے پیر کے سامنے مریض۔

(۲) توجہ خواہ یہ ظاہری آنکھ کی کشش سے ہو یا قلبی ہو جسے عُرفِ عام میں توجہ، قلبی دباؤ، مراقبہ یا ہندی میں گیان دھیان کہتے ہیں اور

(۳) عزمِ راسخ یا عقیدہ۔

پیکرِ محسوس خواہ کوئی جاندار شئے ہو یا بے جان۔ جب اس کے متعلق کوئی عقیدہ قائم کرکے مراقبہ کیا جائے گا تو اُس کے اثرات حسبِ پختگی عقیدہ مرتب ہونے شروع ہو جائیں گے۔ ایسے اعمال و افعال سے جہاں انسان نے رُوحوں کو حاضر کرکے ان سے غیب کی خبریں حاصل کیں۔ وہاں ان سے حسبِ ضرورت کام بھی لیا۔ انسان کی اس طرح سے حاصل شدہ معلومات کو تصوف کی اصطلاح میں کشف[1] یا مکاشفہ کہا جاتا ہے۔

ریاضت مجاہدہ، چلّہ کشی اور مکاشفات کے ذریعہ انسان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اس رُوحوں کی دنیا (عالمِ ارواح) میں بے شمار قسم کی روحیں پائی جاتی ہیں، جو غیر مرئی مخلوق ہیں، مثلاً فرشتے، جن، فوت شدہ انسانوں کی رُوحیں، نیک رُوحیں، شیطانی اور خبیث رُوحیں، سب اس عالم میں پائی جاتی ہیں۔ انسان نے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق ان رُوحوں کو قابو کرنے کے لئے کئی قسم کے اوراد اور جنتر منتر بھی دریافت کر لئے اور اُن کو مسخر کرکے کئی قسم کی شعبدہ بازیاں دکھانا شروع کیں۔ ایسی رُوحوں کو عام طور پر رجال الغیب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

رجالُ الغیب سے استفادہ کرنے والے گروہ

دورِ نبویؐ میں اس عالمِ ارواح سے استفادہ کرنے والے مندرجہ ذیل قسم کے گروہوں کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) رہبان ـــــ جو تارک الدنیا ہو کر جنگلوں میں کوئی کٹیا یا خانقاہ بنا کر اس میں مقیم رہا کرتے تھے۔

---

[1] کشف کی حقیقت کے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ:

"کشف کوئی بڑا کمال نہیں، اگر کافر بھی ریاضت و مجاہدہ کرے تو اس کو بھی ہونے لگتا ہے۔ نیز مجانین و مجنونوں، مجذوبوں، دیوانوں کو بھی کشف ہوتا ہے۔ صاحب شرح اسباب نے لکھا ہے۔ میں نے خود دیکھا۔ ایک مجنوں کو اس قدر کشف ہوتا تھا کہ بزرگوں کو بھی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جب اس کا مسہل ہوا، تو مادہ کے ساتھ کشف بھی نکل گیا۔" (اشرف السوانح ج ۲، ص ۸۷)

تزکیۂ باطن اور دل کو آئینہ بنانے میں مصروف رہتے۔ ان کا اصل مقصود ذاتِ باری تعالیٰ کا مشاہدہ کرنا ہوتا تھا۔ وہ لوگوں کو غیب کی خبریں بھی بتلایا کرتے تھے۔ ان کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

(۲) کاہن ــــــــ ایسے لوگ چلہ کشی ضرور کرتے تھے، لیکن عام آبادیوں میں رہتے تھے۔ ان کا تعلق شیطانی روحوں سے ہوتا تھا۔ بخاری "باب الکہانۃ" میں ہے کہ "کچھ لوگوں نے آں حضرت ﷺ سے پوچھا: کاہنوں کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا: ان کی باتیں محض لغو ہیں۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کبھی تو اُن کی بات سچ نکلتی ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں یہ بات وہ ہوتی ہے جو کاہن شیطان سے اڑا لیتا ہے (یا شیطان فرشتوں سے اڑا لیتا ہے) پھر وہ اپنے "ولی" یعنی دوست کے کان میں پھونک دیتا ہے، تو یہ لوگ اس میں سو جھوٹ ملا لیتے ہیں۔

بخاری و مسلم میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ مدینہ میں ایک شخص ابن صیاد نامی کاہن رہتا تھا۔ وہ غیب کی خبریں بتلایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ حضورِ اکرم ﷺ نے اس سے پوچھا: "کیا تو گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو اُن پڑھوں کا رسول ہے۔ پھر اس نے حضورِ اکرم ﷺ سے کہا کیا آپ گواہی دیتے ہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے اُسے ٹھونکا مارا اور فرمایا: خدا انہیں تمہاری حد سے آگے نہ بڑھنے دے گا۔ پھر آپ نے پوچھا: اچھا، بتاؤ اس وقت میرے دل میں کیا ہے؟ آپ کو اُس وقت سورۂ دخان کا دل میں خیال آیا تھا۔ اس نے کہا "دخ" (یعنی دُھواں) اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہؓ اسے دجال خیال کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے اس کو قتل کرنے کی اجازت بھی طلب کی۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو روک دیا اور فرمایا: کہ اگر یہ دجال ہے تو تیرے ہاتھوں نہیں مارا جائے گا اور اگر یہ دجال نہیں، تو اسے قتل کرنا درست نہیں۔" (بخاری، کتاب القدر، باب یحول بین المرء و قلبہ)

(۳) جادوگر ــــــــ ان کا تعلق خالص شیطانی اور خبیث رُوحوں سے ہوتا تھا۔ یہ لوگ ایسی روحوں کو قابو کر کے

لوگوں کو تنگ کرتے، انہیں نقصان پہنچاتے اور لوگوں میں اپنی ہیبت کا سکہ جماتے تھے۔ یہ لوگ اِن رُوحوں کے ذریعہ اشیاء کی ماہیت اور حقیقت تو نہیں بدل سکتے البتہ فضا کو متاثر کرتے اور ہیبت ناک بنا دیتے ہیں، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے والے جادُوگروں کے متعلق فرمایا:

سَحَرُوٓا اَعۡیُنَ النَّاسِ ان جادوگروں نے حاضرین کی آنکھوں پر جادُو کر دیا

وَاسۡتَرۡهَبُوۡهُمۡ (۷:۱۱۶) اور اُن کو دہشت ناک کر دیا۔

گویا جادُوگروں کی رسیاں فی الحقیقت سانپ نہیں بنی تھیں بلکہ لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا اور وہ اُن سے ڈر بھی گئے تھے۔

اسی طرح بخاری شریف، باب السحر، میں واقعہ مذکور ہے کہ لبید بن عاصم یہودی نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادُو کیا۔ کنگھی سے جھڑے ہوئے سر کے بالوں پر منتر پڑھا، انہیں کھجور کے خوشے کے غلاف میں لپیٹ کر ذروان نامی کنوئیں میں رکھ دیا۔ اس عمل سے کنوئیں کا ماحول اس قدر دہشت ناک ہوگیا تھا کہ جو صحابہ یہ سامان نکالنے کے لئے بھیجے گئے۔ اُن کا بیان ہے کہ کنوئیں کا پانی مہندی جیسا سرخ معلوم ہوتا تھا اور کھجوروں کے درخت اتنے مہیب ہوگئے تھے کہ گویا سانپوں کے پھن ہیں۔"

کیا دیدارِ الٰہی ممکن ہے؟

اسلام نے کہانت اور سحر کو تو کفر قرار دیا تھا، لہٰذا مسلمان بالعموم اس سے محترز رہے۔ رہبانیت سے بھی منع تو کیا تھا، لیکن اس کے باوجود دیدار حق کے اشتیاق میں اس پُر خطر وادی میں داخل ہو گئے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس دُنیا میں اور ان آنکھوں (ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی) سے دیدارِ الٰہی ممکن بھی ہے یا نہیں؟ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

لَا تُدۡرِکُهُ الۡاَبۡصَارُ وَهُوَ نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا

یُدۡرِکُ الۡاَبۡصَارَ (۶:۱۰۳) ادراک کر سکتا ہے۔

نیز موسیٰ علیہ السلام نے جب دیدارِ الٰہی کا اشتیاق فرمایا، تو اللہ نے جواب دیا: "آپ مجھے ہرگز نہ دیکھ سکیں گے اگر اتنا ہی اشتیاق ہے تو پہاڑ کی طرف دیکھئے اگر یہ اپنی جگہ قائم رہا تو شاید تم مجھے دیکھ سکو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر اپنا جلوہ دکھایا تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہوکر زمین بوس ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہوکر گر گئے (۷:۱۴۳)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اُولوالعزم پیغمبر بھی جب دیدارِ الٰہی کی تاب نہ لا سکے تو دوسرے کسی کی کیا مجال، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبعین نے بھی اسی قسم کا مطالبہ کیا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک ہی کر ڈالا۔ ارشاد باری ہے:

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ	اور (اے یہود) جب تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم
لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ	اس وقت تک تمہاری بات نہ مانیں گے جب تک اللہ تعالیٰ
الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ثُمَّ	کو آشکارا نہ دیکھ لیں، تو تمہیں کڑک نے آ دبوچا اور تم دیکھ رہے
بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ (۲-۵۵-۵۶)	تھے۔ پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں زندہ کیا۔

اب احادیث کی طرف آیئے۔ صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ان الفاظ میں ملتا ہے:

حِجَابُهُ النُّوْرُ لَوْكَشَفَهٗ لَاَحْرَقَتْ	اللہ کا حجاب نور ہے۔ اگر وہ اس حجاب کو ہٹا دے تو اس
سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ مَا انْتَهٰى اِلَيْهِ	کے چہرے کے انوار سے وہ ساری مخلوق جل کر رہ جائے جس
بَصَرُهٗ مِنْ خَلْقِهٖ (مسلم، کتاب الایمان)	کو اس نے پیدا کیا ہے، جہاں تک اس کی نظر پہنچے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق گو بعض علماء نے اختلاف کیا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ آپ نے معراج کی رات اللہ تعالیٰ کا دیدار فرمایا تھا۔ لیکن اس مسئلہ میں قطعی فیصلہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث ہے، جو امام بخاریؒ کتاب التفسیر سورۃ والنجم کے تحت لائے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا: "کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار کو دیکھا تھا؟" انہوں نے کہا تیری اس بات پر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تین باتیں جو شخص بھی بیان کرے وہ جھوٹا ہے۔ جو کوئی تجھ سے یہ کہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کو دیکھا، اس نے جھوٹ بولا۔ اس کے بعد یہ آیت پڑھی لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ اِلٰى اٰخِرِهٖ

البتہ بخاری کتاب التوحید میں یہ صراحت موجود ہے کہ قیامت کے دن مسلمان اللہ تعالیٰ کو ایسے دیکھ سکیں گے جیسے اس دنیا میں چاند کو دیکھتے ہیں اور انہیں کوئی اڑچن محسوس نہیں ہوگی۔ گویا دیدارِ الٰہی اُخروی زندگی میں ممکن ہے اس زندگی میں نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس دنیا میں دیدارِ الٰہی ممکن ہی نہیں تو یہ لوگ کس بات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ پھر جو یہ لوگ دیدارِ الٰہی سے مشرف ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں تو اس کی کیا حقیقت ہے؟ اس سوال کے جواب سے پیشتر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تجلی ڈالنے، ہمکلام

ہونے یا وحی بھیجنے سے دو نتائج یقینی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اس میں لذتِ حقیقی محسوس کرتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہمکلام ہوئے تو صرف اتنا پوچھا کہ "موسیٰ! تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟" تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مختصر سے سوال کا اچھا خاصا لمبا جواب دیا۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان لذت کے لمحات کو طویل سے طویل تر بنانا چاہتے تھے۔ یا جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ عرصہ کے لئے وحی رُک جاتی، تو آپؐ بے قرار رہتے اور جبرائیل علیہ السلام کا انتظار کرتے رہتے تھے۔

اور دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی طبیعت پر خاصا بوجھ پڑتا محسوس ہوتا ہے جو بعض دفعہ ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام تجلی کو برداشت نہ کر سکے اور بیہوش ہو گئے اور پہاڑ تو خیر ریزہ ریزہ ہی ہو گیا تھا۔ اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک دفعہ سفر میں وحی نازل ہوئی تو اس بوجھ کا اثر اتنا شدید تھا کہ آپؐ کی اونٹنی بھی زمین پر بیٹھ گئی۔ اور بعض دفعہ تو آپ کو نزولِ وحی کے وقت پسینہ تک آجاتا تھا۔ پہلی دفعہ جب غارِ حرا میں آپؐ پر وحی نازل ہوئی تو اس وقت اتنا شدید بوجھ محسوس کر رہے تھے کہ گھر آکر لیٹ گئے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: زَمِّلُوْنِیْ (مجھ پر چادر اوڑھا دو، مجھ پر چادر اوڑھا دو)

دیدارِ الٰہی یا شیطانی فریب

اب یہ بزرگ یا اولیاء جو مشاہدۂ حق یا ہمکلام ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان میں اور انبیاء میں جو بنیادی فرق ہے وہ یہ ہے کہ:

انبیاء کے ساتھ جو واقعہ پیش آتا ہے وہ مبنی بر حقیقت ہوتا ہے، لیکن دوسروں سے جو ایسے واقعات پیش آتے ہیں وہ بسا اوقات شیطانی فریب کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتے جیسا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنے کشف کا ایک ذاتی واقعہ ارشاد فرماتے ہیں:

"ایک مرتبہ ایک عظیم الشان روشنی ظاہر ہوئی جس سے آسمان کے کنارے بھر گئے۔ اس سے ایک صورت ظاہر ہوئی۔ اس نے مجھ سے خطاب کر کے کہا کہ "اے عبدالقادر! میں تمہارا رب ہوں۔ میں نے تمہارے لئے سب محرمات حلال کر دیئے۔" میں نے کہا: "دور ہو مردود!" یہ کہتے ہی وہ روشنی ظلمت سے بدل گئی اور وہ صورت دھواں بن گئی۔ اور ایک آواز آئی کہ "اے عبدالقادر! خدا نے تم کو تمہارے علم و تفقہ کی وجہ سے بچا لیا۔ ورنہ اس طرح میں تیرے جیسے ستر صوفیوں کو گمراہ کر چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "محض اللہ کی مہربانی سے۔" کسی نے کہا کہ "حضرت! آپ کیسے سمجھے کہ یہ شیطان ہے؟" فرمایا: "اس کے کہنے سے کہ میں نے حرام چیزوں کو تمہارے لئے حلال کر دیا۔" (الطبقات الکبریٰ للشعرانی ج ۱، ص ۱۳۵ و طبقات الحنابلہ ابن رجب بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۱، ص ۱۸۴، مصنفہ ابوالحسن علی ندوی)

دوسرا فرق یہ ہے کہ انبیاء پر ایسے اوقات میں توجہ تو پڑتا ہے اور لذت بھی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ان پر محویت کا عالم (جسے تصوف کی اصطلاح میں سُکر کہتے ہیں) طاری نہیں ہوتا۔ نہ وہ اپنے حواس کھو دیتے ہیں، کیونکہ وہ مامون اللہ ہوتے ہیں لیکن یہ بزرگ حضرات عموماً ایسے مواقع پر ہوش و حواس کھو کر بہت سی غلط سلط باتیں بھی کہہ جاتے ہیں۔ جو شریعتِ مطہرہ کے سراسر خلاف ہوتی ہیں اور جن کا بسا اوقات بعد میں انہیں خود بھی افسوس ہوتا ہے اور ایسے واقعات بے شمار ہیں۔

پھر یہ بات تو کتاب و سنت کی نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے کہ وحی الٰہی کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ کے بعد منقطع ہو چکا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ اس دنیا میں دیدارِ الٰہی ممکن نہیں۔ اب جو کچھ یہ حضرات دیکھتے ہیں یا جن سے ہمکلام ہوتے ہیں وہ رجال الغیب ہی ہو سکتے ہیں۔ شریعت کی رُو سے اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نظر نہیں آتی۔ یہی رجال الغیب اِن متصوفین سے ہمکلام ہوتے ہیں اور یہی اپنی تجلیات سے نوازتے ہیں اور ہمارے اس دعوٰے کی قوی دلیل پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا وہ اقتباس ہے جسے ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اور جس کی تفصیل آگے چل کر بیان ہوگی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تجلّی کے وقت جو بیہوشی طاری ہوئی (حالانکہ آپ نے اس حالت میں کوئی نازیبا بات بھی نہیں کہی) تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ ان کا یہ مطالبہ رضائے الٰہی کے خلاف تھا۔ ورنہ یہ صورتِ حال کبھی پیش نہ آتی۔ اور تاریخِ انبیاء میں صرف یہی ایک استثنائی واقعہ ہے۔ جبکہ ہمارے صوفی اور رہبان ہر وقت ایسے منشائے ایزدی کے خلاف واقعات کی جستجو میں لگے رہتے ہیں اور اگر کچھ بن نہ پڑے تو محفل سماع و رقص منعقد کر کے اپنے آپ پر مصنوعی قسم کے وجد و حال کو مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو بذاتِ خود ایک غیر شرعی فعل ہے یہ مصنوعی وجد و حال اور سماع وغیرہ ایسے امور کے ابطال کی دوسری دلیل ہے۔

ایسی راہبانہ زندگی اختیار کرنے سے شریعت کے کن کن احکامات پر زد پڑتی ہے۔ یہ تو ہم کسی دوسرے مقام پر جائزہ لیں گے۔ سرِدست ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان بزرگوں کے مشاہدات و مکاشفات میں کچھ حقیقت بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو وہ کس قدر ممکن ہے؟

کشف و مشاہدہ کی حقیقت

جس طرح انسان کی عقل ایک محدود دائرہ میں کام کر سکتی ہے بعینہ یہی حال اس کے وجدان اور قلبی واردات کا بھی ہے۔ پھر جس

---

۱ صوفیہ اسے اپنی اصطلاح میں شطحیات اور علماء ایسی باتوں کو ہفوات سے تعبیر کرتے ہیں۔

طرح ہر انسان میں عقل کم اور زیادہ ہوتی ہے۔ ایک عقلمند کسی واقعہ سے جو نتیجہ نکالتا ہے ایک کم عقل یا بیوقوف کی سوچ اس کے الٹ نتائج اخذ کرے گی یا مبہوت رہ جائے گی۔ یہی حال وجدان کا بھی ہے۔ علاوہ ازیں عقل کی کارکردگی میں انسان کے اپنے میلانات، تصورات اور تجربات کو بھی دخل ہوتا ہے بعینہٖ اسی طرح وجدان یا کشف پر بھی صاحب کشف کے میلانات اور رجحانات کا کافی اثر ہوتا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ ہر صاحب کشف کے رجحانات اور میلانات بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ لہٰذا سب لوگوں کے کشف میں بھی یکسانیت اور اتفاق ناممکن ہے اور ان سے محض ظنی سا علم ہوتا ہے۔ جو صرف صاحب کشف کو تو شاید کسی حد تک مطمئن کر سکتا ہو۔ دوسرے لوگوں کو اس کا قائل نہیں کر سکتا۔ ان کے پاس ان کے اپنے مکاشفات ہوتے ہیں جو اس سے الگ نوعیت کے ہوتے ہیں۔

اس کی مثال یُوں سمجھئے، جیسا کہ مشہور کہانی ہے کہ ایک دفعہ چار اندھے ہاتھی کا ملاحظہ و مشاہدہ کرنے گئے۔ ظاہر ہے کہ وہ دیکھ تو نہ سکتے تھے ٹٹول کر اندازہ ہی لگا سکتے تھے کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے۔ ایک نے اس کی ٹانگوں پر ہاتھ پھیر کر اندازہ لگایا۔ دوسرے نے ہاتھ اونچا کر کے اس کے پہلو پر ہاتھ پھیرا۔ تیسرے نے اس کے کان پر ہاتھ پھیرے اور چوتھا اس کی سُونڈ ملاحظہ کر رہا تھا۔ اب جو اپنے اپنے ملاحظات کے نتائج پیش کرنے بیٹھے، تو ٹانگوں پر ہاتھ پھیرنے والے نے کہا کہ ہاتھی تھم یا ستون کی مانند ہوتا ہے۔ پہلو پر ہاتھ پھیرنے والے نے کہا کہ تُو غلط کہتا ہے، ہاتھی تو پہاڑ کی مانند تھا۔ تیسرے نے کہا کہ ہاتھی تو چھاج کی مانند ہے اور ہر دَم متحرک چیز ہے اور تم دونوں غلط بکتے ہو۔ چوتھے نے کہا کہ تم سب غلط کہتے ہو، ہاتھی تو خمدار اور لچکدار ہوتا ہے۔ اب ان اندھوں میں سے ہر ایک کا یہی تکرار تھا کہ اُس کا ملاحظہ صحیح ہے باقی سب کچھ غلط ہے۔

دین طریقت کے مختلف نظریات

بعینہٖ یہی صورتِ حال اِن مشاہدینِ حق کی ہے۔ وہ اندھے اس لحاظ سے ہیں کہ نصوصِ شرعیہ سے یہ ثابت ہے کہ اس ذات باری کا اس دنیا میں نہ تو دیدار ممکن ہے اور نہ ہی کوئی اُس کی کنہ کو پا سکتا ہے۔ مگر یہ حضرات بضد ہیں کہ ہم ضرور یہ ملاحظات و مشاہدات کر کے رہیں گے۔ پھر جس طرح ان اندھوں میں تکرار اور جھگڑا ہوا بعینہٖ یہی صورتحال یہاں بھی پیدا ہو گئی۔ ایک نے کہا کہ میں خدا کے اتنا قریب ہو گیا کہ بالآخر ہم دونوں ایک ہو گئے۔ دوسرے نے کہا کہ میں جذب و مستی میں اتنا منہمک ہوا، اور آتشِ عشق اتنی تیز بھڑکی کہ خود خدا نیچے اُتر کر میرے جسم میں اُتر گیا۔ پھر میں ہی خدا تھا۔ تیسرے نے کہا تم دونوں غلط بکتے ہو، بھلا خدا کوئی مخصوص جسم ہے

جس میں تم مدغم ہو گئے تھے۔ یا وہ تمہارے جسم میں داخل ہو سکے۔ وہ تو ہر شے میں پہلے ہی سے موجود ہے اور ہر چیز میں داخل ہے۔ ہر چیز خدا کی ذات کا حصہ ہے۔ جو تھے نے کہا تم سب غلط ہو۔ خدا تو فی الواقع ایک الگ ہستی ہے تاہم یہ کائنات کی جملہ اشیاء اس کا لباس مجاز ہیں۔ یہ ہیں وہ مختلف نظریات جو اس دینِ طریقت کے مختلف اعیان نے پیش کئے اور جن کا تفصیلی جائزہ ہم اگلے باب میں لیں گے۔

دینِ طریقت کے پیروکاروں میں تکرار و اختلافات

اس خود ساختہ دینِ طریقت کے پیروکاروں میں شدید اختلافات ہیں، رفاعی کہتا ہے، قادری غلط ہے۔ قادری کہتا ہے رفاعی کے پاس کچھ نہیں۔ ایک کہتا ہے میرے پیر نے حضرت عزرائیل علیہ السلام سے ارواح کی زنبیل چھین کر سب ارواح کو ان کے جسموں میں داخل کر دیا۔ دوسرا کہتا ہے، میرا پیر جہنم کے پاس سے گزرا اور اس نے اپنی پھونک سے اسے بجھانا چاہا مگر درمیان میں فرشتے حائل ہو گئے۔ عبدِ دوسی کا ایک مرید کہتا ہے:

اَلْعَبْدُ دُوْسِیْ کَانَ یُحْیِیْ مِنَ الْاَمْوَاتِ مَنْ قَدْ مَاتَ دَهْرًا

(ترجمہ) عبدِ دوسی ایسے مُردوں کو زندہ کر دیتا ہے، جن کو مرے ہوئے عرصہ گزر گیا ہے (اردو ترجمہ غایۃ الامانی ص۲۳)

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ جس طرح عقل نے وحی سے بے نیاز ہو کر بے شمار ٹھوکریں کھائیں اور امت میں افتراق و انتشار کا باعث بنتی رہی ہے۔ اس طرح کشف و وجدان نے بھی وحی الٰہی سے علیحدہ ہو کر ٹھوکریں ہی کھائی ہیں اور انتشار ہی کا بیج بویا ہے۔ طریقت کے سینکڑوں سلسلے چل نکلے۔ جن کے طریق کار کا آپس میں اختلاف ہے (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے، دائرۃ المعارف الاسلامیہ، ج ۱۲، زیر عنوان طریقت)

آخر میں ہم اس مشاہدہ الٰہی کے امکان کی بحث کو مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، جو صوفیہ کی کائنات کے درخشندہ آفتاب ہیں، کے فیصلہ پر ختم کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

"کشف سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے، وہ شہود ہی شہود ہے اور حقیقت نہیں بلکہ غایت فی الباب یہ ہے کہ خدا کا شہود ہو ہی نہیں سکتا۔ پس ایمان بالغیب کے سوا چارہ نہیں۔" (مکتوبات دفتر ثانی مکتوب ۹، بحوالہ مجدد الف ثانی کا نظریہ توحید، از عبدالحکیم انصاری ص۹۵)

دینِ طریقت کے نقصانات اور معاشرہ پر اثرات

اب ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ اس رہبانیت یا دینِ طریقت کے

وہ کون سے مضر اثرات ہیں جن کی بنا پر شریعتِ مطہرہ نے اسے ناپسند فرمایا ہے؟ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب کبھی رہبانیت کا دور دورہ ہوا تو:

۱۔ معاشرہ میں جو لوگ خداترس قسم کے تھے۔ وہ اپنی اس غلط روش کی بنا پر معاشرتی ذمہ داریوں اور دوسرے انسانی تعلقات سے ایک طرف ہو گئے تو اس سے اخلاق و تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست اور اجتماعیت کی جڑیں تک ہل گئیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی زمام کار عیار اور ناخداترس آدمیوں نے سنبھال لی۔ دنیا میں "فساد فی الارض" کا دور دورہ ہو گیا اور خدا کے بھیجے ہوئے پیغامِ ہدایت اور ضابطہ حیات کی انہی "بزرگانِ دین" کے ہاتھوں بیخ کنی ہوئی۔

۲۔ راہبوں کی اس روش کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ عام لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ دین اور دنیا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دین یا مذہب تو محض پوجا پاٹ اور گیان دھیان کا نام ہے اور مذہب کا تعلق بس اسی حد تک ہے۔ رہا دنیا کا کاروبار تو اس میں ہر شخص آزاد ہے۔ معاشرتی تعلقات یا ضابطہ اخلاق کی اگر کچھ اہمیت ہوتی تو یہ خدارسیدہ لوگ اس سے کیوں منہ موڑ لیتے۔ پھر چونکہ ان راہبوں کی روش شریعت الٰہیہ کے احکام سے متصادم ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کا شیرازہ پارہ پارہ ہو گیا۔

۳۔ خدا کے حضور میں عبادت، عاجزی اور تذلل اور زہد و تقویٰ محمودہ صفات ہیں، لیکن ان راہبوں نے ان صفات میں اس قدر غلو کیا اور انکارِ ذات اور خودشکنی اتنے جوش سے کی کہ خودنگری اور خودشناسی، جو قومی زندگی کے لئے روحِ رواں ہے، ایک جرم سمجھا جانے لگا۔ انسان کو اپنی انسانیت سے شرم آنے لگی۔ وہ اپنی ترقی انسانیت میں نہیں، بلکہ ترکِ انسانیت میں سمجھنے لگا۔ وہ انسان جس کو خدا نے احسن تقویم پر پیدا کیا۔ اور اشرف المخلوقات بنا کر باقی کائنات اس کے لئے مسخر کر دی تھی۔ وہ اس قدر بے اعتماد، افسردہ اور دل شکستہ ہو گیا کہ بسا اوقات حیوانات اور جمادات پر بھی رشک کرنے لگا اور ان چیزوں کو اپنے آپ پر ترجیح دینے لگا۔

۴۔ اور چوتھا اثر یہ ہوا کہ معاشرہ میں باقی لوگ جن میں کچھ خداترسی اور دینداری کے اثرات پائے جاتے تھے۔ انہوں نے بھی ان راہبوں، اور پیروں فقیروں کے آستانوں کا رخ کر لیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسجدیں آہستہ آہستہ ویران ہونے لگیں اور خانقاہوں، مزاروں اور آستانوں کی رونق بڑھنے لگی۔

اسلام اور رہبانیت

چہار ترک اور ارشاداتِ نبویؐ

انہی بیان کردہ مفاسد کی بنا پر اسلام نے رہبانیت کو مذموم قرار دیا ہے۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ جس طرح نفس کی خواہش کے خلاف راہب لوگ بدن کو بھوکوں اور فاقوں سے مارتے تھے، اور ساری ساری رات قیام فرماتے ہیں۔ اس سلسلہ میں شریعت ہماری کیا رہنمائی کرتی ہے بخاری، کتاب الصوم، باب حق الاھل فی الصوم میں درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمایئے :

أَنَّهُ سَمِعَ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَمْرٍو وَبَلَغَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنِّي أَسْرُدُ الصَّوْمَ وَأُصَلِّي اللَّيْلَ فَلَمَّا أَرْسَلَ إِلَيَّ وَإِمَّا لَقِيتُهُ فَقَالَ أَلَمْ أُخْبَرْ أَنَّكَ تَصُومُ وَلَا تُفْطِرُ وَتُصَلِّي فَصُمْ وَأَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ فَإِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِنَفْسِكَ وَأَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا قَالَ إِنِّي لَأَقْوَى لِذَلِكَ قَالَ: "فَصُمْ صِيَامَ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ" قَالَ: وَكَيْفَ؟ قَالَ يَصُومُ يَوْمًا وَيُفْطِرُ يَوْمًا

انہوں نے عبداللہ بن عمرو بن العاص سے سنا، آنحضرت ﷺ کو یہ خبر پہنچ گئی کہ میں لگاتار روزے رکھا کرتا ہوں اور رات بھر نماز پڑھا کرتا ہوں، یا تو آپ نے مجھے بلایا، یا میں خود آپ سے ملا۔ آپ نے فرمایا: "مجھ کو خبر پہنچی ہے کہ تو روزے رکھتا ہے اور افطار نہیں کرتا اور نماز پڑھے جاتا ہے ایسا کر، روزہ رکھ اور افطار بھی کر۔ قیام بھی کر اور سو بھی کیونکہ تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔ تیری جان کا بھی تجھ پر حق ہے۔ اور تیری بی بی بال بچوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔ میں نے عرض کیا۔ مجھ میں اس سے زیادہ طاقت ہے۔ آپ نے فرمایا، کہ "حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ رکھ۔" میں نے پوچھا، وہ کیا ہے؟ فرمایا: "وہ ایک دن روزہ رکھتے، ایک دن افطار کرتے اور دشمن کے مقابلہ میں نہ بھاگتے۔"[1] میں نے کہا:

---

[1] ان الفاظ میں واضح اشارہ ہے کہ مسلسل روزے انسان کو اتنا نحیف کر دیتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کے قابل نہیں رہتا، گویا اس حدیث سے رہبانیت یا تصوف کے دو نظریات پر زد پڑتی ہے (۱) نفس کشی اور بدن کو نحیف و نزار بنانے پر اور (۲) صوفیوں کے اس نظریہ پر کہ جہاد فی سبیل اللہ سے نفس کا جہاد افضل ہے۔ یہ نظریہ بھی اپنے مقام پر تفصیل سے پیش کیا جائے گا۔

مولانا اشرف تھانوی مجاہدہ کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نفس کے مطالبات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک حقوق، دوسرے حظوظ۔ حقوق وہ ہیں جن سے قوام بدن اور بقائے حیات ہے اور حظوظ وہ ہیں جو ان سے زائد ہوں۔ مجاہدہ کی صحیح صورت یہ ہے کہ حقوق کا خیال رکھا جائے اور صرف حظوظ کو ترک کیا جائے۔

وَلَا يَفِرُّ إِذَا لَاقٰى قَالَ مَنْ لِيْ بِهٰذِهٖ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ ؟ قَالَ عَطَاءٌ لَا أَدْرِيْ كَيْفَ ذَكَرَ صِيَامَ الْأَبَدِ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا صَامَ مَنْ صَامَ الْأَبَدَ مَرَّتَيْنِ۔

یارسول اللہ! اس بات کی میری طرف سے کون ذمہ داری لے سکتا ہے۔ عطا کہتے ہیں، میں نہیں جانتا کہ ہمیشہ روزہ رکھنے کی نسبت آں حضرت ﷺ نے کیا کچھ فرمایا، بس اتنا جانتا ہوں کہ آپ نے دو بار فرمایا: "جس نے ہمیشہ روزہ رکھا، اُس نے روزہ نہیں رکھا" (ترجمہ: علامہ وحید الزمان)

یہ حدیث بخاری میں کئی طرح سے مذکور ہے ایک روایت میں "تیرے بدن اور تیرے مہمانوں کا بھی حق ہے" (باب حق الضیف) کے الفاظ زیادہ ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ کو دائمی روزہ سے منع فرمایا، تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھ میں روزہ رکھنے کی طاقت ہے، تو پھر آپ نے فرمایا: کہ اچھا تم مہینہ میں تین روزے رکھ لیا کرو، خدا دس گنا اجر دیتا ہے، تو یہ تمہارے پورے مہینے کے روزے ہو جائیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ نے دوبارہ کہا کہ مجھ میں اس سے زیادہ طاقت ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: اچھا حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح ایک دن روزہ رکھو۔ دوسرے دن افطار کرو اور آخر میں فرمایا: کہ جو دائمی روزہ رکھتا ہے اس کا کوئی روزہ نہیں۔" (کیونکہ وہ میری سنت کی مخالفت کرتا ہے۔)

اب بخاری کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح کی درج ذیل روایت بھی ملاحظہ فرمالیں:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ يَقُوْلُ: جَاءَ ثَلٰثَةُ رَهْطٍ إِلٰى بُيُوْتِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا أُخْبِرُوْا كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا فَقَالُوْا: وَأَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَأَخَّرَ

حضرت انس بن مالک ؓ کہتے ہیں، تین آدمی حضور اکرم ﷺ کی بی بیوں کے گھر آئے (حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمرو، اور حضرت عثمان بن مظعون ؓ) یہ آنحضرت ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھتے تھے۔ جب انہیں بتلایا گیا، تو انہوں نے گویا حضور اکرم ﷺ کی اتنی عبادت کو کم سمجھا اور کہنے لگے کہاں ہم اور کہاں حضور اکرم ﷺ جن کے پہلے اور پچھلے سب گناہ معاف کیے جا چکے ہیں (یعنی ہمیں ان سے زیادہ عبادت کرنی چاہیے) پھر ایک نے کہا: میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا، دوسرے

قَالَ اَحَدُهُمْ : اَمَّا اَنَا فَاُصَلِّی اللَّیْلَ اَبَدًا وَقَالَ آخَرُ اَنَا اَصُوْمُ الدَّهْرَ وَلَا اَفْطِرُ وَقَالَ آخَرُ اَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا اَتَزَوَّجُ اَبَدًا فَجَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ : "اَنْتُمُ الَّذِیْنَ قُلْتُمْ کَذَا وَکَذَا" اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاکُمْ لَهٗ لٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ	نے کہا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی روزہ نہ چھوڑوں گا۔ اور تیسرے نے کہا: کہ میں ہمیشہ عورتوں سے کنارہ کش رہوں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا۔ اتنے میں حضور اکرم ﷺ تشریف لے آئے اور ان لوگوں سے پوچھا: "کیا تم نے یہ باتیں کی ہیں؟ خدا کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور پرہیزگار ہوں، اس کے باوجود میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، تو جو کوئی میری سنت کو ناپسند کرے اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔

ان احادیث سے صاف واضح ہے کہ:

۱۔ مجرد زندگی گزارنا، معاشرتی زندگی سے گریز (تاکہ یکسوئی سے عبادت کی جا سکے) بدن کو فاقوں مار کر تزکیۂ نفس کرنا، اور عبادت خواہ کیسی ہی افضل کیوں نہ ہو، اس میں سُنّتِ نبوی سے آگے بڑھنا، یہ باتیں شریعت مطہرہ کے خلاف ہیں۔ اگر صرف یہی چیزیں رہبانیت سے نکال دی جائیں، تو رہبانیت کی عمارت از خود زمین بوس ہو جاتی ہے۔

۲۔ حضور اکرم ﷺ نے سُنّت کی آخری حد سے مطلع فرما دیا۔ اب جو شخص زہد، تقویٰ و عبادت کے میدان میں حضور اکرم ﷺ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے گا۔ وہ بدعت و ضلالت اور کفر ہی ہو گا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بدعت ہمیشہ نیک ارادوں اور ثواب کی نیت سے ہی شروع کی جاتی ہے۔

۳۔ سنت کا تارک گنہگار ہوتا ہے، لیکن سنت سے زیادہ عمل کرنے والا جو شریعت کی حدود کو کم سمجھ کر اس میں اضافہ کر رہا ہے۔ وہ بدعتی، گمراہ اور گمراہ کنندہ ہے۔ بعد میں جو لوگ اس بدعت پر عمل پیرا ہوں گے حصہ رسدی اس کا گناہ بدعت جاری کرنے والے کو بھی پہنچتا رہے گا۔

رہبانیت میں کشش کی وجوہات

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ایسے واضح احکام کی موجودگی میں رہبانیت نے اسلام میں کیسے راہ پائی۔ آخر

رہبانیت میں وہ کیا کشش اور جاذبیت ہے کہ شرعی احکام وحدود کو پھلانگ کر لوگ اس میں جا داخل ہوئے، یہ کہنا سراسر غلط ہوگا کہ قرآن و حدیث میں زہد اور دنیا سے بے رغبتی کے بارے میں جو ارشادات پائے جاتے ہیں۔ وہ رہبانیت کی بنیاد ہیں۔ کیونکہ ان ارشادات کو سمجھنے والے سب سے پہلے حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ لیکن ان میں ایسی رہبانیت کا کوئی اثر نہیں پایا جایا۔ بلاشبہ دنیا اور اس کے مال و اسباب سے بے رغبتی[1] دین کا ایک حصہ ہے، لیکن یہ پورا دین نہیں۔ معاشرتی، معاشی اور عائلی حقوق کی ذمہ داریاں، جو زندگی کا نہایت ہی اہم حصہ ہیں، ان تمثیلی ارشادات سے ساقط نہیں ہوسکتیں۔

رہبانیت کو اختیار کرنے کے اسباب کچھ اور ہی ہیں، جو ہمارے خیال کے مطابق درج ذیل ہیں:

۱۔ روحانی ترقی یا آئینہ باطن کی صفائی

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دنیا کے جھمیلوں میں پھنس کر کبھی یکسوئی کے ساتھ روحانی ترقی نہیں کی جاسکتی۔ ان کے خیال میں روحانی ترقی کا کوئی ایسا راستہ نہیں، جو دنیا کے اندر سے ہوکر جاتا ہو، لہٰذا "درویش" قسم کے لوگوں نے اسے نیکی سمجھ کر اختیار کرلیا۔ جب کہ اسلام نے ایسی روحانی ترقی اور رہبانیت ہی کو مردود قرار دیا ہے۔ اسلام صرف ایسی روحانی ترقی کا قائل ہے جس کا راستہ دنیا کے اندر سے ہوکر آگے بڑھتا ہو۔ یہ روحانی ترقی تھوڑی ہو یا بہت، سب کچھ مقبول ہے، لیکن شریعت کی حدود کے اندر رہ کر ہونی چاہیئے۔ اگر کوئی مسلمان زندگی کی بنیادی اور اہم ذمہ داریوں یا عبادات کو پس پشت ڈال کر ایسی روحانی ترقی کرتا ہے، تو اس کی حیثیت ہندو جوگیوں اور سادھوؤں سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی اور ایسی رہبانیت کو اسلام نے مردود قرار دیا ہے۔

یہ روحانی ترقی خواہ شرعی طریق سے ہو یا غیر شرعی طریق سے نتیجۃً انسان کا دل آئینہ کی مثل بن جاتا

---

[1] **زہد اور رہبانیت (تصوف) میں فرق:** زہد ایک اسلامی عقیدہ ہے اور اس سے مراد اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ دنیا کی محبت کو دل میں جاگزیں نہ ہونے دیا جائے۔ عیب کی بات حصولِ دنیا نہیں بلکہ حُبِ دنیا ہے، لیکن تصوف کا زہد یہ ہے کہ نفس کو اذیتوں سے ہمکنار کیا جائے لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر اور دنیوی تعلقات سے منہ موڑ کر مجاہدہ، ریاضتوں اور چلہ کشی میں مشغول رہا جائے تاکہ غیب کے پردوں سے کشف حاصل ہو۔ یہ تصوف فلسفہ ہی کی ایک شکل ہے جس کا وحی یا انبیاء کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ فلسفہ اسلام سے مدتوں پہلے ہندوستان اور یونان میں پایا جاتا رہا ہے۔ اس فلسفہ کا ماحصل یہ ہے کہ کائنات میں صرف اللہ کا وجود ہے۔ ہر چیز خدا ہے۔ انسان بھی خدا ہے اور خدا بھی انسان ہے۔ پھر اس کشفی عقیدہ نے کئی صورتیں اختیار کی ہیں۔ جن کا تفصیلی ذکر آئندہ اس کتاب میں آئے گا۔

ہے۔ ایسے لوگ جب توجہ کریں تو اپنے مخاطب کے احوال سے کسی نہ کسی حد تک مطلع ہو جاتے ہیں[1]
یہی ان کی غیب دانی اور کرامت ہوتی ہے، جو عوام کے لئے بڑی باعثِ کشش ہوتی ہے۔ اس طرح
ان لوگوں کو عوام پر حکومت کرنے، اُن پر دھاک بٹھانے اور خدائی منوانے کا ایسا موقعہ ہاتھ آجاتا ہے۔
جو عام حالات میں ناممکن ہوتا ہے۔ اور دنیوی منفعت کے لحاظ سے ان کی دکان ایسی چمکتی ہے۔ جو عام
حالات میں ان کی ریاضت و مجاہدہ سے بدرجہا زیادہ محنت اور جدّوجہد کا تقاضا چاہتی ہے۔ اسی
حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے اِن الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

خداوندا ترے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

جس طرح سلطان لوگوں سے اپنے مالی حقوق ٹیکسوں کی صورت میں وصول کرتے ہیں۔ یہ لوگ
نذر و نیاز اور چڑھاووں کی صورت میں وصول کرتے ہیں، بلکہ اس لحاظ سے پیر فقیر سلطان سے بڑھ
جاتے ہیں کہ سلطان کی حکومت تو محض اجسام پر ہوتی ہے، لیکن یہ لوگ دلوں پر اپنی دھاک بٹھاتے ہیں۔

۲۔ کشف و مشاہدات

اسی صفائی قلب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ لوگ عالمِ ارواح
یا رجال الغیب سے اپنا تعلق قائم کرتے، چلّہ کشی کے ذریعہ
انہیں قابو میں لاتے، قبروں پر معتکف ہو کر صاحبِ قبر کی روح یا اس کے متماثل کسی رُوح سے ملاقات
کرتے، ان کے احوال معلوم کرتے اور غیب کی خبریں حاصل کر کے لوگوں کو بتلاتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے
بیشتر کام شیطانی قسم کے ہوتے ہیں، لیکن عوام کیا، خواص میں بھی اتنی تمیز نہیں ہوتی کہ وہ اس حقیقت کو
سمجھ سکیں۔ یہ مقام انہیں عوام میں اور بھی زیادہ پُر وقار اور پُرہیبت بنا دیتا ہے۔

۳۔ مشاہدۂ حق

یہ بات ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ ان لوگوں پر کچھ نہ کچھ تجلّی ہوتی ضرور ہے
خواہ وہ شیطان ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو اور اس تجلّی میں کیف و سرور بھی
ہوتا ہے بعض لوگ اس مستی کی کیفیت کے حصول کے لئے بھی یہ راستہ اختیار کرتے ہیں۔ پھر اس
کیفیت کے حصول کے لئے اتنے بیتاب ہو جاتے ہیں کہ سماع و رقص جیسے مصنوعی طریقوں سے اپنے
آپ پر یہ کیفیت طاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۴۔ معاشرتی ذمہ داریوں اور شرعی تکالیف سے نجات

یہ لوگ چونکہ اپنے آپ کو خود
بھی خدائی صفات کے حامل

[1] آج کے ماہرین علم النفس (PSYCHOLOGISTS) اسے ہپناٹزم سے تعبیر کرتے ہیں۔

اور کوئی بالاتر مخلوق سمجھنے لگتے ہیں، لہٰذا وہ اپنے معتقدین سے خدا کی بجائے اپنی پرستش کرانا شروع کر دیتے ہیں۔ پرستش سے ہماری مراد پوجا پاٹ نہیں، بلکہ حاجت روائی، مشکل کشائی اور نذر و نیاز وغیرہ ہیں۔ پھر کسی کی کیا مجال کہ وہ پیر صاحب کی معاشرتی ذمہ داریوں کی عدم ادائیگی پر معترض ہو اور اس طرح ان کے خلاف شرع اعمال و افعال سے متعلق کچھ کہہ کر راندہ درگاہ بن جائے۔

بعض حضرات سُکر کی حالت میں شرعی تکالیف کے رفع ہونے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح کوئی بے ہوش یا دیوانہ آدمی۔جب تک کہ وہ اس حالت میں رہے۔۔۔ شرعی احکام کا پابند نہیں ہوتا۔ اسی طرح صاحب وجد و حال پر سے بھی شرعی تکالیف اٹھالی جاتی ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ دلیل قیاس مع الفارق سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ وجہ یہ ہے کہ عام آدمی کی دیوانگی یا بے ہوشی اضطراری یا خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ جب کہ ان لوگوں کی یہ محویت خود پیدا کردہ بدعت ہے جس کا سنتِ رسولؐ اور آثارِ صحابہ میں کوئی سراغ نہیں ملتا، تو پھر اس اختیاری محویت پر اضطراری کیفیت کو منطبق کرنا کیسے دُرست ہوسکتا ہے۔

۵۔ شعبدہ بازیاں

ان لوگوں میں ایک کثیر طبقہ ایسا بھی ہے جو نہ تو اہلِ دل ہوتا ہے نہ صاحبِ حال، وہ محض اپنے لباس اور ہیئت کی تبدیلی سے ہی اس عالمِ رہبانیت کے معزز رکن تصور کیے جاتے ہیں، جیسے اکثر گدی نشین، مجاور اور ان کے خلیفے۔ یہ لوگ محض شعبدہ بازیوں سے عوام پر اپنی خدائی کی دھاک سنبھال رکھتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو رفاعی فرقہ کے ایسے ہی شعبدہ باز پیروں سے سابقہ پڑا تھا۔ یہ لوگ سیاہ کپڑے پہنتے، ہاتھوں اور گلے میں لوہے کے کڑے یا طوق پہنتے تھے۔ آگ میں کود جاتے، انگاروں اور سانپوں سے کھیلتے تھے اور یہی ان کے اہلِ حق ہونے کی سب سے بڑی دلیل تھی۔ نماز، روزہ اور دوسرے شرعی احکام سے یکسر غافل اور بے پرواہ تھے۔ اطراف واکناف میں ان کے بے شمار معتقدین پھیل گئے تھے۔ اُمرائے سلطنت پر بھی ان لوگوں کا اثر تھا۔

امام موصوف نے ببانگِ دہل یہ اعلان کر دیا کہ یہ لوگ محض شعبدہ باز ہیں اور رجالِ غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے مشتعل ہو کر حاکمِ وقت امیر افرم سے شکایت کی۔ امیر افرم نے فریقین کو بلا لیا اور طے یہ پایا کہ فریقین آگ میں کود جائیں، پھر جو جل جائے گا وہ جھوٹا اور جو بچ کر نکل آئے گا اسے سچا سمجھا جائیگا۔ امام موصوف نے یہ فیصلہ منظور کر لیا، مگر شرط یہ لگائی کہ فریقین آگ میں داخل ہونے سے پہلے سرکہ اور

گرم پانی سے خوب بدن مل کر نہالیں۔ امیر افرم نے وجہ دریافت کی تو آپ نے کہا کہ یہ لوگ مینڈک کی چربی، نارنج کے اندرونی چھلکے اور طلق کے پتھر وغیرہ پیس کر اپنے بدن پر مل لیتے ہیں جس کی وجہ سے آگ کا اُن پر اثر نہیں ہوتا۔

امیر افرم نے امام صاحب سے پوچھا کہ اگر یہ لوگ غسل کرنے کی شرط مان جائیں، تو آپ آگ میں کودنے کو تیار ہیں؟ اس وقت امام صاحب نے جو جواب دیا وہ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے جو آپ کے اللہ پر توکل، عزم راسخ اور پختگی ایمان کی ایک زندۂ جاوید مثال ہے۔ آپ نے فرمایا :

"ہاں! میں نے خدا سے استخارہ کیا ہے اور میرے دل میں یہ بات ڈال دی گئی ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں بھی آگ میں کود جاؤں۔ اور اگر ایسا کروں گا، تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی کیونکہ نبی کریم ﷺ کے سچے جانشینوں سے اس قسم کے خوارق عادات کا ظہور کئی مرتبہ ہو چکا ہے اور ہمیشہ ہوتا ہی رہتا ہے، جب یہ لوگ اپنے رموز و اشارات اور خوارق عادات امور سے اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کو باطل کرنا چاہتے ہیں، تو ہم پر فرض ہے کہ ان کی حمایت میں اپنے جان و مال کی قربانی سے دریغ نہ کریں، خدا ہم کو ضرور ایسی نشانیاں عطا فرمائے گا جن سے ہم ان کے خوارق عادات کا بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

جب اس فرقہ رفاعیہ کے پیروں نے امام موصوف کی یہ شرط اور ایسا جواب سُنا، تو ان کے حوصلے پست ہو گئے اور صلح کی درخواست کی کہ اس معاملہ کو یہیں پر ختم کر دیا جائے اور معافی مانگ لی اور کہا کہ آئندہ ہم بدعتوں کو چھوڑ کر شریعت محمدیہ کا اتباع کریں گے (امام ابن تیمیہؒ، مرتبہ پروفیسر محمد یوسف کوکن، مدراس یونیورسٹی ص ۵۵ تا ۶۰) اور (تاریخ دعوت و عزیمت، حصہ دوم، مرتبہ، ابوالحسن علی ندوی، ص ۵۰)

عوام میں رہبانیت کی مقبولیت کے اسباب

۱۔ غیب کے حالات سے دلچسپی

صفائی باطن کی بناء پر یا کسی دوسرے ذریعہ سے اگر کوئی "پیر صاحب" کسی کو اس کے دل کے حال سے مطلع کر دیں، تو یہ اس کے لئے سب سے بڑا معجزہ ہے اور یہی اس کی حقانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے مسلمان ہندو جوگیوں، سادھوؤں اور عیسائی راہبوں کے بھی معتقد ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ پیر ایسے ہوتے ہیں، جو کسی بھی مذہب کے پیرو نہیں ہوتے۔ تاہم ان کی اولیائی شک و شبہ سے بالاتر سمجھی جاتی ہے جیسے بابا گورونانک، جس کی وفات پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ جھگڑا پیدا ہو گیا کہ کون اُس کی "سرگ باشی"

کے فرائض سرانجام دے یا بابا گورانڈتہ جس کا مزار مسلمانوں کے لئے بھی مرجع خاص وعام بنا ہوا ہے یا مادھولال حسین وغیرہ۔ (مادھولال حسین کا تذکرہ آگے چل کر تفصیل سے پیش کیا جائے گا)

غیب معلوم کرنے کے ذرائع

شاہ ولی اللہؒ اپنے مقالہ "وصیۃ فی النصیحۃ و الوصیۃ" میں تیسری وصیت کے تحت لکھتے ہیں:

"اس زمانہ کے کرامات فروش (الاّ ماشاءاللہ) طلسمات اور فریب سازیوں کو کرامات سمجھے ہوئے ہیں۔ خرق عادت امور کی مشہور قسمیں اشراف (دوسروں کے دلوں کے ارادے معلوم کرنا) اور آئندہ کے واقعات کا انکشاف ہے اور اس اشراف و انکشاف کے بے شمار طریقے ہیں۔ ازاں جملہ نجوم اور رمل کا علم بھی ہے۔ اور اپنی مختلف قسموں میں کہانت بھی ہے اور یہ فن بہت وسیع ہے، کبھی جنوں کی حاضری سے اور کبھی اُن کی حاضری کے بغیر بھی اور ازاں جملہ ایک طلسم کا باب بھی ہے اور جوگ کے عمل بھی ہیں کہ جوگیوں کی بعض نظروں میں اشراف اور کشف کے سلسلہ میں پوری خاصیت ہے۔ کسی کام پر "توجہ دینا"، کسی مہیب شکل میں ظاہر ہونا، اپنے دل کا دباؤ کسی کے دل پر ڈالنا اور طالب کو مسخر کرنا، یہ سب فریب آفرین فنون میں سے ہیں۔ ایسی چند نگاہیں اور ملاحظات ہیں جو اس مقام تک پہنچا دیتے ہیں۔ صلاح وفساد، سعادت و شقاوت اور مقبول یا مردود ہونا یہاں کوئی فرق پیدا نہیں کرتا۔ ایسے ہی حاضرین میں وجد اور شوق، بیقراری اور مسرت کوئی وزن نہیں رکھتی۔ ان کوائف کا منشاء اور محرک قوتِ بہیمیہ (حیوانیت) ہے، لہٰذا جس کی حیوانیت قوی تر ہے اس کا وجد بھی پرجوش ہوتا ہے، البتہ یہ اعمال اور ایسے افعال بعض نیک لوگ بھی کسی نیک نیت پر کرتے ہیں اور یہ چیز ان اعمال کو کرامات نہیں بنا دیتی۔ ہم نے بہت سے سادہ لوحوں کو دیکھا ہے کہ جب ایسے اعمال کسی شیخ میں دیکھ پاتے ہیں، تو ان کو عین "کرامت" یقین کر لیتے ہیں۔

شاہ صاحب کے درج بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ مندرجہ ذیل علوم وفنون ایسے ہیں جن سے غیب کے حالات کا علم ہو جاتا ہے:

(۱) علم نجوم یا جوتش (۲) علم رمل (۳) کہانت اور اس کی مختلف اقسام (۴) علم طلسمات یا جادوگری (۵) جوگ اور اس کی مختلف اقسام یعنی توجہ ڈالنا یا علم مسمریزم اور ہپناٹزم وغیرہ۔

۲۔ ان علوم میں جنات یا رجال الغیب کا عمل دخل ہوتا ہے۔

۳۔ یہ سب علوم وفنون غیر شرعی ہیں اور اکتساب سے حاصل کئے جاتے ہیں۔

۴۔ ان علوم و فنون کے ذریعہ اگر غیبی حالات معلوم ہو بھی جائیں، تو یہ کرامت نہیں کہلا سکتے۔

۲۔ خوارق عادت امور

ان کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، معجزہ، کرامت اور استدراج یا شعبدہ بازی۔

انبیاء سے اگر ایسے واقعات کا صدور ہو تو اسے معجزہ کہتے ہیں، لیکن قرآن نے اس کے لئے معجزہ کی بجائے "آیت یا نشانی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ پھر یہ معجزات بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو باطل کے مقابلہ میں احقاقِ حق کے لئے اللہ تعالیٰ انبیاء کو عطا فرماتا ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کا سانپ بن جانا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مُردوں کو زندہ کرنا اور بعض دفعہ ایسے معجزات کفار کے مطالبہ کی بناء پر انبیاء کو عطا کئے جاتے ہیں، جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا ظہور اور حضور ﷺ سے انشقاقِ قمر کا ظہور۔ ایسے معجزات چونکہ انبیاء کی حقانیت کو ثابت کرنے اور کفار کو لاجواب کر دینے کے لئے عطا کئے جاتے ہیں، لہٰذا ایسے واقعات کا صدور غیر نبی سے ناممکن ہوتا ہے۔ ایسے واقعات کا عند الضرورت نبی دعویٰ تو کر سکتا ہے، لیکن ان کی نسبت ہمیشہ خدا کی طرف ہی کرتا ہے اور یہ معجزات نبی کو نبوت کے ابتدائی دور میں عطا کئے جاتے ہیں جب کہ باطل زوروں پر ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسے معجزات دیکھنے کے بعد بھی کفار کم ہی ایمان لاتے ہیں اور ایسی صورت میں ان پر عذاب بھی نازل ہوا۔

معجزات کی دوسری قسم وہ ہے جو اولیاء کی کرامت سے بہت حد تک مشابہت رکھتی ہے اور انہیں معجزہ صرف اس لئے کہا جاتا ہے کہ اُن کا صدور نبی سے ہوتا ہے۔ اُن کا نبی کو پہلے سے کوئی علم نہیں ہوتا اور یہ عموماً کسی اشد دینی یا دنیوی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے عطا کئے جاتے ہیں تاکہ حق یا اہلِ حق کی مدد کی جا سکے۔ جیسے حضرت موسےٰ علیہ السلام کا دریا پر عصا مارنا اور اس سے دریا کا پھٹ کر سڑک کی مانند راستہ بن جانا یا حضرت ایوب علیہ السلام کا زمین پر پاؤں مارنے سے چشمہ اُبل پڑنا — یا حضور اکرم ﷺ کا جنگِ بدر کے دوران کفار کی طرف ریت کی مٹھی پھینکنا اور اس سے کفار کا اندھا ہو جانا۔ ایسے معجزات یا تائیدِ غیبی کا نبی کو نہ پہلے سے علم ہوتا ہے نہ ہی وہ اُس کا دعوےٰ کر سکتا ہے، کیونکہ بسا اوقات نبی کی شدید دینی یا دنیوی ضرورت کے باوجود بھی انبیاء کو ایسی غیبی تائید حاصل نہیں ہوتی جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام کا حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی میں مدتوں پریشان رہنا، حالانکہ وہ پاس ہی کنوئیں میں پڑے تھے یا خود حضور اکرم ﷺ کا واقعہ افک کے معاملہ میں ایک ماہ تک پریشان رہنا۔

اسی دوسری قسم کے معجزات کا صدور اگر کسی حامل شریعت بزرگ سے ہو تو اسے کرامت[1] کہا جاتا ہے اس کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ وہ شریعت کا پورا پابند ہو اور اسے نہ تو کسی ایسے واقعہ کے صدور کا دعوےٰ ہو اور نہ پہلے سے علم ہو، پھر جب کبھی ایسے واقعہ کا صدور ہو جائے تو اس بزرگ پر لازم ہے کہ اسے محض اللہ کی مہربانی اور تائید غیبی سمجھے اور اس واقعہ کی اپنی بزرگی جتانے کی خاطر تشہیر نہ کرے۔ معجزہ کی طرح کرامت بھی وہبی چیز ہے اکتسابی نہیں۔

اور جو بزرگ علی الاعلان ہتھیلی پر سرسوں جما کر دکھا دیتے ہیں کہ اِدھر ہاتھ بڑھایا اُدھر انگور کا خوشہ ہاتھ میں آگیا اور اسے بزرگی کے دعویٰ کے طور پر پیش کرتے ہیں، تو یہ خالص شیطانی عمل ہے۔ جسے اصطلاح عام میں استدراج کہتے ہیں۔ یہ کرامت نہیں بلکہ شعبدہ بازی ہے۔ ان لوگوں کا تعلق رجال غیب سے ہوتا ہے اور بعض دفعہ مکر و حیلہ سے کام لیا جاتا ہے اور یہ کسبی چیز ہے، وہبی نہیں۔ جب کہ معجزہ اور کرامت دونوں وہبی ہوتی ہیں۔

یہ تو خیر معجزہ، کرامت اور استدراج کے فرق کی ایک ضمنی بحث چل پڑی۔ مقصد یہ ہے کہ ہر طرح کے خوارق عادت امور میں عوام کے لئے بے کشش ہوتی ہے، بلکہ ان کے نزدیک ولایت کا اصل معیار ہی یہ خوارق عادات امور ہیں۔ اس لئے جہلا کی اکثریت عموماً ایسے لوگوں کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔

۳۔ تصرّف کا عقیدہ

تصرف کا تعلق محض ان معتقدین سے ہے، جو ایسے بزرگوں کی کرامات دیکھ کر کشاں کشاں اُن کے دربار میں حاضر ہو جاتے ہیں اور ان کے مُرید یا چیلے بن جاتے ہیں۔ ان سے غیر مشروط اطاعت پر عہد و پیمان باندھے جاتے ہیں اور ان کو یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ جو بزرگ ایسے مافوق العادت امور پر قادر ہے وہ ان کی بگڑی کو سنوار بھی سکتا ہے۔ اور ان کی حاجات پوری کرنے کی بھی استعداد رکھتا ہے۔ پھر جب کسی مرید کو کسی تجربہ کی بناء پر اس کا یقین ہو جاتا ہے، تو آہستہ آہستہ اس کا یہ یقین راسخ عقیدہ کی شکل اختیار کر جاتا ہے حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے کہ ہر مرید اپنے آپ کو اپنے پیر کے تصرف کی زنجیروں میں جکڑا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی کام مشیتِ ایزدی کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتا۔ نہ کوئی ایسا انسان پایا جاتا ہے جس کی تمام آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہو جائیں اور نہ ہی ایسے آدمی کا وجود ممکن ہے جس کی کوئی تمنا پوری نہ ہوئی ہو۔ اب اگر کسی پیر یا بزرگ کے وسیلہ سے بھی کوئی حاجت پوری ہوتی نظر آتی ہو

---

[1] یہی بحث مزید تفصیل سے کراماتِ اولیاء اللہ میں آئے گی۔

تو وہ خدا کی مشیت ہی کی وجہ سے پوری ہوتی ہے۔ جس کو یہ مُرید اپنے پیر کا تصرف سمجھ رہا ہوتا ہے۔ اس قسم کے مرید اپنے پیر کی بزرگی اور عوام میں رہبانیت کو ہر دلعزیز بنانے میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔

۴۔ سستی نجات کا عقیدہ

جب پیر اور مرید اس تصرف کے عقیدہ کی بنا پر معبُود اور عبد کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں، تو نہ تو پیر اپنے آپ کو شرعی احکام کا پابند رہنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور نہ ہی مرید میں یہ جرأت باقی رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے پیر کے غیر شرعی اعمال و افعال پر کچھ گرفت کر سکے۔ پھر یہ بات یہیں تک محدود نہیں رہتی۔ یہ پیر اپنے مُریدوں کو یہ بھی ذہن نشین کراتے ہیں کہ جیسے اس دنیا میں انہیں تصرّف و اقتدار حاصل ہے۔ ویسے ہی انہیں اُخروی زندگی میں بھی حاصل ہوگا۔ مرید پر شرعی احکامات کی پابندی کی بجائے پیر کی غیر مشروط اطاعت اور نذر و نیاز کے ذریعہ اس کی رضا اور خوشنودی ہی لازم ہے۔ رہا اُخروی نجات کا معاملہ، تو ان مریدوں کی شفاعت کر کے بہشت میں لے جانا ان پیروں کی ذمہ داری ہے۔

اب مریدوں نے یہ سمجھا کہ سال میں صرف چند بار پیر صاحب کی قدم بوسی کرنے، نذر و نیاز دینے، یا ان کے نام چڑھاوے چڑھانے سے اخروی زندگی میں نجات کی ذمہ داری ملتی ہے اور شرعی حدود و قیود کے جھنجھٹ سے بھی چھٹکارا ہو جاتا ہے، تو اس سے زیادہ سستا اور کیا سودا ہو سکتا ہے؟ "اس سستی نجات" کے عقیدہ نے بھی جہاں پیروں فقیروں کے کاروبار کو چار چاند لگائے، وہاں عوام میں رہبانیت کو مقبول بنانے میں بھی کافی فروغ بخشا۔

۵۔ مُریدانِ باصفا کا کردار

مشہور مقولہ ہے ؎

"پیراں نمی پرند۔ مُریداں ہمی پرانند"

یعنی پیر خود اڑ کر کسی بلند مقام پر فائز نہیں ہوتے، بلکہ مُرید انہیں اس مقام پر پہنچاتے ہیں۔ چونکہ ان مریدانِ خاص کا مفاد بھی پیر صاحب کے مفاد سے وابستہ اور مشترک ہوتا ہے۔ لہٰذا اِس کاروبار کو چلانے کا اصل ذریعہ یہی لوگ ہوتے ہیں۔ اکثر کرامتیں اور شعبدہ بازیاں انہیں کے ہاتھوں اور انہیں کے مکر و حیلہ سے سرانجام پاتی ہیں۔ پھر یہی لوگ "پراپیگنڈہ سیکرٹری" کے فرائض سرانجام دینے پر مامور ہوتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ پیر صاحب کی چھوٹی سی کرامت کو لوگوں میں بڑھا چڑھا کر پھیلائیں یا خود کسی کرامت کا افسانہ وضع کر کے اس کی تشہیر کریں۔ اور ظاہر ہے کہ پروپیگنڈہ خواہ کیسی ہی غلط بات کا کیوں نہ ہو، اپنا اثر

دِکھلا کے رہتا ہے۔

۶۔ مرنے کے بعد بھی تصرّف کا عقیدہ

ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان بزرگوں پر موت بس اِک آن کے لئے وارد ہوتی ہے۔ اس کے بعد ان کی رُوحیں مریدوں کی دُعائیں سننے اور ان کی حاجت برآری میں مشغول ہوجاتی ہیں، بلکہ اب وہ پہلے سے زیادہ تصرف رکھتی ہیں، کیونکہ اب وہ عالمِ اَرواح میں ہیں اور باطنی اسباب پر ان کا تصرّف پہلے سے زیادہ ہے۔ یہیں سے نذر لغیر اللہ کے عقیدہ کی ایجاد ہوئی۔

اس عقیدہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگرچہ یہ رُوحیں اپنے ہر مرید کی ہر جگہ سے فریاد سنتی ہیں اور حاجت برآری کرتی ہیں، تاہم ان کی قبر سے اُن کی روح کا سلسلہ نسبتاً زیادہ قائم ہوتا ہے، لہٰذا قبروں سے نسبتاً حاجت برآری اور مشکل کشائی کا بھی زیادہ امکان ہے۔ اس عقیدہ نے دینِ طریقت یا رہبانیت کو لازوال شہرت بخشی۔ قبروں کو آباد رکھنے کے لئے سربفلک "روضے" تعمیر کیے گئے۔ کیونکہ یہاں سے تاقیامت حاجت برآریوں اور مشکل کشائیوں کی ضرورت تھی۔ پھر نئے پیروں کے مزارات سے ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کی نگہداشت کے لئے مجاوروں اور گدّی نشینوں اور خلیفوں کی ایک فوج ظفر موج پیدا ہو گئی۔ نذر و نیاز اور چڑھاووں کا دائرہ وسیع ہوا۔ مجاوروں اور گدّی نشینوں کے وارے نیارے ہوگئے۔ دنیا کا بھی وافر حصہ مل گیا اور دین بھی ہاتھ سے نہ گیا۔ اس سے زیادہ ان لوگوں کی اور کیا خوش بختی ہوسکتی تھی، پھر اس کاروبار کو مزید وسعت دینے کے لئے سالانہ عرسوں یا میلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، تاکہ مریدوں سے باقاعدہ سالانہ نیازیں وصول کی جاسکیں اور ان عرسوں کو حج کا درجہ دیا گیا اور وہاں وہ تمام ارکان ادا کئے جانے لگے، جو حج کے موقعہ پر ادا کئے جاتے ہیں، مثلاً دعا، نداء، طواف اور سعی وغیرہ۔ ان مزاروں کی بھی زمینِ حرم کی حدود مقرر کی گئیں، وہاں روشنی، صفائی اور غلاف وغیرہ کا بھی اہتمام ہونے لگا جس طرح بیت اللہ کا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض عالموں[۱] نے "مناسک حج المشاہد" جیسی کتابیں لکھ کر ان سب مناسک کا شرعی جواز بھی ثابت کر دیا۔ پھر معاملہ اس سے بھی آگے بڑھا۔ اب یہ ضرورت بھی نہ رہی کہ قبر میں کوئی ولی یا کوئی عام انسان دفن ہو۔ گدھوں اور گھوڑوں کی ہڈیوں اور عام لکڑیوں پر مزارات تعمیر ہوئے، تو وہ بھی مرجع خاص و عام بن گئے۔ وہاں سے بھی لوگوں کی حاجتیں پوری ہونا شروع ہوگئیں، وہاں بھی وہ سب کچھ

---

[۱] ایک شیعہ عالم ابو عبداللہ محمد بن نعمان الملقب بالمفید کی اسی نام کی ایک مفصل تصنیف ہے جس میں بہت سی بے سروپا روایات درج ہیں۔ (الرد علی البکری ص ۲۹۵، ابن تیمیہ ؒ (تاریخ دعوت و عزیمت، حصہ دوم، ص ۱۹۶)

ہونے لگا جو ایک "بزرگ" کی قبر پر ہوتا تھا اور ایسے واقعات اس کثرت سے موجود ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے تاریخی حوالہ دینے کی ہم ضرورت محسوس نہیں کرتے، کیا اس سے زیادہ بھی انسانیت کی تذلیل ہو سکتی ہے؟

مزارات، آستانوں اور بعض دفعہ زندہ پیروں سے "ایسی کرامات" کے ظہور کے متعلق امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"بعض لوگوں نے اپنے شیخ کی دہائی دی اور اُن کو اُن کی صورت نظر آئی اور بعض دفعہ انہوں نے اس کا کوئی کام بھی کر دیا۔ اس سے ان کا یہ عقیدہ ہوا کہ شیخ خود آئے یا یہ کوئی فرشتہ تھا، جو اُن کی صورت میں ظاہر ہوا اور یہ ان کی کرامت ہے۔ اس سے اُن کا مشرکانہ عقیدہ مزید راسخ ہو جاتا ہے۔ ان کو معلوم نہیں کہ اس طرح کی باتیں اور معاملات شیاطین بُت پوجنے والوں کے ساتھ بھی کرتے رہتے ہیں۔ وہ ان بت پرستوں کے سامنے اکثر ظاہر ہوتے ہیں اور بعض غیبی باتیں اُن کو بتلاتے ہیں اور ان کے بعض مطلب بھی پورے کر دیئے جاتے ہیں، لیکن یہ سب امور دورِ اخیر کی پیداوار ہیں۔ جن کا خیر القرون میں کوئی وجود نہ تھا" (تفسیر سورۃ اخلاص، ص ۱۱۸)

ایک دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ یہ معاملہ صرف صالحین تک محدود نہیں بلکہ ستارہ پرستوں کو بھی ایسے ہی احساسات اور فتوحات حاصل ہوتے ہیں، فرماتے ہیں:

"جو لوگ کواکب سے دُعا کرتے ہیں ان پر ایسی صورتیں نازل ہوتی ہیں جن کو کواکب کی روحانیت کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ شیطان ہوتا ہے جو اس کے شرک کی بناء پر اس کو گمراہ کرنے کے لئے نازل ہوتا ہے جیسے کہ بعض اوقات شیاطین بتوں اور مورتیوں کے اندر گھس جاتے ہیں۔ وہ بعض اوقات لوگوں سے باتیں کرتے ہیں اور بعض اوقات مجاوروں اور پوجا پاٹ کرنے والوں کو دکھائی دیتے ہیں اور دوسروں کو بھی دکھائی دیتے ہیں۔" (کتاب النبوات، ص ۲۷۴، بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت ج ۲، ص ۳۲۷)

ان مزارات میں دمبدم اضافے اور عوام کے اس طرف رجحان کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مساجد کی رونق مزارات کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئی۔ مسجدیں بے آباد ہوئیں اور مزارات پر عوام کا ہجوم بڑھنے سے اس دین طریقت کو بہت تقویت ملی۔

بتوں کی کرامات اور تصرف

اہلِ عرب جاہلیت کے زمانہ میں اپنے بتوں سے باتیں سنتے تھے ابو احمد حسن بن عبداللہ عسکری نے اپنی کتاب میں ابو مسکین سے باسند لکھا ہے

کہ حضر موت میں جلسد نامی ایک بُت تھا، جس کو اہل کندہ و حضر موت پوجتے تھے۔ اس کے مجاور بنی شکامہ بن شبیب تھے، جو کندہ کی نسل سے تھے۔ پھر بنو علاق مجاور بنے۔ اخزر ابن ثابت مجاورت کے فرائض سر انجام دیتا تھا۔ اس بت کی باقاعدہ ایک چراگاہ تھی۔ جس میں اس کی بکریاں اور دوسرے جانور چرتے اور پلتے تھے۔ اگر کسی اور کی بکریاں اس میں چرلیتیں، تو وہ اپنے مالکوں پر حرام ہو جاتیں وہ سفید پتھر سے بنا ہوا بڑے قد کاٹھ کے انسان کی شکل کا بُت تھا۔ اس کے اوپر والا حصّہ سر کی مانند سیاہ تھا۔

اخزر نے بیان کیا کہ ایک دن جب میں جلسد کے پاس تھا بنی الامری بن مرہ کے ایک شخص نے اس بُت کے لئے ایک جانور ذبح کیا۔ اچانک ہم نے بادل کی گرج جیسی آواز سنی۔ ہم نے دھیان سے سنا تو یہ آواز آ رہی تھی:

شَعَارُ اَهْلِ عَدَمٍ ، اِنَّهٗ قَضَاءَ	مُردوں کی مخصوص بات یہ ہے کہ وہ (مرنا) قطعی فیصلہ
حَتْمٌ، اِنَّ بَطْشَ سَهْمٍ،	ہے۔ اگر تیر پوری قوت سے لگے، تو وہ کامیاب ہو
فَقَدْ فَازَ سَهْمٌ۔	جائے گا۔

ہم نے کہا ہمارا رب بہت خوبصورت اور گورا ہے۔ بُت سے پھر آواز آئی:

فَاءَ نَجْمُ الْعِرَاقِ يَا اَخْزَرُ بن عَلَاقٍ۔	اے اخزر بن علاق! عراق کا ستارہ غروب ہو گیا۔ کیا
هَلْ اَحْسَسْتَ جَمْعًا عَمًّا وَعَدَدًا جَمًّا۔	تو نے ایک عام لشکر کو محسوس کیا ہے، جو جم غفیر کی شکل میں
يَهْوِىْ مِنَ الْيَمَنِ وَالشَّامِ اِلٰى	یمن و شام سے قلعوں والے علاقے پر حملہ آور ہو گا۔ روشنی
ذَاتِ الْاٰجَامِ نُوْرًا ظَلَّ الظَّلَامِ	پھیل جائے گی اور اندھیرا ختم ہو جائے گا بادشاہی
اَفَلَ وَمُلْكٌ اِنْتَقَلَ مِنْ مَحَلٍّ اِلٰى مَحَلٍّ	ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جائے گی۔

پھر وہ بُت خاموش ہو گیا۔ ہم نے کہا لامحالہ یہ صورتِ حال پیدا ہو کر رہے گی۔ جب اگلا سال آیا تو بُت کی آواز جو ہم سنا کرتے تھے وہ نہ آئی اور دیر کر دی۔ ہمیں بدگمانی پیدا ہوئی۔ ہم نے قربانی کی، اور بُت کو اس کے خون سے ملوث کیا۔ قبل ازیں ہمارا یہی طرزِ عمل ہوتا تھا۔ اچانک پھر آواز آئی۔ ہم نے کہا۔ اے ہمارے رب! ہر صبح کو ہمارے ساتھ گفتگو کیا کرو، کوئی تجھے روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ ہم تیرے غضب سے پناہ مانگتے ہیں اور تیرے درگزر کا سہارا چاہتے ہیں۔ اچانک بُت سے پھر آواز آئی۔ اور کچھ مسجع عبارت کہنے کے بعد پھر خاموشی ہو گئی اور اس کا چرچا یمن کے مختلف صوبوں کے قبائل میں

ہونے لگا۔

لوگوں نے ضمار بُت سے بھی باتیں سنی تھیں۔ یہ بنی سلیم کا بُت تھا۔ جب مرداس مرنے لگا، تو اس نے اپنے بیٹے عباس کو کہا: اے بیٹے! ضمار کی عبادت کرو، تیرا نفع ونقصان اس کے اختیار میں ہے عباس بن مرداس کہتے ہیں کہ ہم اس کی عبادت کرتے تھے اور اس سے باتیں سنا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے اس کے آس پاس جھاڑو دیا۔ پھر اس پر ہاتھ پھیرا تو اس کے پیٹ سے ایک چیخ سنی، پھر یوں کہنے لگا۔

قُلْ لِلْقَبَائِلِ مِنْ قُرَيْشٍ كُلِّهَا هَلَكَ الضِّمَارُ وَفَازَ أَهْلُ الْمَسْجِدِ
هَلَكَ الضِّمَارُ وَكَانَ يُعْبَدُ مُدَّةً قَبْلَ الصَّلٰوةِ عَلَى النَّبِيِّ مُحَمَّدِ
إِنَّ الَّذِي وَرِثَ النُّبُوَّةَ وَالْهُدٰى بَعْدَ ابْنِ مَرْيَمَ مِنْ قُرَيْشٍ مُهْتَدِ

قریش کے سب قبائل سے کہدو کہ ضمار ہلاک ہو گیا اور اہل مسجد کامیاب ہوئے۔ جو ضمار مدت سے پوجا جاتا رہا وہ محمد ﷺ پر صلوٰۃ سے قبل ہلاک ہو چکا ہے، جو ذات اقدس ابن مریم علیہ السلام کے بعد نبوت وہدایت کی وارث بنی ہے۔ وہ قریش کا ہدایت یافتہ شخص ہے۔

عباس کہتے ہیں، میں بنی حارثہ کے لوگوں کی معیت میں مدینہ منورہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس مسجد میں پہنچ گیا، جب آپؐ نے مجھے دیکھا، تو مسکرائے اور فرمایا:

"اے عباس! تیرا اسلام کس طرح ہے؟ میں نے پورا قصہ سنایا آپؐ نے فرمایا، تو نے سچ کہا۔ پھر میں اپنی قوم کے ساتھ مسلمان ہو گیا، اور ایک دوسری روایت کے مطابق انہی عباس بن مرداس نے ضمار بُت کو آگ لگا کر جلا دیا تھا۔ (غایۃ الامانی فی الرد علی النبہانی اردو، ص ۱۴۷، مصنفہ، علامہ محمود شکری آلوسی)

مندرجہ بالا واقعات و اقتباسات سے درج ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں

۱ پتھر کے بے جان بتوں سے بھی آوازیں آتی تھیں، وہ اپنے عبادت گزاروں کو غیب کی خبریں بھی دیتے تھے، جو بسا اوقات مہمل اور کبھی درست بھی ہوتی تھیں۔ یہ وہی بات ہے جسے اللہ تعالیٰ "إِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ" سے تعبیر کرتا ہے اور اس کی حقیقت قرآن نے یوں بیان فرمائی کہ یہ شیاطین یا رجال الغیب ملاء اعلیٰ یا تدبیرِ کائنات پر مامور فرشتوں سے کچھ باتیں سن پاتے ہیں۔ پھر اس حق میں کچھ باطل کی بھی آمیزش کر کے اپنے عبادت گزاروں تک پہنچا دیتے ہیں اور یہ سب شیاطین کا کام ہے۔

۶۔ ہوتا تو وہی ہے جو اللہ کی مشیّت میں ہے، لیکن اِن غیب کی خبروں کی وجہ سے ان کے عبادت گزار یہی سمجھتے ہیں کہ ان کا نفع و نقصان ان شیاطین (آستانوں یا آستانے والوں) کے تصرف میں ہے۔

۷۔ اُمراء اور دنیا داروں کی درویشوں سے عقیدت

اُمراء اور عام دنیادار دونوں طبقوں کو علماء و فقہاء سے زیادہ خلافِ شرع پیروں اور گانے بجانے والے صوفیوں سے عقیدت و محبت ہوتی ہے اس لئے کہ علماء اطباء کی طرح ہیں اور دوائیں خرچ کرنا انسان کو بار محسوس ہوتا ہے، لیکن ان پیروں اور قوالوں پر خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسے گانے بجانے والی عورتوں پر خرچ کرنا، یہ بھی گانے والوں اور مداریوں کی طرح سامانِ تفریح پیدا کرتے ہیں۔

امام ابن الجوزیؒ تلبیس ابلیس، ص ۳۸۹ پر لکھتے ہیں:

"امراء اور دنیا دار لوگ بناوٹی پیروں اور تارکُ الدنیا درویشوں کے بہت جلد معتقد ہوتے اور علماء پر اُن کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ لوگ اگر سب سے بڑے جاہل پر درویشی کا لباس دیکھ لیں تو فوراً اُس کے معتقد ہو جائیں اور اگر وہ مصنوعی طور پر بھی خشوع و خضوع کا اظہار کرنے لگے تو ان لوگوں کو اس پر فریفتہ ہونے میں دیر نہیں لگتی اور کہتے ہیں کہ بھلا اس درویش اور فلاں عالم کا کیا مقابلہ؟ یہ تارکِ دنیا وہ طالبِ دنیا۔ درویش لوگ نہ اچھی غذا کھاتے ہیں، نہ شادی کرتے ہیں، حالانکہ یہ محض جہالت ہے اور شریعتِ محمدیؐ کی تحقیر ہے کہ ایسے زُہد کو علم پر ترجیح دی جائے، خدا کا بڑا احسان ہے کہ یہ لوگ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں نہ تھے، ورنہ آپ کو شادیاں کرتے، پاک صاف چیزیں کھاتے، میٹھے اور شہد سے رغبت کرتے ہوئے پاتے، تو آپؐ سے بھی بداعتقاد ہو جاتے۔"

یہاں حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ آپؐ نے فرمایا: "ایک عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت ہے، جیسے تم میں سے ایک ادنیٰ (صحابی) پر مجھے فضیلت ہے۔"[1]

۸۔ تذکرے اور ملفوظات کا وجود

رہبانیت کے وجود کو بقائے دوام بخشنے کے لئے ایک طرف تو مزارات کی تعمیر کا سلسلہ

---

[1] یہ بحث بھی تفصیل سے آگے چل کر بیان ہوگی۔

شروع ہوا، تو دوسری طرف ایسی تصانیف کا آغاز ہوا جو کسی "بزرگ" کی وفات کے بعد مرتب کی گئیں جن میں رطب و یابس سب کچھ ہی شامل ہوتا ہے کیونکہ ان کا مقصد صرف کسی بزرگ کی کرامتوں کو بڑھا چڑھا کر اس کی بزرگی کی دھاک بٹھانا اور تصرف فی الامور کو ثابت کرنا ہوتا ہے۔ ایسی کتابوں کے غیر معتبر ہونے کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ روایتی انداز

ایسی کتابیں چونکہ مریدانِ خاص کی کوشش سے مرتب ہوتی اور بالعموم مریدوں کے مطالعہ کے لیے ہی مرتب کی جاتی ہیں، لہٰذا وہ عقیدت مندی کی وجہ سے کسی واقعہ کی تحقیق کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ ان واقعات کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ "روایت ہے، نقل ہے یا آپ نے فرمایا" اس کے علاوہ وہ کسی سند کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، لہٰذا یہ غیر مستند ہوتی ہیں اور اگر کبھی اتفاق سے کہیں حوالہ کی ضرورت پڑ بھی جائے، تو کسی ایسی کتاب کا حوالہ دیا جاتا ہے جس کا شرعی حیثیت سے کوئی مقام نہیں ہوتا۔ اور وہ بھی ان جیسے ہی حضرات کی تصنیف شدہ ہوتی ہیں۔ جن کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔

۲۔ تذکرے اور تاریخی لغزشیں

اس روایتی انداز کا اثر کرامات کی روایت تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ اس کی زد تاریخی روایات پر بھی پڑتی ہے یہاں ہم چند ایک مثالوں سے اس کی وضاحت پیش کرتے ہیں:

۱۔ **حضرت علی ھجویری**: دنیائے تصوف کی ایک درخشندہ شخصیت ہیں مشہور ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں انہی کی وساطت سے اسلام پھیلا اور لاہور کے مرکزی مقام میں آج تک ان کے مزار سے فیضِ عام بھی جاری ہے۔ اب دیکھئے ان کی تاریخِ وفات میں بھی اختلاف ہے اس بات پر بھی اختلاف ہے کہ "گنج بخش" کے لقب سے کب اور کیسے نوازے گئے اور اس بات میں بھی کہ ان کا ورود مسعود لاہور میں کب اور کیسے ہوا۔

ا۔ ان کی تاریخِ وفات ۴۶۵ ھ مشہور ہے اور یہی کچھ ان کی تاریخ وفات کے کتبوں سے جو مزار پر لگے میں واضح ہوتا ہے لیکن ان کی شہرہ آفاق کتاب کشف المحجوب کی داخلی شہادت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۴۸۰ ھ تک تو بہرحال بقید حیات تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ وفات کا اصل سن[1] کیا ہے؟

---

[1] حدیقۃ الاولیاء، ص ۱۸۴، حاشیہ کی ابتدائی سطور

ب ـــ عام تذکروں میں یہ بات مندرج ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی نے آپ کے مزار پر آ کر حسبِ دستور چلہ کشی کی اور فیض و برکت سے جب مالا مال ہو کر رخصت ہونے لگے، تو مزار کے رخ کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا:

گنج بخش فیضِ عالم مظہر نورِ خدا ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

(تصوف اسلام، ص ۳۶)

معین الدین چشتیؒ کا سن وفات ۶۳۳ھ بتلایا جاتا ہے۔ گویا گنج بخش کا لقب انہیں ۶۳۳ھ سے پہلے مل چکا تھا۔ لیکن حدیقۃ الاولیاء کے مرتب محمد اقبال مجددی لکھتے ہیں کہ "قدیم ترین مصنف جس نے سب سے پہلے گنج بخش لکھا ہے، وہ محمد قاسم عبرت لاہوری مصنف عبرت نامہ، بسال ۱۱۳۵ھ ہے۔

(حدیقۃ الاولیاء، ص ۱۸۲، حاشیہ ۲)

ج ـــ ان کے ورودِ مسعود بہ لاہور سے متعلق فوائد الفواد[1] (ملفوظات خواجہ نظام الدین سلطان المشائخ، م ۷۲۵ھ) میں یہ روایت درج ہے کہ حسین زنجانیؒ اور علی ہجویریؒ دونوں پیر بھائی تھے (یعنی حسن ختلی جنیدیؒ کے مرید تھے) جب مرشد نے لاہور جانے کا حکم دیا تو کہنے لگے وہاں حسین زنجانی موجود ہیں، میری کیا ضرورت ہے؟ مرشد نے مکرر یہی حکم فرمایا، جب لاہور پہنچے تو شیخ حسین زنجانی کا جنازہ جاتے دیکھا تو مرشد کی نظرِ رسا کا علم ہوا۔" (تصوفِ اسلام، ص ۳۵۔ حدیقۃ الاولیاء، ص ۱۸۶)

اب دیکھئے حسین زنجانی کی وفات ۶۰۰ھ اور علی ہجویری کی ۴۶۵ھ یا ۴۸۰ھ کے لگ بھگ ہے۔ اقبال مجددی صاحب، مرتب حدیقۃ الاولیاء نے اس اشکال کو دور کرنے کے یہ تو لکھ دیا ہے کہ یہ حسین زنجانی دو الگ الگ شخصیتیں ممکن ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات بھی بنانے سے بنتی نہیں، ایک تو "مرشد کی نظر رسا" پر زد پڑتی ہے۔ دوسرے دنیائے تصوف میں حسین زنجانی کے مرتبہ کی اور اس نام کی کوئی دوسری شخصیت ہمیں کہیں نظر نہیں آتی۔

۲۔ **حسین بن منصور حلاج** جو دنیائے تصوف کے آفتاب و ماہتاب ہیں، ان کے متعلق شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنی کتاب البلاغ المبین فارسی، ص ۸۷ (مطبوعہ مکتبہ سلفیہ، لاہور)

---

[1] فوائد الفواد کو "روح تصوف" کے مصنف خورشید احمد گیلانی نے تصوف کی مستند اور امہات کتب میں شمار کیا ہے اور تصوف کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کے لئے جن کتب کی سفارش کی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے، روحِ تصوف ص ۲)

پر لکھتے ہیں کہ "سید الطائفہ جنید بغدادیؒ اور دیگر مشائخ وقت نے اس کے قتل کا فتویٰ لکھا اور اسے سولی پر چڑھایا گیا۔"

اب دیکھئے کہ جنید بغدادی کا سنِ وفات بالاتفاق ۲۹۸ھ ہے اور منصور حلاج ۳۰۹ھ میں مقتول ہوا، تو جنیدؒ فتویٰ کیسے لکھ سکتے تھے۔

پھر شاہ صاحب مذکور اپنے بیان کی تائید میں مزید فرماتے ہیں کہ:

اخبار الاخیار (عبدالحق محدث دہلوی، بحوالہ قشیریہ[ل] ص ۵۹) لکھتا ہے کہ "نظام الدین اولیاء (م ۷۲۵ھ) سے سوال کیا گیا کہ "منصور حلاج کے بارے میں کیا حکم ہے؟" فرمایا: "مردود ہے، جنیدؒ نے اس کو رد کیا جنید مقتدائے وقت تھا، اس کا رد سب کا رد ہے۔"

اب ان تینوں مذکورہ تذکروں کی تاریخی صحت کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے۔

۳۔ پیرانِ پیر محمد ضیاء اللہ قادری اپنی تصنیف "غوث الثقلین" جسے مصنف صاحب نے بزعمِ خویش نہایت تحقیق سے لکھا ہے ــــ کے "صفحہ ۱۸۲" پر رقمطراز ہیں کہ:

"حضرت سہل بن عبداللہ تستری فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ اہلِ بغداد کی نظر سے حضرت غوث الاعظم کافی عرصہ غائب رہے، ہم لوگوں نے آپ کو تلاش کیا، تو معلوم ہوا کہ آپ کو دجلہ کی جانب جاتے دیکھا گیا ہے جب ان کو تلاش کرتے ہوئے دریائے دجلہ پر پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ آپ پانی پر چلتے ہوتے ہماری طرف آرہے ہیں۔ بکثرتِ تعداد مچھلیاں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کرتی ہیں اور ہم نے مچھلیوں کو آپ کا دستِ مبارک چومتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت نمازِ ظہر کا وقت ہو گیا تھا۔ اسی اثناء میں ہمیں ایک سبز رنگ کا سونے اور چاندی سے مرصع مصلیٰ دکھائی دیا جو تختِ سلیمانی کی مانند ہوا میں دریائے دجلہ کے اوپر معلق تھا..... " (قلائد الجواہر ص ۱۶۔ تفریح الخاطر ص ۲۵-۲۶ مطبوعہ مصر)

سید عبدالقادر جیلانی کا یہ کرامت نامہ خاصا طویل ہے، تاہم اتنے اقتباس میں بھی آپ کی چار کرامتیں تو واضح ہو ہی جاتی ہیں۔ یعنی (۱) آپ کا پانی پر چلنا (۲) بکثرت مچھلیوں کی حاضری (۳) مچھلیوں کا آپ کے دستِ مبارک کو چومنا، اگرچہ آپ کا ہاتھ پانی کی سطح سے ڈیڑھ، دو فٹ کی

[ل] رسالہ قشیریہ کو بھی روحِ تصوف کے مصنف نے امہات کتب میں شمار کیا ہے۔ روحِ تصوف، ص ۱۱

بلندی پر تھا اور (۴) آپ کے اوپر ایک طلائی اور نقرئی مرصع مصلیٰ کا ساتھ ساتھ ہوا میں چلتے ہا

اب مشکل یہ ہے کہ اس واقعہ یا ان کرامتوں کے راوی سہل بن عبداللہ تستری (ولادت ۲۰۳ھ، وفات ۲۸۳ھ بحوالہ انسائیکلوپیڈیا اسلامی، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، جلد ۱۱، ص ۴۰۴) ہیں، جو حضرت عبدالقادر جیلانی کی پیدائش (۴۷۰ھ) سے ۱۸۷ سال پہلے فوت ہو چکے تھے۔ اندریں صورت یہ روایت اور کرامت کیونکر معتبر سمجھی جا سکتی ہے۔

اب قادری صاحب کا یہ اعلان کہ ـــ آپ کی کسی تصنیف میں سے کوئی حوالہ غلط ثابت ہونے پر ایک صد روپیہ انعام دیا جائے گا، اپنی جگہ درست بھی ہو تو ایسی تحقیق اور محنت کا کیا فائدہ؟ جب کہ تذکروں کی اصل تصنیفات میں تاریخی لغزشیں بدستور موجود ہیں۔

۴۔ "پھر آپ (فریدالدین گنج شکر) نے اس موقع پر فرمایا: "ایک دفعہ رسولِ خدا ﷺ صحابہ کے ساتھ بیٹھے ہوتے تھے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یزید پلید کو کندھے پر بٹھائے ہوئے جا رہے تھے رسولِ خدا ﷺ نے تبسم کیا اور فرمایا: سبحان اللہ دوزخی بہشتی کے کندھے پر سوار ہوتے جا رہا ہے۔" جب یہ کلمہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سنا، تو حال پوچھا کہ "یا رسول اللہ! یہ تو معاویہ کا لڑکا ہے، دوزخی کہاں سے ہے؟" کہا۔ "اے علی رضی اللہ عنہ! یہ یزید وہ بدنصیب لڑکا ہے جو میرے حسن و حسین اور میری ساری آل کو شہید کرے گا۔" (راحۃ القلوب، ص ۲۰۶، ملفوظات خواجہ فرید گنج شکر، مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی، ترجمہ غلام احمد بریاں مطبع مجتبائی دہلی)

یہ پورا اقتباس تو ہم آگے چل کر باب ۴ میں شیعیت سے لگاؤ" کے عنوان کے تحت بیان کریں گے۔ سرِدست ہم یہ بتلانا چاہتے کہ:

۱۔ یزید، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے پندرہ سال بعد ۲۶ھ میں پیدا ہوئے تھے، تو رسول اللہ ﷺ یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ دوزخی بہشتی کے کندھے پر سوار ہے۔

۲۔ امام حسنؓ کا سنِ وفات ۵۰ھ ہے اور کربلا کا واقعہ گیارہ سال بعد ۶۱ھ میں پیش آتا ہے۔ پھر یزید نے امام حسن رضی اللہ عنہ کو کیسے شہید کیا تھا؟"

اب ایسی تاریخی لغزشوں کی تین ہی وجوہ ہو سکتی ہیں:

۱۔ خواجہ صاحب موصوف کا تاریخ سے متعلق مبلغ علم ہی اتنا ہو۔

۲۔ اگر یہ علم انہیں باطنی طور پر حاصل ہوا، یا بذریعہ کشف و مشاہدہ معلوم ہوا، تو پھر یہ علم غلط قرار پاتا ہے۔
۳۔ تذکرہ نگاروں نے ملفوظات وغیرہ میں سب کچھ رطب و یابس اکٹھا کر دیا ہے۔

پھر جہاں تاریخی واقعات کا یہ حال ہو اور معتقدین تو سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے میں مگن اور سرشار ہوں اور مخالفین انہیں خرافات سمجھ کر درخور اعتنا ہی نہ سمجھتے ہوں، تو پھر آخر ان روایات کی صحت کی ضرورت بھی کسے رہ جاتی ہے؟

۳۔ زندگی کا دوسرا پہلو

ہر انسان کی، خواہ وہ نبی ہو، زندگی میں بے شمار ایسے مقام بھی آتے ہیں جب کہ وہ مشیت ایزدی کے سامنے بے بس ہوتا ہے، وہ پریشان بھی ہوتا ہے۔ اپنی تکلیف رفع کرنے سے عاجز بھی ہوتا ہے جس کا اس کے پاس خدا کی ذات پر بھروسہ کے سوا کوئی حل نہیں ہوتا۔ ایسے تذکرے اس پہلو سے بالکل خاموش ہوتے ہیں۔ اگر حضور اکرم ﷺ جیسی مقدس ہستی کو ان کی آرزو کے برعکس مکہ سے ہجرت کا حکم دیا جاتا ہے یا جنگ میں شکست کا منظر دکھلایا جا سکتا ہے یا دندان مبارک شہید اور آپ خود زخمی ہو سکتے ہیں۔ واقعہ افک میں ایک طویل مدت پریشان رہ سکتے ہیں، موت کے سکرات سے پریشان ہو سکتے ہیں اور ایسے مقامات پر خدا کی ذات پر بھروسہ کے سوا کوئی حل نظر نہیں آتا، تو اور کون انسان ہو گا جو اپنی زندگی میں بے بس نہ ہو، لیکن ان تذکروں میں یہ پہلو عموماً مفقود ہوتا ہے۔

۴۔ روایت کرامت میں اختلاف

اگر ایک عقیدت مند کسی بزرگ کی ایک کرامت کو ایک رنگ میں پیش کرتے ہیں تو دوسرے عقیدتمند اسی بزرگ کی اسی کرامت کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں، جو مبالغہ آرائی کا ایک واضح ثبوت ہوتا ہے۔ مثلاً کتاب "سرچشمہ حیات" کے مصنف عبدالعزیز خاوری اس کتاب کے صفحہ ۶۷ پر حضرت ابراہیم بن ادھم کی ایک کرامت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"مشہور ولی اللہ ابراہیم ادھم جب بلخ کی حکومت چھوڑ کر فقیری اختیار کر چکے، تو ایک دن دریا کے کنارے گدڑی سینے لگے، تو آپ کا ایک سابقہ وزیر پاس سے گزرا، عرض کیا یا حضرت! کہاں وہ شوکت شاہانہ اور کہاں یہ رنگ فقیرانہ۔ آپ نے سوئی دریا میں ڈال دی اور فرمایا: فوج کو بلا کر کہو کہ سب مل کر میری سوئی نکال لائیں۔ اس نے کہا یہ ممکن نہیں۔ آپ نے دریا پر نظر ڈالی۔ پانی کی سطح پر مچھلیاں تھیں،

اور ایک کے منہ میں وہ سوئی تھی۔"

اب اسی واقعہ کو حافظ احمد الدین چشتی اپنی تصنیف "مقربانِ حق" بنظرِ ثانی پروفیسر بشیر الدین مطبوعہ قرآن سوسائٹی، لاہور کے صفحہ ۹۶ پر یوں لکھتے ہیں:

"نقل ہے ایک بار آپ دجلہ کے کنارے بیٹھے تھے۔ ایک امیر آیا کہنے لگا "آپ نے بلخ کی شاہی چھوڑ کر کیا پایا؟" (گویا آپ نے ناحق تکلیف اٹھائی) آپ نے سوئی دریا میں ڈال دی۔ ہزارہا مچھلیاں سونے اور چاندی کی سوئیاں منہ میں لئے ظاہر ہوئیں، آپ نے فرمایا: مجھے اپنی سوئی چاہیئے۔" فوراً ایک مچھلی آگے بڑھی اور وہ لوہے کی سوئی لے کر آئی۔ آپ نے لے لی، پھر اس امیر سے فرمایا: "یہ خدا کا ادنیٰ احسان ہے، جو تو نے دیکھا۔"

اب دیکھئے پہلے اقتباس میں سوال وجواب کا ربط ہے اور کرامت بھی اتنی ہی بیان کی گئی ہے جو شافی جواب پر دلالت کرتی ہے اور بوقتِ ضرورت بعض دفعہ اللہ تعالیٰ مہربانی فرما کر بزرگوں سے ایسی کرامت کا اظہار فرما بھی دیتے ہیں، لیکن دوسرے اقتباس میں محض ایک "بہت بڑی کرامت" کا اظہار مقصود ہے۔ بیشتر باتوں کا نفسِ واقعہ سے کوئی تعلق بھی معلوم نہیں ہوتا۔

اسی طرح ایک بزرگ حضرت اویس قرنی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے انہیں خیر التابعین کے لقب سے ملقب فرمایا۔ مسلم شریف کی یہ روایت ہے ہم مشکوٰۃ مترجم ومحشی من فوائد غزنویہ سے معہ ترجمہ اور حاشیہ کے نقل کرتے ہیں:

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "اِنَّ رَجُلًا يَاْتِيْكُمْ مِنَ الْيَمَنِ، يُقَالُ لَهٗ اُوَيْسٌ لَا يَدَعُ بِالْيَمَنِ غَيْرَ اُمٍّ لَهٗ، قَدْ كَانَ بِهٖ بَيَاضٌ فَدَعَا اللّٰهَ فَاَذْهَبَهٗ اِلَّا مَوْضِعَ الدِّيْنَارِ اَوِ الدِّرْهَمِ فَمَنْ لَقِيَهٗ مِنْكُمْ فَلْيَسْتَغْفِرْ لَكُمْ"	روایت ہے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے یہ کہ تحقیق رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "ایک شخص آوے گا تمہارے پاس یمن سے، کہا جاوے گا اسے اویس نہ چھوڑے گا یمن میں سوائے اپنی ماں کے تحقیق تھی اس کے بدن میں سفیدی پس دعا کی اللہ تعالیٰ سے۔ پس دور کیا اللہ نے اس کو مگر مقدار ایک دینار یا درہم کے۔ پس جس کو کہ ملے اویس تم میں سے، پس چاہیے کہ وہ بخشش طلب کرے تمہارے لئے۔"

وَفِیْ رِوَایَةٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: "اِنَّ خَیْرَ التَّابِعِیْنَ رَجُلٌ یُقَالُ لَهٗ اُوَیْسٌ، وَلَهٗ وَالِدَةٌ وَکَانَ لَهٗ بَیَاضٌ فَمُرُوْهُ فَلْیَسْتَغْفِرْ لَکُمْ" (مسلم)	اور ایک روایت میں ہے کہ کہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنا میں نے رسول اللہ ﷺ سے، "تحقیق بہتر تابعین میں سے ایک شخص ہے کہا جائے گا اس کو اویس، اور اس کے لئے ماں ہے اور تھے اس کے برص پس حکم کرنا اس کو استغفار کرے تمہارے لئے۔"[1]

اب کتاب سیرۃ خواجہ اویس قرنی مسمّی "الاویس" مصنفہ ارشد اویسی مطبوعہ اویسیہ پبلشرز بلال گنج، لاہور کی مبالغہ آرائیاں ملاحظہ فرمائیے:

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ حضور اکرم ﷺ کی زیارت کو گئے، آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں داخل ہوگئے اور پوچھا: "حضور کہاں ہیں اور کب آئیں گے؟" جواب ملا: "تبلیغ کو گئے ہیں اور ظہر کے وقت آئیں گے۔ آپ نے انتظار نہیں کی اور واپس چلے آئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کہا کہ جب حضور اکرم ﷺ واپس آئیں تو میرا سلام عرض کر دینا۔ چنانچہ جب حضور ﷺ آئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے واقعہ بیان کیا اور سلام عرض کیا، آپ نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا کیا تم نے اویس کو دیکھا ہے۔؟"

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فرمایا "ہاں! دیکھا ہے۔" یہ جواب سن کر حضور پُر نور باہر تشریف لائے اور تمام صحابہ کرام کو بلایا۔ سب کے سب موجود صحابہ کرام بلاوا سنتے ہی خدمت اقدس میں حاضر ہوگئے، آپ نے فرمایا: "میرے چہرے کی طرف دیکھو۔" سب نے حکم کی تعمیل کی اور آپ کے چہرۂ اقدس کی طرف دیکھا۔ پھر آپ نے فرمایا:

"اویس قرنی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف دیکھا وہ بخشی گئی اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے میری طرف دیکھا، میں بخشا گیا، اور تم سب نے میری طرف دیکھا، تم سب بخشے گئے۔" (ص ۴۴)

---

[1] استغفار کرے تمہارے لئے، اس حدیث سے اویس قرنی کی بڑی عمدہ فضیلت ثابت ہوئی، اویس قرنی تابعین میں ہے صحابی نہیں۔ ہرچند حضرت کے وقت میں موجود تھے، لیکن ماں کی خدمت سے فرصت نہ پائی کہ حضرتؐ کے حضور میں حاضر ہوتے۔ اس حدیث سے اویس قرنی کی صحابہؓ پر فضیلت ثابت نہیں ہوتی، کہ تابعی اصحاب سے افضل نہیں ہوسکتا اور صرف دعا کرانے سے فضیلت ثابت نہیں ہوتی اس واسطے کہ خود حضرتؐ نے اپنے واسطے بعضے لوگوں سے دعا کروائی ہے، بلکہ پانچوں وقت کی اذان میں تمام امت سے مقام محمود کے حاصل ہونے کے واسطے دعا کرنے کو فرمایا۔ (مشکوٰۃ، ج ۴، ص ۵۳۰)

غور فرمائیے ! یہ واقعہ ایک "ولی" کے مقابلہ میں حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کیا تصویر پیش کر رہا ہے۔ نیز بلا اجازت حضرت اویس کا حجرہ میں داخل ہونے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بے حجابی کو بھی۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ "قیامت کے دن حضور اکرم ﷺ خدا تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ سب مومنوں نے مجھے دیکھا اور میں نے انہیں دیکھا مگر اویس نے نہ مجھے دیکھا ہے اور نہ میں نے اُن کو۔" بارگاہِ الٰہی سے ارشاد ہوگا۔ "آپ کو جو کوئی دیکھتا ہے میرے لئے پھر جب مجھے دیکھ لیا جائے تو آپ سے نہ ملنے میں کوئی قباحت نہیں۔" (ایضاً، ص، ۴۲)

غور فرمایا آپ نے، محبتِ رسول ﷺ، جسے شریعت نے ایمان کا جزوِ اعظم قرار دیا ہے، کا کیسا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تذکرہ نویس نے اس دنیا میں دیدارِ الٰہی کے امکان کا مسئلہ بھی حل فرما دیا۔

اویس قرنی کا جُبّہ

تیسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ "ہر پیغمبر کے زمانہ میں قطب ہوتے ہیں اور خواجہ اویس قرنی نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے خصوصی قطب تھے[1]۔" (ایضاً ص ۴۳)

چوتھے مقام پر فرماتے ہیں: "جب حضور اکرم ﷺ کے وصال کا وقت ہوا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: آپ کا جبہ کس کو دیا جائے۔ فرمایا، اویس قرنی کو۔" (ایضاً، ص، ۴۷)

اب اسی حدیث کے راوی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ سے اویس قرنی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ آپ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں پھر اپنے زمانہ میں تلاش کرتے رہے۔ ہر شخص سے جو عراق، مصر، شام اور یمن سے آتا۔ خواجہ اویس کے متعلق پوچھتے مگر بے سُود۔" (ایضاً، ص ۴۷)

"اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی ساتھ لے کر اس مہم کو سر کرنے نکلتے ہیں[2]۔ بعض روایات کے مطابق آپ دونوں کوفہ کی طرف، بعض کے مطابق وادیٔ نمر اور بعض روایات کے مطابق

---

[1] قطب کون ہوتا ہے؟ یہ جاننے کے لئے اسی کتاب میں "طریقت کا باطنی سیاسی نظام" ملاحظہ فرمائیے۔

[2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غالباً اس لئے مہم پر بھیجا جا رہا ہے کہ وہ حدیث کے راوی ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لئے کہ وہ اکثر تذکرہ نگاروں کے خیال میں اس دینِ طریقت کے جدِ اعلیٰ ہیں۔ لہٰذا اس مہم کے لئے یہی دو اشخاص موزوں تر ہو سکتے تھے۔ رہا جُبّہ والا معاملہ تو اس کے متعلق متضاد روایات آگے چوتھے باب میں بیان کی جائیں گی۔

وادئ عرفات کی طرف گئے۔ وہاں اویس موجود تھے، جو نماز ادا کر رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر نماز جلد ختم کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کے ہاتھ کا نشان دیکھنے کے بعد دعا کی درخواست کی۔ اویسؒ نے پوچھا آپ کون ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "یہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور میں علی ابن ابی طالب ہوں۔

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا اور فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری اُمت کے لئے مغفرت کی دعا کریں اور ساتھ ہی جُبّہ مبارک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم والا پیش کیا۔ خواجہ نے جُبّہ لیا، سینے سے لگایا، چوما اور پاس رکھ لیا۔ پھر کچھ دوسری باتیں ہوتی رہیں، آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، جُبّہ مبارک پہن لیجئے اور دُعا کیجئے۔ آپ نے جُبّہ سامنے رکھا اور سجدہ میں گر گئے اور دُعا کرنے لگے۔

"اے باری تعالیٰ! یہ جُبّہ اس وقت تک نہ پہنوں گا جب تک ساری اُمت کو نہ بخش دے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اور میں نے سب نے اپنا کام پورا کیا، اب تیرا کام باقی ہے۔" غائبانہ آواز آئی "امت بخش دی گئی ہے، جُبّہ پہن لیں" اب خواجہ نے جواب دیا۔ "ساری امت کی بخشش چاہتا ہوں" ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آ گئے۔ دیکھتے ہیں کہ اتنی دیر کیوں کر دی۔ حضرت خواجہؒ نے آہٹ محسوس کی تو آپ اُٹھ بیٹھے اور فرمایا: "کاش! تم نہ آتے اور میں اس وقت تک جُبّہ نہ پہنتا، جب تک ساری امتِ محمدیہ کو نہ بخشوا لیتا۔" (ایضاً، اقتباس، از ص ۴۷ تا ۵۲)

عقیدت اور مبالغہ آرائی کی حد دیکھی آپ نے۔ خواجہؒ کی نظرِ کرم کی وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی پھر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بخشش ہو رہی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے خلفائے راشدین آپ کی جستجو میں سرگرداں اور اس مہم کو سر کرنے نکلتے ہیں۔ پھر خواجہ اللہ سے ساری امت کی بخشش اس طرح سے چاہتے ہیں کہ اگر نہ کی گئی، تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جُبّہ نہ پہنیں گے۔

ایسے تذکرے پڑھ کر عوام یہ تو اندازہ نہیں کر سکتے کہ ان کرامات کی شریعت کے کون کون سے نصوص و احکام پر زد پڑ رہی ہے۔ البتہ ان خرافات کو حقیقت سمجھ کر سبحان اللہ سبحان اللہ کے نعرے لگاتے اور انہیں بزرگوں کو حاجت رَوا اور مشکل کُشا سمجھ کر ان کے حلقۂ دام کے اسیر بن جاتے ہیں۔

۵۔ مبالغہ آرائی کی حد

ہم یہاں پیرانِ پیر کی وسعت علم کا ایک واقعہ بطورِ مثال پیش کریں گے۔ اس طرح کے بہت سے واقعات آپ کو اس کتاب

میں مناسب مقام پر مل جائیں گے۔

قادری صاحب "سیرت غوث" کے صفحہ ۵۰ پر رقمطراز ہیں کہ:

"غوث اعظم کے علم وعرفان کی شہرت جب دور دراز تک پھیل گئی، تو بغداد کے اجل فقہائیں سے ایک سو اجل فقہاء آپ کا امتحان لینے کی غرض سے حاضر ہوئے۔ ان میں سے ہر فقیہہ بہت سے پیچیدہ مسائل لے کر حاضر ہوا، جب وہ فقیہہ بیٹھ گئے، تو آپ نے اپنی گردن جھکالی، آپ کے سینہ مبارک سے نور کی ایک کرن ظاہر ہوئی، جو ان سب کے سینوں پر پڑی جس سے وہ سب سوال، جو اُن کے دلوں میں تھے، سلب ہو گئے۔ وہ سخت پریشان اور مضطرب ہوئے۔ سب نے مل کر زور سے چیخ ماری اور اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اپنی پگڑیاں پھینک دیں۔ اس کے بعد آپ کرسی پر جلوہ افروز ہوئے اور اُن کے سوالات، جو وہ اپنے دلوں میں لے کر آئے تھے، کے جوابات ارشاد فرمائے جس پر سب فقہائے نے آپ کے علم وفضل کا اعتراف کیا۔" (جامع کرامات، ص ۲۰۱، ج ۱۔ قلائد الجواہر، ص ۳۴۔ طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۱۲۸۔ نزہتہ الخاطر، ص ۶۸۔ تفریح الخاطر، ص ۱۵۔ تحفہ قادریہ، ص ۴۷)

اب دیکھئے بغداد میں ہی دس علمائے حدیث نے امام بخاریؒ کا امتحان لیا تھا۔ وہ یوں کہ ان دس آدمیوں میں سے ہر ایک نے امام بخاری کے سامنے دس دس حدیثیں پڑھیں (یعنی کل سو حدیثیں پڑھی گئیں) اور انہوں نے کیا یہ تھا کہ ان احادیث کی اسانید اور متون کو گڈمڈ کر دیا تھا۔ ہر حدیث سننے کے بعد امام بخاری کہہ دیتے کہ مجھے اس کا علم نہیں۔ جب یہ حضرات سو احادیث پوری پڑھ چکے، تو آپ نے پہلے شخص کو بلایا اور کہا کہ آپ نے جو احادیث پڑھی ہیں۔ فلاں فلاں حدیث کے متون کی اسانید یہ اور یہ ہیں اور فلاں اسانید کے متن یہ ہیں۔ اسی طرح آپ نے پوری سو احادیث کے اسانید اور متون کو بالکل صحیح صحیح بیان فرما دیا، تو آپ کی اس وسعت علم وحافظہ کا انہیں قائل ہونا پڑا اور نتیجۃً آپ امام المحدثین کے لقب سے نوازے گئے۔

معلوم ہوتا ہے عبدالقادر جیلانی کے کسی عقیدت مند نے امام بخاریؒ والے واقعہ کی ریس میں یہ افسانہ گھڑا، پھر مذکورہ بالا چھ تذکرہ نگاروں نے اسے درج فرمایا۔ اب سوال یہ ہے کہ امام بخاری کو تو اس امتحان کے بعد امام المحدثین کا لقب دیا گیا۔ شیخ جیلانی کو بھی کسی نے امام الفقہاء سمجھا؟ اصل بات یہ ہے کہ:

۱۔ ان تذکرہ نگاروں کو بس کرامات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ جو وہ پورا کر لیتے ہیں۔

سوچنے کی بات ہے کہ جب شیخ عبدالقادر نے نور کی کرن ڈال کر اُن پر وجد طاری کر دیا اور اُن کی مَت مار دی، تو اب جو کچھ بھی پیرانِ پیر جواب دیتے، یہ بغداد کے سَو اَجَل فقہاء اسے ٹھیک نہ کہتے تو کیا کرتے

۲۔ اجَلّ فقہاء کے لفظ سے تو یوں پتہ چلتا ہے کہ بغداد کے سب لوگ فقیہہ ہی تھے ان میں سو اجلّ فقہائ شیخ صاحب کا امتحان لینے گئے تھے۔

۳۔ ان سو اجَلّ فقیہوں میں سے ہر ایک نے بہت سے پیچیدہ فقہی سوالات سوچ رکھے تھے۔ اور اگر اب اِن مسائل کا اندازہ اوسطاً پانچ مسائل فی فقیہہ لگائیں، تو یہ پانچ صد پیچیدہ فقہی مسائل بنتے ہیں جن کا ایک مجلس میں مدلل جواب دینا ناممکنات سے ہے، اِلّا یہ کہ کوئی صاحبِ نور کی کرن پھینک کر ان کا ناطقہ بند کر دیں۔

۴۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ نور کی کرن ہمیشہ خطِ مستقیم میں سفر کرتی ہے۔ پیرانِ پیر کے سینہ سے نور کی ایک کرن بیک وقت سب پر کیسے پڑ گئی؟ ہو سکتا ہے کہ سو اَجَل فقہاء ایک قطار بنا کر کھڑے ہو گئے ہوں، اور یہ نور کی کرن سب کے جسموں کو چھیدتی ہوئی پار نکل کر سب پر یکدم جا پڑی ہو۔ بہر حال یہ سب باتیں مذکورہ بالا چھ تذکرہ نگار ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ ؎ رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

۶۔ الحاقی مضامین اور جعلی تصانیف

پھر جن علمائے حق نے ایسے صوفیوں کے عقائد اور کتابوں پر اعتراض کیے، ان صوفیوں نے ان سے انتقام یوں لیا کہ ان کی کتابوں میں اپنی طرف سے ایسے مضامین شامل کر دیئے جس سے دینِ طریقت کے نظریات کو تقویت پہنچ سکے۔ چنانچہ امام شعرانی خود اپنی کتابوں کے متعلق ایک دلچسپ اور عبرت انگیز تجربہ لکھتے ہیں۔ اَلْاَجْوِبَۃُ الْمَرْضِیَّۃ میں فرماتے ہیں کہ:

"میری کتاب البحر المورود فی المواثیق والعھود، میں بعض حاسدوں نے ایسے مضامین شامل کر دیئے۔ جو مخالفِ شریعت تھے اور جامع ازہر وغیرہ میں اُن کو خوب گشت کرایا اس سے ایک فتنہ کھڑا ہو گیا، یہاں تک کہ میں نے اپنا صحیح اور محفوظ نسخہ علماء کے پاس بھیجا جس پر بڑے بڑے علماء و مشائخِ اسلام نے تقریظ و توثیق لکھی تھی۔ اس وقت اِن کو ان الحاقی مضامین کی حقیقت معلوم ہوئی اور فتنہ فرو ہوا۔

اور امام غزالیؒ کے متعلق بھی بعض علمائ کا خیال ہے کہ بعض صُوفی قسم کے لوگوں نے مستقل کتابیں تصنیف کر کے امام غزالیؒ کے نام سے منسوب کر دی ہیں۔ پھر ان کُتب کی وسیع پیمانے پر اشاعت بھی کی

جاچکی ہے۔ مثلاً المضنون بہ علی غیر اھلہ، المضنون بہ علی اہلہ، معارج القدس، مشکوٰۃ الانوار، ایسی ہی بے اصل کتابیں ہیں جو امام غزالی کے دشمنوں اور بدخواہوں نے خود تصنیف کرکے ان کے نام منسوب کردی ہیں۔ (تاریخ دعوت وعزیمت، ج ۲، ص ۱۵۴) واللہ اعلم بالصواب، اسی طرح بعض حضرات کے نزدیک قصیدہ غوثیہ بھی سید عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف خواہ مخواہ منسوب کیا گیا ہے۔

ہمیں فریب کا یہ پہلو اس لئے اُجاگر کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے کہ اس کتاب میں آپ کو جا بجا ایسے صحیح العقیدہ اور مشہور متبع سنت اولیائے کرام کے ایسے اقتباس بھی ملیں گے جن کا ان بزرگ حضرات کی طرف نسبت کرنا گرانبار گزرتا ہے، مگر چونکہ ان کے معتقدین اور کرم فرماؤں کی مہربانی سے یہ کُتُب چھپ کر مُتداول ہیں۔ لہٰذا ہم یہ اقتباسات دَرج کرنے میں حق بجانب ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادرؒ کی اپنی تصنیف **غنیۃ الطالبین** میں اتباعِ سنّت پر زور دیا گیا ہے، مگر جب ہم اخبار الاخیار مصنفہ عبدالحق دہلوی جیسے تذکرے دیکھتے ہیں، تو بہت سی باتیں جو اُن کی طرف منسوب ہیں، بدعت اور صریح شرک تک جا پہنچتی ہیں۔ چند ایک اقتباسات آپ خود بھی ملاحظہ فرمائیں گے۔

اسی طرح حضرت مجدد الف ثانیؒ شریعتِ مُطہرہ کی تائید اور صوفیاء کے نظریاتِ باطل کی تردید میں یوں رقمطراز ہیں:

"اس طرح کا مقولہ شیخ کبیر یمنی کا ہو یا شیخ اکبر شامی کا۔ ہمیں محمد عربی ﷺ کا کلام درکار ہے نہ کہ محی الدین (ابن) عربی صدر الدین قونوی اور عبدالرزاق کاشی کا۔ ہم کو نَص سے کام ہے نہ کہ فص[1] سے، فتوحاتِ مدینہ نے ہم کو فتوحاتِ مکیہ[2] سے بے نیاز کردیا ہے۔" (مکتوبات امام ربانی، مکتوب ۱۰۰، ج ۱۔ بحوالہ: تاریخ دعوت وعزیمت، ج ۲، ص ۱۵۳، از ابوالحسن علی ندوی)

مگر جب انہی حضرت مجدد الف ثانیؒ کو ملفوظات اور تذکروں کے آئینہ میں دیکھتے ہیں تو یہ بزرگ بھی کچھ اور ہی شخصیت نظر آنے لگتے ہیں۔



---

[1] ابنِ عربی کی مشہور کتاب "فصوص الحکم" کی طرف اشارہ ہے۔

[2] فتوحاتِ مکیہ بھی ابن عربی ہی کی تصنیف ہے۔ ابنِ عربی نے بہت سے باطل نظریات کو تصوف میں داخل کردیا۔ جن کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

باب (۲)

دینِ طریقت کے نظریات و عقائد

دینِ طریقت کے آفاقی مذہب ہونے کا جو دعویٰ کیا جاتا ہے، تو وہ اس لحاظ سے نہیں کہ اس میں عالمگیریت اور ہمہ گیریت پائی جاتی ہے اور جملہ بنی نوع انسان کو پیش آمدہ مسائل کے حل کرنے کا ضامن ہے، بلکہ یہ دعویٰ اس لحاظ سے ہے کہ یہ دین زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے اور دنیا کے تمام مذاہب میں موجود رہا ہے۔

اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ اِن دینِ طریقت کے پیروکاروں کو سینٹ کہتے تھے، قرآن نے اِن کے لئے رُہبان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہندوؤں میں یہی لوگ جوگی، گرو، سادھو، رشی، مُنی کے مختلف ناموں سے موسُوم کئے جاتے ہیں۔ بُدھ مَت ایسے لوگوں کو بھگشو کا نام دیتا ہے۔ سِکھ انہیں گیانی کہتے ہیں اور مسلمانوں میں ایسے لوگوں کے بے شمار نام مشہور ہیں۔ مثلاً پیر، فقیر، مُرشد، درویش، صوفی، خدا رسیدہ، بزرگ، عارف، مجذوب، واصل باللہ، واصل بحق، قطب، ابدال، غوث وغیرہ وغیرہ۔ جن میں سے کچھ نام ان کے مراتب کے لحاظ سے رکھے گئے ہیں۔

اِس مذہب کی اصل بنیاد ذاتی مکاشفات و مشاہدات پر ہوتی ہے، لیکن ان مشاہدات و مکاشفات میں فروعی اختلاف کے باوجود چند باتیں ایسی ہیں۔ جن پر ان سب مذاہب کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی متفق علیہ باتوں کو دینِ طریقت میں نظریات و عقائد کی حیثیت حاصل ہے جو مراتب کے لحاظ سے درج ذیل ہیں:

۱۔ وحدتُ الوجود

یعنی انسان چلّہ کشی اور ریاضتوں کے ذریعہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے، کہ اسے کائنات کی ہر چیز میں خُدا نظر آنے لگتا ہے، بلکہ وہ ہر چیز

کو خدا کی ذات کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس قدر مشترک کے لحاظ سے ایک بدکار انسان اور ایک بزرگ، ایک درخت اور ایک بچھو، لہلہاتے باغ اور ایک غلاظت کا ڈھیر سب برابر ہوتے ہیں کیونکہ ان سب میں خدا موجود ہے۔

۲۔ وحدت الشہود جب انسان اس مقام سے ترقی کر جاتا ہے تو اس کی ہستی خدا کی ہستی میں مدغم ہو جاتی ہے اور وہ دونوں ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ گویا یہ نظریہ خدا کی ہستی کو کائنات سے الگ تسلیم تو کرتا ہے اور اس کائنات کو خدا کا پرتو یا سایہ تصور کرتا ہے لیکن مزید روحانی ترقی کے بعد خود کو خدا کی ذات میں گم کر دیتا ہے۔

۳۔ حلول اس سے اگلا مقام یہ ہے کہ انسان اپنے آئینۂ دل کو اتنا لطیف اور صاف بنا لیتا ہے کہ خدا کی ذات خود اس کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے یا حلول کر جاتی ہے۔ گویا وحدت الشہود میں تو انسان روحانی ترقی کرتا کرتا خدا کی ذات میں جا مدغم ہوتا ہے لیکن حلول میں خدا خود اپنے مرتبہ سے نیچے اتر کر انسان کے جسم میں داخل ہو کر مدغم ہو جاتا ہے۔

بالفاظِ دیگر ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وحدت الشہود اور حلول، وحدت الوجود ہی کے دوسرے پہلو یا ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ اصل الاصول وحدت الوجود ہی ہے۔

دینِ طریقت کے پیروکاروں میں کم و بیش مندرجہ بالا تینوں عقائد پائے جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی خاص فرد کسی ایک نظریے کو زیادہ نمایاں کرتا اور اس کا علمبردار بن جاتا ہے۔ بعد میں اس شخص کے معتقدین اسی نظریے کے پرچارک بن جاتے ہیں۔ گو دینِ طریقت کے مراتب و مقامات کی رو سے یہی ترتیب درست ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے مگر چونکہ اسلام میں سب سے پہلے حلول کا عقیدہ در آیا ہے اس لئے ہم اس ترتیب کو ملحوظ رکھ کر پہلے "حلول" کی تفصیل بیان کریں گے۔

ا۔ حلول کا نظریہ

خدا کا کسی انسان کے جسم میں حلول کر جانے کا عقیدہ یہود و نصاریٰ میں بھی پایا جاتا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ — اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور عیسائی

النَّصَارَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ (۹/۱۱)

کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں۔ پہلے کافر بھی اسی طرح کی باتیں کہا کرتے تھے۔

اس آیت سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں :۔

۱۔ حلول کا عقیدہ یہود و نصاریٰ سے پہلے بھی دنیا میں پایا جاتا تھا۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے بھی موجود تھا۔

۲۔ حلول کا عقیدہ ایسا نظریہ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ صرف منہ کی باتیں ہیں اور مزید یہ کہ یہ صریح کفر ہے۔

ایک دوسرے مقام پر اس عقیدہ کی اور زیادہ وضاحت ہوتی ہے، ارشاد باری ہے :

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (۵/۱۷)

بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں، جو کہتے ہیں کہ مریم کے بیٹے مسیح ہی خدا ہیں۔

پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ خدا صرف کسی نبی ہی کے جسم میں حلول کرے۔ دوسرے پیروں، فقیروں کے جسم میں بھی حلول کر سکتا ہے۔ دیکھئے ایک عیسائی راہب اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کا کیسے اظہار کر رہا ہے :

"سینٹ پال[1] کا قول ہے، ہم ذاتِ باری میں مسلسل تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ جب ایک شئے دوسری میں مدغم ہو جائے، تو ان دونوں کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ میں بھی خدا میں تحلیل ہو رہا ہوں اور وہ ذاتِ برحق مجھ سے ہم آہنگ ہو رہی ہے۔ قسم ہے اس زندۂ جاوید خدا کی کہ اب مجھ میں اور خالقِ کائنات میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا، ہم اب دونوں ایک ہی ہیں۔"

"وہ آنکھ جس سے میں دیدارِ خداوندی سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ اسی آنکھ سے وہ علیم و بصیر ذات میرا انتظار کر رہی ہے۔ میری آنکھ اور خدا کی آنکھ دونوں ایک ہی ہیں۔"

اقتباسِ بالا میں "حلول" کے علاوہ "وحدت الوجود" کی صاف جھلک دکھائی دے رہی ہے۔

---

[1] ایک مشہور فلسفی اور صوفی، جسے قرونِ وسطیٰ میں بڑی شہرت حاصل رہی ہے (وعظ ۳۵، صفحہ ۲۱۳ بحوالہ مذہب و تجدید مذہب، پروفیسر عبدالحمید صدیقی)۔

عیسائی راہب سینٹ پال کی طرح ایک مسلمان صوفی عبدالکریم جیلی (م - ۸۲۰ھ) حلول کے متعلق اپنا ذاتی تجربہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"میں نے اپنا وجود کھو دیا، پھر وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) میری طرف سے مجھ میں قائم مقام ہوا۔ یہ عوض جلیل القدر تھا، بلکہ بعینہٖ میں ہی تھا۔ پس میں وہ تھا اور وہ میں تھا۔ وجود مفرد تھا۔ جس کے لئے کوئی جھگڑنے والا نہ تھا۔ میں اس کے ساتھ اس میں باقی رہا اور فرق ہمارے درمیان سے اٹھ گیا اور میرا حال ماضی و مضارع میں ایک ہی جیسا ہوگیا۔ لیکن میں نے اپنے نفس کو بلند کیا۔ پھر حجاب اُٹھ گیا اور میں اپنی نیند سے بیدار ہوا گویا کہ میں لیٹا ہی نہ تھا۔ میں نے اپنی چشمِ حقیقت سے اپنے آپ کو حق دیکھا۔" (انسان کامل ص۵۱)

غور فرمایئے ! ایک عیسائی راہب اور ایک مسلمان صوفی کے اندازِ بیان یا اندازِ فکر میں کچھ فرق ہے ؟

ہندوستان میں بھی یہ سب نظریات قدیم سے پائے جاتے ہیں۔ ہندوؤں میں ایسے انسان کو جس کے بدن میں خدا اُتر آتا ہے، اَوتار کہتے ہیں۔ رام چندر جی اور کرشن ان کے ایسے ہی اَوتار ہیں جنہیں یہ لوگ خدائی صفات کے حامل قرار دیتے ہیں۔

اور مسلمانوں میں اس عقیدہ کی صدائے بازگشت ان الفاظ میں سنائی دے رہی ہے۔

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر   اُتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر

اسی طرح ایک دوسرا شعر ؎

اپنا اللہ میاں نے ہند میں نام   رکھ لیا خواجۂ غریب نواز

بھی اس عقیدہ حلول کی وضاحت کر رہا ہے۔

اسلام میں عقیدہ حلول کی ابتداء

اسلام میں اس عقیدہ کی داغ بیل عبداللہ بن سبا یہودی نے ڈالی تھی۔ یہ شخص یمن کے شہر صنعاء کا رہنے والا اور نہایت ذہین و فطین آدمی تھا۔ قرونِ اولیٰ میں یہودیوں کو جو ذلت نصیب ہوئی اس کا انتقام لینے کے لئے منافقانہ طور پر مسلمان ہوا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ عملی میدان میں اب مسلمانوں سے انتقام لینے کی یہودیوں میں سکت باقی نہیں رہ گئی۔ لہٰذا وہ مسلمانوں کے عقائد میں تفرقہ کے بیج بو کر تشتت و

انتشار پیدا کرنا چاہتا تھا۔ یہ شخص درویشی کا لبادہ اوڑھ کر زہد و تقویٰ کے رُوپ میں سامنے آیا اور اسی زہد و تقویٰ کی ریاکاری سے نومسلموں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مسلمان ہوا اور حالات کے دھارے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کی یہ سازشی تحریک انتہائی خفیہ طور پر مکہ اور مدینہ سے دُور دُور کوفہ، بصرہ اور مصر میں کام کر رہی تھی۔ بالآخر اسی یہودی کے حامیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر مختلف الزامات عاید کئے اور موقعہ پاکر غنڈہ گردی کر کے انہیں شہید کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اسلام کے جسم پر اس نے دو طرح کے وار کئے اور اپنی سازش کی کامیابی کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بطورِ ہیرو منتخب کیا۔

۱۔ نومسلم عجمی، لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابتداری کی بناء پر خلافت کے اصل حقدار حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور پہلے تین خلیفوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق غصب کیا ہے نئے مسلمان جو ابھی اسلامی تعلیمات سے پوری طرح آشنا نہ تھے۔ دُنیا کے عام دستورِ وراثت و نیابت کے مطابق اس کی چال میں آگئے۔

۲۔ چونکہ خود درویشی کے رُوپ میں آیا تھا۔ لہٰذا ظاہر اور باطن کی تفریق کر کے اور شریعت و طریقت کے رموز بتلا کر اِن نومسلموں میں دینِ طریقت کے ملحدانہ اور کافرانہ نظریات داخل کر دیئے اور بتلایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خُدا کی ذات کا مظہر ہیں اور خدا ان کے بدن میں حلول کر گیا ہے۔

ایک دفعہ خود اُس نے کوفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے رمز و کنایہ کی زبان میں کہا اَنْتَ ھُوَ یعنی "تو وہی ہے" تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے نظریہ کو بھانپ گئے اور اسے سخت سرزنش کی، بعد میں اسے سزا دینے کے لئے بلا بھیجا، لیکن معلوم ہوا کہ وہ کوفہ سے راہِ فرار اختیار کر چکا ہے۔

بہر حال اس نے اپنے معتقدین کی ایک جماعت تیار کر لی تھی۔ ایک دفعہ یہ لوگ علی الاعلان بازار میں کھڑے ہو کر اپنے نظریہ کا پرچار کر رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غلام قنبر نے بھی یہ باتیں سنیں، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جا کر اطلاع دی کہ کچھ لوگ آپ کو خُدا کہہ رہے ہیں اور آپ میں خدائی صفات مانتے ہیں۔ آپ نے ان کو بلایا۔ یہ قومِ زُط کے ستر (۷۰) اشخاص تھے۔ ان سے آپ نے پوچھا: تم کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا: "آپ ہمارے رب ہیں اور خالق و رازق ہیں۔" آپ نے فرمایا: "تم پر افسوس

ہے۔ میں تو تم جیسا ایک بندہ ہوں، تمہاری طرح کھاتا اور پیتا ہوں، اگر اللہ کی اطاعت کروں گا تو مجھے اجر دے گا اور اس کی نافرمانی کروں گا، تو مجھے سزا دے گا، لہٰذا تم خدا سے ڈرو اور اس عقیدے کو چھوڑ دو۔"

دوسرے دن قنبر نے پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ وہ لوگ تو وہی کچھ کہہ رہے ہیں۔ آپ نے دوبارہ انہیں بلایا اور پھر تنبیہ اور سرزنش کی، لیکن پھر بھی یہ لوگ باز نہ آئے۔ تیسرے دن آپ نے بلا کر اُن کو یہ دھمکی بھی دی کہ اگر تم نے پھر یہی بات کہی تو میں تم کو بدترین طریقہ سے سزا دوں گا مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ آپ نے ایک گڑھا کھدوایا اور اس میں آگ جلوائی اور ان سے کہا: "دیکھو! اَب بھی باز آجاؤ۔ ورنہ اس گڑھے میں پھینک دوں گا، مگر وہ اپنے عقیدہ پر قائم رہے تب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے آگ میں پھینک دیئے گئے۔" (فتح الباری، ص ۲۳۸ ج ۱۲)

امام بخاری نے یہ حدیث مختصراً بخاری کتاب استتابۃ المرتدین میں درج فرمائی ہے اور ان حلولیوں کے لئے "زنادقہ" کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ بھی صراحت کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ اگر میں حاکم ہوتا، تو ان لوگوں کو جلانے کے بجائے قتل کر ڈالتا۔

حلول کا عقیدہ رکھنے والے وہ لوگ جو بچ رہے تھے۔ وہ اپنے عقیدہ میں اور بھی سخت ہو گئے ان کی دلیل یہ تھی کہ "آگ اور پانی کا عذاب (جلا کر مار ڈالنے یا ڈبو کر مار ڈالنے کی سزا) صرف اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی جلایا ہے۔ لہٰذا وہ عین خدا ہیں۔ وہ زبان سے یہ کہتے تھے لَا يُعَذِّبُ بِالنَّارِ اِلَّا رَبُّ النَّارِ یعنی آگ کا خدا ہی آگ سے عذاب دیتا ہے۔

حسین بن منصور حلاج (م ۳۰۹ھ)

عبد اللہ بن سبا کا یہ عقیدہ اس کے پیروکاروں نصیریہ، کیسانیہ، قرامطیہ اور باطنیہ سے ہوتا ہوا صوفیا کے اندر داخل ہو گیا۔ حسین بن منصور حلاج (م ۳۰۹ھ) اس عقیدہ کے علمبردارِ اعلیٰ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان سے پہلے بھی ایسے صوفیاء گزرے ہیں، جو یہ عقیدہ رکھتے تھے مگر سینوں میں چھپائے رکھتے تھے۔ اس عقیدہ کو شہرتِ دوام حلاج سے ہی ہوئی اس کا دعویٰ تھا کہ خدا اس کے اپنے اندر حلول کر گیا ہے۔

اسی وجہ سے وہ اَنَا الْحَق کا نعرہ لگاتا تھا۔ اسے یہ بھی خوب معلوم تھا کہ اس کا یہ عقیدہ

مسلمانوں کے متفقہ عقیدہ کے سراسر خلاف ہے۔ اس سلسلہ میں اس کے اپنے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

عَقَدَ الْخَلَائِقُ فِی الْاِلٰہِ عَقَائِدًا   وَ اَنَا اعْتَقَدْتُ جَمِیْعَ مَا اعْتَقَدُوْا

الٰہ کے بارے میں لوگوں کے بہت سے عقیدے ہیں اور میں ان سب عقیدوں پر عقیدہ رکھتا ہوں۔

کَفَرْتُ بِدِیْنِ اللّٰهِ وَالْکُفْرُ وَاجِبٌ   لَدَیَّ وَعِنْدَ الْمُسْلِمِیْنَ قَبِیْحٌ

میں اللہ کے دین سے کفر کرتا ہوں اور یہ کفر میرے لئے واجب ہے جب کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک یہ بُرا ہے۔

حلاج کے درج ذیل اشعار بہت مشہور ہیں:

سُبْحَانَ مَنْ اَظْھَرَ نَاسُوْتَهٗ   سِرَّ سَنَا لَاھُوْتِهِ الثَّاقِبُ

پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے ناسوت (یعنی حسین بن منصور حلاج) کو اپنے لاہوتِ ثاقب کی چمک کا راز بنا کر ظاہر کیا۔

ثُمَّ بَدَا فِیْ خَلْقِهٖ ظَاهِرًا   فِیْ صُوْرَةِ الْاٰکِلِ وَالشَّارِبِ

پھر وہ اپنی مخلوق میں ایک کھانے اور پینے والے کی صورت میں ظاہر ہوا۔

حَتّٰی لَقَدْ عَایَنَهٗ خَلْقُهٗ   کَلَحْظَةِ الْحَاجِبِ بِالْحَاجِبِ

یہاں تک کہ اس کی مخلوق نے اس کو اس طرح دیکھا، جس طرح ایک دیکھنے والا دوسرے کو دیکھتا ہے۔ (تاریخ بغداد للخطیب بغدادی، ج ۸، صفحہ ۱۲۹)

حسین بن منصور نے اپنے متعلق دین سے ارتداد اور کفر کا فتویٰ تو خود ہی لگا دیا۔ سمجھانے کے باوجود بھی جب وہ اپنے اس عقیدہ پر مصر رہا تو بالآخر اسے خلیفہ بغداد المقتدر باللہ نے ۲۴ ذی قعدہ ۳۰۹ھ (۹۱۴ء) کو بغداد میں قتل کر دیا۔ اور اس "خدا" کی لاش کو جلا کر دریا میں پھینک دیا گیا۔ اتنے شدید جرم کے باوجود صوفیاء کی اکثریت نے اُن کے حق پر ہونے اور اُن کے سزا دینے والوں کو باطل پر ہونے کا فیصلہ کیا اور کہا ؎

روا باشد انا الحق از درختے   چرا نہ بود روا از نیک بختے

یعنی اگر ایک درخت[1] سے انا الحق کی آواز درست ہو سکتی ہے تو ایک "نیک بخت" کی طرف سے یہ آواز کیوں درست نہیں ہو سکتی۔ گویا صوفیاء کے نزدیک دین سے ارتداد اور کفر کوئی جرم نہ تھا بلکہ عین توحید تھی۔ ان کے نزدیک اگر کچھ جرم تھا تو فقط یہ کہ حسین بن منصورؒ نے اس اصل رازِ توحید کو فاش کیوں کر دیا۔ کسی شاعر نے اس بات کو یوں بیان کیا ؎

مَنْ بَاحَ بِالسِّرِّ كَانَ الْقَتْلُ شِيمَتَهٗ   بَيْنَ الرِّجَالِ وَلَمْ يُؤْخَذْ لَهٗ ثَارٌ

ترجمہ: جو شخص راز فاش کر دے اس کا انجام قتل کے سوا کیا ہو اور ایسے مقتول کا بدلہ بھی نہیں لیا جا سکتا۔

عبدالکریم جیلی اور عقیدہ حلول

مشہور متصوف عبدالکریم جیلی (م ۸۲۰ ھ) مصنف "الانسان الکامل" کا کمال یہ ہے کہ اس نے حلول کے اس صریح کفریہ عقیدہ کو قرآن سے ہی ثابت کر دکھایا ہے۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کی "صفت سمع کی تجلی" کے ذیلی عنوان کے تحت رقمطراز ہے کہ:

"اور اس (حقیقت سمع کی) تجلی سے خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے بدوں حجاب اسماء کلام کرتا ہے قبل تجلی اسمائے کے۔ پھر بعض کلام کرنے والے ایسے ہیں جس سے حقیقت ذاتیہ (یعنی خدا تعالیٰ۔ مؤلف) اس کے نفس سے اس کے ساتھ سرگوشی کرتا ہے۔ پھر وہ (بندہ) بغیر جہت اور بغیر جارحہ (یعنی کان) کے کلام کو سنتا ہے اور کلام کا سننا اپنی کلیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ نہ کان سے۔ پھر اس کو کہا جاتا ہے تو میرا حبیب ہے، تو میرا محبوب ہے، تو مراد ہے، عباد میں میرا منہ ہے، تو مقصدِ اسنیٰ اور مقصد اعلیٰ ہے، اسرار میں تو میرا ستر ہے، انوار میں تو میرا نور ہے، تو میرا عین، تو میری زینت، تو میرا جمال، تو میرا کمال، تو میرا اسم، تو میری ذات، تو میری نعت، تو میری صفات، میں تیرا اسم، میں تیری رسم، میں تیری علامت، میں تیری نشانی ہوں، تو موجودات کا خلاصہ اور حدوث و مقصود ہے۔ تو میرے شہود کی طرف قریب ہوتا ہے، میں اپنے وجود سے تیرے قریب ہوتا ہوں، تو دور نہ ہو۔ پھر میں ہی

---

[1] واضح رہے کہ وہ درخت خود نہیں بول رہا تھا۔ نہ اس کے اندر سے یہ آواز آتی تھی بلکہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق (۲۸:۳۰) اس پر اس وادی کے دائیں کنارے پر ایک درخت تھا جس میں سے ہو کر یہ آواز آ رہی تھی جبکہ حسین بن منصور خود خدائی کے دعویدار تھے۔ بعض صوفیاء اس درخت والی آواز کو اسی عقیدہ حلول کے تحت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آواز قرار دیتے ہیں۔

وہ ہوں، جو میں نے کہا نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اسم عبد سے مقید نہ ہو (یعنی اب تمہیں میرا عبد بنے رہنے کی ضرورت نہیں، مؤلف) پھر اگر رب نہ ہوتا، تو بندہ بھی نہ ہوتا، تو نے مجھے ظاہر کیا، جیسا کہ میں نے تجھے ظاہر کیا اگر تیری عبودیت نہ ہوتی، تو میری ربوبیت ظاہر نہ ہوتی۔ تو نے مجھے موجود کیا جیسا کہ میں نے تجھے موجود کیا۔ پھر اگر تیرا وجود نہ ہوتا، تو میرا بھی وجود نہ ہوتا۔" (انسان کامل، ص ۱۱۳)

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ کی اسرار و رموز کی زبان میں یہ لاجواب تشریح پڑھنے کے بعد کسی شاعر کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

من تو شدم تو من شدی من جاں شدم تو تن شدی تاکس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

حسین بن منصور حلاج کا مقام اولیائے کرام کی نظر میں

حضرت علی ہجویریؒ

حضرت علی ہجویریؒ (م ۴۶۵ ھ) ان کی مدح میں یوں رقمطراز ہیں کہ:

"انہیں میں سے مستغرق معنیٰ ابو المغیث حضرت حسین بن منصور حلاج رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ سرمستان بادۂ وحدت اور مشتاق جمال احدیت گزرے ہیں اور نہایت قوی الحال مشائخ تھے۔" (کشف المحجوب مصنفہ حضرت علی ہجویری، ص ۳۰۰)

پھر فرماتے ہیں کہ: "دیکھتے نہیں کہ حضرت شبلیؒ[1] رحمۃ اللہ علیہ حضرت حسین بن منصور کی شان میں کیا فرما رہے ہیں۔ آپ کا اعلان ہے: اَنَا وَالْحَلَّاجُ فِیْ شَیْءٍ وَّاحِدٍ فَخَلَّصَنِیْ جُنُوْنِیْ وَاَهْلَکَهٗ عَقْلُهٗ یعنی میں اور حسین بن منصور حلاج ایک ہی طریق پر ہیں مگر مجھے میرے دیوانہ پن نے آزاد کرا دیا (اصل ترجمہ "بچائے رکھا" ہونا چاہیئے۔ مؤلف) اور حسین بن منصور کو اس کی عقلمندی نے ہلاک کرا دیا۔"

"اگر (معاذ اللہ) وہ بے دین ہوتے، تو شبلی رحمۃ اللہ علیہ یہ نہ فرماتے کہ میں اور حلاج ایک ہی چیز ہیں۔ حضرت محمد بن خفیف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: هُوَ عَالِمٌ رَبَّانِیٌّ حسین بن منصور حلاج عالم ربانی

---

[1] یہ جنید بغدادی کے خلیفہ تھے۔

سے تھے اور ایسے اوروں نے بھی بہت کچھ تعریف کی اور انہیں بزرگ بتایا" (کشف المحجوب ص ۴۰۲، بحوالہ توحید خالص ص ۳۸)

حضرت علی ہجویریؒ کے بیان سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں:

۱۔ یہ بزرگ صحابی نہ ہونے کے باوجود "رضی اللہ عنہ" ہیں۔

۲۔ ان کی بزرگی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انہیں شبلیؒ نے اپنا ہم مسلک قرار دیا ہے۔ یہ ایسی دلیل ہے جو تقلیدِ آباء پر ختم ہو جاتی ہے۔

۳۔ آپ کے سوا دوسرے بزرگوں نے بھی انہیں بزرگ (بڑی شان والے صوفی) تسلیم کیا ہے۔

مولانا رومؒ

اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں۔

گفت فرعونے انا الحق گشت پست　　گفت منصورے انا الحق گشت مست

لعنۃُ اللہ ایں انا را در قفا　　رحمۃُ اللہ ایں انا را در قفا

ترجمہ: فرعون نے انا الحق کہا تو ذلیل ہوگیا اور منصورؒ نے انا الحق کہا تو (عشق و محبت میں) مست قرار پایا۔ فرعون کی خودی کے لئے تو بعد میں اللہ کی لعنت ہی رہ گئی اور منصورؒ کی خودی کے لئے بعد میں اللہ کی رحمت رہی ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

پیرانِ پیر، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ) کا مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"حضرت شیخ نے فرمایا کہ حسین بن منصورؒ حلاج کے زمانہ میں کوئی اُن کی دستگیری کرنے والا اور جس لغزش میں وہ مبتلا ہوئے، کوئی بچانے والا نہیں تھا۔ اگر میں ان کے زمانے میں ہوتا، تو ان کی دست گیری کرتا اور نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔" (اخبار الاخیار، مصنفہ عبدالحق محدث دہلوی، ترجمہ اردو، مولانا سبحان محمود ص ۴۹)

شیخ عبدالقادر، حلاج کی کس قسم کی دست گیری فرمانا چاہتے تھے، یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے وہ اسے اس عقیدہ سے باز رکھنا چاہتے تھے یا اس عقیدہ کو سینہ میں چھپانے کی تلقین کرنا چاہتے تھے۔ یا علمائے وقت کے فتویٰ سے اختلاف کرکے انہیں بچالینا چاہتے تھے۔ بہرحال یہ بات واضح ہے کہ آپ کو حلاج سے ہمدردی ضرور تھی۔

خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی

خواجہ نظام الدین اولیاء (م ۷۲۵ھ) ان کی بزرگی کے

اس قدر قائل تھے کہ آپ نے فرمایا :

"ذکر مشائخ کا ہو رہا تھا۔ بندہ نے عرض کیا کہ سیدی[1] احمد کیسے تھے؟ آپ نے فرمایا، وہ بزرگ شخص تھے۔ عرب کا قاعدہ ہے کہ جب کسی کو بزرگی سے یاد کرتے ہیں، تو اسے سیدی کہتے ہیں۔ وہ شیخ حسین بن منصور حلاج کے زمانے میں تھے۔ جب کہ ان کو جلایا گیا اور ان کی خاک دجلہ میں ڈالی گئی۔ سیدی احمد صاحب نے ذراسی خاک اس میں سے تبرکاً اٹھا کر کھائی تھی۔ یہ ساری برکتیں اسی سبب سے انہیں حاصل تھیں۔" (فوائد الفواد، ملفوظات نظام الدین اولیاء صاحب۔ مرتبہ: خواجہ حسن دہلوی، ص ۱۷۴، ترجمہ: پروفیسر محمد سرور صاحب شائع کردہ: محکمہ اوقاف، پنجاب)

ملاحظہ فرمایئے کہ جب ان کی خاک تبرکاً کھانے سے اتنی برکتیں حاصل ہو جائیں، تو ان بزرگ کی بزرگی کا کیا عالم ہوگا؟

اب تذکرہ نگاروں کا اختلاف بھی ملاحظہ فرمائیے۔ فوائد الفواد میں تو مندرجہ بالا عبارت مذکور ہے لیکن اخبار الاخیار میں حضرت نظام الدین اولیاء کا حلاج کے متعلق فتویٰ یوں ہے۔

"اخبار الاخیار می نویسد کہ از نظام الدین اولیاء سوال کردند کہ حکم شیخ ابن منصور حلاج چیست؟ فرمود کہ "مردود است جنید او را رد کردہ بود۔ جنید مقتدائے وقت بود۔ ردِ او ردِ ہمہ باشد۔"

ترجمہ: صاحب اخبار الاخیار لکھتا ہے کہ نظام الدین اولیاء سے پوچھا گیا کہ شیخ ابن منصور حلاج کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ فرمایا: "وہ مردود ہے۔ جنید نے اس کو رد کیا تھا۔ جنید مقتدائے وقت تھے۔ اُن کا رد کرنا سب کا رد کرنا ہے۔" (البلاغ المبین فارسی از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ص ۸۰، مطبوعہ مکتبہ سلفیہ لاہور)

واضح رہے کہ حضرت جنیدؒ تو ۲۹۸ھ میں وفات پاگئے اور حلاج کے قتل کا واقعہ ۳۰۹ھ[2] کے آخر کا ہے۔ البتہ حضرت جنیدؒ کے مریدِ خاص شبلیؒ زندہ تھے اور وہ منصور کے ہم خیال اور ہمراز تھے اور یہ بھی واضح رہے کہ فوائد الفواد کے مطابق تو نظام الدین اولیاء حلاج کو بہت بڑا بزرگ قرار دیتے ہیں مگر اخبار الاخیا

---

[1] احمد سے رفاعی سلسلہ کا آغاز ہوتا ہے جسطرح ہمارے ملک میں یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ جیسے شرکیہ وظائف رائج ہیں مصر میں یا سیدی احمد شیئاً للہ کا وظیفہ کیا جاتا ہے۔ اب نظام الدین اولیا صاحب کی تاریخ دانی کا یہ عالم ہے کہ سیدی احمد کو حلاج کا ہمعصر قرار دے رہے ہیں، حالانکہ یہ بزرگ پیران پیر کے معصر تھے اور ان کا سن وفات ۵۷۰ھ ہے۔ (خزینۃ الاصفیا، ص ۱۷۱)۔ [2] تذکرہ نگاروں کی تاریخ دانی بھی ملاحظہ فرمایئے اور روایات کا اختلاف بھی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ حلاج کے نظریات اس کی وفات سے بہت عرصہ پیشتر پھیل چکے ہوں اور حضرت جنیدؒ نے اُن کو مردود قرار دیا ہو، لیکن وہ اس کے قتل کے وقت زندہ نہ تھے۔

میں مردود قرار دے رہے ہیں۔

امام اہلسنت رضا خان بریلوی

حلول کا عقیدہ آج تک مسلمانوں میں متوارث چلا آرہا ہے۔ چنانچہ امامِ اہلِ سنت" احمد رضا خان بریلوی فرماتے ہیں:

سوال: "حضرت منصور و تبریز و سرمد نے ایسے الفاظ کہے جن سے خدائی ثابت ہے، لیکن وہ ولی اللہ گنے جاتے ہیں اور فرعون، شداد، ہامان و نمرود نے دعویٰ کیا تھا تو مخلد فی النار ہوئے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

جواب: "ان کافروں نے خود کہا اور ملعون ہوئے اور انہوں نے خود نہ کہا۔ اس نے کہا جسے کہنا شایاں ہے اور آواز بھی انہی سے مسموع ہوئی۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخت سے سنا اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰہُ میں ہوں رب اللہ سارے جہان کا، کیا درخت نے کہا تھا۔ حاشا بلکہ اللہ نے۔ یونہی یہ حضرات اس وقت شجرِ موسیٰ ہوتے ہیں۔" (احکام شریعت، ص ۹۳)

دیکھئے عقیدۂ حلول کی کس قسم کے اسرار و رموز سے وضاحت فرما رہے ہیں، فرعون، نمرود وغیرہ کو اللہ نے جہنمی قرار دیا اور اس کی اطلاع قرآن میں دی ہے۔ حلاج و سرمد وغیرہ کو ولی تو آپ لوگ کہتے ہیں۔ عامۃ المسلمین نے تو منصور کو زندیق اور کافر قرار دیا اور باقی دونوں کا انجام اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر یہی "امام اہل سنت" فرماتے ہیں:

"حضور پر نور سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ حضور اقدس و انور سیدِ عالم کے وارثِ کامل و نائب تام و آئینہ ذات ہیں کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم مع اپنی جمیع صفات جمال و جلال و کمال و افضال کے ان میں متجلی ہیں جس طرح ذاتِ عزت احدیت مع جملہ صفات و نعوت و جلالت آئینۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں تجلی فرما ہے۔" (فتاویٰ افریقہ، ص ۱۰۱)

ہم نے بغرض اختصار صرف چار پانچ مشہور صوفیہ کے اقتباسات پر اکتفا کیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ صوفیاء کی اکثریت آج تک منصور کو اس صریح کفر کے باوجود بہت بڑا متعبد اور راست باز ثابت کرنے کی کوشش کرتی اور اس کی مدافعت میں طرح طرح کی تاویلات پیش کرتی چلی آئی ہے۔ منجملہ ایک عذر "حالتِ سُکر" کا ہے۔

سُکر اور صحو کا امتیاز

صوفیاء کی طرف سے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ حالت سُکر (کیف و مستی) میں اگر کسی بزرگ کے منہ سے ایسے خدائی صفات کے حامل الفاظ یا خدائی کا دعویٰ زبان سے نکل جائے، تو وہ شرعی لحاظ سے قابلِ مواخذہ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر یہ سُکر کب شرعی چیز ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کبھی یہ کیفیت طاری ہوئی؟ تو کیا یہ بزرگ ان سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں؟ یہ سُکر تو بذاتِ خود ایک بدعت اور مصنوعی چیز ہے اور اس کی وکالت اس سے بھی بدتر۔ اسی طرح کے چند اقوال بایزید بسطامی کی طرف منسوب ہیں مثلاً آپ نے فرمایا:

سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمُ شَانِیْ — میں پاک ہوں، میری شان کتنی بڑی ہے۔

یا یہ بھی فرمایا:

مُلْکِیْ اَعْظَمُ مِنْ مُلْکِ اللّٰہِ — میری بادشاہی، خدا کی بادشاہی سے زیادہ ہے۔

اور یوں بھی فرمایا کہ:

خُضْنَا بَحْرًا وَّوَقَفَ الْاَنْبِیَاءُ بِسَاحِلِہٖ — ہم تو (معرفت کے) سمندر میں کود گئے جب کہ انبیاء اس کے ساحل پر ہی کھڑے رہے۔ (فضائح صوفیہ، ص ۱۰، از عبدالرحمٰن عبدالخالق، مطبوعہ کویت)

یہ تو خیر سُکر اور صحو کی بحث تھی حسین بن منصور حلاج کے متعلق تو بالصراحت مذکور ہے کہ وہ انا الحق کا نعرہ صرف حالتِ سکر میں ہی نہیں بلکہ صحو میں یعنی بقائمی ہوش و حواس اپنے آپ کو انا الحق کہتا تھا، تو پھر اس سے بھی ہمدردی کس بناء پر کی جاتی ہے؟

سکر اور صحو کی آڑ میں انبیاء پر اتہام

پھر صوفیاء کا یہ عذر بھی محض عذرِ لنگ ہے کیونکہ بعض صوفیاء سُکر کو صحو (ہوشمندی) سے بہتر سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ علی ہجویریؒ اپنی کتاب کشف المحجوب میں "الکلام فی السُّکرِ والصَّحو"

لہ مولانا اشرف علی تھانوی سکر پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اللہ کا ذکر ہوش بڑھانے کے لئے کیا جاتا ہے نہ کہ کھونے کے لئے۔ خواجہ عبید اللہ احرار کہتے ہیں کہ سکر و استغراق میں قرب نہیں بڑھتا، کیونکہ اس میں تعقل نہیں ہوتا، جو مدارِ قرب ہے۔" (تجدید تصوف و سلوک، ص ۴۵)

کے تحت فرماتے ہیں :

"جان تو کہ اللہ عزوجل تجھے عزت عطا فرمائے سکر اور غلبہ اربابِ معانی کے نزدیک حق تعالیٰ کی محبت کے غلبہ سے ہے اور صحو یعنی حصولِ مراد سے مراد ہے اور صاحبانِ معانی کو ان معنوں میں بہت ہی کلام ہے۔ ایک گروہ صحو کو سکر پر فضیلت دیتا ہے اور ایک گروہ سکر کو صحو پر فضیلت دیتا ہے۔ اور وہ لوگ جو سُکر کو صحو پر فضیلت دیتے ہیں وہ بایزید (بسطامی) اور ان کے متبعین ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صحو اعتدال اور تمکین پر آدمیت کی صفت سے صورت پذیر ہوتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے حجابِ اعظم ہے۔ اور سکر کا آفت کے زوال اور بشریت کی صفات کے نقص پر اور اس کے اختیار اور تدبیر کیئے جانے اور اس کے تصرف کے حق میں فنا ہونے پر اطلاق کرتے ہیں ...." جب خدا کا فعل بندہ کی طرف منسوب ہوگا تب بندہ اپنے آپ کے ساتھ قائم ہوگا اور جب بندہ کا فعل خدا کی طرف منسوب ہوگا، تب حق پر قائم ہو گا۔ جب بندہ اپنے آپ میں قائم ہوتا ہے (حالتِ صحو) تو وہ ایسا ہوتا ہے جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر اُوریاہ کی عورت پر پڑی اور جو دیکھا، سو دیکھا اور جب بندہ خدا کے ساتھ قائم ہوتا ہے (حالتِ سکر) جیسے کہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو اس کی نظر کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ جب اس کی نظر جنسِ عورت پر پڑتی ہے، تو حضرت زید رضی اللہ عنہ کی بیوی (زینب بنتِ جحش) خود حضرت زید رضی اللہ عنہ پر حرام ہو جاتی ہے اسکی وجہ یہی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت زید رضی اللہ عنہ محلِ صحو میں تھے اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم محلِ سُکر میں۔" (کشف المحجوب، اردو ترجمہ از مولوی محمد حسین، ص ۲۶۶، مطبوعہ، ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور)

ہجویری صاحب کے اس اقتباس سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :

۱ صوفیاء کا ایک گروہ بالخصوص بایزید بسطامی اور اس کے متبعین سُکر کو صحو سے بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک صحو (ہوشمندی) اللہ تعالیٰ کی محبت کے راستہ میں حجابِ اعظم ہے۔

۲ ہجویری صاحب نے صحو و سکر کا فلسفہ بیان کر کے اور ان اصطلاحات کو انبیاء کی ذات سے منسوب کر کے صحو و سُکر دونوں کا جواز بھی پیش کر دیا ہے۔

۳ "صحو کی حالت میں حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر اوریاہ کی عورت پر پڑی، پھر دیکھا جو دیکھا۔" جیسے غلط الزام کی آپ نے تائید و توثیق فرما دی ہے۔ جس کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ (جنہیں تمام صوفیاء اپنا جدِ امجد سمجھتے ہیں) نے فرمایا تھا کہ جو شخص یہ بات بیان کرے گا میں اس کو حدِ قذف کا دوگنا یعنی ۱۶۰ دُرّے

لگاؤں گا کیونکہ اس نے ایک نبی پر تہمت لگائی، جس کی سزا دگنی چاہیئے۔[۱]

۴۔ سکر کی آڑ میں آپ نے حضور اکرم ﷺ کی عصمت کو داغدار فرمایا اور ایک ایسے الزام کی تائید و توثیق کر دی جسے اسلام دشمن مصنفین اکثر اچھالتے رہے ہیں۔ اگرچہ رطب و یابس اکٹھا کرنے والے بعض مفسرین نے بھی ایسی باتیں لکھ دی ہیں تاہم علمائے حق نے اس کی پرزور تردید بھی کر دی ہے نیز قرآن کے سیاق و سباق سے بھی ایسے الزام کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

۵۔ ان سب باتوں کے باوجود ہجویری صاحب سکر و صحو دونوں حالتوں کو جائز اور درست کہتے ہیں اور ان واقعات اور حالات کو بھی جن پر آپ نے صحو اور سکر کا حکم لگا کر عصمتِ انبیاء کو داغدار فرمایا ہے۔

منصور حلاج کی تدریجی ترقی

خطیب بغدادی ؒ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ دینور میں ایک شخص پکڑا گیا جس کے ساتھ ایک توبرا تھا جسے وہ کسی وقت بھی جدا نہیں کرتا تھا جب اس توبرے کی تلاشی لی گئی، تو اس میں سے ایک خط برآمد ہوا جس میں "من الرحمٰن الرحیم الیٰ فلان ابن فلان" کے الفاظ لکھے تھے۔ یہ خط فوراً بغداد روانہ کیا گیا۔ قاضی کے سامنے حلاج کو پیش کیا گیا انہوں نے اعتراف کیا کہ یہ خط انہی کا لکھا ہوا ہے۔ قاضی نے پوچھا، "اتنے دن تک تو تم نبوت کا دعویٰ کرتے تھے اب ربوبیت کا بھی دعویٰ کرنے لگے ہو؟" حلاج نے جواب دیا: "میں ربوبیت کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن یہ ہمارے نزدیک عین الجمع ہے کیا کاتب اللہ کے سوا کوئی اور ہو سکتا ہے۔ میں اور میرا ہاتھ تو صرف ایک آلہ ہے۔" (تاریخ بغداد، جلد ۸، ص ۱۳)

اسی طرح شیخ ابن عربی نے حلاج کا ایک خط نقل کیا ہے جس کو انہوں نے اپنے ایک شاگرد کے نام لکھا ہے۔ جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

"اے میرے لڑکے! تجھ پر سلامتی ہو، خدا تجھ سے ظاہری شریعت کو چھپائے اور تجھ پر کفر کی حقیقت

---

[۱] حضرت سعید بن مسیبؒ اور حارث اعور نے حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ:

مَنْ حَدَّثَكُمْ بِحَدِيثِ دَاوُدَ عَلٰى مَا يَرْوِيهِ الْقُصَّاصُ جَلَدْتُهُ مِائَةً وَسِتِّيْنَ جَلْدَةً وَهُوَ حَدُّ الْفِرْيَةِ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ (بیان المختار ص ۲۶۵، علامہ عنایت اللہ اثری)	تم میں سے جو کوئی حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق وہ باتیں بیان کرے گا جو قصہ گو (اسرائیلیات سے) بیان کرتے ہیں تو اس کی سزا ایک سو ساٹھ درّے ہے اور یہ انبیاء پر تہمت لگانے کی سزا ہے۔

کھولے کیونکہ شریعت کا ظاہر شرکِ خفی ہے اور کفر کی حقیقت معرفتِ جلیہ ہے۔ اما بعد۔۔۔۔۔" (رسائل ابن عربی، مطبوعہ حیدرآباد، جز اول، رسالہ امام رازی، ص ۱۴)

حلاج کے متعلق ابنِ عربی نے اپنی فتوحاتِ مکیہ میں ایک اور واقعہ نقل کیا ہے کہ مشہور بزرگ شیخ ابو عمرو بن عثمان مکیؒ حلاج کے سامنے سے گزرے اور پوچھا کیا لکھ رہے ہو؟ حلاج نے جواب دیا "قرآن کا جواب لکھ رہا ہوں۔" یہ سن کر ابو عمرو بن عثمان مکیؒ نے بددعا کی اور انہی کی بددعا کا نتیجہ تھا کہ حلاج قتل کر دیا گیا۔

کیا یہ سب واقعات حالتِ سکر کے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حلاج پر باطنیت کے اثرات نمایاں تھے اور یوں بھی تصوف شیعیت (عبد اللہ بن سبا کا پیدا کردہ فرقہ) سے متاثر ہے۔ حلاج کے متعلق امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ دونوں نے صاف لکھا ہے کہ "وہ کافر تھا اور اس کے متعلق علماء کا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا" امام ابنِ تیمیہؒ ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حلاج فنا میں ڈوب گیا اور باطنی حقیقت سے معذور تھا، مگر ظاہری طور پر اس کا قتل واجب تھا اور کچھ دوسرے اسے شہید، فنا فی اللہ، موحد اور محقق کہتے ہیں۔ یہ لوگ شریعت کی پرواہ نہیں کرتے۔" پھر واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

"حلاج اپنے کفر کی وجہ سے قتل کیا گیا، وہ قرآن کا معارضہ کرتا تھا اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر کسی کا حج فوت ہو جائے، تو اپنے ہاں کعبہ بنا کر اس کا طواف کر سکتا ہے اور حج کے سوا تمام رسوم ادا کر سکتا ہے اور حج پر جتنی رقم خرچ ہو سکتی ہو اس کو صدقہ دے سکتا ہے۔" آگے چل کر لکھتے ہیں:

"جنیدؒ، عمرو بن عثمان مکیؒ اور ابو یعقوبؒ جیسے جلیل القدر مشائخ نے حلاج کی مذمت کی ہے۔ اگر کوئی شخص حلاج کے متعلق حسنِ ظن رکھتا ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ اصل حالات سے آگاہ نہیں۔"

(مجموعۃ الرسائل الکبریٰ، جلد ۲، ص ۹۰ تا ۹۹)

سید سلیمان ندویؒ اور حسین بن منصور حلاج

رسالہ معارف، جلد ۲، شمارہ ۴، میں "حسین بن منصور حلاج کی تاریخی شخصیت" کے عنوان سے سید سلیمان ندوی کا ایک بصیرت افروز مضمون چھپا تھا جس کے چیدہ چیدہ اقتباسات درج ذیل ہیں:

"حسین بن منصور حلاج ایران میں پیدا ہوئے۔ ان کا دادا پارسی تھا۔ باپ مسلمان ہوا۔ آبائی وطن شہر بیضا ہے۔ حسین نے واسط میں جو بصرہ اور کوفہ کے درمیان واقع ہے، نشوونما پائی۔ اس کی آمد و رفت بغداد میں بھی ثابت ہے۔ سنِ ولادت معلوم نہیں۔ ۳۱۰ھ میں بغداد میں قتل ہوا۔"

"تاریخ کی کتب اس امر پر متفق ہیں کہ حلاج نیرنگ، شعبدہ بازی اور ہاتھوں کے کھیل میں بہت چالاک اور مشاق تھا۔ روپے برسا دیتا تھا، طرح طرح کے میوے منگواتا، ہوا میں اڑتا اور اس کے علاوہ بھی کئی عجائباتِ دکھلاتا تھا۔ اس کے ایک ہم سفر کا بیان ہے کہ حسین اس کے ساتھ صرف اس غرض سے ہندوستان آیا تھا کہ یہاں کی مشہور شعبدہ بازیوں کی تعلیم حاصل کرے۔ چنانچہ اس نے میرے سامنے ایک عورت سے رسی پر چڑھ کر غائب ہو جانے کا فن سیکھا۔ راہ میں گڑھے کھود کر کہیں پانی، کہیں میوہ، کہیں کھانا پہلے سے چھپا دیتا۔ پھر اپنے ہمراہیوں کو لے کر اسی سمت میں سفر کرتا اور بوقتِ ضرورت کرامتوں کے تماشے دکھاتا۔"

سید سلیمان ندویؒ نے ابن سعد قرطبی، بغداد کے مشہور سیاح ابن موقل، مورخ ابنِ ندیم، ابو علی بن مسکویہ، مسعودی، علامہ ابن جوزی، ابن اثیر اور امام الحرمین کی تواریخ سے ثابت کیا ہے کہ وہ ایک شعبدہ باز اور گمراہ شخص تھا۔ چنانچہ ابنِ ندیم کے حوالہ سے، جو صرف ایک واسطہ سے روایت کرتا ہے، لکھتے ہیں کہ:

(ترجمہ) "حسین بن منصور حلاج ایک حیلہ گر اور شعبدہ باز آدمی تھا اس نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے صوفیوں کے طریقے اختیار کر لئے تھے۔ صوفیوں کی طرح باتیں کرتا اور علم کے جاننے کا دعویدار تھا، حالانکہ وہ اس سے خالی تھا۔ البتہ علمِ کیمیا میں اسے کچھ مہارت ضرور تھی۔ جب اپنے مریدوں کے پاس ہوتا، تو خدائی کا دعویٰ کرتا اور کہتا کہ خدا مجھ میں حلول کر گیا ہے اور جب سلاطین کے پاس جاتا، تو کہتا میں شیعہ مذہب کا آدمی ہوں اور عوام سے کہتا کہ میں ایک صوفی ہوں۔ البتہ یہ بات سب سے کہتا کہ خدا نے مجھ میں حلول کیا ہے اور میں بالکل خدا ہی ہوں۔"

اور ابن اثیر کی عبارت درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(ترجمہ) "حسین بن منصور کے قتل کا سبب یہ ہے کہ حلاج جب واپس بغداد آیا، تو کسی نے وزیر حامد بن عباس کو اطلاع دی کہ حلاج کہتا ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں کو زندہ کیا ہے اور میں مُردوں کو زندہ کر سکتا

ہوں اور بہت سے جنات میرے تابع ہیں اور میں جو چاہوں میرے پاس لا کر حاضر کر دیتے ہیں۔ نیز یہ کہ بہت سے اہل کار میرے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ نصر حاجب سرکاری دفاتر کا نگران بھی میری طرف مائل ہو گیا ہے اور اس کے علاوہ کئی بڑے بڑے لوگ حلقہ بگوش ہو گئے ہیں۔ یہ سُن کر وزیر حامد بن عباس نے خلیفہ سے درخواست کی کہ حلاج کا معاملہ اس کے سپرد کر دیا جائے لیکن نصر حاجب آڑے آیا۔ جب وزیر نے اصرار کیا تو خلیفہ مقتدر باللہ نے منصور اور اس کے چیلوں کا معاملہ حامد بن عباس کے سپرد کر دیا۔"

حامد بن عباس نے علماء سے اس کے قتل کا فتویٰ طلب کیا، تو علماء اور فقہائے نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ثبوت کافی نہیں۔ پھر حامد نے علماء کے سامنے اس کی ایک کتاب پیش کی جس میں لکھا تھا کہ "اگر کوئی شخص حج نہ کر سکے تو ایک صاف ستھری کوٹھری کو لیپ پوت کر حج کے ارکان اس کے سامنے ادا کرے۔ پھر تین یتیموں کو بلوا کر انہیں عمدہ کھانا کھلائے، عمدہ کپڑے پہنائے اور سات سات درہم ان کے حوالے کر دے، تو اس کو حج کا ثواب مل جائے گا۔" حامد بن عباس نے جب یہ فقرے قاضی القضاۃ کو سنائے، تو اس نے حلاج سے پوچھا کہ اس کا ماخذ کیا ہے؟ حلاج نے حسن بصری کی کتاب "الاخلاص، کتاب السنۃ" کا حوالہ دیا۔ حلاج کی یہ کذب بیانی سُن کر قاضی القضاۃ غضب ناک ہو گیا کیونکہ کتاب مذکورہ وہ پڑھ چکا تھا اور اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی۔ بالآخر قاضی القضاۃ نے لکھ دیا کہ ایسے شخص کا خون حلال ہے۔ اس تحریر پر اور بھی کئی علماء نے دستخط کر دیئے چنانچہ حلاج ارتداد اور زندقہ کی سزا میں پہلے قتل کیا گیا، پھر جلایا گیا اور راکھ کو دریا بُرد کر دیا گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے پیروؤں نے وہی بات مشہور کر دی جو ہر ناکام مدعی کے پیروکار کرتے ہیں۔ یعنی وہ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے اور پھر لوٹ کر آئے گا۔ مگر افسوس کہ وہ آج تک واپس نہ آسکا۔

حلولِ معین اور حلولِ مطلق

حسین بن منصور حلاج سے عقیدت رکھنے والے جن بزرگوں کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں وہ ولایت کی دنیا میں آفتاب و ماہتاب کی مانند درخشندہ ہیں اور جن کی اسلامی خدمات اور ان کے متبع سنت ہونے کو شک سے بالاتر سمجھا جاتا ہے جب ایسے اساطین کا یہ حال ہو تو عام ولیوں اور پیروں فقیروں کی اس عقیدہ سے جو وابستگی ہوگی اس کا اندازہ خود لگایا جا سکتا ہے۔

بعد کے ادوار میں حلول کا یہ شرکیہ عقیدہ اور بھی ترقی کر گیا اور یہ تسلیم کر لیا گیا کہ حلول کے لیے کسی معین ہستی

کی قید ضروری نہیں حلول ہر شخص میں ہو سکتا ہے اور اس کو حلولِ مطلق کا نام دیا گیا۔

حلول مطلق کے علمبرداروں میں سے ایک عبدالکریم جیلی[1] ہے۔ جو کہتا ہے کہ " قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں ھُوَ کا مرجع قُلْ میں مستتر ضمیر اَنْتَ ہے اور اس سے مراد انسان کامل ہے یعنی حضور اکرم ﷺ اس بے بنیاد بات کا ماخذ دراصل محی الدین کا یہ قول ہے سُبْحٰنَ مَنْ اَظْهَرَ الْاَشْيَاءَ وَهُوَ عَيْنُهَا یعنی پاک ہے وہ ذات جس نے اشیاء کو ظہو کا لباس پہنایا۔ جب کہ اشیاء اور اس کی ذات ایک ہی ہے۔ جیلی نے یہ بھی کہا " عیسائی حلول کی بناء پر کافر قرار نہیں دیئے گئے۔ بلکہ اُن کے کُفر کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عام اشیاء کو چھوڑ کر صرف حضرت مسیح علیہ السلام میں ہی حلول کو خاص کیا۔ اگر وہ خدا کے حلول کو ہر چیز میں تسلیم کر لیتے، تو کافر نہ ہوتے۔

نئے نئے خدا

انہی عقائد اتحاد و حلول اور ان کی بر ملا حمایت کا یہ اثر ہوا کہ بعد کے ادوار میں کئی "خدا" پیدا ہوتے رہے اور ان کی خدائی کو بھی بہ نظرِ استحسان ہی دیکھا جاتا رہا ہے یہاں ہم گیارہویں صدی ہجری کے ایک خدا اور اس کے انجام کا ذکر کرتے ہیں حدیقۃ الاولیاء کے مصنف مفتی غلام سرور کتاب مذکور کے صفحہ ۱۹۰ پر حکیم سرمد دہلوی مقتول کے حالات قلمبند کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ بزرگ صاحبِ جذب و سکر و مستی و استغراق و عشق و محبت تھا۔ پہلے یہودی مشرب تھا۔ کتاب توراۃ کمال شوق سے پڑھا کرتا۔ من بعد مشرف بہ اسلام ہوا اور علوم ظاہری کی تحصیل کی۔ اچانک حضرتِ عشق اس کے حال پر متوجہ ہوئے اور یہ ایک ہندو بچہ پر عاشق ہوا۔ مدت تک اس کے عشق کے دام میں بتلا رہا من بعد بحکم المجاز قنطرۃ الحقیقت معشوقِ حقیقی کے عشق میں ایسا محو ہوا کہ دوئی کی گنجائش عاشق و معشوق میں نہ رہی اور یہ بے خود، بے ہوش، سر و پا برہنہ مکشوف الصوت کبھی بازاروں میں پھرا کرتا اور کبھی ویرانہ جنگل کو نکل جاتا۔ ہوتے ہوتے یہ حالت طاری ہوئی کہ ؎

من خدایم من خدایم من خدا

کہنے لگا جب یہ بات علمائے وقت کو معلوم ہوئی۔ سب نے باتفاق اس کے قتل کا فتوےٰ لکھا اور اورنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کے قتل کی اجازت چاہی۔ چنانچہ یہ بادشاہ کے حکم سے ۱۰۷۰ھ میں قتل ہوا۔"

[1] عبدالکریم جیلی کا ایک اقتباس اس ضمن میں ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ اس نے الانسان الکامل لکھ کر ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم کی ہی ایک طرح سے شرح پیش کی ہے۔

۲- وحدت الوجود

وحدت الوجود یہ ہے کہ کائنات کی ہر ایک چیز، کائنات کے پھیلے ہوئے حصّوں میں سے ایک حصّہ ہے۔ کسی ایک چیز کی دوسرے سے غیریت نہیں۔ سب موجودات میں مکمل وحدت پائی جاتی ہے۔ گویا خدا کا کائنات سے اس طرح کا تعلق ہے جسے ایک کو دوسرے سے جُدا نہیں کیا جاسکتا۔ بالفاظِ دیگر مادہ کی محدود دنیا خدا سے الگ اپنا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی۔ "ہمہ اوست" اسی نظریہ کا دوسرا نام ہے۔ جس کے مطابق خدا ہی سب کچھ ہے اور سب کچھ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ یہ کائنات خدا سے الگ کوئی مخلوق نہیں۔ بلکہ یہ کائنات ہی خدا اور خدا ہی کائنات ہے۔ وحدتُ الوجود کے قائلین اس کائنات کی مثال ایک بحرِ بیکراں سے دیتے ہیں۔ جس میں ہر وقت موجیں اور حباب اٹھتے ہیں اور پھر اسی میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہی صورت اس کائنات میں حوادث کی ہے۔ ہر آن نئی نئی اشیاء وجود میں آتی ہیں اور پھر اسی میں ہی گم ہوتی رہتی ہیں۔

دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں "ہمہ اوست" کا یہ عقیدہ کسی نہ کسی شکل میں اختیار نہ کیا گیا ہو۔ ہندوؤں کے ہاں اس عقیدہ کا علمبردار شنکر اچاریہ بتلایا جاتا ہے۔ ہندو مت میں اس عقیدہ کی ہمہ گیری کا اندازہ اُپنشد کے مندرجہ ذیل شلوکوں سے لگایا جاسکتا ہے:

"(اے ذاتِ برحق) تم تو آگ ہو،
تم تو سورج ہو،
تم ہوا ہو،
تم چاند ہو،
تم ستاروں سے روشن فلک ہو،
تم برہمنِ اعظم ہو،
تم جل ہو،
تم فی الحقیقت ان ساری چیزوں کے خالق ہو۔" (اُپ نشد ترجمہ از سوامی دیانند)

ہندوؤں ہی کا ایک فرقہ جین مت کائنات کی ہر چیز کو خدا ہی تصور کرتا ہے۔ اسی وجہ سے

ہندو مظاہر قدرت یعنی سورج، چاند، شجر و حجر، غرض ہر چیز کو خدا ہی سمجھ کر اُس کو اور اپنے اوتاروں کے مجسموں کو پوجتے ہیں۔ وہ "ہمہ اوست" کی بجائے "ہر میں ہر" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

عیسائیوں میں اس نظریہ کی موجودگی کا اندازہ ایک راہب کے درج ذیل بیان سے لگایا جا سکتا ہے وہ جن الفاظ میں اپنے قلبی واردات کا اظہار کر رہا ہے۔ اس میں حلول اور وحدتُ الوجود دونوں پر روشنی پڑتی ہے:

"مجھے آج تک وہ رات، بلکہ پہاڑی پر وہ جگہ اچھی طرح یاد ہے جب کہ میری رُوح لامحدود میں گم ہو گئی تھی اور دونوں عالم یعنی عالمِ خارجی اور عالم باطنی دونوں ایک دوسرے سے مِل گئے تھے۔ جیسے کہ ایک گہرا سمندر دوسرے گہرے سمندر کو پکار رہا ہو۔ میری رُوح ذاتِ مطلق میں پوری طرح گم تھی۔ مجھے خارجی دنیا کا کوئی احساس تک باقی نہ رہا تھا۔ مجھ پر ایک ناقابلِ بیان کیف و مستی کا عالم طاری تھا اور مجھے چند لمحوں کے لئے یہ محسوس ہوا کہ میں کائنات اور خالقِ کائنات ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہیں جس طرح کہ کسی راگ کی مختلف دھنیں ایک نغمہ میں شامل ہو کر اپنی انفرادیت کھو دیتی ہیں۔ (RELIGEOUS EXPERENCE P 144 BY WILLIWM JAMES)

اسلام میں نظریہ وحدتُ الوجود کی درآمد

اسلامی تاریخ میں اس کے علمبردار تو شیخ محیؔ الدین ابن عربی، المعروف شیخ اکبر (م ۶۳۸ھ مطابق ۱۲۴۰ء) تسلیم کیئے جاتے ہیں لیکن تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ ان سے پہلے بھی مسلمان صوفیاء میں موجود تھا۔ اسلام میں تصوّف کا آغاز دوسری ہجری کے آخر میں شروع ہوا اور تیسری صدی میں پروان چڑھا۔ اس دَور کے سب صوفیہ میں کم و بیش یہ نظریہ موجود تھا ایسے شواہد تو ہم بعد میں پیش کریں گے۔ سردست ہم ابنِ عربی کی تعلیمات سے آپ کو متعارف کرائیں گے جنہوں نے فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم جیسی کتابیں لکھ کر اس نظریہ کو صوفیہ کے عقائد میں داخل کر دیا اور پھر اپنی ساری زندگی اسی عقیدہ کی آبیاری میں کھپا دی، وہ اپنا نظریۂ توحید ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

ابنِ عربی کی توحید اور فتوحاتِ مکیہ

"ایک توحید عقل والے کی ہے اور ایک توحید عارف صاحبِ تجلیات کی۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ صاحبِ عقل، توحید کا شعر یوں پڑھے گا ؎

وَفِی کُلِّ شَیْئٍ لَهُ اٰیَةٌ　　تَدُلُّ عَلیٰ اَنَّهُ وَاحِدٌ

ترجمہ : اور ہر ایک چیز میں اللہ تعالےٰ کی ذات کے لئے ایک نشانی ہے ، جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ایک ہے۔

اور صاحبِ تجلی کا شعر یوں ہوگا۔

وَفِی کُلِّ شَیْئٍ لَهُ اٰیَةٌ　　تَدُلُّ عَلیٰ اَنَّهُ عَیْنُهُ

ترجمہ : اور ہر ایک چیز میں اس کے لئے ایک نشانی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ اسی کا عین ہے۔

ابنِ عربی نے خدا اور بندے کے تعلق کو کیونکر ختم کیا ، وہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ فتوحاتِ مکیہ کے پہلے ہی صفحہ پر فرماتے ہیں :

۱ اَلرَّبُّ حَقٌّ وَالْعَبْدُ حَقٌّ　　یَا لَیْتَ شِعْرِیْ مَنِ الْمُکَلَّفُ

۲ اِنْ قُلْتَ عَبْدٌ فَذٰلِكَ مَیِّتٌ　　اَوْ قُلْتَ رَبٌّ اَنّیٰ مُکَلَّفٌ

۱ ترجمہ : پروردگار بھی حق ہے اور بندہ بھی حق ۔ کاش ! میں معلوم کر سکتا کہ ان میں سے مکلف (مطیع) کون ہے۔

۲ اگر تم کہو کہ مکلف بندہ ہے ، تو بندہ تو مُردہ اور میت ہے اور اگر کہو رب ہے تو وہ بھلا مکلف کیسے ہو سکتا ہے۔

لیجئے تمام احکامِ شرعیہ کی پابندی اور تعمیل سے چھٹی ہوئی۔ یہ ہیں بندہ اور خدا سب کو عین ذات سمجھنے کے مزے۔ آپ اسی مضمون کو اپنے رسالہ " رسائل ابنِ عربی ، کتاب الجلالۃ ، ص ۱۲" پر یوں ادا فرماتے ہیں

فَیَا لَیْتَ شِعْرِیْ مَنْ یَکُوْنُ مُکَلَّفًا　　وَمَا ثَمَّ اِلَّا اللّٰهُ لَیْسَ سِوَاهُ

ترجمہ : کاش ! مجھے معلوم ہوتا کہ مکلف کون ہے ؟ درآنحالیکہ یہاں اللہ کے سوا کسی کا وجود ہی نہیں ہے۔

ابنِ عربی کی فتوحاتِ مکیہ صرف باطنی علوم پر ہی محتوی نہیں ہے بلکہ اس میں علمِ جفر اور علمِ نجوم (جوتش) کے مباحث بھی شامل ہیں جن کی نفسِ انسانی پر تاثیرات تسلیم کی گئی ہیں۔ (دائرۃ المعارف الاسلامیہ مج ۱/۱۴۱ ، ص ۱۳۰ ، زیرِ عنوان " علم تصوف ")

فصوص الحکم کی تعلیمات

اب فصوص الحکم کی داستان بھی سُن لیجئے۔ فصوص، فص بمعنی نگینہ کی جمع ہے اور فصوص الحکم بمعنی دانائی کے نگینے۔ یہ کل ۲۷ فص یا نگینے ہیں۔ ہر ایک فص کو قرآن کریم میں مذکور ۲۷ انبیاء سے منسوب کیا گیا ہے

ابنِ عربی کا دعویٰ ہے کہ اِن فصوص کا علم مجھے مشاہدہ سے حاصل ہوا ہے۔ میں نے اسے لوحِ محفوظ سے نقل کیا۔ بعد میں ۶۲۷ھ کے محرم میں حضرت محمد ﷺ کو دمشق کے شہر محروسہ میں دیکھا۔ آپؐ کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ آپؐ نے مجھ سے فرمایا: "یہ کتاب فصوص الحکم ہے اس کو محفوظ کرو اور لوگوں کے سامنے پیش کرو تاکہ انہیں فائدہ حاصل ہو۔ چنانچہ میں نے آپؐ کے حکم کے مطابق اسے لوگوں میں پھیلانے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اس میں کمی بیشی کرنا میرے لئے ممکن نہ رہا۔ (فصوص، ص، ۴۷، ۵۸)

آپ بھی یقیناً ایسی معرکۃ الآرا کتاب کے مندرجات سے مستفید ہونا پسند فرمائیں گے۔ اس کتاب میں ابنِ عربی نے قرآن کی تعلیمات کی تحریف کر کے اس کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا ہے اور وحدت الوجود کی عینک چڑھا کر ہر واقعہ پر تبصرہ فرماتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ فرعون خود بھی صراطِ مستقیم پر تھی۔ فرعون کامل الایمان تھا اور قومِ نوح بھی۔ اللہ پاک نے قومِ نوح اور فرعون کو ان کے نیک اعمال کا بدلہ دیتے ہوئے وحدت الوجود کے سمندر میں غرق کیا۔ اور قومِ ہود کو عشقِ الٰہی کی آگ میں داخل کیا تاکہ اسے عیش و آرام حاصل ہو۔ حضرت ہارون علیہ السلام سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ انہوں نے بنی اسرائیل کو بچھڑے کی عبادت سے منع کیا۔ حالانکہ بچھڑا بھی خدا تھا یا خدا کا عکس اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی بہت اچھا کردار ادا کیا جو بُت پرستی سے باز نہ آئے، کیونکہ یہ تمام بُت خدا ہی کے مظاہر تھے۔ جہنم عذاب کی جگہ نہیں، بلکہ اس میں حلاوت اور شیرینی موجود ہے۔ (وہ عذاب کو عذوبۃ سے مشتق قرار دیتا ہے) وغیر ذٰلک من الخرافات۔ (امام ابن تیمیہؒ، از کو کن عمریؔ زیرِ عنوان صوفیہ پر تنقید)

دوزخ کی حقیقت

عبدالکریم جیلی (م ۸۲۰ھ) مصنف "انسان کامل" جو ایک طرح فصوص الحکم ہی کا شارح ہے۔ دوزخ کی حقیقت کو ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

"پھر اس کے بعد جاننا چاہیئے کہ آگ چونکہ وجود میں عارضی چیز تھی، لہٰذا اس کا زوال جائز ہوا اور اس کا زوال یہ تھا کہ جلانے کی صفت اس سے دُور کر دی اور احراق کی صفت کے دُور ہونے سے اُس کے فرشتے بھی چلے جائیں گے اور نعمتوں کے فرشتے ان کی جگہ پر آجائیں گے ان کے آنے میں اس (دوزخ)

میں تھوہڑ (زقوم) کا درخت پیدا ہو جائے گا اور وہ سبز ہے اور جنت میں سب رنگوں سے اچھا رنگ سبز ہے۔ پس معاملہ منعکس ہو گیا کہ جو جحیم تھا، وہ نعیم بن گیا۔ اللہ تعالٰی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کو گلزار بنا دیا اور اس کا محل اب تک ویسے ہی باقی ہے، لیکن ناریت چلی گئی، اگر تو چاہے تو کہہ دے کہ آگ زائل نہیں ہوئی، لیکن عذاب کی تکلیف راحت کے ساتھ مبدل ہو گئی۔ ایسا ہی قیامت کے دن جحیم کا حال ہو گا۔ چاہے تو کہہ دے کہ قدم رکھنے کے بعد بالکل آگ زائل ہو جائے گی اور چاہے تو یہ کہہ دے کہ وہ اپنے حال پر باقی ہے، لیکن تکلیف راحت سے بدل جائے گی۔ یہ دونوں احتمال صحیح ہو سکتے ہیں۔"

(انسان کامل، ص ۱۰۳)

ابن عربی نے یہ مسئلہ تو حل کر دیا کہ تمام بت پرست اقوام حق پر تھیں اور یہ بھی حل فرما دیا کہ انہیں جو اس بت پرستی کے بدلہ میں عذاب ہو گا وہ دراصل عذاب نہیں بلکہ شیرینی اور حلاوت، ان کے اعمال کا اچھا بدلہ ہے۔ اب صرف یہ الجھن باقی رہ جاتی ہے کہ اللہ تعالٰی نے انبیاء کو پھر کس غرض کے لئے مبعوث فرمایا؟ کاش! وہ اس بات کا بھی تسلی بخش جواب دے کر دین طریقت کی حقانیت ثابت کر دیتے۔

ابن عربی ایک بہت بڑے عالم، ادیب، شاعر اور صوفی تھے۔ اپنی کتابوں میں اپنی بے شمار کرامات بھی ارشاد فرمائی ہیں جن کا انداز بالکل وہی ہے جو عام پیروں فقیروں کا ہوتا ہے۔ نمونۃً ایک کرامت ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کعبۃ اللہ اور اس کے طواف کے متعلق اپنا ایک واقعہ بیان فرما رہے ہیں۔

ابن عربی اور کعبۃ اللہ

"ایک مرتبہ کعبۃ اللہ کو مجھ پر بڑا ہی طیش آ گیا وہ اپنی بنیادوں سے بلند ہو کر ابن عربی پر گر جانا چاہتا تھا۔ ابن عربی نے حجر اسود کو ڈھال بنایا۔ کعبۃ اللہ کو یہ کہتے ہوئے صاف طور پر سنا کہ ذرا نزدیک تو آ۔ دیکھو میں تمہیں کیا کرتا ہوں۔ کب تک میری قدر گھٹاتے رہو گے اور عارفین کو مجھ پر فضیلت دیتے رہو گے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے لئے عزت اور بڑائی ہے۔ میں ہرگز ہرگز تمہیں اپنا طواف نہیں کرنے دوں گا۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ اس وقت میں نے سوچا کہ اللہ تعالٰی مجھ کو ادب سکھانا چاہتا ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور کعبہ کی تعریف شروع کر دی۔ جوں جوں میں اس کی تعریف کرتا جا رہا تھا اس کا غصہ بھی ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا اور وہ اپنی بنیادوں پر جمتا جا رہا تھا۔ اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں طواف شروع کروں۔ جب میں حجر اسود کے پاس پہنچا تو میری زبان سے کلمۂ شہادت نکلا جو حجر اسود میں متمکن ہو گیا۔ میں نے کعبہ کی تعریف میں کئی رسائل لکھے

ہیں۔ جن کو تاج الرسائل کے نام سے مرتب کر دیا ہے۔" (فتوحاتِ مکیہ ج ۱، ص ۱۰۰، ۱۰۱)

اس عقیدہ وحدت الوجود کا جو اثر آپ کی ذاتِ والاصفات پر مترتب ہوا اس کی بھی ایک جھلک ملاحظہ فرما لیجئے یعنی ایک دوسری کرامت بھی؛

"آپ نے اپنی دو سال سے بھی کم عمر بچی زینب سے جماع کے متعلق ایک مسئلہ پوچھا، تو وہ فوراً بول پڑی۔ یہ دیکھ کر بچی کی ماں اور نانی فوراً چیخ پڑی اور بچی کی نانی تو بے ہوش ہو گئی۔" (فتوحاتِ مکیہ، ج ۳، ص ۱۷)

ابن عربی اور علمائے حق

ہم یہ تو بتلا چکے ہیں کہ یہ عقائد وحدت و حلول، دینِ طریقت یا تصوف کی جان ہیں، تو جب سے تصوف اسلام میں داخل ہوا یہ عقائد بھی شامل ہوتے گئے۔ پھر جس طرح حسین بن منصور حلاج نے کھل کر عقیدۂ حلول کو پیش کرنے اور اپنے خدا ہونے کا دعویٰ کیا اور مقتول ہوا بعینہٖ یہی صورت شیخ اکبر کی تھی۔ چونکہ عقیدہ وحدت الوجود قرآن کی تعلیم سے براہِ راست متصادم تھا اس لئے علمائے دین مخالف ہو گئے۔ چنانچہ جب یہ مصر پہنچے، تو علمائے کرام نے ان کے کفر کا فتویٰ دیا اور سلطانِ مصر نے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ یہ بات ابنِ عربی کو بھی معلوم ہو گئی، تو چپکے سے مصر سے راہِ فرار اختیار کر کے دمشق پہنچ گئے۔ باقی عمر درس و تدریس میں گزار کر ۶۳۸ھ کو راہی ملکِ عدم ہوئے۔ (حقیقت وحدت الوجود، ص ۹)

ابن عربی اور اشرف علی تھانویؒ

تو جس طرح صوفیاء کی نظر میں حلاج کا قصور یہ نہیں تھا کہ اس نے خدائی کا دعویٰ کیوں کیا ہے۔ بلکہ قصور یہ تھا کہ اس نے اس راز کو فاش کیوں کیا؟ بعینہٖ یہی معاملہ شیخ اکبر کا بھی ہے۔ صوفیاء میں سے کسی نے بھی کھل کر شیخ اکبر کی تردید نہیں کی۔ ان میں سے جو بزرگ وحدت الوجود کو اسلامی تعلیم کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ بھی تاویل و تعبیر کے ہر ممکن پہلو سے اپنے شیخ اکبر کی حمایت و دفاع میں کوشاں رہتے ہیں۔ چنانچہ دورِ متاخرین میں سے اشرف علی تھانویؒ نے ایک کتاب التنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن عربی لکھ کر یہی خدمت سرانجام دی ہے۔ آپ اس کتاب سے پہلے فصوص الحکم کی شرح بنام خصوص الکلم لکھنا چاہتے تھے جس کو اکمل الاقوم کی صورت میں بعض مقامات کی شرح کر کے چھوڑ دیا گیا۔ اس کی وجہ آپ یہ لکھتے ہیں کہ:

فصوص سے توحش اور اس کی شرح کا ترک

"اس (شرح کے لکھنے) کے زمانہ میں مجھ کو جو توحش و انقباض ان مضامین سے

ہوتا تھا۔ عمر بھر یاد رہے گا۔ بعض مقامات پر قلب کو بے حد تکلیف ہوتی تھی۔ چنانچہ کہیں کہیں اس کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ وجہ تھی اس شرح کے چھوڑ دینے کی۔"

یہ توحش و انقباض ایسا شدید تھا کہ پھر حضرت (اشرف علی) اس کام کی طرف سال ہا سال طبیعت کو رجوع نہ فرما سکے۔ بالآخر سات سال بعد التنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن عربی کے نام سے ایک کتاب مستقلاً شیخ کی تنزیہ و حمایت میں سپردِ قلم فرمائی۔" (تجدید تصوف و سلوک، ص ۴۰۸)

عفیف الدین تلمسانی

پھر کچھ دوسرے بزرگ ایسے بھی گزرے ہیں جو فصوص الحکم کو سبقاً پڑھایا کرتے تھے۔ انہیں میں سے ایک عفیف الدین تلمسانی ہیں فصوص الحکم کی شرح کیا کرتے تھے۔ جب اس کے خلافِ شریعت مسائل پر نکتہ چینی ہوتی تو معترضین پر کم عقلی کا الزام لگاتے۔ کبھی کبھی کفریہ اقوال بھی بک دیا کرتے تھے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ "شیخ کمال الدین ابن المراغی کو ابتدا میں تلمسانی سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ ان سے فصوص الحکم پڑھنے لگے۔ اثناء درس میں کمال الدین نے فصوص الحکم کی بعض قابل اعتراض باتوں پر گرفت کی اور کہا کہ یہ قرآن و حدیث کے صریح ارشادات کے خلاف ہیں، تو ایک مرتبہ تلمسانی کو سخت غصہ آ گیا اور کہا: "بار بار قرآن و حدیث کا کیا حوالہ دیتے ہو۔ انہیں اٹھا کر دروازے سے باہر پھینکو اور یہاں صاف دل ہو کر آؤ تاکہ تمہیں خالص توحید ملے۔"

تلمسانی کی ان باتوں سے کمال الدین کے دل کو سخت ٹھیس پہنچی وہ فوراً ان کی مجلس سے چلے آئے تلمسانی کو خطرہ لاحق ہوا کہیں یہ بات عام لوگوں میں نہ پھیل جائے اور ان کے خلاف کوئی زبردست ہنگامہ کھڑا نہ ہو جائے، تو روتے ہوئے کمال الدین کے پاس آئے اور انہیں راضی کیا۔

شیخ کمال الدین ہی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ شیخ تلمسانی نے کہا: "قرآن میں توحید ہے کہاں؟ وہ تو پورے کا پورا شرک سے بھرا ہوا ہے، جو شخص اس کی اتباع کرے گا وہ کبھی توحید کے بلند مرتبے پر نہیں پہنچ سکتا۔" (امام ابن تیمیہؒ، از کوکن عمری، زیر عنوان صوفیاء پر تنقید، ص ۳۲۱)

شیخ کمال الدین نے ایک مرتبہ اعتراض کیا کہ "اگر عالم کی تمام چیزیں ایک ہیں جیسا کہ تمہارا عقیدہ ہے تو پھر تمہارے نزدیک جورو، بیٹی اور ایک اجنبی عورت میں کیا فرق ہے؟" تلمسانی نے جواب دیا: "ہمارے ہاں تو کوئی فرق نہیں، چونکہ ان محجوبوں (اہلِ شریعت) نے ان کو حرام قرار دیا ہے تو ہم بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ چیزیں تم پر حرام ہیں، ورنہ ہم پر کوئی چیز حرام نہیں۔" (امام ابن تیمیہؒ، مصنفہ کوکن عمری ایم اے، ص ۳۲۱)

ملاحظہ فرمایا آپ نے اس نظریۂ وحدت کی زد کہاں کہاں تک جا کر پڑتی ہے۔

ابنِ عربی کے فلسفہ کو صوفیاء کے طبقہ میں بہت پذیرائی ہوئی۔ اس کے شارحین میں مندرجہ ذیل حضرات بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ النابلسی، الکاشانی، القصیری، بالی آفندی، جلال الدین رومی، عبدالرحمٰن جامی، رومی کی مثنوی کو تو "فتوحات در فارسی" کہا جاتا ہے۔ عبدالکریم جیلی کی کتاب "انسان کامل"، فصوص الحکم ہی کی ایک طرح سے شرح ہے۔ بے ضابطہ تشریح اور استفادہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ (دائرۃ المعارف الاسلامیہ زیرِ عنوان طریقت، ص ۱۳۱، ج ۱۲)

مندرجہ بالا شارحین کے علاوہ ان میں کئی دیگر معروف ہستیوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ ابنِ سبعین، عبدالوہاب شعرانی، شیخ فریدالدین عطار وغیرہ یہ سب حضرات اسی نظریہ کی آبیاری کرتے نظر آتے ہیں۔

ابنِ عربی کے پیشرو

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ وحدۃ الوجود کے نظریہ کے مطابق کائنات کی ہر چیز چونکہ خدا کا حصہ ہے لہٰذا اس پہلو سے ایک شریف اور بدمعاش، آدمی اور گدھا، کتے اور پرند سب برابر ہیں۔ اب دیکھئے یہی عقیدہ ابنِ عربی سے پہلے صوفیا میں پایا جاتا تھا:-

ابوالنصر سراج طوسی (م ۳۷۸ھ) کی کتاب اللمع فی التصوف اس موضوع پر ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کے صفحہ ۴۹۵ پر مذکور ہے۔

"ابوحمزہ صوفی کو حارث محاسبی کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ حارث کی بکری نے مَیں مَیں کیا تو ابوحمزہ صوفی ہچکیاں لینے لگا اور اس بکری سے مخاطب ہو کر کہا۔ "لَبَّیْکَ یَا سَیِّدِیْ!" (میرے آقا! میں حاضر ہوں)

اس پر حارث محاسبی نے ٹوکا، تو ابوحمزہ نے جواب دیا: "معلوم ہوتا ہے، تم ابھی تصوف کے میدان میں مبتدی ہو۔"

اب دیکھئے حارث محاسبی کا سنِ وفات ۲۴۳ھ ہے اور یہی وہ شخص ہے، جس کو سب سے پہلے صوفی کے لقب سے پکارا گیا۔ اور ابوحمزہ انہیں مبتدی قرار دے رہے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ تیسری صدی ہجری کے آغاز میں وحدت الوجود کا عقیدہ مسلمان صوفیوں میں آگیا تھا۔ اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ کتاب مذکورہ

کے صفحہ ۴۹۲ پر درج ہے:

"ابو الحسن نوری نے ایک کتے کو بھونکتے دیکھا تو کہنے لگا "لَبَّیْکَ وَسَعْدَیْکَ" (یعنی میں حاضر ہوں اور تجھ سے سعادت چاہتا ہوں") یہ بزرگ جو کتے کے بھونکنے کو خدا کی پکار قرار دے کر جواب دے رہے ہیں۔ یہ سری سقطیؒ کے مرید اور جنیدؒ کے ہم صحبت تھے۔ (مقربانِ حق، ص ۱۶۴) اور سری سقطی کا سنِ وفات ۲۵۹ھ ہے جن کے یہ مرید تھے۔

پھر شیخ جنید بغدادی بھی اس عقیدہ سے سخت متاثر تھے۔ شیخ عبد الغنی نابلسیؒ (م ۱۱۴۳ھ) اپنی کتاب فتح الربانی میں ایک واقعہ درج کیا ہے کہ:

"جنید بغدادی کہتے ہیں کہ مجھے کسی چیز سے اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا مجھے ایک شعر سننے سے ہوا۔ میں سڑک پر جا رہا تھا تو ایک شاعر یوں کہہ رہا تھا ؎

وَاِذَا قُلْتُ مَا ذَنْبِیْ اِلَیْكَ اَجْبْتَنِیْ   وَجُوْدُكَ ذَنْبٌ لَا یُقَاسُ بِهٖ ذَنْبٌ

جب میں پوچھتا ہوں کہ میرا گناہ کیا ہے تو مجھے جواب دیتا ہے کہ تیرا اپنے وجود کو الگ سمجھنا ہی ایسا گناہ ہے جس کے برابر کوئی گناہ نہیں۔

پھر جنیدؒ بغدادی کے مرید شبلیؒ اور منصور حلاج (م ۳۰۹ھ) اس وحدت و حلول کے معاملہ میں ایک دوسرے کے ہمراز و ہم خیال تھے۔ جب منصور کو تختۂ دار پر کھینچا گیا، تو پہلے اس پر پتھر برسائے گئے۔ علماء و بزرگانِ دین جمع ہو کر آئے مگر شبلیؒ نہیں گئے۔ بالآخر لوگوں کے مجبور کرنے پر انہیں جانا پڑا۔ اس مقام پر صاحب "مقربانِ حق" صفحہ ۱۴۵ پر تحریر فرماتے ہیں:

"نقل ہے کہ جب آپ (حلاج) کو سنگسار کیا جا رہا تھا، تو حضرت شبلیؒ نے ذرا سا پتھر اٹھا کر آپ کو مارا۔ آپ نے آہ کی۔ لوگوں نے کہا: "کسی بڑے پتھر پر تو آپ نے آہ نہیں کی، لیکن اس کے ذرا سے ڈھیلے پر درد محسوس کیا؟" فرمایا: "لوگ نہیں جانتے کہ مجھے نہیں مارنا چاہئے مگر شبلی جانتا ہے۔ پس دوست کا ناروا فعل باعثِ درد ہوا۔"

غرض اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں۔ جن میں تصوف کے ان پیشرؤوں میں وحدت الوجود کے نظریات ملتے ہیں۔ تاہم رازہائے درون کو سب سے پہلے جس شخص نے تحریری صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کیا وہ ہمارے امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) ہیں۔ آپ اخلاقیات اور فلسفہ و منطق کے بڑے متبحر عالم تھے۔ فلسفہ کی رد

سے تو یہ پہلے ہی وحدت الوجود کو ایک حقیقت سمجھتے تھے لیکن مشاہدہ نہیں تھا۔ لہٰذا ایک مدت بے قرار اور پریشان رہنے کے بعد خود راہِ سلوک پر چل کھڑے ہوئے۔ اور گیارہ سال کی ریاضت و مجاہدہ کے دوران اس نظریۂ وحدت کو برحق پایا۔ یہ ساری داستان انہوں نے خود ایک رسالہ اَلْمُنْقِذُ مِنَ الضَّلَالِ لکھ کر بیان کی ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے:

امام غزالیؒ کی توحید

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ "توحید کی دو قسمیں ہیں، ایک توحید عوام کی، دوسرے خواص کی۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عوام کی توحید ہے اور لَا هُوَ اِلَّا هُوَ (نہیں، مگر وہی) خواص کی توحید ہے، کیونکہ وہ عام ہے اور یہ خاص۔ اور یہ زیادہ شامل، زیادہ لائق اور زیادہ اخص ہے۔ اور اس کو ماننے والے کو فردانیت میں زیادہ داخل کرنے والا۔ مخلوقات کے معراج کی انتہا فردانیت ہے" (ترجمہ مشکوٰۃ الانوار، مصنفہ امام غزالی، ص، ۳۱)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتوں پر روشنی پڑتی ہے:

(ا) حضور اکرم ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین وغیرہ سب عوام کا کلمہ توحید پڑھتے رہے لہٰذا وہ خواص کے زمرہ سے باہر ہیں۔

(ب) خواص کا کلمہ توحید نظریۂ وحدت الوجود ہے اور یہ کلمہ "نہیں مگر وہی" زیادہ شامل، زیادہ لائق، اور زیادہ اخص ہے۔

(ج) آپ سمجھے کہ فردانیت، جو مخلوقات کے معراج کی انتہا ہے۔ وہ کیا شے ہے۔ یعنی خالق و مخلوق اور عبد و معبود میں کوئی دوئی باقی نہ رہے اور یہ نظریہ اس آفاقی مذہب کے تینوں نظریات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

امام غزالی کے بعد وحدت الوجود کا مسئلہ صوفیاء میں متفق علیہ قرار پا گیا۔ تاہم اس نظریہ کو بقائے دوام شیخ اکبر ہی کی کوششوں سے حاصل ہوا، چنانچہ آج تک صوفیاء میں یہ مسئلہ مسلّم چلا آ رہا تھا۔ تا آنکہ مجدد الف ثانیؒ نے اس سے اختلاف بھی کیا اور اس کی تردید بھی کی۔ جس کی وضاحت ہم آگے وحدت الشہود کے بیان میں کریں گے۔ سرِدست یہ کہنا مقصود ہے کہ آج بھی اکثر صوفیاء اس پر ایسے ہی ایمان رکھتے ہیں جیسے کہ ابنِ عربی اور ان کے خوشہ چینوں کا تھا۔ چنانچہ دورِ متاخرین کے صوفی حکیم الامۃ اشرف علی تھانوی اپنی تصنیف "امداد المشتاق ملفوظات امداد اللہ مہاجر مکی" (جو ان کے پیر ہیں) کے صفحہ "۱۱۰" پر ایک ایسے

بزرگ کا واقعہ درج فرماتے ہیں۔ جس نے وحدت الوجود کی اس تعبیر کو کہ کائنات کی ہر چیز خدا کا حصہ ہے۔ اور بلحاظ درجہ برابر ہے۔ پاخانہ (نجاست) کھا کر عملاً صحیح ثابت کر دکھایا۔ فرماتے ہیں :

" ۲۲۴ ، فرمایا کہ ایک موحد (یہاں موحد سے مراد وحدت الوجود کا قائل ہے) سے لوگوں نے کہا کہ اگر حلوا و غلیظ ایک ہیں، تو دونوں کھاؤ۔ انہوں نے بشکلِ خنزیر ہو کر گوہ کھا لیا۔ پھر بصورتِ آدمی ہو کر حلوا کھایا اس کو حفظِ مراتب کہتے ہیں، جو واجب ہے۔"

(حاشیہ) قولُہٗ : انھوں نے بشکلِ خنزیر ہو کر گوہ کھا لیا۔ اَقُولُ : اس معترض کی غباوت کے سبب اس کے تکلف و تصرف کی ضرورت پڑی۔ ورنہ جواب ظاہر ہے کہ یہ اتحاد مرتبۂ حقیقت میں ہے نہ کہ احکام و آثار میں۔"

ملاحظہ فرمائیے پیر و مرشد دونوں کا اس نظریہ پر کیسا پختہ ایمان ہے اور ان کی نظروں میں موحد وہ شخص ہے جو (۱) جو وحدت الوجود کا قائل ہو۔ لہٰذا حلال و حرام کی عقیدتاً تمیز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں (۲) وجودی حضرات اپنی شکل تبدیل کرنے پر بھی قادر ہوتے ہیں۔

نظریہ وحدت الوجود کی تاریخ

ہم پہلے یہ بتلا چکے ہیں کہ یہ نظریہ خود اسلام کے وجود میں آنے سے ہزارہا سال پہلے ہندوؤں کے اُپنشدوں میں موجود تھا اور ایک اقتباس بھی پیش کر چکے ہیں۔ آج سے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے کرشن نے، جو ہندوؤں کے سب سے بڑے اوتار مانے جاتے ہیں۔ (جیسے ہمارے ہاں منصور حلاج تھے، یا جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق خیال کیا گیا ہے) مہابھارت یعنی کورو اور پانڈوؤں کو اس کا اُپدیش دیا تھا، جو آج بھی گیتا کے صفحات میں موجود ہے۔ اس طرح یہ نظریہ دوسرے مذاہب میں بھی پایا جاتا تھا۔ تو جب عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں (یعنی دوسری صدی ہجری کے آخر میں) یونانی، لاطینی اور سنسکرت کی بے شمار کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہونے لگا تو ان کتابوں میں فلسفہ وحدت الوجود اور تصوف کے بیشمار مسائل پر بحث موجود تھی۔ انہی نظریات و مسائل سے ہمارے صوفیاء نے بھی متاثر ہونا شروع کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے پہلے ایسے زاہد قسم کے لوگوں کو زہاد، عباد یا صالحین کہا جاتا تھا۔ صوفی یا تصوف کے نام سے کوئی واقف نہ تھا اور فنِ تصوف کی اصطلاحات اور اسرار و رموز تو بہت بعد کی پیداوار ہیں۔

چنانچہ ہارون الرشید (۱۷۰ھ ۔ ۱۹۳ھ) کے دور کے بعد فلسفہ و منطق کے دوسرے مسائل و نظریات کی طرح گیان دھیان اور رہبانیت کے مسائل و نظریات بھی ہمارے صوفیاء میں داخل ہوئے۔

فلسفہ اور وحدت الوجود

ہم پہلے باب میں واضح کر چکے ہیں کہ وحی الٰہی سے بے نیاز ہو کر جب کبھی انسان نے محض اپنی عقل یا وجدان کے بل بوتے پر کائنات کا معمہ حل کرنے کی کوشش کی ہے تو اس میں ہمیشہ ٹھوکریں ہی کھائی ہیں۔ اب اتفاق کی بات ہے کہ وحدت الوجود کا مسئلہ عقل یا فلسفہ کا مسئلہ بھی ہے اور وجدان یا تصوف کا بھی۔ بالفاظِ دیگر یہ خالص مادہ پرستانہ فلسفہ بھی ہے اور صوفیاء کا روحانی مسئلہ بھی۔ اور ان دونوں کا اس مسئلہ پر اتحاد و اتفاق بھی ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود وحیِ الٰہی سے متصادم ہے۔

اب دیکھئے کہ! مادہ پرست کہتے ہیں کہ وجود ایک ہے جو ازلی ابدی ہے اور وہ مادہ ہے، جس کو فنا نہیں۔

اور وجودی کہتے ہیں: وجود ایک ہے جو ازلی ابدی ہے اور وہ اللہ ہے جس کو فنا نہیں۔ اسی طرح مادہ پرست کہتے ہیں کہ مادہ میں جو حرکت، تغیر و تبدل اور صور و اشکال پائی جاتی ہیں وہ مادہ کا طبعی خاصہ ہے اور وجودی کہتے ہیں کہ وجود میں جو حرکت، تغیر و تبدل اور صور و اشکال پائی جاتی ہیں، وہ اللہ کی تجلیات ہیں۔

اب اگر ہم اللہ کی جگہ مادہ اور تجلیات کی جگہ طبعی خاصہ کے الفاظ رکھ دیں، تو دونوں کے جواب بالکل ایک ہیں۔ پھر وجودی چونکہ کائنات کو اللہ کا عین یعنی اللہ ہی مانتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کائنات ہی ازلی و ابدی ہے یعنی قدیم ہے حادث نہیں۔ اور یہی مادہ پرست بھی کہتے ہیں۔

اور اس وحدت الوجود کے عین فلسفہ کا مسئلہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ کالجوں میں فلسفہ کے مضمون میں یہ مسئلہ بھی شاملِ نصاب ہے۔ چنانچہ حقیقتِ وحدت الوجود کے مصنف عبدالحکیم انصاری اس کتاب کے صفحہ ۱۱ پر ایک لطیفہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"میرے ایک دوست، جو فلسفہ کے ایم اے تھے، ایک دن مجھ سے وحدت الوجود پر گفتگو کر رہے تھے۔ جب میں نے ان کو ہر طرف سے لاجواب کر دیا۔ تو کہنے لگے کہ: "جو کچھ بھی ہو، مجھ کو تو اگر ایک سیکنڈ کے لئے بھی یقین آ جائے کہ میں خدا نہیں ہوں، تو میں فوراً مر جاؤں۔" میں نے جواباً کہا: "سبحان اللہ! آپ بڑے

اپ تھے خدا ہیں کہ آپ کو موت بھی آ سکتی ہے۔"

تصوف اور وحدت الوجود

بعینہٖ اسی طرح کا ایک دوسرا لطیفہ ایک صوفی کے متعلق اسی کتاب کے صفحہ ۶۰، ۶۱، پر تحریر کرتے ہیں:

"ہمارے ایک چشتیہ خاندان کے پیر بھائی تھے، جو صوفی جی کے نام سے مشہور تھے۔ وہ صاحب اجازت تھے اور ان کے بہت سے مرید بھی تھے۔ ایک دن میرے پاس آئے، تو ہم مل کر چائے پینے لگے۔ چائے پیتے پیتے صوفی جی کے چہرے پر کیفیت کے آثار نمایاں ہوئے۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں لال لال ڈورے اُبھر آئے۔ پھر کچھ نشہ کی سی حالت طاری ہوئی۔ یکایک صوفی جی نے سر اٹھایا اور کہنے لگے "بھائی جان! میں خدا ہوں۔" اس پر میں نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور اس کے دو ٹکڑے کر کے صوفی جی سے کہا: "آپ خدا ہیں، تو اسے جوڑ دیجئے۔" صوفی جی نے دونوں ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو ملا کر ان پر توجہ فرمائی، لیکن کیا بنتا تھا۔ ساتھ ہی اِن کی وہ کیفیت بھی غائب ہو گئی جس کی وجہ سے وہ خدائی کا دعویٰ کر رہے تھے۔"

"اس پر صوفی جی کہنے لگے، "پھر یہ آخر سب کچھ کیا ہے۔؟" میں نے پوچھا: "کیا؟" بولے کہ "یہی وحدت الوجود! میرے خیال میں تو یہ سب ایک کیفیت ہے، حقیقت نہیں ہے۔" میں نے کہا: "واقعی آپ نے پتہ کی بات کہی، وحدت الوجود ایک بہت بڑی کیفیت ہے، حقیقت نہیں ہے۔" صوفی جی نے کہا: "تو کیا حضرت ابنِ عربی جیسے عظیم الشان بزرگ نے بھی غلطی کی ہے۔" میں نے کہا: "ابنِ عربی نبی تو نہیں تھے، ولی ہی تھے اور اولیاء سے غلطی ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔" لیکن میرے خیال میں حق یہ ہے کہ انہوں نے غلطی نہیں کی بلکہ اُن کو غلط فہمی ہوئی جیسی کہ ابھی آپ کو اپنے بارے میں ہو گئی تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ کی کیفیت صرف چند لمحوں کے لئے تھی اس لئے غلط فہمی بھی چند لمحے رہی، لیکن ابنِ عربی چونکہ اپنے سلوک کے اختتام پر آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے۔ اس لئے ان کی غلط فہمی دُور نہ ہوئی۔"

یہ ہیں ذاتی تجربات و خیالات خواجہ عبدالحکیم انصاری نقشبندی، مجددی، توحیدی صاحب کے، جو بانی سلسلۂ عالیہ توحیدیہ ہیں اور جنہیں یہ بھی دعوےٰ ہے کہ وہ سلوک کی تمام منازل طے کر چکے ہیں۔

اسی طرح ایک دوسرے عبدالباری صاحب، سابق استاذ فلسفہ و دینیات عثمانیہ یونیورسٹی، جو تجدید تصوف و سلوک کے مصنف بھی ہیں اور مرتب بھی۔ وہ اس کتاب کے صفحہ ۱۶۲ پر لکھتے ہیں:

"راقم احقر پر کچھ تو ہمیشہ سے طبعاً عقلیت و تفلسف کا غلبہ رہا۔ پھر کڑوا کریلا نیم چڑھا کہ ساری عمر فلسفہ کے مطالعہ اور تعلیم و تعلم کا مشغلہ رہا۔ اور فلسفہ دراصل نام ہے وحدت الوجود ہی کی تاریخ کا۔ یعنی عالم کثرت کے بعد وحدت کو معلوم کرنے کی فکری و عقلی سعی و طلب کا، لیکن متعارف اور اصطلاحی وحدت الوجود کا نام زیادہ تر تصوف کے سلسلہ میں پڑھنے اور سننے میں آتا رہا"۔۔۔۔ حضرت مجدد تھانوی کی اس مجددانہ تحقیق و توثیق سے بڑا اطمینان ہوا کہ یہ مسئلہ دراصل ایک علمی و کلامی مسئلہ ہے اور اسلامی تصوف کا یہ کوئی خاص جز نہیں اور نہ اس اعتبار سے اس بحث کی کوئی اہمیت و حاجت رہ جاتی ہے کہ اسلامی تصوف میں یہ مسئلہ باہر سے داخل ہوا یا نہیں۔ بلکہ اس کی غالیانہ تعبیرات یقیناً بیرونی اثرات کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔"

پھر اسی کتاب کے صفحہ ۱۶۳ پر اپنے مرشد تھانوی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"مسئلہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود مسائل کشفیہ ہیں۔ ایسے ظنی و احتمالی مسئلہ کی کسی خاص تعبیر کو کھینچ تان کر قرآن و حدیث کی نصوص سے ثابت کرنے کی کوشش کرنا بڑی جسارت اور خطرہ کی بات ہے جس میں تحریف تک کا غلو لوگوں نے کیا۔" (حوالہ مذکورہ)

اشرف علی تھانوی اور ابن عربی کی تنزیہہ

اب دیکھئے کہ یہی مجدد علیہ الرحمۃ تھانوی جو تصوف و سلوک کی تجدید کرنا چاہتے ہیں اور علمائے کرام اور صوفیائے عظام کی راہوں میں افراط تفریط کی نشاندہی کر کے کچھ علماء کو سمجھانا چاہتے ہیں کچھ تصوف کے داغ دھونا چاہتے ہیں۔ وحدت الوجود اور شہود کے کشف کو ظنی اور غیر منصوص قرار دے رہے ہیں۔ پھر آخر اس بات کی کیا مجبوری تھی کہ آپ فصوص الحکم کی شرح خصوص الکلم محض اس خیال سے لکھنے بیٹھ گئے کہ جہاں جہاں قرآن و سنت کے خلاف واضح باتیں موجود ہیں ان کی تاویل کر کے ابن عربی کے دامن کو پاک کیا جا سکے۔ اس سلسلہ میں آپ نے سات سال تک محنت کی۔ طبیعت میں سخت انقباض پیدا ہوا اور بالآخر وہ کام نہ ہو سکا، تو ابن عربی کی تنزیہہ ہی چھاپ دی، کہ اسی کے خلاف شریعت اقوال کے مقابلہ میں اسی کے اقوال مطابق شریعت درج کر کے ابن عربی کی صفائی پیش کی جا سکے۔ اس نظریہ کے اثرات جو دنیائے اسلام پر مرتب ہوئے وہ تو سب کو معلوم ہیں۔ پھر بھلا ایسا شخص اس کرم فرمائی کا مستحق تھا؟ کیا یہ بات مجدد علیہ الرحمۃ کی جادۂ سلوک پر گامزن ہونے کی وجہ سے ابن عربی کی صریح جانبداری پر دلالت نہیں کرتی۔؟

اب اس کشفی، ظنی اور غیر منصوص مسئلہ کو قرآن و حدیث سے ثابت کرنے والوں کے دلائل بھی دیکھ لیجئے،

جنہیں مجدد صاحب خطرناک غلطی اور بڑی جسارت قرار دے رہے ہیں۔

وحدت الوجود پر شرعی دلائل

قرآنی دلائل

قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات سے یہ مسئلہ ثابت کیا جاتا ہے۔ ذرا غور سے ان کا مفہوم اور تاویلات ملاحظہ فرماتے جایئے:

۱۔ سب سے پہلے تو کلمۂ توحید لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه پر ہی ہاتھ صاف کیا جاتا ہے اور اس کے معنی یہ کیے جاتے ہیں کہ "نہیں کوئی معبود مگر وہ اللہ ہی تو ہے۔" یعنی "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کے بجائے "لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اللّٰه" کا مفہوم بیان کیا جاتا ہے۔ بس اب معاملہ ہی صاف ہے۔ کسی بُت کو سجدہ کر دیا یا درخت یا کسی پتھر یا سورج کو، جسے بھی سجدہ کرو گے وہ اللہ ہی ہے کیونکہ اللہ ہی کا حصہ ہے۔

۲۔ اسی طرح آیت "وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ" (۲۳/۱۷) کا واضح مفہوم تو یہ ہے کہ "تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرنا"، کا مفہوم یہ لیا گیا کہ تم جس کی بھی عبادت کرو، وہ وہی تو ہے۔

۳۔ اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (۲/۱۱۵) تم جس طرف بھی منہ کرو گے اسی طرف اللہ ہے۔

اس آیت کے معنی خواجہ حسن سنجری اپنی زبان میں یوں فرما رہے ہیں:

کافراں سجدہ کہ بروئے بُتاں می کردند ہمہ اُو سوئے تو بود ہمہ سوروئے تو بود

یعنی کافر جو بتوں کو سجدہ کرتے ہیں، تو ان کا منہ تیری طرف ہوتا ہے، کیونکہ ہر طرف تیرا ہی چہرہ ہوتا ہے

اب دیکھئے! جب ذہن اس قدر ٹیڑھا اور دور از کار تاویلات پر آمادہ ہو جائے، تو پھر سارے قرآن سے ہی سب کچھ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کی چند آیتیں اور بھی پیش کی جاتی ہیں مثلاً

۴۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ (۵۷/۳) وہی اوّل ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے۔

اس کے معنی بھی وجودی حضرات یہی لیتے ہیں کہ وجود صرف ایک ہے اور وہ اللہ ہے، جو باطن میں تو اللہ ہے اور ظاہر میں موجودات و مخلوقات۔

---

[۱] حقیقت وحدت الوجود، خواجہ عبدالحکیم انصاری۔

۵- اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

یعنی اللہ ہی کی وجہ سے تمام کائنات منور ہے۔ یہی معنی مفسرین نے کئے ہیں۔ وجودی اس کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ آسمان وزمین اللہ ہی کا نور یا اس کی تجلیات ہیں اور ان تجلیات ہی سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے۔

۶- وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ — میں نے آدم میں اپنی روح سے پھونکا

وجودی اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ خدا نے اپنی روح آدم میں پھونک کر فرشتوں کو سجدہ کروایا، تو وہ انسان گویا خدا ہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر تمام جانداروں میں اللہ تعالیٰ اپنی روح کے حصے پھونکتے جائیں تو ایسے خدا کا تصور اسلام میں کہیں موجود ہے؟ اس کا صحیح مفہوم ہم انشاء اللہ روح کی بحث میں بیان کریں گے۔

اور عبدالکریم جیلی صاحب اس وحدت وحلول کا فلسفہ اپنی زبان میں یوں فرما رہے ہیں:

"حلِ اشکال کی صورت یہ ہے کہ جب حق سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے کسی اسم یا صفت سے بندہ پر متجلّی ہونا چاہتا ہے، تو اس بندہ کو فنا کر دیتا ہے۔ ایسی فنا کہ اس کو اپنے نفس سے معدوم کر ڈالتا ہے اور وجود سے اُس کو سلب کر لیتا ہے۔ پھر جب نورِ عبدی مٹ جاتا ہے اور روحِ خلقی فنا ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ بندہ کی ہیکل میں بدوں حلول (لفظ حلول سے غالباً مصنف صاحب کو چڑ ہے جو بدوں حلول فرمایا، ورنہ بحث تو حلول ہی کی چل رہی ہے جو حلِ اشکال سے شروع ہوئی ہے۔ مؤلف) اپنی ذات کا ایک لطیفہ اس چیز کے بدلے قائم کر دیتا ہے جو اس سے اُس نے چھینی ہے اور وہ لطیفہ اس بندہ سے نہ جدا ہوتا ہے نہ اس سے منفصل۔ اس لئے کہ اپنے بندوں پر اُس کا تجلی کرنا بطور اُس کے فضلِ وجود کے ہے اگر وہ اس کو فنا کر کے اس کا عوض اُن کو نہ دے تو یہ ایک قسم کا عذاب ہے۔ جو شایانِ شانِ باری نہیں۔" (انسان کامل، ص ۱۰۹)

حدیث سے دلائل

اب احادیث کی طرف آئیے!

اتحاد وحلول جیسے مشرکانہ عقائد کے حق میں جو حدیث بڑے زور وشور سے پیش کی جاتی ہے وہ بخاری کی درج ذیل قدسی حدیث کتاب الرقاق میں مذکور ہے۔ جسے ہم علامہ وحیدالزمان صاحب تیسیرالباری کے ترجمہ اور حاشیہ کے ساتھ بلاکم وکاست پیش کرتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ — آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ جل جلالہٗ ارشاد

اِنَّ اللّٰهَ قَالَ: مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ — فرماتا ہے جو شخص میرے کسی ولی سے دشمنی رکھے۔ میں

اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَيَّ عَبْدِيْ — اس کو یہ خبر کئے دیتا ہوں کہ میں اس سے لڑوں گا اور

بِشَیْءٍ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ کُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّذِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّذِیْ یَمْشِیْ بِهَا وَاِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ وَلَئِنْ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَیْءٍ اَنَا فَاعِلُهٗ تَرَدُّدِیْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ یَکْرَهُ الْمَوْتَ وَاَنَا اَکْرَہُ مَسَاءَتَهٗ

(بخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع)

میرا بندہ جن جن عبادتوں سے میرا قرب حاصل کرتا ہے ان میں سے کوئی عبادت مجھ کو اس سے زیادہ پسند نہیں ہے جو میں نے اس پر فرض کی ہے اور میرا بندہ (فرض ادا کرنے کے بعد) نفل عبادتیں کر کے مجھ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ میں اسے محبت کرنے لگتا ہوں، پھر تو یہ حال ہوتا ہے کہ میں ہی اس کا کان ہوتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہوتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہوتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہوتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے[1] اگر مجھ سے کچھ مانگتا ہے، تو میں اس کو دیتا ہوں، وہ اگر کسی (دشمن یا شیطان) سے میری پناہ چاہتا ہے، تو اس کو محفوظ رکھتا ہوں[2] اور مجھ کو کسی کام میں، جس کو میں کرنا چاہتا ہوں، اتنا تردد نہیں ہوتا۔ جتنا اپنے مسلمان بندے کی جان نکالنے میں ہوتا ہے وہ تو موت کو (بوجہ جسمانی تکلیف) برا سمجھتا ہے اور مجھ کو بھی اس کو تکلیف دینا برا لگتا ہے۔

گویا جو حدیث اپنے دعوے کے اثبات میں پیش کی جاتی ہے اسی میں اس کا رد ہے اور جس حصے میں رد ہے وہ عموماً پڑھی بھی نہیں جاتی۔

۲۔ دوسری حدیث جس سے وحدت الوجود کا استدلال کیا جاتا ہے۔ وہ حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ یعنی میں (اللہ) اپنے بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق سلوک کرتا ہوں۔ وجودی

---

[1] اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ بندہ عین خدا ہو جاتا ہے جیسے معاذ اللہ حلولیہ اور اتحادیہ کا دعویٰ ہے۔ کہاں خدا اور کہاں بندہ، بلکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ میری عبادت میں غرق ہو جاتا ہے اور مرتبہ محبوبیت پر پہنچتا ہے، تو اس کے حواس ظاہری اور باطنی سب شریعت کے تابع ہو جاتے ہیں۔ وہ ہاتھ، پاؤں، کان، آنکھ سے وہی کام لیتا ہے جس میں میری مرضی ہے۔ خلاف شریعت اس سے کوئی کام سرزد نہیں ہوتا۔ [2] اس فقرے سے حلولیہ اور اتحادیہ کا رد ہو گیا۔ اگر بندہ عین خدا ہو جاتا تو پھر دعا قبول کرنے اور پناہ دینے کے معنی نہیں بنتے۔ (وحید الزمان)

کہتے ہیں کہ اگر ہم کسی بت کو بھی یہ گمان کر کے پوجیں کہ فی الحقیقت ہم اللہ کو پوج رہے ہیں، تو وہ اس حدیث کی رُو سے اللہ ہی کو سجدہ ہوگا۔ یہ ایسا استدلال ہے، جو ساری اسلامی تعلیم کے خلاف ہے اور اس کے لئے کوئی قرینہ بھی نہیں۔

حدیث کا مطلب صاف ہے کہ خوف اور اُمید میں سے جس پہلو کا انسان اللہ سے زیادہ ظن رکھے گا۔ خدا اس سے ویسا ہی برتاؤ کرے گا، لیکن یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ کسی ایک پہلو سے انسان یکسر غافل رہے۔ بموجب ارشادِ باری تعالیٰ یَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا (۳۲/۱۶) پھر خوف اور طمع یا بیم و رجا میں سے جونسا پہلو انسان کی طبیعت پر غالب رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے ایسا ہی معاملہ کریں گے۔

۳۔ تیسری حدیث جس سے اولیاء کا علمِ غیب ثابت کیا جاتا ہے وہ ہے اِتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ یعنی مومن کی فراست سے بچو، کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اس حدیث میں کئی باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ مثلاً:

۱۔ یہ حدیث جملہ مومنین سے متعلق ہے، لیکن حضرات صوفیہ اس حدیث کا مصداق وہ اولیاء اللہ بتلاتے ہیں جن کی تعداد بھی ان کے ہاں مقرر ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے دینِ طریقت کا باطنی نظام)

۲۔ فراست کے معنی غیب دانی یا اشراف و انکشاف نہیں، جیسا کہ یہ اتحادی اور وجودی سمجھتے ہیں بلکہ اس کے معنی کسی کے ظاہری احوال و آثار کو دیکھ کر اس کے باطن کا حال سمجھنا ہے۔ علم قیافہ و فراست مشہور لفظ ہے۔

۳۔ نور سے مراد، نورِ ایمان ہے۔ جیسا کہ حدیث میں لفظ 'مومن' آیا ہے۔ اس سے مراد صفائی قلب کے وہ طریقے نہیں، جن کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔

اس کے علاوہ کئی وضعی احادیث اور صوفیاء کے احادیث سے ملتے جلتے مقولے مثلاً مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بھی اس ضمن میں پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ علمی اعتبار سے ایسی چیزوں کا کوئی مقام نہیں۔ لہٰذا بغرضِ اختصار یہاں ہم انہیں نظر انداز کر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ مناسب مقامات پر انشاء اللہ پیش کیے جائیں گے۔

۳۔ وحدت الشہود

ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ اسلام میں دینِ طریقت کے نظریات دو راستوں سے داخل ہوئے تھے پہلا راستہ تو عبداللہ بن سبا یہودی کی باطنی تحریک کا تھا، جو کہ درویشی کے رنگ میں ہی سامنے آیا تھا اور یہودیوں میں رہبانیت کے جو طرق و عقائد تھے وہ سب اس نے مسلمان مریدوں میں داخل کر دیئے چنانچہ پروفیسر سلیم چشتی اپنی کتاب "اسلامی تصوف" میں اسی ماخذ پر زیادہ سے زیادہ زور صرف کرتے ہیں، لیکن اس بات سے بھی مجالِ انکار نہیں کہ اسلامی تصوف اس سے زیادہ متاثر ان تراجم سے ہوا، جو ہارون الرشید اور مامون الرشید کے زمانہ میں یونانی، لاطینی اور سنسکرت کی کتابوں کے کئے گئے۔ جن میں گیان دھیان اور مادی فلسفہ سب کے اصول مندرج تھے۔

وحدتُ الوجود اور وحدتُ الشہود میں فرق

وحدتُ الشہود کی اسلام میں درآمد کی تاریخ پر بحث کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں نظریات اور عقائد کا فرق واضح کر دیا جائے۔ مختصر الفاظ میں اس فرق کو یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ وحدتُ الوجود سے مراد "ہمہ اوست" ہے اور وحدت الشہود سے "ہمہ از اوست" اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ وجودی صرف ایک وجود کے قائل ہیں کہ خدا ہی کائنات اور اس کی ہر چیز ہے اور کائنات اور اس کی ہر چیز ہی خدا ہے۔ لیکن شہودی خدا کی ہستی کو ایک مستقل بالذات ہستی اور کائنات سے علیحدہ قرار دیتے ہیں اور کائنات کو خدا کا ظل، سایہ یا پرتو قرار دیتے ہیں۔

اب اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ جس طرح سایہ مناسب وقت پر دھوپ یا نور میں گم ہو جاتا ہے اسی طرح انسان بھی روحانی ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا مناسب وقت پر اللہ کی ذات میں گم ہو جاتا ہے اور ایسے عیسائی راہبوں کے اقتباس ہم پہلے پیش کر چکے ہیں جو اپنے آپ کو خدا کی ذات میں گم کر رہے تھے۔ اب دیکھئے کہ گو بظاہر شہود کا نظریہ وجودی نظریہ سے کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن نتائج کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ وحدت الوجود کا نظریہ خود اللہ تعالیٰ کو انسان کے جسم میں اتارتا ہے اور شہود کا نظریہ انسان کو بلند کر کے اللہ کی ذات میں داخل یا مدغم کرتا ہے حالانکہ وہ انسان اسی دنیا میں موجود ہوتا ہے کہیں ساتوں آسمانوں سے ماوراء ہستی سے نہیں جا ملتا۔ وجودی نظریہ حلول کے ذریعہ انسان کو خدا بناتا ہے۔ لیکن شہودی نظریہ اپنے

مخصوص نظریہ سے انسان کو خدا بناتا ہے۔ گویا نتیجہ کے لحاظ سے دونوں انسان کو خدا بنانے کے لحاظ سے ایک ہی جیسے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے عیسائیوں کے اس عقیدہ کو صریح کفر قرار دیا اور فرمایا:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ (۵/۷۳)

بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں، جو اس بات کے قائل ہیں، کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے۔

عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام خدا کی ذات میں یوں مدغم ہوتے ہیں کہ تینوں الگ الگ بھی خدا ہیں اور تینوں مل کر بھی ایک ہی خدا بنتا ہے اور یہ عقیدہ کا ایسا گورکھ دھندا ہے جسے سمجھانے سے خود عیسائی پادری بھی لاچار اور اس لاچاری کے معترف ہیں وجہ یہ ہے کہ وحدت الشہود خالصتاً دینِ طریقت کا جزو ہے اور بموجب آیاتِ بالا صریح کفر ہے تو آخر کفر اور شریعتِ الٰہی کا اتحاد کیسے ممکن ہو؟

ہندومت وحدت الشہود کے تصور کو آتما، مہاتما اور پرماتما کی اصطلاحوں سے پیش کرتا ہے۔ آتما بمعنی روح ہے اور مہاتما، بزرگ روح جو بہت زیادہ روحانی مدارج طے کر چکی ہو، جیسے مہاتما گاندھی، مہاتما بدھ وغیرہ۔ پھر روحانی ترقی کا اگلا درجہ یہ ہے کہ مہاتما، مزید روحانی ترقی کر کے پرماتما (سب سے بڑی اور بزرگ روح یعنی خدا) سے مل جائے بس اسی صورت میں انسان کی نجات ممکن ہے ورنہ روح تا ابد "آواگون" یا تناسخ (جس کی تفصیل آگے آئے گی) کے چکر میں بھٹکتی رہتی ہے۔

اور مسلمان صوفیاء نے اپنے سلوک کی مندرجہ ذیل سات منازل مقرر کر رکھی ہیں:

۱۔ طلب ۲۔ عشق ۳۔ معرفت ۴۔ استغناء ۵۔ توحید ۶۔ حیرت

۷۔ فقر و فنا یا فنائے اتم۔ (مرشدِ کامل، ترجمہ: حدائق الاخیار، مصنفہ: صادق فرغانی[1]، ص ۱۲۷ تا ۱۳۳)

گویا ساتویں منزل یا سیر الی اللہ کی آخری منزل پر جا کر انسان یا سالک فنا فی اللہ یا واصل باللہ یا واصل بحق ہو جاتا ہے، تاہم یہ ساتویں منزل سلوک کی آخری منزل نہیں۔ اس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہو جاتی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں اور یہی فلسفہ ہندومت یا عیسائیت بھی پیش کرتی ہے۔

وحدت الشہود کی تاریخ

وحدت الوجود کی طرح گو یہ نظریہ بھی دوسری صدی ہجری کے اواخر میں اسلام میں درآمد ہو گیا تھا، تاہم منصور حلاج نے وجودی نظریہ کو جو استحکام

---

[1] ابن اکبر کی طرح صادق فرغانی کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ اس نے اس کتاب کے مندرجات کشف میں رسول اللہ ﷺ پر پیش کئے اور ان کی تصحیح کے بعد شاملِ کتاب کئے ہیں۔

بخشتا۔اس کی وجہ ہے یہ نظریہ ، دبا رہا۔ اسلامی تاریخ میں پہلے شخص ہمیں ابو اسمٰعیل ہرویؒ[1] (م ۴۸۱ھ) نظر آتے ہیں جنہوں نے یہ فلسفہ تحریری طور پر پیش کیا۔ پھر اس کے بعد علاؤ الدولہ سمنانی (م ۷۳۶ھ) نے اس نظریہ کو آگے بڑھایا، لیکن امام غزالی اور ابنِ اکبر جیسے فلاسفروں اور متصوفین کی تبلیغ کے مقابلے میں شہودی نظریہ ناقابلِ التفات ہی سمجھا جاتا رہا۔ تاآنکہ گیارھویں صدی ہجری میں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے اس نظریہ کی آبیاری کی اور اسے پروان چڑھایا۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں :

"پہلے میں بھی وحدت الوجود کو مانتا تھا، لیکن جب میں نے آگے ترقی کی، تو وحدت الوجود کی کیفیت مجھے بہت ادنیٰ نظر آئی اور مجھے یہ یقین حاصل ہوا کہ مخلوق خالق کا ظل ہے۔ مجھ پر اصل حقیقت کھلی اور مجھے معلوم ہو گیا کہ خدا، خدا ہے اور مخلوق، مخلوق۔ دونوں الگ الگ وجود ہیں۔" (حقیقت وحدت الوجود، ص ۱۸، مصنفہ عبدالحکیم انصاری)

اب ایک دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ فرمالیجیے، جو ذرا مفصل ہے۔ شیخ مجدد اپنے باطنی ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"میں پہلے وحدت الوجود کا معتقد تھا۔ کیونکہ بچپن ہی سے اسے بربنائے استدلال عقلی جانتا تھا اور اس کی صداقت کا کامل یقین تھا، لیکن جب راہِ سلوک اختیار کی، تو پہلی مرتبہ وحدت الوجود ایک ادراک روحانی کی حیثیت سے متحقق ہوئی اور میں نے برائے العین اس کا مشاہدہ کر لیا۔ عرصہ تک اس مقام میں رہا اور تمام معارف، جو اس مقام سے متعلق ہیں وہ مجھے حاصل ہو گئے۔" (مکتوبات امام ربانی، دفتر اول، مکتوب نمبر ۳۱، بحوالہ حضرت مجدد کا نظریۂ توحید، ص ۷۰)

بعد ازاں ایک بالکل نیا روحانی ادراک میری روح پر غالب آگیا اور میں نے پایا کہ میں آئندہ وحدت الوجود کو نہیں مان سکتا۔ تاہم مجھے اپنے کشف کے اظہار میں تامل تھا۔ کیونکہ میں عرصہ دراز تک وحدت الوجود کا معتقد رہا تھا۔ آخر کار مجھے اس کا انکار بصراحتِ تمام لازم آپڑا اور مجھ پر منکشف ہو گیا کہ وحدت الوجود ایک ادنیٰ مقام ہے اور میں ایک بالاتر مقام پر پہنچ گیا ہوں، یعنی ظلیت پر۔ اگرچہ میں ابھی تک دراصل وحدت الوجود کے انکار پر راضی نہ تھا کیونکہ تمام بڑے بڑے متصوفین نے اسے مانا تھا، لیکن اب اس کا انکار ایک ناگزیر واقعہ ہو گیا تھا۔ بہرکیف میری آرزو تھی کہ میں ظلیت پر ہی رہوں کیونکہ ظلیت کو وحدت الوجود سے ایک انسبیت تھی۔ میں اس میں اپنے

---

[1] ابو اسمٰعیل عبداللہ ہروی کی کتاب منازل السائرین تصوف کی اُمہاتِ کتب میں شمار ہوتی ہے۔

تئیں اور اس عالم کے تئیں خدا کا ظلّ محسوس کرتا تھا، لیکن فضلِ خداوندی دستگیر ہوا اور میں اعلیٰ ترین مقام یعنی مقامِ عبدیت پر فائز ہو گیا۔ تب میں نے پایا کہ عبدیت تمام دوسرے مقامات سے بالاتر ہے اور مجھے مقامِ وحدت الوجود یا ظلیت میں رہنے کی آرزو پر ندامت ہوئی۔" (مکتوبات دفتر اول مکتوب نمبر ۱۶۰۔ بحوالہ حضرت مجدد کا نظریۂ توحید، ص ۱۷۰)

پھر مجدد صاحب کشف کی حقیقت اور اس کے غیر یقینی ہونے کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

"کشف سے جو ظاہر ہوتا ہے وہ شہود ہی شہود ہے اور حقیقت نہیں بلکہ غایت فی الباب یہ ہے کہ خدا کا شہود ہو ہی نہیں سکتا۔ پس ایمان بالغیب کے سوا چارہ نہیں اور ایمان بالغیب اس وقت میسر آتا ہے۔ جب وہم و خیال اپنی سعی سے عاجز آجائیں اور متخیلہ کچھ باقی نہ رہے یعنی متحقق ہو جائے کہ وہ ذات ہماری دسترس سے بالاتر ہے اور ہمارے حیطہ ادراک و عقل سے ماوراء ہے۔" (مکتوبات دفتر ۲، مکتوب نمبر ۹، بحوالہ حضرت مجدد کا نظریۂ توحید، صفحہ نمبر ۹۵)

مندرجہ بالا اقتباسات سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱ مجدد صاحب کے نزدیک سلوک کی تین منازل ہیں جو انہوں نے طے کیں۔

(i) وحدۃ الوجود، جہاں سالک خدا، انسان اور کائنات سب کو ایک ہی ذات سمجھتا ہے۔

(ii) اس سے اگلا درجہ وحدۃ الشہود کا ہے۔ جہاں سالک خدا اور انسان میں ثنویت محسوس کرنے لگتا ہے مگر صرف اس حد تک کہ خدا قائم بالذات ہے اور باقی چیزیں اس کا سایہ یا ظل ہیں اور

(iii) اس سے اگلا مقام یہ ہے کہ خدا اور کائنات میں ثنویت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے۔ سالک یہ سمجھنے لگتا ہے۔ خدا الگ ہے، کائنات الگ۔ صرف سایہ کے لحاظ سے نہیں، بلکہ مستقل وجود کے لحاظ سے اور یہی مقامِ عبدیت ہے۔

۲۔ آپ کے زمانہ تک نظریہ وحدت الوجود کی متصوفین پر اس قدر گہری چھاپ تھی کہ کوئی اس کے خلاف کہنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ اس کی وجوہ دو تھیں۔ ایک اپنے پرانے عقیدہ سے محبت، دوسرے اپنے بزرگوں کا احترام۔

۳۔ کشف، بہرحال کشف ہی ہے، حقیقت نہیں، چار و ناچار ہمیں وحی الٰہی یا ایمان بالغیب کے سایۂ عاطفت ہی پناہ لینی پڑتی ہے۔

اب دیکھئے کہ مجدّد صاحب نے اتنی محنتِ شاقہ کے بعد جو سربستہ راز تلاش کیا ہے کیا یہ خُدا نے ہمیں بغیر کسی محنت اور دماغ سوزی کے بذریعہ انبیاء ابتداء سے ہی نہیں بتلا دیا تھا۔ قرآن میں جو یہ آیت ہے کہ:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (۶/۱۰۴) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔

اس میں عین کی بجائے بصر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ 'عین' ظاہری آنکھ کے لئے آتا ہے اور 'بصر' ظاہری اور باطنی یا قلبی ہر دو آنکھوں کے لئے آتا ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نہ تم عقل و فلسفہ کی رُو سے خدا کی کنُہ کو پا سکتے ہو اور نہ وجدان و مشاہدہ و کشف کے ذریعے۔ پھر یہ بھی تبلا دیا کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کوئی چیز اس کے مثل نہیں۔

اس آیت میں انسان کے تخیّل و واہمہ کو چیلنج کیا گیا ہے کہ وہ بھی خدا کا تصوّر پیش نہیں کر سکتا۔

سچ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (۶۹۱) ان لوگوں نے (انبیاء کی ہدایت کو قابلِ اعتنا نہ سمجھ کر) خدا کی قدر جیسے جاننی چاہیئے تھی، نہ جانی۔

پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ مجدّد صاحب نے اتنی ریاضت اور محنتِ شاقہ کے بعد جس عبدیت کے مقام کا اظہار کیا ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس قدر محنتِ شاقہ اور تزکیۂ نفس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ تو مجھے اور مجھ جیسے گنہگاروں سب کو حاصل ہے۔ حسبِ ارشادِ باری تعالیٰ:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اے (پیغمبر! میری طرف سے لوگوں کو کہہ دو کہ اے) میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔

یہ الگ بات ہے کہ مجھ گنہگار کا عبدیت کے لحاظ سے مقام الگ ہے، مجدّد صاحب کا بہت اونچا، اور حضورِ اکرم ﷺ کا سب سے اونچا، مگر عبد ہونے میں تو مجالِ انکار نہیں ہو سکتا۔

وجود اور شہود کی ایک دوسرے انداز سے تحقیق

اب اسی طرح ایک اور صاحب ہیں خواجہ عبدالحکیم انصاری، نقشبندی، مجدّدی، توحیدی، بانی سلسلہ عالیہ، توحیدیہ اور مصنف کتاب "حقیقت وحدۃ الوجود" جن کے کچھ اقتباس

ہم پیش کر چکے ہیں۔ گو یہ اتنی معروف شخصیت تو نہیں تاہم اُن کا دعوٰے ہے کہ وہ بھی ذاتِ بحت تک یا حریم کبریا تک مشاہدہ کر آئے ہیں۔ یہ بزرگ سلوک کی منازل، روح اور خدا کی ذات وصفات بیان کرنے میں منفرد نظر آتے ہیں۔ ان کے خیالات کے مطابق سالک کی روحانی پرواز کی پہلی منزل دوزخ ہے، جو ہماری زمین سے متصل ہے اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں:

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى — اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں مگر اسے (جہنم) پر سے گزرنا ہوگا
رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (۱۹/۷۱) — اور یہ تمہارے پروردگار پر لازم ومقرر ہے۔

لہٰذا کوئی بھی روح (زندگی میں یا مرنے کے بعد) جب اوپر کو پرواز کرے گی تو یہاں سے گزرنا ہوگا۔ اگر روح گنہگار ہوگی تو بس اُس میں رہ جائے گی تا آنکہ جل کر اور لطیف ہو کر پرواز کے قابل نہ ہو جائے۔ وہ اس دوزخ کو زمین ہی کی مثل قرار دیتے ہیں جس میں کہیں لق ودق صحرا ہیں، کہیں ریگستان، کہیں کڑوے اور گرم چشمے اور کہیں آتش فشاں پہاڑ۔

پھر اس کے بعد اعراف ہے۔ پھر جنت کے طبقات شروع ہو جاتے ہیں، جو بہ ترتیب اس طرح ہیں عالمِ ملکوت، دوسرا جبروت، تیسرا لاہوت، چوتھا ہاہوت اور پانچواں ہو۔ دوزخ کے طبقات سے عالمِ ہو کے آخر تک عالمِ مثال کہلاتا ہے۔ اس کے بعد عالمِ اَمر ہے جس میں بے شمار لطائف ہیں۔ پہلے لطیفہ عدم ہے پھر لطیفہ نفس، پھر لطیفہ عقل اور پھر لطیفہ رُوح۔ ان لطائف سے آگے ماورائے عرش کا علاقہ ہے، پھر عرشِ مجید ہے جس کے عین مرکز میں سالک کو ذاتِ بحت کا مشاہدہ اور عرفان ہوتا ہے اسی جگہ سالکِ رُوح کا سفر ختم ہو جاتا ہے اور وہ عارفِ کامل اور ولیٔ مکمل بن جاتا ہے۔ (ص ۹۰)

خدا کے متعلق ان کا تصور یہ ہے کہ:

"روح کا سفر مادی عالم یعنی کرۂ زمین سے شروع ہو کر عرشِ کبریا پر اس جگہ ختم ہوتا ہے جہاں سالک کو اللہ تعالےٰ کی ذاتِ بحت کا عرفان ہوتا ہے۔ جن میں نہ کوئی رنگ ہے، نہ بُو ہے، ——— نہ کوئی صفت ہے اور جس کی بابت وہ خود قرآن میں ارشاد فرماتا ہے:

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ — پاک ہے، وہ ذات تمام صفات سے۔
عَمَّا يَصِفُوْنَ (۳۷/۱۸۰) (ترجمہ از موصوف)

ملاحظہ فرمائیے! اپنے مسلک کی تائید میں آیت کے ترجمہ کا کیسا ستیاناس کیا گیا ہے۔ یہ آیت یا اس

جیسی اور تین چار جگہ پر آیات ہیں، سب میں کافروں اور مشرکوں کی ایسی بات کا رَد فرمایا گیا ہے، جو صفاتِ الٰہی کے منکر تھے لیکن یہاں اس کو خدا ہی کی ذات و صفات کے رَد میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مزید طرفہ یہ کہ اس مسلک کی تائید میں ایک اور "آیت" پیش کی گئی ہے، جو سرے سے قرآن میں موجود ہی نہیں۔ اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ اور اس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے: "وہ جیسا تھا، ویسا ہی ہے اور ویسا ہی رہے گا۔" (ص ۶۹) لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ اپنے مسلک کی تائید میں قرآن کے ساتھ اس قدر زیادتی۔

اور رُوح کے متعلق اِن کا نظریہ ہے کہ وہ ایک روحانی شعاع ہے۔ جس کا ایک سرا تو عالمِ امر میں ہے اور دوسرا انسان کے دماغ میں پیوست ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ:

وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِھَا (۱۱/۵۶) گویا کوئی جاندار ایسا نہیں، جس کو اللہ نے اس کی چوٹی سے نہ پکڑ رکھا ہو۔

اب یہ روحانی سیر یا سلوک اسی شعاع کی راہ پر ہوتا ہے، گویا یہی صراطِ مستقیم ہے اور ہر شخص کا یہ صراطِ مستقیم الگ الگ ہے۔ (اقتباس، ص ۵۹)

وحدت الوجود اور شہود کے بارے میں ان کا نظریہ ہے کہ ابنِ عربی جب عالمِ ہاہوت کے بعد عالمِ ہُو میں داخل ہوئے تو ان کو ایسی فرحت اور سکون ہوا کہ بس یہیں کے ہو کر رہ گئے اور سمجھے کہ یہ (ہُو) ذاتِ احدیت ہے اور یہیں سے تمام شعاعیں نکل کر عالمِ مادی تک پہنچ کر متشکل ہوتی اور جامد شکل اختیار کر رہی ہیں تو انہوں نے دعویٰ کر دیا کہ وجود ایک ہے اور وہی خدا ہے اور بالکل یہی نظریہ مادہ پرستوں کا بھی ہے۔ لیکن مجدد الف ثانیؒ کچھ عرصہ یہاں رہ کر "ہُو" کے اوپر والے کنارے پر پہنچے، تو وحدت الوجود کے منکر ہو گئے اور سمجھے کہ مخلوقات خدا کا ظل (سایہ) ہے۔" (اقتباس، ۱۰۶، ۱۰۷)

ہم حیران ہیں کہ صوفیاء کا طبقہ کشف کو غیر یقینی قرار بھی دیتا چلا جاتا ہے۔ پھر بھی انہی عقائد و نظریات کو صحیح ثابت کرنے اور حرزِ جان بنائے رکھنے پر مُصر بھی ہے۔ یہ بزرگ بھی نظریۂ وحدت الوجود کا بطلان یا تردید نہیں کرتے، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ابنِ عربی کو غلط فہمی ہوئی اور مجدد صاحب تو اس "ہُو" کے مقام سے آگے نکل گئے تھے۔ اس غلط فہمی کا آپ نے ذکر نہیں فرمایا۔ جسے مجدد صاحب نے خود ایک کیفیت سے تعبیر کیا ہے۔ حقیقت سے نہیں۔

متاخرین میں ایک صُوفی توکل شاہ انبالوی (م ۱۳۱۸ھ) نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے علیٰ وجہ البصیرت

نظریۂ وحدت الوجود کو غلط قرار دے کر وحدت الشہود کو اپنایا، وہ فرمایا کرتے تھے کہ:

"جب وحدت الوجود کے حالات و واقعات کا انکشاف ہوا، تو وحدت کا ایک بحرِ بیکراں نظر آیا۔ اپنا وجود اس بحرِ بیکراں کا قطرہ معلوم ہوتا تھا اور ہر طرف وحدت ہی وحدت کا عالم نظر آتا تھا۔ جب یہ حالت ہوتی تو ہم اپنے جسم میں سوئیاں چبھوتے اور جب اس طرح کرنے سے تکلیف ہوتی، تو خیال آتا کہ اللہ تعالیٰ تو تمام تکلیفوں سے منزا ہے۔ اگر تو (یعنی توکل شاہ) خدا ہے تو تجھے تکلیف کیوں ہوتی؟ اور اگر سوئی چبھنے سے بھی تکلیف نہ ہوتی تو آگ کا دہکتا ہوا انگارہ بدن پر رکھتے تھے۔ جب جلنے سے تکلیف ہوتی، تو پھر وہی خیال آتا تھا کہ اس آگ نے تجھے کیوں جلایا؟ اللہ تعالیٰ کی ذات تو ان تمام کیفیات سے مبرا ہے۔ پھر عاجزی اور انکساری سے بارگاہ ایزدی میں دعا کرتے کہ میری مدد فرما اور میرے حال پر رحم فرما کہ میں تیری نماز ادا سکوں۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مالک الملک نے اس بحرِ بےکنار سے پار نکال کر شاہراہِ شہود پر ڈال دیا۔ پہلے ہم اسی حالت کو بڑا مقام سمجھتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وجود سے آگے شہود کی منزل ہے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۲۴۴)

شاہ ولی اللہ اور وجود و شہود

ایک اور بزرگ ہستی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں۔ ہم مجدد الف ثانی کی طرح ان کی دینی خدمات کے بدل وجان معترف ہیں اور ان بزرگوں کے حق میں تہہ دل سے دعا نکلتی ہے لیکن شاہ صاحب مذکور جہاں عالم محدث اور فقیہہ ہیں وہاں متصوف بھی ہیں۔ انہوں نے ایک رسالہ بنام "فیصلہ وحدۃ الوجود والشہود" لکھا۔ جس میں صرف ابن عربی اور مجدد صاحب کے نظریات کو تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ وحدت الوجود یا شہود کی تردید یا بطلان کی جرأت نہیں ہوئی بلکہ حقیقتاً دیکھا جائے تو مجدد الف ثانی کے نظریۂ توحید کی مقبولیت کے باوجود شاہ صاحب کا ذہن نظریۂ وحدت الوجود کی حقانیت کی طرف مائل رہا اور تطبیق یوں دی گئی کہ وحدت الوجود کے نظریہ میں وحدت الشہود کا نظریہ پہلے ہی شامل ہے اور نزاع صرف لفظی ہے حقیقت ایک ہی ہے۔ چنانچہ اسی رسالہ کے صفحہ پر فرماتے ہیں:

فالمذھب الاول تسمی بوحدۃ الوجود و	"تو پہلے مذہب کا نام وحدت الوجود ہے اور دوسرے کا
الثانی بوحدۃ الشھود ووقع عندنا انّ	وحدت الشہود ہے اور ہمارے نزدیک دونوں مکاشفے صحیح
المکشوفین صحیحان جمیعا۔ لکن القول	ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ شیخ عربی نے وحدت الشہود اس
بان وحدۃ الشھود علی ھذا المعنی لم یقل	معنی سے نہیں کہے، یہ سہو ہے، بلکہ شیخ اور اتباع

به الشیخ العربی سھو کبل الشیخ واتباعہ شیخ ، بلکہ حکماء نے بھی کہی ہے۔

بل الحکماء ایضاً یقولون بھا (فیصلہ وحدۃ الوجود والشہود ، ص ۷)

آپ کو یہ نظریات چونکہ ورثہ میں ملے تھے۔ لہٰذا ان کا انکار اور بُطلان مشکل تھا، چنانچہ انفاس العارفین، صفحہ ۹۶ پر فرماتے ہیں:

" والدِ گرامی (شاہ عبدالرحیم صاحب) فرماتے تھے کہ اوقاتِ عزیز میں سے ایک وقت فنائے کلی اور غیبتِ تامہ میسر ہوئی تو دیکھا کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ: میرے فلاں بندے کو ڈھونڈ لاؤ، زمین میں تلاش کیا، آسمان چھان مارے، نہ ملا۔ بہشت میں تلاش کیا نہ پایا۔ اس پر حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرشتوں سے خطاب کیا کہ جو مجھ میں فنا ہوا، وہ نہ آسمانوں میں ملے گا نہ زمینوں میں اور نہ ہی بہشت میں۔"

لیکن شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کی اس تطبیق کو شیخ مجدد کے متبعین نے قبول نہیں کیا۔ چنانچہ خواجہ میر ناصر عندلیب نے اپنی کتاب نالۂ عندلیب صفحہ ۱۵۳ میں وحدت الوجود کی تغلیط کی۔ پھر خواجہ میر درد نے اس وجودی نظریہ کو سراسر زندقہ قرار دیا۔ پھر مولوی غلام یحییٰ (م ۱۱۹۵ھ) نے مرزا مظہر جانِ جاناں کے ایماء پر شاہ ولی اللہ صاحب کی تردید پر قلم اٹھایا اور ۱۱۸۴ھ میں رسالہ دفع باطل شائع کیا۔ جس میں اپنے والد کی پُرزور حمایت کی۔ پھر سید احمد بریلوی نے صراطِ مستقیم لکھ کر وحدت الوجود کو حقانیت کے خلاف قرار دیا، چاہیے تو یہ تھا کہ جس طرح مجدد الف ثانی نے بربنائے کشف وحدت الوجود کو صرف ایک کیفیت قرار دیا ہے اور اس کی تردید کی ہے اسی طرح کوئی بزرگ بربنائے کشف ان کے نظریات کی توثیق یا تردید کرتے مگر ایسا کسی نے بھی نہیں کیا۔ صرف عقلی اور استدلالی قسم کی بحث چل رہی ہے، جو آج تک جاری ہے۔

دینِ طریقت کے عقائد پر تحقیقی نظر

اس باب میں جن تین نظریات وعقائد (وحدت الوجود، وحدت الشہود اور حلول) کی وضاحت پیش کی ہے ان کو عرفِ عام میں اتحادِ ثلاثہ یا اتحاد وحلول کے نظریات کہا جاتا ہے۔ اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ شرعی نقطۂ نظر سے اسلام میں ایسے نظریات کی گنجائش ہے یا نہیں۔ وحدت الوجود کا نظریہ کائنات میں تمام اشیاء کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمام موجودات خدا ہی کا حصہ ہیں اور انہیں اس کی ذات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کریم اس باطل نظریہ کی پُرزور تردید کرتا ہے۔ قرآن نے کائنات کو دو الگ الگ دائروں میں تقسیم

کیا ہے۔

۱۔ عبد اور معبود : اس لحاظ سے اس کائنات کا خالق، مالک اور معبود فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ باقی تمام مخلوق اُس کی بندگی پر مامور ہے۔ تمام موجودات میں سے صرف انسان اور جن کو کسی حد تک اطاعت اور عصیان کا اختیار بھی دیا گیا ہے اور اس سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ دوسری موجودات کی طرح اللہ کو خالق اور معبود سمجھے اور تکوینی امور کی طرح اختیاری امور میں بھی اپنے آپ کو اللہ کی مرضی کے تابع بنا دے یہی اس کی روحانی ترقی ہے اور یہی مقامِ ولایت ہے۔

۲۔ انسان اور دیگر موجودات : قرآن ہمیں یہ بھی بتلاتا ہے کہ کائنات کی باقی تمام موجودات صرف انسان کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی اور وہ اس کی خادم ہیں۔ اس کے ہمسر یا بالاتر نہیں کہ انسان ان کی پرستش شروع کر دے۔ انسان باقی تمام اشیاء کو حسبِ ضرورت و مرضی اپنے مصرف میں لا سکتا ہے، ان سے کام لے سکتا ہے۔ ان کو تلف بھی کر سکتا ہے، مار بھی سکتا ہے اور نافع اشیاء سے فائدہ اٹھانے کا اسے پورا پورا حق دیا گیا ہے، کیونکہ سب چیزیں اس کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔

اب وحدت الشہود اور حلول کی طرف آیئے۔ اگر انسان اور خدا کا جوہر ایک ہی ہو، تو کیا اس کا امکان ہے؟ اور اگر ان میں غیریت پائی جاتی ہو تو بھی یہ ناممکن ہے اور اس مبحث میں مرکزی بحث روح کے متعلق ہے کہ آیا انسان اور خدا میں ایک ہی روح کارفرما ہے، جو ازلی اور ابدی ہے یا ان میں کچھ فرق ہے۔ قرآن کریم ان دونوں میں فرق کرتا ہے اور ان دونوں قسم کے جوہروں کو یکسر مختلف قرار دیتا ہے۔

روح کی حقیقت

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کے بارے میں استفسار کیا گیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا۔

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ ؕ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا (۱۷/۸۵)	آپ سے رُوح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ وہ میرے پروردگار کے حکم سے ہے اور تم لوگوں کو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔

اس آیت میں "قل الروح من ربی" کے بجائے "من امر ربی" کہہ کر وحدتِ رُوح کے نظریہ کا ابطال کر دیا گیا ہے۔ "امر ربی" کی حقیقت کو علماء نے دو طرح سے بیان کیا ہے۔ پہلی مثال اس طرح ہے کہ فرض کیجئے کہ کوئی کارخانہ بجلی کے ذریعہ چلتا ہے۔ اس کارخانہ کی بھاری بھرکم مشین موجود اور نصب ہونے

کے باوجود صرف اس وقت حرکت کرتی ہے جب بجلی کی کرنٹ آتی ہے اور جب کرنٹ چلی جائے، تو یہ از خود بند ہو جاتی ہے۔ اب اس کرنٹ پر بھی کسی دوسری ہستی کا کنٹرول ہے۔ وہ ہستی اور کرنٹ ایک چیز نہیں۔ بعینہٖ یہی مثال خدا، رُوح اور ذوی الارواح کی ہے۔

دوسری یہ کہ مثلاً ایک بادشاہ کسی شخص کو محض اپنے حکم سے، خواہ وہ زبانی ہو تحریری، گورنر بنا دیتا ہے، تو وہ شخص گورنری کا حکم ملتے ہی از خود ان اختیارات کا مالک ہو جاتا ہے اور جب بادشاہ کسی کو معزول کرنا چاہتا ہے کہ اس کے ایک حکم سے اس کے سب اختیارات از خود چھن جاتے ہیں اور وہ اسی وقت پہلے جیسا ایک بے بس انسان رہ جاتا ہے، گویا قوت تمام تر حکم میں ہے۔ پھر بادشاہ اور حکم الگ الگ چیزیں ہیں اور وہ لازم و ملزوم بھی نہیں، بعینہٖ یہی مثال خدا، روح اور انسان کی ہے اور رُوح کی حیثیت محض ایک حکم ہے۔

ہندو مت اور نظریۂ رُوح

ہندو مت میں رُوح کو لازوال اور ازلی ابدی تسلیم کیا گیا ہے۔ پھر وہ رُوح کی وحدت پر بھی زور دیتا ہے۔ آتما، مہاتما اور پرماتما کی تقسیم میں یہی نظریہ کارفرما ہے، اس نظریہ نے دو مسائل کو جنم دیا۔

اہنسا کا اصول۔ یعنی انسان کو کسی جاندار شے کو دُکھ دینا یا مارنا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ انسان کی رُوح اور اس جاندار کی روح ایک ہی وحدت کے حصے ہیں۔ لہٰذا ہندوؤں میں کسی جانور کو، خواہ کتنا ہی موذی کیوں نہ ہو، دُکھ دینا بہت بڑا پاپ (گناہِ کبیرہ) سمجھا گیا ہے۔ نہ ہی کسی انسان کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ جانور کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھائے یا اسے کسی اور طریقہ سے استعمال میں لائے۔

۲۔ آواگون یا تناسخ کا اصول بھی اسی نظریۂ وحدت کا مرہونِ منت ہے۔ آواگون کا چکر یہ ہے کہ ایک انسان اگر اپنی تمام زندگی میں بُرے کام کرتا ہے، تو مرنے کے بعد اس کی رُوح کسی کمتر مخلوق مثلاً کسی گدھے کے قالب میں منتقل ہو جائے گی، جو ابھی پیدا ہونے والا ہے اور اگر بہت زیادہ پاپ کیے، تو اس سے بھی کمتر مخلوق مثلاً کسی کتے یا چیونٹی میں منتقل ہو جائے گی اور اس دوران اپنے گناہوں کی سزا بھگتے گی۔ جب تک سزا بھگت نہ چکے کسی انسان کے قالب میں منتقل نہیں ہو سکتی اور اگر کسی انسان نے اپنی زندگی میں اچھے کام کئے ہیں تو کسی ایسے انسان کے قالب میں منتقل ہو گی، جو نیک بخت ہو گا اور یہ چکر یونہی چلتا رہتا ہے۔ تاآنکہ آتما (روح) مہاتما نہ بن جائے اور مہاتما سے آگے روحانی مدارج طے کر کے پرماتما (خدا) میں مدغم نہ ہو جائے تبھی جا کر اس کی نجات ہوتی ہے۔

ہندومت کا نظریہ روح وحدت الشہود اور حلول دونوں نظریوں کا جواز ثابت کرتا ہے، لیکن اسلام کا نظریۂ روح اِن دونوں نظریات کی مخالفت کرتا ہے جیسا کہ پہلے واضح کیا گیا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہندومت جس طرح پرماتما کو ازلی ابدی تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح کائنات یعنی روح اور مادہ دونوں کو ازلی ابدی تسلیم کرتا ہے۔

مسلمانوں میں کچھ ایسے "بزرگ" بھی پیدا ہوئے ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ قرآن کے ایک ایک صفحہ سے تناسخ کو ثابت کر سکتے ہیں۔ آپ تصوف کی کوئی معتبر کتاب لے کر اس میں "مبدا اور معاد" کی بحث پڑھ لیجئے۔ اس کے اور ہندوؤں کے نظریات بالکل ملتے جلتے نظر آئیں گے۔

دینِ طریقت کے نظریات کا اسلامی تعلیمات پر اثر

مندرجہ بالا نظریات کی سب سے پہلی زد اسلام کے بنیادی عقیدہ توحید پر پڑتی ہے۔ ان نظریات نے عبد اور معبود کا قصہ ہی پاک کر ڈالا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اِن کے قائل ہیں نہ وہ مسلمان رہ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے دِلوں میں قرآن و حدیث کا احترام باقی رہ جاتا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ معبود کو معبود اور خود کو عبد کہتے ہیں، تو یہ محض لوگوں کے ڈر سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ عفیف الدین تلمسانی کا مکالمہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ یا بعض دوسرے اہلِ قلم صوفیاء طریقت کو شریعت کے تابع ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

۱۔ ان لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ اَن دیکھے خدا کی پرستش، ایمان کی پہلی منزل ہے (جس کو یہ لوگ اپنی زبان میں طلب کہتے ہیں) جس پر عاشقانِ ربانی کبھی قناعت نہیں کر سکتے۔ وہ اس کی مثال آبِ شور سے دیتے ہیں، جو پیاس کو بجھاتا نہیں، بلکہ مزید بھڑکاتا ہے۔ اس کے مقابل اہلِ تصوّف کی توحید (نظریہ وحدت الوجود) آبِ شیریں ہے، جو پیاس بھی بجھاتا ہے اور تسکین بھی بخشتا ہے۔

۲۔ نظریہ وحدت الوجود کا دوسرا اثر مظاہر پرستی کی شکل میں رُونما ہوا۔ سورج، چاند، ستاروں کی پرستش اور ان کے انسان پر اثرات، آگ، ہوا، پانی، سمندر، دریا، شجر و حجر حتیٰ کہ جانوروں، درندوں اور پرندوں کی پرستش صرف اس لئے شروع ہوئی کہ وہ ہر چیز کو خدا کا ہی حصّہ سمجھتے ہیں۔ جس نے جس میں کوئی خوشگوار اثر دیکھا اسی کی پُوجا شروع کر دی۔ وحدتِ روح اور اس کو لازوال سمجھنے کے نظریہ نے بُت پرستی اور قبر پرستی کی صورت اختیار کر لی اور اس طرح دُنیا طرح طرح کے شرک میں مُبتلا ہو گئی۔ عالم حادث کے بجائے قدیم بن گیا اور اللہ تعالٰے کو معطل کر دیا گیا۔

۳۔۔۔ اس نظریہ کی سب سے بڑی زد صفاتِ باری پر پڑتی ہے، مثلاً:

الف۔۔۔ انسان ظالم، جاہل اور بدکردار بھی ہوتے ہیں۔ اگر یہ سب عین ہیں، تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدا میں بھی معاذاللہ یہ نقائص موجود ہیں۔

ب۔۔۔ انسانوں پر اور اسی طرح کائنات کی دوسری اشیاء پر تغیر و تبدل کا عمل جاری رہتا ہے۔ انسان پیدا بھی ہوتے ہیں۔ بیمار بھی ہوتے ہیں، دکھ بھی اٹھاتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ اگر انسان خدا کا عین ہے، تو کیا معاذاللہ خدا، جو حیّ اور قیوم ہے، وہ بھی ان تغیرات کی زد میں ہے۔

ج۔۔۔ خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی خدائی کی تردید ان الفاظ سے کی تھی کہ "وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔" اور جو کھانا کھائے اس کو بہت سے عوارض لاحق ہوتے ہیں۔ اب ساری دنیا بنی نوع انسان اور حیوان کھانا کھاتے ہیں، اگر یہ خدا کا عین بھی ہیں، تو کیا معاذ اللہ خدا بھی انہی عوارض سے دوچار ہے۔

۴۔۔۔ ان نظریات کو تسلیم کرنے والے خود بخود جبریہ عقائد کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک پانی کا قطرہ، جو اپنے جوہری اوصاف کے لحاظ سے سمندر کا ہم جنس ہے۔ جب لڑھکتا لڑھکتا پہاڑیوں، نشیبوں اور ندی نالوں سے ہوتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے، تو اس سارے عمل میں اس قطرہ کا کچھ بھی اختیار نہیں ہوتا بعینہٖ یہ صورتِ حال انسان کی ہے۔ جس کی اصل منزلِ مقصود سمندر یا خدا تعالیٰ کی ذات میں ادغام ہے اور دنیا میں جو اعمال و افعال اس سے سرزد ہوتے ہیں ان میں وہ مجبورِ محض ہے۔

۵۔۔۔ ان نظریات نے اسلامی اخلاق پر گہرا اثر ڈالا۔ نہ تو خیر و شر کی تمیز باقی رہی اور نہ حلال و حرام کی۔ اسی طرح شرعی احکام کی پابندی کی ضرورت بھی ختم ہو گئی۔ جیسا کہ عفیف الدین تلمسانی سے پوچھا گیا کہ اگر دنیا کی سب چیزیں خدا ہی کا حصہ ہیں، تو تم جورو اور بیٹی میں تمیز کیوں روا رکھتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا کہ یہ تمیز تو تم مجوبوں (اہل شریعت) کی پیدا کردہ ہے، ہم تو اس میں تمیز روا نہیں رکھتے۔

۶۔۔۔ مندرجہ بالا تبدیلی اقدار کی وجہ سے جزا و سزا اور جنت و دوزخ بے معنی چیزیں بن کر رہ گئیں بھلا وہ کون خدا ہوگا جو اپنے ہی ایک حصے کو جہنم کی آگ میں جھونک دے۔ ابن عربی کہا کرتا تھا کہ جہنم کی آگ ٹھنڈی ہو کر لطف و لذت کا سامان مہیا کرے گی۔ کبھی یہ لوگ اپنے مکاشفات میں جہنم کو پھونکوں سے بجھا دیتے ہیں تو کبھی جنت کو آگ لگا دیتے ہیں۔ ابن عربی کے اس نظریہ نے اس قدر زور پکڑا کہ ساری دنیا میں اس کے حامی اور

علمبردار پیدا ہو گئے۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی محبت اور ان کی غیر مشروط اطاعت ایمان کا جزو قرار دیا ہے اور جس کے دل میں رسول اللہ ﷺ کا یہ مقام نہ ہو، وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ کا شعر ہے ؎

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ ست　　آبروئے مازنامِ مصطفیٰ ست

لیکن یہ نظریہ رسول اللہ ﷺ کی محبت اور اطاعت کو خارج از بحث قرار دیتا ہے۔ جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مجھ میں بھی خدا ہے اور ایسا ہی خدا نبی پاک ﷺ میں ہے، تو آخر رسول اللہ ﷺ کی کیا فضیلت باقی رہ گئی۔ چنانچہ اس نظریہ کے ایک علمبردار ملا بدخشانی، قادری، مرشد دارا شکوہ کا ایک مشہور شعر ہے ؎

پنجہ در پنجۂ خدا دارم　　من چہ پروائے مصطفیٰ دارم

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۴۰)

اب اس سے بھی آگے بڑھیئے، اس نظریہ کے ماننے والے بوساطت "عشق" کرشن جی، ہیر سیال کے عاشق رانجھا اور رسول کریم ﷺ اور اللہ تعالیٰ سب کو ایک مقام پر لے آتے ہیں۔ یہ حضرات بڑے مزے سے ایسے اشعار پڑھتے ہیں۔

بندرا بن وِچ بین وجائے　　متھرا دے وچ گنواں چرائے

چوچک دے گھر چاکر سد لئے　　عرشاں تے رحمٰن کہائے

گھر عبد اللہ جائی دا

نعوذ باللہ من ذٰلک الخرافات۔

۸۔ یہ عقیدہ عزت و ذلت، عروج و زوال، آزادی و محکومی کے فرق کو ختم کر کے سب کو ایک سطح پر لا کھڑا کرتا ہے۔ ہمارے ان عارفین کے ہاں ذلت، غلامی و محکومی بھی شانِ خداوندی کا ایک نشان ہے۔ بھلا جہاں تربیت سے نفس کشی کی جاتی ہو، وہاں عزتِ نفس ایک بے معنی چیز بن جاتی ہے۔ لہٰذا جہاد و قتال اور سعی و عمل ان کے ہاں بیکار چیزیں ہیں اور یہی بات قومی زندگی کے لئے زہرِ ہلاہل ہے۔

۹۔ اس نظریہ نے شعائر اللہ کی تعظیم کا تصور بھی ختم کر دیا اور پیروں، فقیروں کے مزارات خانقاہوں

اور معابد کو مسجد حرام یا مسجد نبوی کا درجہ دے دیا۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے :

مدینہ بھی مطہر ہے مقدس ہے علی پور بھی   ادھر جائیں تو اچھا ہے، اُدھر جائیں تو اچھا ہے

مندرجہ بالا نتائج سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دینِ طریقت اور دینِ اسلام بالکل متضاد اور ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ جس طرح اسلام میں عفو وانفاق کی تاکید کی بنا پر سوشلزم کو قبول نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح زُہد اور دنیا سے بے رغبتی اور تقویٰ وغیرہ کے خود ایجاد کردہ مفاہیم کی بنا پر یہ دینِ طریقت بھی قطعاً گوارا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اسلام میں زُہد کا تصور اس زُہد سے یکسر مختلف ہے، جو ہمیں دینِ طریقت بتلاتا ہے۔

دینِ طریقت کے کچھ علمبرداروں کو جرأت ہوئی اور اعلانیہ اپنے کفر کا اعلان کر دیا۔ کچھ ان نظریات کو دل میں چھپائے رکھتے اور اپنے خاص رازداروں اور شاگردوں سے ایسے نکات بیان کرتے رہتے۔ لیکن ان میں زیادہ طبقہ ایسے بزرگوں پر مشتمل رہا، جو زبان سے یہی کہتے رہتے کہ خدا کے عاجز بندے اور رسول کے ادنیٰ خادم ہیں اور تعلیماتِ اسلامیہ کی مخصوص تعبیر (جو باطنی علوم کا جزو لاینفک ہے) کا جو حق انہیں حاصل ہے وہ بھی خدا کا احسان اور نبی کی برکت سے ہے لیکن ان کی عملی زندگی میں اس کی قطعاً شہادت نہیں ملتی من مانی کارروائیوں کی دلیل ان کے نزدیک صرف یہ ہے کہ انہیں زندہ جاوید خدا ہر بات سے آگاہ کر دیتا ہے۔

باب (۳)

صوفیاء کے نظریات و عقائد

ہم چند ایسے نظریات کا ذکر کریں گے جن کا تعلق صرف اسلام سے ہے۔ دوسرے مذاہب اس میں شامل نہیں۔ ان نظریات کی تفصیل پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صوفیاء کا مختصر تعارف پیش کر دیا جائے۔

زہاد اور صلحاء

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں ان "بزرگوں" کو زہاد، عُباد اور صلحاء کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ عبداللہ بن سبا کے حلولی پیروکاروں کو تو علی الاعلان خارج از اسلام قرار دیا جا چکا تھا۔ عام مسلمانوں میں یہ مشرکانہ عقائد ابھی تک در نہیں آئے تھے۔ تاریخ اسلام میں ہمیں سب سے پہلے زاہد و عابد اویس قرنیؒ ملتے ہیں جنہوں نے پوری کی پوری زندگی زہد و عبادت میں صرف کی۔

ان کے بعد ہمیں مندرجہ ذیل مشہور زاہدین کے نام ملتے ہیں۔

۱۔	حسن بصریؒ	دم ۱۱۰ھ)	۲۔	حبیب عجمیؒ	دم ۱۲۷ھ)
۳۔	ابراہیم بن ادھمؒ	دم ۱۶۲ھ)	۴۔	فضیل بن عیاضؒ	دم ۱۸۷ھ)
۵۔	معروف کرخیؒ	دم ۲۰۰ھ)	۶۔	بشر حافی الزاہدؒ	دم ۲۱۷ھ)

لیکن فن تصوف پر بعد میں کتابیں لکھنے والوں میں سے ایک صوفی مصنف حافظ ابو النعیم الاصبہانی (م ۴۳۰ھ) نے اپنی تصنیف "حلیۃ الاولیاء" میں متصوفین کی برتری جتلانے کی خاطر اس فہرست میں خلفائے اربعہ اور بہت سے دوسرے بزرگ صحابہؓ اور تابعین کو بھی شامل کر لیا۔

غیر اسلامی نظریات کی درآمد

پہلا شخص جس نے فقر و فاقہ اور نفلی عبادات میں غلو سے کام لیا اور تصوف کو ایک علمی شکل عطا کی وہ حارث بن اسد

محاسبی تھے۔ مالداروں سے سخت نفرت کرتے اور حصولِ مال میں حد سے زیادہ احتیاط کرتے تھے۔ انہوں نے والد کی میراث لینے سے محض اس وجہ سے انکار کر دیا تھا کہ وہ رافضی تھے اور تقدیر کے قائل نہ تھے۔ ان کی اس احتیاط ہی کی وجہ سے اُن کا نام محاسبیؒ[1] پڑ گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ یونانی فلسفہ کا اسلامی نظریات پر اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ حارث بن اسد کے علمِ کلام کے بعض مسائل پر گفتگو کرنے کی وجہ سے امام احمد بن حنبلؒ نے ان سے ملاقات ترک کر دی تھی۔

تیسری صدی میں ہمیں ایسے بزرگ بھی ملتے ہیں جنہوں نے معرفتِ نفس، فقر و فاقہ، توکل، صبر و رضا پر بہت زیادہ زور دیا۔ انہوں نے مندرجہ بالا مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور بعض نے چھوٹے چھوٹے رسائل بھی لکھے ان کے یہی ملفوظات آگے چل کر تصوف کی بنیاد قرار پائے۔ گویا زندگی کے جس ایک پہلو (دنیا سے بے تعلقی یا زہد) پر انہوں نے زور دیا تھا۔ وہی دینِ تصوف میں اصل بنیاد قرار پائی۔ ان بزرگوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ ذوالنون مصریؒ ۔۔ (م ۲۴۵ھ) ۔۔ ۲ ۔۔ بایزید بسطامیؒ ۔۔ (م ۲۶۱ھ)
۳ ۔۔ سری سقطیؒ ۔۔ (م ۲۵۹ھ) ۔۔ ۴ ۔۔ سہل بن عبداللہ تستریؒ ۔۔ (م ۲۸۳ھ)
۵ ۔۔ حکیم ترمذیؒ ۔۔ (م ۲۸۵ھ) ۔۔ ۶ ۔۔ عبداللہ دقاقؒ ۔۔ (م ۲۹۰ھ)
۷ ۔۔ جنید بغدادیؒ ۔۔ (م ۲۹۸ھ) ۔۔ ۸ ۔۔ ابوالحسن نوریؒ ۔۔ (م ۲۹۵ھ)
۹ ۔۔ عمرو بن عثمان مکیؒ ۔۔ (م ۲۹۷ھ) ۔۔ ۱۰ ۔۔ حسین بن منصور حلاج ۔۔ (م ۳۰۹ھ)
۱۱ ۔۔ ابو علی ثقفیؒ ۔۔ (م ۳۲۸ھ) ۔۔ ۱۲ ۔۔ ابوبکر شبلیؒ ۔۔ (م ۳۳۴ھ)

ان بزرگوں میں بعض حضرات کے ملفوظات یا تذکرے ہمیں آج بھی ملتے ہیں۔ ان میں رطب و یابس بہت کچھ شامل ہے اور ان کے حالات میں عجیب و غریب باتیں پائی جاتی ہیں۔ جن کی وجہ ہم پہلے ہی بیان کر آئے ہیں مگر حقیقتاً ان میں اکثر لوگ صالح، کتاب و سنت کے پابند، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا خیال رکھنے والے، وجد و سماع کی محفلوں سے پرہیز کرنے والے تھے۔ ان کی اصلاحِ نفس اور تربیت کا ایک خاص طریقہ تھا۔ جس سے علمائے شریعت کو بھی کچھ اختلاف نہ تھا۔ پھر ان میں سے بعض حضرات ایسے بھی نکلے، جو نوافل میں غلو سے کام

---

[1] محاسبی (م ۲۴۳ھ) انہوں نے سب سے پہلے تصوف پر ایک رسالہ "الرعایۃ" لکھا تھا۔ جس میں محاسبہ نفس پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ ان کو محاسبی کہنے کی دوسری وجہ یہ بتلائی جاتی ہے اور یہی زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ بغداد میں رہائش پذیر تھے۔

لینے کے علاوہ یونانی فلسفہ اور مشرکانہ نظریات کے قائل، ترغیب و ترہیب کے لئے لوگوں میں احادیث وضع کر کے پھیلانے والے اور جھوٹ سے کام چلانے والے تھے۔ جن کی فہرست ہم پہلے دے چکے ہیں۔ (امام ابن تیمیہؒ، از کوکن عمری، ص ۲۶۸)

پہلا صُوفی

صوفی کی اصطلاح بھی دوسری صدی کی ایجاد ہے۔ سب سے پہلا شخص جو صوفی کے نام سے مشہور ہوا ابو ہاشم محمد بن احمد الصوفی تھا۔ صُوفی کے لفظ کی توجیہات تو کافی بیان کی جاتی ہیں۔ تاہم زیادہ راجح یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ چونکہ اُون کا موٹا کپڑا پہنتے تھے اور خرقہ یا گدڑی ان کا شعار یا علامت بن چکی تھی، لہٰذا یہ صوفی کہلائے۔ صوفیائ کے مخصوص نظریات و عقائد بھی اسی دور کی پیداوار ہیں۔

ان تصریحات کے بعد اب ہم صوفیہ کے مخصوص عقائد کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ ولایت نبوت سے افضل ہے۔

ولایت کا مقام اور ابنِ عربی

تیسری صدی کے اواخر کے مصنفین میں سے ایک ابو عبداللہ الحکیم ترمذی دم ۲۸۵ھ ہیں جنہوں نے "ختم الولایۃ" کے نام سے ایک کتاب لکھی اور انبیاء و اولیاء کے سلسلے میں ہر ایک کا ایک خاتم قرار دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس کتاب میں تصوف کے بعض مسائل پر اپنا خاص نقطۂ نظر پیش کیا۔ علمائے وقت نے ان کے خلاف بڑی شورش کی اور ان پر کفر کا فتویٰ صادر کیا۔ آخر انہیں ترمذ سے جلاوطن ہو کر بلخ میں پناہ لینی پڑی (حلاج اور ترمذی دونوں ہمعصر تھے) تاہم ترمذی صاحب کے خیالات لوگوں میں پھیلتے رہے تا آنکہ ابنِ عربی کا زمانہ آگیا، تو ابنِ عربی نے اس پر مزید حاشیے چڑھاتے۔ ابنِ عربی نے ولایت کی دو قسمیں بتلائیں۔

ایک ولایت عامہ مطلقہ، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے مخصوص ہے اور دوسری ولایتِ خاصہ محمدیہ جو حضورؐ کے متبعین کو حاصل ہوتی ہے۔

ابنِ عربی نے ہر دور کا ایک خاتم الاولیاء مقرر کیا۔ ۵۹۵ھ میں اس نے بزعم خود اپنے زمانہ کے ختم الاولیاء کو دیکھا۔ اس نے اس میں ختمِ ولایت کی وہ نشانی دیکھی جو دوسروں کو نظر نہیں آتی تھی۔ پھر بعد میں خود اپنے ختم الاولیاء ہونے کا دعویٰ پیش کر دیا اور کہا ؎

اَنَا خَتْمُ الْوِلَايَةِ دُوْنَ شَكٍّ   لِوِرْثِ الْهَاشِمِيِّ مَعَ الْمَسِيْحِ

میں بلاشبہ ختم الاولیأ ہوں، مجھے حضرت مسیح کی ولایت (عام مطلقہ) کے، ساتھ ہی ساتھ رسول اکرم کی ولایت (خاصہ) بھی میراث میں ملی ہے۔

پھر اس کے آگے بڑھ کر اس نے یہ نظریہ بھی پیش کر دیا کہ ولایت کا درجہ نبوت سے اونچا ہے۔ اور ارشاد فرمایا:

مَقَامُ النُّبُوَّةِ فِیْ بَرْزَخٍ   فُوَيْقَ الرَّسُوْلِ وَدُوْنَ الْوَلِیْ

نبوت کا مقام درمیانی درجہ ہے۔ اس کا مرتبہ رسول سے اوپر اور ولی سے نیچے ہے۔

یعنی آپ فرما رہے ہیں کہ مقامِ رسالت سے مقام نبوت افضل ہے اور مقام نبوت سے مقام ولایت افضل ہے۔ نبوت کا مقام درمیان میں ہے۔ جو رسالت سے اوپر ہے اور ولایت سے نیچے۔ بالفاظ دگر مقام ولایت سب سے اوپر ہے اس کے نیچے نبوت، پھر اس کے نیچے رسالت۔

خاتم الاولیأ کی خاتم الانبیأ پر فضیلت

اور اس سے دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ خاتم الاولیأ خاتم الانبیاء سے افضل ہوتا ہے۔ جب اس نظریہ پر علمأ کی طرف سے گرفت اور لے دے شروع ہوئی تو یہ کہہ دیا جاتا کہ نبی، نبوت اور ولایت دونوں مقامات پر فائز ہوتا ہے اور اس کا درجہ ولایت اس کے درجہ نبوت سے افضل ہوتا ہے۔[1] یہ ان لوگوں کی حیلہ سازی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اس طبقہ کے اکثر لوگ ولی کو نبی سے برتر مقام پر فائز سمجھتے ہیں۔

اکتسابی نبوت اور مرزائے قادیان

نبوت کا مرتبہ گھٹانے کے لئے ابن عربی نے ایک تیسرا نظریہ بھی پیش کیا۔ وہ یہ ہے کہ نبوت بھی وہبی چیز نہیں بلکہ کسبی اور اکتسابی ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آخر زمانہ میں مسیحؑ آئیں گے جو شریعت محمدیہ کا نظام جاری کریں گے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا نبی آسکتا ہے جو نئی شریعت کا جاری کرنے والا نہ ہو۔ اور ایسی نبوت روحانی ریاضتوں کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔

---

[1] چنانچہ صادق فرغانی اپنی کتاب "حدائق الاخبار" (ترجمہ: مرشد کامل، ص ۱۹) پر لکھتا ہے: "نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے مگر اس کی ولایت سے نبی کی ولایت مراد ہے۔ یعنی نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے کہ نہ ولی کی ولایت۔ کچھ اسی قسم کے ارشادات عبدالکریم جیلیؒ (م ۸۱۲ھ) نے بھی اپنی کتاب "انسان کامل" میں بیان فرماتے ہیں۔

چنانچہ مرزائے قادیاں کو ایسے ہی مواد سے نبوت کا دعوےٰ کرنے کا جواز مل گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مرزا قادیانی اور شیخ اکبر کے الہامات و شطحیات میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ وہ تدریجاً نبی بنا تھا۔ یہ تدریجاً خاتم الاولیاء بن گئے جو ان کے نزدیک خاتم الانبیاء سے بھی بہت بلند مقام ہے۔

گویا میدانِ ولایت میں ابنِ عربی شیخ اکبر نے درج ذیل کارنامے سرانجام دیئے:

۱۔ نظریہ وحدت الوجود کو اپنی تقریر و تحریر کے ذریعے دوام بخشا۔

۲۔ ولایت کو دو حصوں میں تقسیم کیا، ولایتِ عامہ اور ولایتِ خاصہ، ولایتِ عامہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مختص قرار دیا اور ولایتِ خاصہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مختص کیا اور خود کو ان دونوں اقسام کا خاتم قرار دیا۔ بعد میں آنے والوں نے ولایتِ عامہ کو عام مسلمانوں کے لئے رہنے دیا اور ولایتِ خاصہ کو اولیاء اللہ کے لئے مختص کیا۔ اس طرح لفظ ولی کا اطلاق مومنین کی ایک صفت ہونے کے بجائے ایک مخصوص منصب قرار پا گیا۔

۳۔ نبوت اور رسالت کا الگ الگ تصور پیش کیا۔ خدا سے خبریں حاصل کرنے کا تعلق نبوت سے ہے اور ان خبروں کو لوگوں تک پہنچانے کا رسالت سے۔ اور نبوت کو رسالت سے بہتر قرار دیا۔ اور یہی اس شعر کا مطلب ہے ؎

مَقَامُ النُّبُوَّةِ فِیْ بَرْزَخٍ   فُوَیْقَ الرَّسُوْلِ وَدُوْنِ الْوَلِیِّ

گویا سب سے اونچا مقام تو ولی کا ہوتا ہے پھر اس کے نیچے نبی کا اور اس کے نیچے رسول کا۔ گویا نبوت کا مقام درمیانی مقام ہے۔ رسول اس سے نیچے اور ولی اس سے اوپر ہوتا ہے۔

۴۔ چونکہ ولایت اکتسابی چیز ہے لہٰذا نبوت، جو اس سے فروتر مقام ہے، کو بھی اکتسابی ہی قرار دیا۔ انہی نظریات اور اس کے پیش کردہ دلائل سے مرزائے قادیان نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور نبوت کا دعوےٰ کر دیا۔

اب ولایت کو نبوت سے افضل ثابت کرنے کی عقلی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نبی تو فرشتہ کے واسطہ سے خدا سے علم حاصل کرتا ہے لیکن ایک ولی اپنے مکاشفات و مشاہدات کے ذریعہ براہِ راست خدا سے یہ علم حاصل کرتا ہے۔ گویا ولی بزعمِ خود یا تو خدائی کے مقام پر ہوتے ہیں یا اس سے ذرا تھوڑا نیچے۔ کبھی وہ خدا بن کے لوگوں سے اپنی بندگی کرواتے ہیں اور کبھی بندہ بن کر رسول سے بھی کسی اوپر کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ چنانچہ بایزید بسطامی کے متعلق ایسے بہت سے اقوال مشہور ہیں۔ مثلاً انہوں نے فرمایا:

شطحیات بایزید بسطامی

(۱) سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمُ شَانِیْ

میں پاک ہوں، میری شان کے کیا کہنے۔

اور علی ہجویریؒ یہ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: "یہ کہنا ان کی گفتار کا نشانہ ہے اور درحقیقت یہ کہنے والا حق تعالیٰ ہی پردۂ عبد میں ہے۔" (کلام المرغوب۔ ترجمہ کشف المحجوب ص ۴۴۳)

اگر کلام المرغوب کی یہ روایت صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ علی ہجویریؒ بھی حلول کا عقیدہ رکھتے تھے اور ان میں گویا خدا ہی بول رہا تھا۔

بایزید بسطامی سے یہ روایات بھی منسوب ہیں:

(۲) مَا فِیْ جُبَّتِیْ اِلَّا اللّٰہِ — میرے جُبّہ میں اللہ کے سوا کچھ نہیں۔

یہ قول بھی اسی عقیدۂ حلول کا مظہر ہے۔

۳ مُلْکِیْ اَعْظَمُ مِنْ مُلْکِ اللّٰہِ — میری بادشاہی خدا کی بادشاہی سے عظیم ہے

اب حالتِ سکر میں خدا سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں، تو بھلا انبیاء کو کیا سمجھیں۔ فرمایا:

۴ خُضْتُ بَحْرًا وَ وَقَفَ الْاَنْبِیَاءُ بِسَاحِلِہٖ — میں نے تو سمندر میں غوطہ لگا دیا۔ جب کہ انبیاء اس کے ساحل پر ہی کھڑے رہے۔

اور افضل الانبیاء والمرسلین، افضل البشر حضور اکرم ﷺ کے متعلق فرمایا:

۵ لِوَائِیْ اَرْفَعُ مِنْ لِوَاءِ مُحَمَّدٍ — میرا جھنڈا محمد ﷺ کے جھنڈے سے بلند ہوگا۔

اور شریعتِ اسلامیہ تو ان کے مرتبہ سے بہت ہی فروتر تھی۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔ باطنی علوم کی شرعی علوم پر فضیلت۔

بایزید بسطامی کے علاوہ دوسرے بھی بہت سے اولیاء کرام کے ایسے بلند بانگ دعوے اُن کی کتابوں میں درج ہیں، جنہیں ہم مناسب مقام پر درج کریں گے۔

ولایت کی نبوت پر برتری کا قرآن کریم سے ثبوت

اولیاء اللہ کی انبیاء پر فوقیت اور فضیلت ثابت کرنے کے لئے قصہ حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

جیسے اولوالعزم پیغمبر کو حضرت خضر علیہ السلام کے پاس بھیجا گیا جنہوں نے حضرت خضر علیہ السلام سے التجا کی اس ہدایت سے کچھ باتیں مجھے سکھلائیں، جو آپ کو اللہ نے عطا کی ہیں اور میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ حضرت خضر علیہ السلام کو خدا نے "لَدُنِّی علم" عطا کیا تھا جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم فرشتہ کے واسطہ سے تھا۔ (سورۂ کہف، آیات ۶۵-۶۶)

قصہ موسیٰ و خضر

اس دلیل میں بہت سے مغالطے ہیں۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ ولی نہ تھے، بلکہ نبی تھے۔ علامہ شبیر عثمانی اس آیت کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"اس میں اختلاف ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کو رسول مانا جائے، یا نبی یا ولی کے درجہ میں رکھا جائے۔ ایسے مباحث کا فیصلہ یہاں نہیں ہو سکتا، تاہم احقر کا رجحان ہے کہ ان کو نبی تسلیم کیا جائے، جیسا کہ بعض محققین کا خیال ہے۔"

۲۔ لفظ "لَدُن" سے یہ مراد لینا کہ اس میں فرشتے کا واسطہ درکار نہیں، یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے، کیونکہ انبیاء کا علم، جو فرشتے کے واسطے سے انبیاء پر نازل ہوتا ہے، کے لئے بھی یہی لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد باری ہے:

وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (۲۷/۶)

اور آپ کو قرآن خدائے حکیم و علیم کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔

۳۔ اگر حضرت خضر کو ولی تسلیم کر لیا جائے، تو از روئے شریعت ولی پر نہ ایمان لانا فرض ہوتا ہے۔ نہ ہی اس کی اطاعت واجب ہوتی ہے جبکہ نبی یا رسول پر ایمان لانا فرض ہوتا ہے اور اس کی اطاعت کو بھی عین اللہ کی اطاعت اور فرض قرار دیا گیا ہے، لہٰذا نبی کا درجہ بہر حال ولی سے بہت بلند تر ہوتا ہے۔ جیسا کہ انہی بایزید بسطامی نے دوسرے مقام پر (شاید حالت صحو میں) ان الفاظ میں اعتراف کیا:

مراتب ولایت

فرمایا: "عام مومنین کے مقام کی نہایت، اولیاء کے مقام کی ابتداء ہے اور اولیاء کے مقام کی نہایت شہیدوں کے مقام کی ابتداء ہے اور شہیدوں کے مقام کی نہایت صدیقوں کے مقام کی ابتداء ہے۔ اور صدیقوں کے مقام کی نہایت نبیوں کے مقام کی ابتداء ہے اور نبیوں کے مقام کی نہایت رسولوں کے مقام کی ابتداء ہے اور رسولوں کے مقام کی نہایت اولوالعزم کے

مقام کی ابتداء ہے اور اولوا العزم کے مقام کی نہایت حضرت محمد ﷺ کی ابتداء ہے اور آپؐ کے مقام کی نہایت کسی کو معلوم نہیں۔ سوائے حق تعالےٰ کے کوئی آپؐ کے مقام کی نہایت کو نہیں جانتا۔ روزِ ازل اور یثاق کے دن بھی رُوحوں کا مقام انہی مراتب پر تھا اور قیامت کو بھی ان ہی مراتب پر ہوگا اور ان کے اسرار حق تعالیٰ کی محبت میں انہی درجات پر مرتب ہوں گے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۹۶)

گویا مختصراً درجات کی ترتیب یوں ہوئی۔ ۱۔ عام مؤمنین ۔۲۔ ولی ۔۳۔ شہید ۔۴۔ صدیق ۔۵۔ نبی ۔۶۔ رسول ۔۷۔ اولوا العزم رسول ۔۸۔ حضرت محمد ﷺ

اب سوال یہ ہے کہ اگر حضرت خضر علیہ السلام ولی تھے، یا حضرت موسےٰ علیہ السلام سے (جو اولو العزم رسول ہیں) کم درجہ کے نبی تھے، تو اللہ نے حضرت موسیٰ کو ہدایت کی باتیں سیکھنے کے لئے ان کے پاس کیوں بھیجا۔ اس سوال کے جواب میں صحیح بخاری کی روایت یوں ہے:

عَنْ اُبَیِّ ابْنِ کَعْبٍ اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَنَّ مُوْسٰی قَامَ خَطِیْبًا فِیْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ فَسُئِلَ اَیُّ النَّاسِ اَعْلَمُ؟ فَقَالَ "اَنَا" فَعَتَبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ اِذْ لَمْ یَرُدَّ الْعِلْمَ اِلَیْہِ فَاَوْحَی اللّٰہُ عَلَیْہِ اَنَّ لِیْ عَبْدًا بِمَجْمَعِ الْبَحْرَیْنِ ھُوَ اَعْلَمُ مِنْکَ...... قَالَ اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا یَا مُوْسٰی اِنِّیْ عَلٰی عِلْمٍ مِّنْ عِلْمِ اللّٰہِ عَلَّمَنِیْہِ لَا تَعْلَمُہٗ وَ اَنْتَ عَلٰی عِلْمٍ مِّنْ عِلْمِ اللّٰہِ عَلَّمَکَہُ اللّٰہُ لَا اَعْلَمُہٗ	ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یوں کہتے سنا۔ آپؐ فرماتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو کھڑے ہو کر خطبہ سنایا۔ کسی نے ان سے پوچھا، "لوگوں میں سب سے زیادہ عالم کون ہے؟" انہوں نے کہا "میں!" اللہ نے ان پر عتاب فرمایا۔ ان کو چاہئے تھا کہ اللہ پر سونپ دیتے (یوں کہتے کہ اللہ جانتا ہے) تب اللہ نے ان پر وحی بھیجی کہ "جہاں دو دریا ملتے ہیں، وہاں میرا ایک بندہ ہے جو تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے....." حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: "تم سے بھلا وہ باتیں دیکھ کر کیسے صبر ہو گا، سنو موسیٰ! بات یہ ہے کہ اللہ نے مجھ کو ایک خاص قسم کا علم دیا ہے جو تم نہیں جانتے اور تمہیں ایک خاص قسم کا علم دیا ہے جسے میں نہیں جانتا۔ (بخاری، کتاب التفسیر)

اس حدیث کا ترجمہ علامہ وحید الزمان کا ہے۔ اب اس کے تشریحی نوٹ بھی انہی کی زبانی سنئے:

"یعنی میرا طریق اور، تمہارا طریق اور، میں خاص باتوں پر اللہ کی طرف سے مامور ہوں، تم ہدایتِ عام کے لئے

یہ بھیجے گئے ہو۔ ہر بات پر اعتراض کرو گے۔ جس کو تم بظاہر خلافِ شرع پاؤ گے۔ میں کہاں تک تم کو سمجھاتا رہوں گا

لہٰ بعضے صوفیوں نے اس کی شرح میں یوں کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صرف شریعت کا علم تھا۔ اور حضرت خضر علیہ السلام کو حقیقت کا اور ہمارے پیغمبر کو دونوں علم ملے تھے۔ میں کہتا ہوں یہ تقریر صحیح نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انبیاً اولوالعزم میں سے تھے۔ ان کو تو حقیقت کا علم نہ ہوا اور ادنیٰ ادنیٰ اولیا کو نہ جانے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس طرح حضرت خضر علیہ السلام کو شریعت کا علم تو بالکل نہ ہو، تو حقیقت کا علم کیونکر ہوگا۔ حقیقت بغیر شریعت کے زندقہ والحاد ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات میں علامہ عثمانی اپنے رجحان کے مطابق حضرت خضر رحمۃ اللہ علیہ کو نبی قرار دیتے ہیں۔ اور علامہ وحید الزمان کے "علیہ السلام" لکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خضر رحمۃ اللہ علیہ نبی تھے۔ کیونکہ "علیہ السلام" کا لفظ عموماً انبیاء کے لئے ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کا علم جس میں کائنات میں جاری و ساری مشیت الٰہی سے چند اوقات سے پردے اٹھائے گئے تھے۔ تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مشیتِ الٰہی کے مصلحتوں سے واقف ہو سکیں حضرت موسےٰ علیہ السلام کے علم (شریعت) سے منصادم ہے تو حضرت خضر رحمۃ اللہ علیہ کو ادنیٰ ولی بھی تسلیم کرنے کو تیار نظر نہیں آتے اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حقیقت کے علم کا انحصار ہی شریعت پر ہے ورنہ وہ علم زندقہ و الحاد ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات سے البتہ مندرجہ ذیل باتیں ضرور مستنبط ہوتی ہیں:

حضرت خضر علیہ السلام کون اور کیا تھے؟

۱۔ حضرت خضر خواہ نبی تھے یا ولی تھے، یا کچھ اور، انہوں نے جو کچھ کیا، اللہ کے حکم سے کیا۔ انہیں یہ علم اللہ ہی نے عطا کیا، گویا وہ بھی مامور من اللہ تھے۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یقیناً اولوالعزم رسول تھے۔ وہ بھی مامور من اللہ تھے۔ انہیں بھی خدا تعالیٰ نے ہی علم عطا کیا تھا، لیکن ان کا علم حضرت خضر کے علم سے منصادم تھا۔

۳۔ قرآنی آیات کی رُو سے یہ ثابت شدہ اَمر ہے کہ انبیاً کا علم ابتداء سے ایک ہی رہا ہے۔ لہٰذا حضرت خضر علیہ السلام یقیناً نبی نہیں ہو سکتے۔ اب اگر انہیں ولی تسلیم کر لیا جائے، تو یہ تو باور کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں (بقولِ صوفیاء) کشف و الہام سے اِن غیب کے حالات سے مطلع کر دیا ہو، لیکن ولی کو یہ کب اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے علمِ غیب سے اطلاع کی بنا پر کسی دوسرے کی مملوکہ چیز کو تباہ کر دے۔ یا کسی شخص کو قتل بھی

کر دے۔ ولی بھی آخر انسان ہے اور احکامِ شرعیہ کا مکلف اور اصولِ شریعت میں یہ گنجائش کہیں نہیں پائی جاتی کہ کسی انسان کے لئے محض اس بناء پر احکامِ شرعیہ میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی جائز ہو کہ اسے بذریعہ الہام اس خلاف ورزی کا حکم ملا ہے اور بذریعہ علمِ غیب اس خلاف ورزی کی مصلحت بتائی گئی ہے۔

یہ ایک ایسی بات ہے جس پر نہ صرف تمام علمائے شریعت متفق ہیں، بلکہ اکابرِ صوفیاء بھی بالاتفاق یہی بات کہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ آلوسی نے چند نامور اکابر صوفیاء مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، جنید بغدادیؒ، سری سقطیؒ، مجدد الف ثانیؒ اور امام غزالیؒ وغیرہم کے اقوال نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اہلِ تصوف کے نزدیک بھی کسی ایسے الہام پر عمل کرنا خود صاحبِ الہام تک کے لئے بھی جائز نہیں ہے جو نصِ شرعی کے خلاف ہو۔ (روح المعانی، ج ۱۶، ص ۱۶ تا ۱۷)

حضرت خضر علیہ السلام کی شخصیت؟

حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں جو تحقیق پیش کی ہے، وہ ایسے تمام اشکالات کو دور کر دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام نہ نبی تھے نہ ولی، بلکہ وہ انسان بھی نہ تھے۔ وہ اللہ کے اُن بندوں میں سے تھے جو مشیتِ الٰہی (نہ کہ شریعتِ الٰہی) کے تحت کام کرتے ہیں۔ ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ حضرت خضر علیہ السلام کے لئے قرآن میں "انسان" کا لفظ نہیں آیا بلکہ "عبد" کا لفظ آیا ہے، جو فرشتوں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، مثلاً:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا (۴۳/۱۹) اور انہوں نے فرشتوں کو کہ وہ بھی خدا کے بندے ہیں۔ خدا کی بیٹیاں مقرر کیا۔

۲۔ احادیث میں حضرت خضر علیہ السلام کے لئے "رجل" کا لفظ آیا ہے۔ لیکن رجل کا لفظ بھی انسان کے علاوہ جن کے لئے بھی قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:

وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (۷۲/۶) اور یہ کہ بعض بنی آدم بعض جنات کی پناہ پکڑا کرتے تھے۔

اور یہ تو ظاہر ہے کہ جب کوئی فرشتہ، جن یا کوئی غیر مرئی مخلوق انسان کے سامنے آئے گی، تو انسان کی شکل میں ہی آئے گی۔ جیسا کہ فرشتہ، حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے انسان ہی کی شکل میں نمودار ہوا تھا۔ (۱۹/۱۷)

لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام نے وہاں ایک "مرد" کو پایا۔ حضرت خضر علیہ السلام کے انسان

یا بنی آدم ہونے پر صریح دلالت نہیں کرتا۔

۳۔ــــ لہٰذا حضرت خضر فرشتہ یا اللہ کی کوئی ایسی مخلوق تھی، جو شرائع کی مکلف نہیں، بلکہ کارگاہِ مشیئت کی کارکن ہے اور متقدمین میں سے بعض لوگوں نے یہی رائے ظاہر کی ہے۔ جسے ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ماوردی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ (تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۴۴) وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

ہمارے خیال میں مولانا مودودیؒ نے ابن کثیر اور علامہ ماوردیؒ کے حوالہ سے جو تحقیق پیش کی ہے یہی اقرب الی الحق ہے۔ کیونکہ اس سے تمام اشکالات از خود رفع ہو جاتے ہیں۔ اندریں صورتحال حضرت موسٰے علیہ السلام و حضرت خضر علیہ السلام کے تقابل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور یہ بات بھی ہم اکابرِ صوفیاء کے اقوال کے حوالوں سے پیش کر چکے ہیں کہ ولی خواہ کس مقام پر ہو۔ اگر اس کے الہام نصِ شرعیہ سے متصادم ہوں، تو وہ مردود ہیں۔

اولیأ اللہ کی برتری کا دوسرا ثبوت

دوسرا واقعہ، جو قرآن سے اولیاء اللہ کی جنوں پر فضیلت کے سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے، جو سورۂ نمل میں اس طرح مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے درباریوں سے پوچھا کہ ملکۂ سبا بلقیس کا تخت کون جلد از جلد میرے پاس لا سکتا ہے؟ تو:

قَالَ عِفْرِيتٌ مِّنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَن تَقُومَ مِن مَّقَامِكَ وَإِنِّي عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ أَمِينٌ قَالَ الَّذِي عِندَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَن يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِندَهُ قَالَ هَٰذَا مِن فَضْلِ	جنوں میں سے ایک قوی ہیکل جن نے کہا: "میں اسے دربار برخاست کرنے سے پیشتر لائے دیتا ہوں۔" اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم تھا، کہنے لگا: "میں اسے تمہاری پلک جھپکنے سے پہلے لائے دیتا ہوں۔" جونہی حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا، تو پکار اٹھے: "یہ میرے رب کا فضل ہے۔"

(نمل ۲۷ : ۳۹-۴۰)

اس آیت میں "اس شخص سے جس کے پاس کتاب کا علم تھا" سے بعض حضرات حضرت خضر مراد لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا قیاس ہے جس کے لئے قرآن و حدیث میں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔ حالانکہ بات سیدھی سی ہے اور اس پر واضح دلائل بھی موجود ہیں کہ اس سے مراد فرشتے ہیں جو تدبیرِ کائنات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں۔ اور اللہ کے ارادے کن فیکون کے مطابق پلک جھپکنے سے پیشتر انہی مدبراتِ امر کے ذریعہ سرانجام پا

جاتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب (حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق باقی مباحث "خضر کی شخصیت" کے تحت آگے آرہے ہیں)۔

۲۔ عابد کی عالم پر فضیلت

انبیاء کی ذمہ داریاں

ایک نبی کی ذمہ داریاں، جو قرآن کریم نے بیان کی ہیں، وہ یہ ہیں:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ (۲/۱۲۹)	اے پروردگار! ان لوگوں میں انہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیجیو۔ جو ان میں تیری آیتیں پڑھ کر سنایا کرے اور کتاب اور دانائی سکھائے اور ان (کے دلوں) کو پاک صاف کرے۔

گویا ایک نبی یا رسول کے ذمہ مندرجہ ذیل چار ذمہ داریاں ہیں:

۱۔ تبلیغ یا وحی الٰہی کو دوسروں تک پہنچانا۔

۲۔ تعلیم کتاب، یعنی اللہ کی کتاب کے معانی و مفہوم کو واضح اور متعین کرنا اور ان کی تعلیم دینا۔

۳۔ حکمت سکھلانا۔ حکمت سے مراد احکام الٰہی کو عملی تشکیل دینے کا طریق ہے اور بعض کے نزدیک تفقہ فی الدین، یعنی نصوص شرعیہ سے حالات زمانہ کے مطابق نئے مسائل کا استنباط ہے۔

۴۔ تزکیہ نفس: جس سے مراد، دل کو شرک کی نجاستوں سے پاک کرنا اور گناہ کے کاموں اور اخلاق رذیلہ سے نفرت پیدا کرنا ہے۔

اب صوفیاء کا دعویٰ یہ ہے کہ چوتھی شق اہل باطن یا صوفیاء سے تعلق رکھتی ہے۔ نیز یہ کہ دین کا یہی پہلو اصل دین ہے اور باقی باتوں کا درجہ ان سے کم تر ہے۔ اسی وجہ سے نبی کی نبوت کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا، ایک نبوت، دوسرے ولایت۔ پہلے تین کام تو نبوت کے درجہ کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں اور چوتھے کو ولایت سے منسوب کیا گیا۔

جب صوفیاء میں یہ بات طے پاگئی کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی نکلنا تھا کہ ایک عابد (جو بعد کے ادوار میں صوفی اور عارف کہلائے) کو ایک عالم سے افضل ہونا چاہیے۔

یہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ تصوّف کا لفظ تیسری صدی کی پیداوار ہے۔ قرونِ ثلٰثہ میں اس لفظ کا کوئی وجود نہ تھا پہلی، دوسری صدی ہجری میں لوگوں کو عابد، زاہد یا صالح ہی کہا جاتا تھا۔ فنِ تصوّف ایک باقاعدہ فن کی شکل میں چوتھی صدی میں سامنے آتا ہے۔ تصوف کیا ہے؟ ابھی کوئی ایسی جامع تعریف آج تک پیش نہیں کی جا سکی جس پر سب اعیانِ صوفیاء کا اجماع ہو۔ البتہ صوفی کے لفظ کی بے شمار توجیہات میں سے معقول تر توجیہ یہی ہے کہ اون کا موٹا جبہ، گدڑی یا مرقع پہننے اور اس کو اپنا شعار بنانے کی وجہ سے یہ لوگ صوفی کے نام سے موسوم ہوئے۔ صوفی اور تصوف دونوں الفاظ میں قدرِ مشترک اس کا مادہ "صوف" ہے، جس کے معنی اُون کے ہیں۔

صوفی کون ہیں؟

جب اہلِ تصوّف پر یہ اعتراض ہوا کہ صوفیاء کا یہ ایک الگ فرقہ پیدا ہو گیا ہے، تو انہوں نے اپنا وجود ثابت کرنے کے لئے کئی توجیہات پیش کیں، مثلاً:

۱۔ حدیثِ جبریل میں، جب حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، کہ "احسان کیا ہے؟" تو آپ نے جواب دیا کہ "تُو اللہ کی ایسے عبادت کرے، جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو کم از کم یہ سمجھے کہ خدا مجھے دیکھ رہا ہے۔" تو اس حدیث میں احسان سے مراد تصوّف ہے اور محسنین ہم ہی لوگ ہیں۔ اس توجیہ پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ پھر قرونِ ثلاثہ کے مسلمانوں کو اس "مراد" کی کیوں سمجھ نہ آئی۔

۲۔ یہ لوگ کہتے ہیں، صدیقوں سے مراد ہم لوگ ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ اس توجیہ پر تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صدیق کا درجہ اختصاص کے حامل لوگوں (SPECIALISTS) کے لئے بولا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو صدیقون فی الزہد تو کہا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ زہد اسلامی نظریات کا حامل ہو، مگر علی الاطلاق لفظ صدیق اسلام کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہے۔ (الفقر والتصوف لابن تیمیہؒ)

۳۔ ان لوگوں کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ قرآن میں محسنین، ابرار، مشاہدین، موقنین، قانتین، مطمئنین، صادقین ان سب الفاظ سے ہم اہلِ تصوّف ہی مراد ہیں۔ (خلاصہ تصوف اسلام، ص) گویا جو صفات بھی مومنوں کی ہو سکتی ہیں۔ وہ سب انہوں نے اپنی طرف منسوب کر لی ہیں۔

بہرحال یہ سب ایسے دعوے ہیں جس پر کوئی واضح دلیل موجود نہیں اور حقیقت یہی ہے کہ یہ فرقہ اپنے مخصوص عقائد و نظریات اور اعمال و کردار کے لحاظ سے مابعد کی پیداوار ہے۔ پھر ان صوفیاء نے مراتب و مدارج کے لحاظ سے بھی کئی اصطلاحیں بنا لی ہیں۔ مثلاً طالب، عاشق، سالک، عارف، مجذوب، فقیر،

فنا فی اللہ، واصل باللہ یا نجیب، ابدال، غوث اور قطب وغیرہ وغیرہ۔ جن کا دورِ صحابہ کرام میں کہیں اشارہ تک نہیں ملتا۔

کیا تصوّف ایک بدعت ہے؟

جب سے یہ فن تصوف وسلوک معرضِ وجود میں آیا ہے۔ اس پر علمائے حق کی طرف سے مسلسل اور متواتر یہ اعتراض ہوتا رہا ہے۔ پھر بعض ایسے صوفیاء کرام جن کے دلوں میں شریعت کی بھی کچھ قدر وقیمت ہوتی ہے، وہ اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش اور اس طریقت کو شریعت کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش فرماتے رہے ہیں۔ موجودہ دور میں مولانا اللہ یار خان صاحب نے، جو اسی بحرِ طریقت کے شناور ہیں اور شریعت کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس اعتراض کا جواب اپنی تصنیف " دلائل السلوک" میں ذرا تفصیل سے دیا ہے۔ یہاں ہم آپ کے اس جواب کا جائزہ لینا مناسب سمجھتے ہیں۔ آپ نے اس کتاب میں " مدرسہ محمدیہ" کے عنوان کے تحت اس اعتراض کے جواب میں کئی اصولی باتیں بیان فرمائیں۔ جن کا ملخص یہ ہے:

۱۔ حضور اکرم ﷺ جامع کمالات تھے۔ صحابہ میں سے ہر شخص کو اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق حصہ ملا، کوئی مبلغ بنا، کوئی مدرس، کوئی محدث، کوئی فقیہہ کوئی قاضی اور صاحبِ الہام وکشف وصوفی وعارف اب حیرت یہ ہے کہ لوگ یہ تو نہیں کہتے کہ تمام صحابہ مفسر ومحدث وفقیہ کیوں نہیں تھے، مگر یہ بات بڑی بے تکلفی سے کہہ دیتے ہیں کہ سارے صحابہ صاحبِ کشف والہام اور صوفی کیوں نہیں تھے۔ (دلائل السلوک ص ۱۹۶)

دوسری اصولی بات آپ نے یہ بتلائی کہ " آپ کی تعلیم بنیادی اور اصولی قسم کی ہوتی تھی۔ ان اصول و کلیات سے جزئیات کا استخراج ان لوگوں کے ذمے تھا، جو اس کی صلاحیت رکھتے ہوں۔" اور تیسری اصولی بات آپ نے یہ بتلائی کہ " دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ میں تمام علوم وفنون اصولی اور اجمالی شکل میں تھے۔ کسی فن کی تدوین نہ ہوئی تھی۔ فن تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، صرف ونحو، معانی وغیرہ جس طرح حالات کے مطابق اپنی تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ مدون ہوتے رہے ہے۔ اسی طرح تصوف سلوک کی تدوین بھی رفتہ رفتہ عمل میں لائی گئی تو جب دوسرے علوم کو کوئی بدعت نہیں کہتا، تو آخر اس علم یا فن تصوف وسلوک کو کیوں بدعت کہا جاتا ہے۔ (دلائل السلوک، ص ۱۹۶)

اب دیکھئے کہ مولانا اللہ یار خان نے جو تین اصولی باتیں بتلائی ہیں دراصل یہ ایک ہی اُصولی بات ہے اور وہ یہ کہ فن حدیث، فقہ، تفسیر، صرف ومعانی وغیرہ بعد میں مدون ہونے کی وجہ سے بدعت نہیں، تو

تصوف کیسے بدعت ہوا ؛ آپ کو تو یہ حیرت ہے کہ آخر تصوف ہی کیوں بدعت کہلائے۔ اور حیرت ہمیں بھی ہے اور وہ یہ کہ آخر علماً کو ان تمام علوم وفنون میں سے صرف تصوف کے ساتھ وہ کون سی دشمنی تھی کہ اور کسی علم و فن کو بدعت نہیں کہا گیا ، مگر اسے بدعت کہتے ہیں ۔ آخر دال میں کچھ تو کالا ہے ۔ علماً کچھ ایسے سر پھرے تو نہیں کہ بلا وجہ ہی تصوف کے پیچھے پڑ گئے۔

حدیث، تفسیر، فقہ وغیرہ بدعت نہیں

دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہ میں مدرس ، مبلغ ، مفسر ، محدث ، قاری ، قاضی اور فقیہہ صحابہ موجود تھے۔ جو اسی اعزازی لقب سے مشہور تھے اور ان کے نام تک گنوائے جا سکتے ہیں ۔ مثلاً

۱ـــ **مُدرس، مُبلغ اور قاری** : وہ صحابہ کرامؓ تھے ، جو درس گاہِ صفہ میں زیرِ تعلیم رہا کرتے تھے ان میں کچھ صحابہؓ تو یہاں مستقلاً رہائش پذیر تھے ۔ کچھ ایسے بیرونی صحابہ تھے ، جو چند دن کے لئے یہاں رہ کر تربیت و تعلیم حاصل کرتے تھے اور کچھ صبح سے شام تک رہ کر چلے جاتے تھے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک انصاری سے باری مقرر کر رکھی تھی ۔ ایسے صحابہؓ کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ قبیلہ رعل اور ذکوان کے لوگوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے قبیلوں کے لئے مبلغوں کا مطالبہ کیا ۔ تو آپ نے ستر صحابہؓ برائے تدریس و تبلیغ ان کے ہمراہ بھیج دئیے تھے (جنہیں بعد میں انہوں نے دھوکہ سے شہید کر دیا تھا) لہٰذا ایسے مبلغین ، مدرسین ، اور قاری صحابہؓ کے نام گنوانا بھی دشوار ہے۔

۲ـــ **مُحدثین** : ایسے تمام صحابہ کرامؓ جو کثیر الروایۃ ہیں ، محدثین تھے ۔ کثیر الروایۃ سے مراد وہ اصحاب ہیں جنہوں نے ایک ہزار سے زیادہ احادیث روایت کی ہیں اور وہ یہ ہیں ۔ ۱ ـ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ تعداد مرویات (۵۳۷۴) ۲ ـ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (۲۲۱۰) ۳ ـ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (۱۶۳۰) ۴ ـ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ (۱۶۶۰) ۵ ـ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ (۱۵۴۰) ۶ ـ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ (۱۲۸۶) ۷ ـ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ (۱۱۷۰) وغیرہم ۔

اور حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کو تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ " میں جانتا ہوں کہ تم میری حدیثوں کے سب سے زیادہ مشتاق ہو ۔" (بخاری ، کتاب العلم)

۳ـــ **فقیہہ** ـــ صحابہ وہ تھے جن کے متعلق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ان چار حضرات سے قرآن سیکھو اور وہ چار حضرات یہ ہیں : ۱ ـ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ۲ ـ حضرت سالم مولیٰ

ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ ۳۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور ۴۔ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ (بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن)

۵۔ ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فقیہہ تھے۔ جن کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا تھی کہ "الٰہی انہیں قرآن کی حکمت سکھلا دے۔"

۶۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا شمار بھی اکابر فقہاء صحابہ میں ہوتا ہے۔ ترمذی کی روایت کے مطابق جب کبھی صحابہ کسی مسئلہ کو حل نہ کر سکتے، تو آپ کے پاس آتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس مسئلہ کا حل مل جاتا۔

علاوہ ازیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی فقہاء میں شمار ہونے ہوتے ہیں۔

۴۔ **مفتی** : حضرت صفوان بن سلیم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دورِ نبوی میں درج ذیل صحابہ کرامؓ فتوےٰ دیا کرتے تھے۔

وَ لَمْ يَكُنْ يُفْتِىْ فِىْ زَمَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيْرُ عُمَرَ وَ عَلِىٍّ وَ مُعَاذٍ وَ اَبُوْ مُوْسٰى (تاریخ الفقہ ص۱۵)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چار آدمیوں کے سوا کوئی فتوےٰ نہ دیتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

(قاضی ظہور الحسن، عبد الصمد صارم)

۵۔ **قاضی** : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مملکتِ اسلامیہ کے مختلف صوبوں میں جو عمال مقرر کئے وہ سب کے سب قاضی بھی تھے اور وہ یہ ہیں :

۱۔ مکہ مکرمہ میں عتاب بن اسید انصاری رضی اللہ عنہ ۲۔ طائف میں مالک بن عوف اور عثمان بن ابی العاص ۳۔ بحرین، ابو العلاء الحضرمی رضی اللہ عنہ ۴۔ صنعاء (یمن) بازان انجمی، مہاجر بن امیہ اور ابان بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ ۵۔ عمان، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ۶۔ نجران، ابو سفیان بن حرب رضی اللہ عنہ ۷۔ السواحل ابو موسےٰ اشعری رضی اللہ عنہ ۸۔ یمن، معاذ بن جبل اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ۹۔ وادی القریٰ، عمرو بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ ۱۱۔ تیماء، یزید بن ابی سفیان (صحیح بخاری، کتاب اخبار الاحاد، باب ما کان یبعث من الامراء۔ بحوالہ اسلامی ریاست، ص ۱۴۲، مطبوعہ علماء اکیڈمی، لاہور۔)

۶۔ **صرف و نحو** : صرف و نحو کے قواعد کی اہلِ عرب کو قطعاً ضرورت نہ تھی۔ جب اسلام

حدودِ عرب سے باہر پھیل گیا اور غیر عرب قرآن پڑھنے میں اعراب کی غلطیاں کرنے لگے، تو اس علم کی ضرورت پیش آئی، تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں اس علم کی تدوین شروع ہو گئی۔ چند ابتدائی قواعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وضع کیے باقی کام حضرت اسود دؤلی کے سپرد کر دیا جنہوں نے اس علم کی ابتدائی تدوین کی۔

یہ پوری تصریحات پڑھنے کے بعد اب بتلائیے کہ دورِ نبویؐ یا دورِ صحابہؓ میں صوفی کون تھا؟ جو اس لقب سے پکارا گیا ہو؟ نیز علم و فن تصوف و سلوک کی تدوین کس صحابی نے کی ہے؟ اگر ان باتوں کا جواب نفی میں ہو تو بتلائیے کہ بدعت اور کسے کہتے ہیں؟ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ آج جس "صحیح اسلامی تصوف" کا تصور پیش کیا جانے لگا ہے، اس کے کچھ اصول کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں اور یہ اصول صحابہ کرامؓ کو بھی معلوم تھے۔ پھر بعض صحابہ اور تابعین نے انہی اصولوں پر زیادہ توجہ مبذول فرمائی۔ تزکیہ نفس کے لیے ان کا اپنا ایک مخصوص طریق عمل تھا، جس پر علماء کو بھی چنداں اعتراض نہ تھا اور ایسے حضرات عابد، زاہد یا صالح کہلاتے تھے۔ سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ آخر بعد کے لوگوں کو صوفی کا لقب اختیار کر کے اپنا الگ تشخص قائم کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ وہ کون سی مابہ الامتیاز باتیں ہیں، جو ان زہاد، عباد اور صالحین میں نہ تھیں مگر بعد میں اُن کے جانشین "صوفیہ" میں آگئیں۔ بس یہی باتیں ہماری اس کتاب کا موضوع ہیں اور یہی باتیں بعض صورتوں میں صرف بدعت ہی نہیں، بلکہ کفر و شرک تک پہنچ جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس فن کی بے شمار ایسی اصطلاحات ہیں۔ جن کا کتاب و سنت میں سراغ تک نہیں ملتا۔

کیا تصوف دین کا اہم شعبہ ہے؟

یہ تین اصولی باتیں بیان کرنے کے بعد مولانا اللہ یار خان صاحب فتح الباری کے حوالہ سے ایک روایت پیش کرتے ہیں کہ

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو منافقین کے نام معلوم تھے اور دیگر کئی آئندہ امور کا علم تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو کشف و الہام اور علم الاسرار سے وہ وافر حصہ ملا، جو دوسروں کو نہیں ملا، لہٰذا چوتھی اصولی بات یہ فرمائی کہ تصوف و احسان دین کا اہم شعبہ ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک شے ثابت ہو جائے، تو وہ اپنے تمام لوازمات کے ساتھ ثابت ہو جاتی ہے اور الہام و کشف کا ثابت ہونا تصوف کے لوازمات سے ہے۔ اس لئے دین کو تسلیم کرنے کے ساتھ تصوف و احسان کو تسلیم کرنا پڑے گا، اسے تسلیم کیا، تو کشف و الہام کو ماننا پڑے گا۔ کیونکہ یہ لازم و ملزوم ہیں۔ (ایضاً، ص ۱۹۰)

مولانا موصوف کا یہ بیان کئی لحاظ سے محل نظر ہے۔ مثلاً:

۱۔ مولانا موصوف کو خود بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ کشف و الہام کا صحیح ہونا ضروری نہیں (دلائل السلوک، ص ۷۱) لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا علم چونکہ یقینی طور پر صحیح تھا، لہٰذا وہ ان کا ذاتی کشف و الہام نہ تھا، بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل شدہ علم تھا، جو آپ کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی عطا کیا تھا۔

۲۔ آپ فرماتے ہیں کہ چونکہ الہام و کشف، تصوّف کے لوازمات سے ہے اور یہ الہام و کشف، جوگیوں، ہندوؤں، سکھوں، کافروں اور شیطانوں تک کو بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے لوگ بھی اہل تصوّف اور صُوفی کہلا سکتے ہیں اور یہی مفہوم ہے اس مقولہ کا، جو صوفیہ میں بکثرت مشہور ہے کہ "اَلصُّوْفِیُّ لَا مَذْھَبَ لَہٗ" لیکن اس صغریٰ سے یہ نتیجہ پیش کرنا، "لہٰذا دین کے ساتھ تصوف و احسان کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا"، کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

۳۔ تصوّف اور احسان کو ہم معنی قرار دینا بھی غلط ہے۔ اب اگر صوفیا کے اکابرین یا متاخرین میں سے عبدالحق محدث دہلوی[۱] وغیرھم احسان سے مراد تصوّف ہی لیں، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مفہوم کو صحابہ کرامؓ کیوں نہ سمجھ سکے۔ صحابہ کرام کی کثیر تعداد محسنین ضرور تھی۔ ارشاد باری ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُھٰجِرِیْنَ	مہاجرین و انصار میں سے جن لوگوں نے پہلے ایمان لانے
وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ	میں سبقت کی، پھر وہ لوگ جنہوں نے احسان کے ساتھ

---

[۱] عبدالحق محدث دہلوی نے حدیث جبریل کی شرح میں امام مالکؒ کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

قَالَ الْاِمَامُ مَالِكٌ: مَنْ تَصَوَّفَ وَلَمْ	حضرت امام مالکؒ نے فرمایا: "جس نے فقہ کے بغیر تصوّف
یَتَفَقَّهْ فَقَدْ تَزَنْدَقَ وَمَنْ تَفَقَّهَ وَلَمْ	حاصل کیا، وہ زندیق ہوا۔ اور جس نے تصوّف سیکھے
یَتَصَوَّفْ فَقَدْ تَفَسَّقَ وَمَنْ جَمَعَ بَیْنَھُمَا	بغیر فقہ کا علم حاصل کیا، وہ فاسق ہوا اور جس نے دونوں کو
فَقَدْ تَحَقَّقَ (دلائل السلوک، ص ۲۰)	جمع کیا، وہ محقق ہوا۔

امام مالکؒ کے اس قول سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ تصوّف کا علم یا فن حاصل کرنا دین کی تکمیل کے لئے نہایت ضروری ہے۔

۲۔ عبدالحق محدث دہلوی چونکہ دونوں چیزوں کے ماہر ہیں لہٰذا آپ فی الواقع محقق ہوئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ قول امام مالکؒ کا ہو نہیں سکتا اور خواہ مخواہ ان کے سر تھوپ دیا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ امام مالکؒ تو ۱۷۹ھ میں فوت ہو جاتے ہیں جبکہ ابھی صوفی کا لفظ بھی عالم وجود میں آیا تھا۔ فن تصوف تو بہت بعد کی پیداوار ہے۔ یہ محدث اور محقق صاحب کا اپنا خیال تھا۔ جو انہوں نے امام مالکؒ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اسی لئے اس کا حوالہ بھی درج نہیں۔

بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوا عَنْهُ ان کی پیروی کی، اللہ ان سب سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ (۹/۱۰۰)

لیکن تمام صحابہ میں سے صوفی ایک بھی نہ تھا، لہٰذا احسان سے تصوف مراد لینا دُرست نہیں۔

صُحابہ کرامؓ صُوفی کیوں نہ کہلائے؟

صحابہ کرامؓ میں سے کسی صحابی کے صُوفی کے لقب سے ملقب نہ ہونے کا جواب سب سے پہلے ابوُالنصر سراج طوسی (م ۳۷۸ھ) نے اپنی کتاب "اللمع" میں دیا۔ اور اسی جواب کو بعد میں آنے والے مصنفین دُہراتے چلے آرہے ہیں اور وہ جواب یہ ہے: "اصحاب رسول کریم ﷺ کے لئے دوسرا کوئی تعظیمی لفظ ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کے لئے سب سے بہتر فضیلت آپؐ کا اصحاب ہونا تھا۔ اس لئے جس شخص کو صحابی کے لقب سے ملقب کردیا۔ اس کے فضائل کی انتہا ہوگئی۔ اس کے لئے کسی اور لفظ کی ضرورت ہو ہی نہیں سکتی۔" (خلاصہ تصوفِ اسلام، ص ۷)

اب اس جواب میں جتنا وزن ہے وہ آپ خود ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ صحابیت کی فضیلت میں تو سب صحابہ کرام برابر ہیں۔ پھر کسی صحابی کا مفسر، محدث یا فقیہہ ہونا صحابیت سے زائد فضائل ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ صوفی ہونا بھی کوئی زائد فضیلت ہے، جو کسی صحابی کو میسر آئی ہو؟ ابوالنصر سراج کے اس جواب سے یہ بات ضرور واضح ہوجاتی ہے کہ صحابہ کرام میں سے کوئی صحابی بھی اس لقب سے ملقب نہیں ہوا اور یہ دورِ صحابہ ۱۱۰ھ تک پھیلا ہوا ہے۔

۵ اب اگر احسان کے لفظ سے تصوف کو الگ کردیا جائے اور اس کے ساتھ اس کا مترادف لفظ سلوک بھی ملا دیا جائے، تو تصوف وسلوک جب بذاتِ خود ہی دین کا کوئی شعبہ قرار نہیں پاتا، تو اس کے لوازمات یعنی منازل سلوک، مقامات و احوال اور ان کی لاتعداد اصطلاحات مثلاً جمع تفرقہ، فنا، بقا، سیر، کشف، مشاہدہ، توحید وتجرید، صحو وسکر وغیرہ وغیرہ کا بھی مولانا موصوف کے بیان کردہ اصول کے مطابق دین سے کچھ تعلق نہ رہا۔

اب اگر اس تصوف کو اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے بعض بزرگوں کی کتابوں سے مثلاً شاہ ولی اللہ (م ۱۱۷۶ھ) کی تفہیمات سے یا قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵ھ) کی تفسیر مظہری سے یا امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کی عبارت یا حافظ عزالدین محمود (م ۶۸۶ھ) کی تفسیر جمل سے، اصولِ دین اور بمنزلہ روح فی

الجسد اور اس کا حصول فرضِ عین قرار دیا جائے اور اس کا تواتر ثابت کر دکھایا جائے تو ہم ایسی مابعد کی پیدا کردہ شریعت اور تواتر کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔

عالم پر عابد کی فضیلت کی کشفی دلیل

اب ان لوگوں کا دعوے یہ ہے کہ راہِ سلوک پر چلنے والا کوئی شخص بھی عالم اور فقیہہ سے افضل ہوتا ہے اس کی پوری وضاحت کے لئے شیخ موفق کا "کشف و مشاہدہ" ملاحظہ فرمائیے۔

"نقل ہے کہ حضرت شیخ موفق نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص بہشت میں کھڑا ہے جو نیک بخت لوگوں کو بہشت کی طرف بلاتا ہے اور بدبختوں کو اس کے قریب نہیں آنے دیتا۔ اس کے بعد ایک شخص کو دیکھا، جو تخت پر بیٹھا ہے اور اس کے دونوں طرف دو فرشتے ہیں۔ ایک اس کے منہ میں بہشت کا کھانا ڈالتا ہے اور کہتا ہے اے وہ شخص جس نے بہشت کے کھانوں کی خاطر دنیا کے کھانے نہیں کھاتے، اب بہشت کا کھانا کھا۔ دوسرا اس کے منہ میں بہشت کی شراب ٹپکاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ تو نے بہشت کی شراب کی خاطر دنیا کی شراب نہیں پی، اب بہشت کی شراب سے لطف اٹھا۔ اس کے بعد ایک اور شخص کو دیکھا جو عرش پر آنکھیں لگائے کھڑا ہے اور بہشت کے کھانے اور شراب کی اسے بالکل خواہش نہیں ہے۔ میں نے پوچھا یہ کون ہیں، ہاتف نے کہا "جو بہشت کے دروازے پر کھڑا ہے اور نیک بختوں کو بہشت کی طرف بلاتا ہے اور بدبختوں کو اس کے قریب نہیں آنے دیتا، وہ امام احمد بن حنبلؒ ہیں اور جو تخت پر بیٹھا ہے اور فرشتے اس کے منہ میں کھانا اور شراب ڈالتے ہیں وہ بشر حافی ہیں، جو بہشت کے کھانے اور شراب کی امید پر تمام عمر روزہ دار رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی ہے اور جو عرش پر آنکھیں لگائے کھڑے ہیں وہ معروف کرخیؒ ہیں، جو بہشت کی امید اور دوزخ کے خوف سے بے نیاز، محض اللہ تعالیٰ کے دیدار کی امید پر روزہ دار رہے ہیں۔ پس خدا نے حجاب اٹھا دیا ہے اور آپ ہمیشہ اس کے دیدار میں محوِ حیرت رہتے ہیں۔" (مرشدِ کامل، ص ۳۶، ۳۷)

دیکھئے یہ روایت علماء اور صوفیاء کے مراتب کے متعلق صوفیاء کے نظریات کی کیسی صحیح ترجمانی کر رہی ہے۔ اب بشر حافی، جن کا امام احمد بن حنبلؒ کو مرید بتایا جاتا ہے، وہ بزرگ ہیں، جن سے کسی نے کہا تھا کہ میرے پاس دس ہزار درہم ہیں اور میں حج کو جانا چاہتا ہوں، تو آپ نے فرمایا۔ "تو حج کو نہیں جاتا سیرِ تفریح کو جاتا ہے۔ یہ رقم حاجت مندوں میں بانٹ دے، تو تیرے اس ایک حج سے ہزار گنا بڑھ کر اس کا درجہ ہوگا۔" (مقربانِ حق، ص ۸۰)

بھلا امام احمد بن حنبلؒ جیسے محدث اور فقیہہ ایک ایسے بزرگ کی بیعت کر سکتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے فریضہ کو محض ایک مستحسن فعل کے عوض ساقط کر رہا ہے، بلکہ اس کا درجہ ہزار گنا زیادہ بتلاتا ہے۔ پھر بشر حافیؒ کے اور بھی کئی واقعات تذکرہ میں موجود ہیں، جو سنت کے صریح خلاف ہیں۔ مثلاً عمر بھر روزہ دار رہنا۔

رہا معاملہ معروف کرخیؒ کا، تو یہ وہ خود کہتے ہیں کہ "بہشت کی آرزو کرنا بغیر عمل کے اور شفاعت کی امید رکھنا بغیر نگہداشت کے آدمی کے نفس کا فریب اور غرور ہے۔" (مقربانِ حق، ص ۱۸۶) لیکن درج بالا اقتباس انہیں شریعت سے بے نیاز ثابت کر رہا ہے۔ یہ ہیں مندرجہ بالا روایت کے تضادات۔

عابد پر عالم کی فضیلت کے دلائل

اب دیکھئے رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمایا کہ:

اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ

عالم لوگ ہی انبیاء کے وارث ہیں۔ (ابو داؤد، کتاب العلم، باب فضل العلم)

یہاں علماء کا ذکر فرمایا ہے۔ عُبّاد یا زہاد و صالحین (جیسا کہ اس دور میں لوگ موسوم تھے) کا ذکر نہیں فرمایا پھر آپؐ نے عالم اور عابد یا زاہد کے مراتب کا فرق ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

وَاِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلٰى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ

عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے، جیسے چودھویں رات کا چاند تمام ستاروں پر فضیلت رکھتا ہے۔ (احمد، ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ، دارمی، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب العلم، فصل الثانی)

تیسری روایت یوں ہے:

ذُكِرَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلَانِ اَحَدُهُمَا عَابِدٌ وَالْاٰخَرُ عَالِمٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِيْ عَلٰى اَدْنَاكُمْ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عليه وسلم اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهٗ وَاَهْلَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةَ فِيْ جُحْرِهَا

رسول اللہ ﷺ سے دو آدمیوں کا ذکر کیا گیا۔ جن میں سے ایک عابد تھا، دوسرا عالم۔ آپؐ نے فرمایا کہ "عالم عابد پر ایسی فضیلت رکھتا ہے۔ جیسا کہ میں تم سے ادنیٰ آدمی پر فضیلت رکھتا ہوں۔" اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: "تحقیق اللہ اور اس کے فرشتے اور آسمانوں اور زمین کی ساری مخلوقات، یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے سوراخوں میں اور مچھلیاں اس کے لئے دعائے خیر کرتی ہیں۔ جو

وَحَتَّی الْحُوْتَ لَیُصَلُّوْنَ عَلٰی مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَیْرَ" لوگوں کو بھلائی سکھاتا ہے۔

(ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب العلم، الفصل الثانی)

اب عالم اور عابد کے متعلق ایک فیصلہ صوفیاء کا ہے۔ دوسرا حضور اکرم ﷺ کا۔ تقابل آپ خود کر لیجئے اور فیصلہ کر لیجئے کہ قابلِ حجت کس کا فیصلہ ہو سکتا ہے؟

۳۔ عابد کی مجاہد پر فضیلت

اس ضمن میں تفصیلی بحث باب نمبر ۴ صوفیاء کے مخصوص مسائل کے تحت بعنوان "جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر" میں دیکھئے۔ صوفیاء کا یہ نظریہ ہے کہ ریاضتِ نفس جہادِ اکبر ہے اور جہاد بالسیف جہادِ اصغر، یعنی ریاضت نفس و مجاہدہ، جہاد فی سبیل اللہ سے افضل اور بہتر ہے۔ عنوان مندرجہ میں اس نظریہ کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ باطنی علوم کی شرعی علوم پر فضیلت

چونکہ صوفیاء کے اکثر اعمال و عقائد شریعتِ مطہرہ کے صریح برخلاف ہوتے ہیں، بلکہ بسا اوقات دائرہ اسلام سے ہی خارج کر دیتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے مسلمانوں میں مقبول ہونے کی خاطر اسلام سے علی الاعلان بیزاری کا اعلان تو نہیں کیا۔ البتہ ایسی تدبیریں ضرور اختیار فرمائیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی بچ رہے۔ اسی سلسلہ میں ہم ان کا قرآن کریم کی تفسیر و تاویل کا انداز اور موضوع احادیث کا ذکر آئندہ چل کر پیش کریں گے منجملہ ان تدابیر کے ایک تدبیر ظاہری علم اور باطنی علم کی اصطلاح بھی ہے اور یہ کہ باطنی علم ظاہری علم سے افضل ہوتا ہے۔

باطنی علوم کے حصول کے ذرائع

ظاہری علم کا مفہوم تو بالکل واضح ہے، یعنی وہ علم جو قرآن و حدیث سے حاصل ہوتا ہے۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ باطن کے علم کی کیا کیا صورتیں ہو سکتی ہیں اور وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ بذریعہ توجہ: ایسا علم جو درس و تدریس اور کتابوں سے حاصل نہ ہوتا ہو۔ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہو، جیسے ایک پیر سے اس کے کسی مرید یا خلیفہ کو حاصل ہوتا ہے۔

مثلاً: نقل ہے کہ ایک شخص نے حضرت احمد جامؒ کے پاس آکر عرض کیا: ''میں طالب علم ہوں، چونکہ کند ذہن ہوں اس لئے دقیق اور مشکل مسئلے میری سمجھ میں نہیں آتے۔'' آپ نے فرمایا: ''تمہارا نام کیا ہے؟'' عرض کیا ''عمر!'' فرمایا ''عمر! اپنے استاد کو میری طرف سے کہنا کہ کل میرے ہاں آکر طالب علموں کو سبق پڑھانا۔'' عمر نے پیغام پہنچا دیا۔ دوسرے دن عمر اور مولوی صاحب دونوں حضرت احمد جام کے تکیہ میں تشریف لائے۔ طالب علم سبق پڑھنے لگے۔ آپ نے عمر کو کہا: ''آج تم عبارت پڑھو'' جب آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا، تو عمر کے سینے میں علم کا دریا جوش مارنے لگا۔ عمر نے عبارت پڑھی اور عبارت کا مطلب ایسا بیان کیا کہ استاد اور طلبہ اسے سمجھ نہ سکے۔ تمام اہلِ مجلس حیران رہ گئے آپ نے فرمایا: ''عمر! یہ مطالب جو تم نے بیان کئے ہیں حاضرینِ مجلس اِن کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کسی قدر آسان اور سہل مطالب بیان کرو۔'' عمر نے پہلے کی نسبت آسان مطالب بیان کئے'' مگر اس کا استاد اور طلبہ اُن کو بھی نہ سمجھ سکے۔ آپ نے فرمایا: ''اس سے بھی زیادہ آسان مطلب بیان کر۔ کیونکہ حاضرینِ مجلس اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔'' عمر نے اس سے بھی زیادہ آسان اور سہل مطالب بیان کئے، تو اُس کے استاد اور حاضرینِ مجلس نے اُن کو کسی قدر سمجھ لیا۔'' (مرشدِ کامل، ص ۲۴)

تو یہ ہے باطنی علم جو ایک سینہ سے دوسرے سینہ میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ خود شیخ احمد جام کا علم کتنا وسیع ہوگا؟ اس طریقہ کے بعد کسی دینی درسگاہ یا یونیورسٹی کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ اگر حضور اکرم ﷺ کو اس علمِ باطنی کا علم ہوتا تو صفہ کی درس گاہ کبھی جاری نہ فرماتے۔

حضور اکرم ﷺ نے بھی حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے لئے تفقہ فی الدین کی دُعا فرمائی تھی۔ لیکن اُن کے بیان کردہ مطالب عوام سمجھتے تو تھے۔ پھر یہ دیکھئے کہ حضور اکرم ﷺ نے تو دُعا فرمائی تھی اور وہ بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوئی اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا سینہ کُھل گیا، لیکن یہاں صرف توجّہ سے ہی شیخ مذکور نے سینہ میں ایسے علوم بھر دیئے، جو کہ عوام کے فہم سے بُہت بالاتر تھے۔ جو بار بار کی تاکید کے بعد انسانی فہم کی سطح پر آتے اور اغلب خیال تو یہ ہے کہ شیخ موصوف ان علوم سے خود بھی واقف نہ تھے۔ دوسرے کے سینہ میں وہ کیا بھر سکتے تھے۔ لہٰذا اس کرامت کی حقیقت افسانہ سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہوتی۔

۲۔ حصولِ علم بذریعہ فیضِ عام

اب باطنی علم کا اس سے بھی عجیب تر واقعہ ملاحظہ فرمایئے:

''مختصر یہ ہے کہ ایک شخص حضرت (محمد اسمٰعیل لاہوری ،

المشہور میاں کلاں) کا مُرید تھا، شادی ہوئی تو اس عورت کو قرآن حفظ تھا۔ رات کو ہمبستری کے وقت عورت نے کہا کہ جب تک تو قرآن حفظ نہ کر لے میری صُحبت کے لائق نہیں۔ یہ بات سُن کر مرد گھبرایا اور حضرت کی خدمت میں آکر عرضِ حال کیا۔ فرمایا "کل فجر کی نماز کے وقت، جب ہم امام ہوں، تو ہمارے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑے ہونا اُس نے ایسا ہی کیا۔ بعد ادائے نماز جب حضرت نے سلام کیا اور نظرِ فیض اثر داہنی طرف کے نمازیوں پر پڑی، تو سب کے سب قرآن کے حافظ ہوگئے اور بائیں طرف کے ناظرہ۔ حافظوں میں وہ مرید بھی حافظ ہوگیا اور اپنے گھر میں آباد ہو کر تمام عمر حضرت کے عنایات کا شکریہ ادا کرتا رہا۔" (حدیقۃ الاولیاء ص ۱۷۶، تصنیف مفتی غلام سرور لاہوری)

اب بتایئے کہ ایسے باطنی فیض کا حضور اکرم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی میں بھی کوئی سراغ ملتا ہے اگر اس نظرِ فیض اثر کا نسخہ حضور اکرم ﷺ کے پاس ہوتا، تو ستر قاریوں کی شہادت پر اتنا افسوس کبھی نہ کرتے اور نہ ہی مہینہ بھر صبح کی نماز میں قبیلہ رعل اور ذکوان کے خلاف جنہوں نے دھوکہ سے ان قاریوں کو شہید کیا تھا، قنوت نازلہ پڑھتے۔

۳۔ بذریعہ کشف و مشاہدہ یا لدُنّی علم

کشف و مشاہدہ سے حاصل شدہ لدُنّی علم کی افضلیت سائیں توکل شاہ انبالوی کی زبان سے سنیئے:

"فرمایا، علم دو قسم کا ہے۔ ایک کسبی دوسرا لدُنّی۔ کسبی کی مثال ایک ہوہڑ کی سی ہے۔ جس میں جتنا پانی بھر دیا جائے اُسی قدر اس میں رہے گا۔ لوگ علم پڑھتے ہیں، جتنا پڑھتے ہیں اسی قدر رہتا ہے اور یہ مسائل بتاتے ہیں تو اسی میں سے دیکھ کر بتاتے ہیں۔ اور علم لدُنّی کی مثال ایک چشمہ کی سی ہے جس میں سے نہر کاٹ لی جائے، تو اب اس میں سے خود پیو، جانوروں کو پلاؤ، خواہ کسی جگہ صرف کرو، پانی اس میں سے کم نہیں ہوتا۔ یعنی جب دل کی طاقی کھُل جاتی ہے، تو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک نُور کا منبع دل میں آتا ہے اور خود بخود ساری باتیں دِل کے اندر سے اس کی سمجھ میں آتی رہتی ہیں کسی سے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ پھر فقیر، مولویوں سے نہیں بلکہ اپنے دِل سے فتویٰ لیتا ہے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۲۵۶)

کشفی علوم کی اجتہاد پر فضیلت

مولانا اللہ یار خان اپنی کتاب دلائل السلوک کے صفحہ ۱۸۱ پر لکھتے ہیں:

"صوفیائے کرام میں فقہاء مجتہدین کے مقابلہ میں ایک قوت زائد ہوتی ہے کہ وہ صاحب

کشف و الہام ہوتے ہیں۔ فقہاء محض ذاتی رائے سے مسائل کا استخراج کرتے ہیں اور یہ لوگ کشف و الہام کی روشنی میں اور کشف و الہام، اعلام و اطلاع من اللہ ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اعلام من اللہ محض ذاتی رائے سے افضل ہے۔ جس طرح قیاس و رائے کی صحت کا معیار یہ ہے کہ کتاب و سنت کے مخالف نہ ہو۔ اسی طرح کشف و الہام کی صحت کا معیار بھی کتاب و سنت کی موافقت ہے۔ بہرحال اس کی فوقیت مسلّم ہے۔"...... "میں ذاتی طور پر فقہائے مجتہدین کے اجتہاد کو صوفیاء کے کشف و الہام پر مقدم سمجھتا ہوں۔ اس کی دلیل صوفیاء کا تعامل ہے۔ تمام صوفیائے محققین، مجتہدین کے مقلد رہے ہیں پس فقیہہ کے اجتہاد کا مقدم ہونا ثابت ہوگیا۔" (دلائل السلوک، ص ۱۴۱)

اب دیکھئے کہ:

۱ مولانا موصوف کے اس اقتباس کے پہلے حصہ میں آپ فرما رہے ہیں کہ "کشف و الہام کی فوقیت بہرحال مسلّم ہے۔" اور دوسرے حصہ میں اپنا ہی ذاتی خیال یہ پیش فرماتے ہیں کہ میں آئمہ مجتہدین کے اجتہاد کو کشف و الہام پر مقدم سمجھتا ہوں تو پھر کشف و الہام کی فوقیت مسلّم کیسے ہوگئی۔ جب آپ خود ہی اسے مسلّم تسلیم نہیں فرما رہے، تو دوسرے اسے کیسے مسلّم سمجھیں گے؟

۲۔ آپ نے کشف و الہام کی برتری کی عقلی دلیل بھی پیش کر دی اور صوفیائے محققین کے تعامل سے اس عقلی دلیل کی خود ہی تردید[1] بھی فرما دی۔ جس سے معلوم ہوا کہ صوفیاء محققین کے نزدیک آپ کی عقلی دلیل

---

[1] چنانچہ ایک دوسرے مقام پر صاف لکھ دیا کہ: "جس طرح شریعتِ ظاہری میں اخبار علوم کے متعلق صحیح تمیز رکھنے والے علماء موجود ہیں۔ اسی طرح کشف و الہام میں بھی مہارت رکھنے والے صوفیاء عارفین موجود ہیں۔ البتہ یہ درست ہے کہ علوم ظاہریہ کو پرکھنے والے ماہرین بہت ہیں۔ مگر کشف و الہام کے ماہرین کم یاب ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ علوم کشفیہ و الہامیہ بھی خزانہ غیب کے علوم ہیں۔ دونوں میں فرق قطعی اور ظنی کا ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۱۱۳)

مولانا موصوف کے دونوں اقتباسات سامنے رکھنے سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ صوفیاء کے نزدیک علوم کشفیہ و الہامیہ کی اجتہاد پر فوقیت مسلّم ہے کیونکہ صوفیاء میں کشف و الہام کی ایک قوت زائد ہوتی ہے۔

۲۔ لیکن آپ ذاتی طور پر فقہا کے اجتہاد کو صوفیا کے کشف و الہام پر مقدم سمجھتے ہیں کیونکہ اکابر صوفیا کا تعامل آئمہ فقہاء و مجتہدین کی تقلید رہا ہے۔

۳۔ اجتہاد کو مقدم سمجھنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ علوم شرعیہ کو پرکھنے والے ماہرین علوم کشفیہ کی نسبت بہت زیادہ ہیں۔

۴۔ اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ گو علوم شرعیہ اور کشفیہ دونوں خزانہ غیب سے ہیں مگر علوم شرعیہ قطعی ہیں جبکہ علوم کشفیہ ظنی ہیں۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

درست نہیں اور عقلی دلیل کی کمزوری یہ ہے کہ کشف و الہام سب کے سب اعلام و اطلاع من اللہ ہی نہیں ہوتے من الشیطان بھی ہو سکتے ہیں۔ اب اگر کسی غلط فہمی یا حسنِ عقیدت کی بنا پر سب کچھ ہی من اللہ سمجھ لیا جائے، تو یہ ایک فاش غلطی ہے۔ اسی لئے صوفیاء محققین اپنے کشف و الہام پر فقہاء کے اجتہاد کو ترجیح دیتے ہیں اور مقلد رہے ہیں۔ البتہ وہ صوفیاء، جو محقق نہیں اور کثیر تعداد میں یہی لوگ ہیں، یہی سمجھتے ہیں کہ کشف و الہام کی فوقیت آئمہ مجتہدین کے اجتہاد پر بہر حال مقدم ہے۔ چنانچہ سائیں توکل شاہ انبالوی نے صاف فرما دیا کہ ایسا صاحب کشف و الہام "مولوی سے نہیں اپنے دل سے فتویٰ پوچھتا ہے۔" اور صاحب مرشد کامل فرماتے ہیں کہ:

۴۔ کشفی یا لدنّی علم بذریعہ عشق

"غلبہ محبت کے سبب جب اُس کے دل کا شیشہ علائق و عوائق کی کدورت سے پاک ہو جاتا ہے تو اس کے اور خدا کے درمیان باطن سے ایک راستہ کھُل جاتا ہے اور موانع کے زائل ہونے کے سبب اسے اپنے معشوق (خدا) سے ایک اتصال ہو جاتا ہے اور اسے تجلیات ہونے لگتی ہیں۔ اس مقام میں سالک کو حضرتِ عشق وہ عجیب و غریب علوم سکھلاتا ہے جن سے زبان آشنا نہیں اور وہ زبان کے بغیر انہیں بیان کرتا ہے۔" (مرشدِ کامل، ص ...)

اقتباسِ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ باطنی علوم کا استاد خدا نہیں کیونکہ وہ تو (نعوذ باللہ) معشوق ہے، بلکہ "حضرتِ عشق" ہے۔ پھر اِن علُوم کو بغیر زبان کے بیان کرنے کی صُورت بھی ہم جیسوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

۵۔ علم لدنّی کا حصُول بذریعہ حضرت خضر علیہ السلام

صاحب صوفیائے نقشبند عبدالخالق غجدوانی کے حالات

گذشتہ صفحہ کا بقیہ

تضاد بیانی لیکن اس دعوے کے باوجود جب صوفیاؒ کے عقائد پر بحث کی باری آتی ہے، تو مولانا موصوف آئمہ مجتہدین کے اجتہاد سے راہِ فرار اختیار کرنے لگتے ہیں۔ بحث یہ ہے کہ کیا رجال الغیب۔ جن، شیطان اور اولیاؒ و انبیاؑ کی ارواح وغیرہ کو دیکھا جا سکتا ہے جیسا کہ صوفیاؒ ایسا ہی اعتقاد رکھتے ہیں۔ اب امام شافعیؒ کا فتوٰے یہ ہے کہ "مدعی رویتِ جن کی شہادت بھی مردود ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۱۴۳) تو آپ اس پر طویل بحث کرنے کے بعد یہ نتیجہ پیش کرتے ہیں کہ یہ رویت بطورِ خرقِ عادت ہوتی ہے نہ کہ بطورِ عادت اور فتویٰ عادت پر ہوتا ہے۔

اب اس دلیل میں جتنا وزن ہے ... خود ملاحظہ فرمائیے۔ امام شافعیؒ کو بھی خوب معلوم تھا کہ جنوں کا دیکھنا بطورِ عادت نہیں۔ بطورِ خرق عادت ہی ہو سکتا ہے اور یہ ... سب کچھ سمجھتے ہوئے انہوں نے ایسا فتوٰے دیا تھا۔

قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اس کے بعد آپ (عبدالخالق غجدوانی م ۵۷۵ھ) اہل اللہ اور اولیاء اللہ کی جستجو میں مصروف ہو گئے حتیٰ کہ ایک دن خضر علیہ السلام سے آپ کی ملاقات ہوئی اور حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: "میں تم کو اپنی فرزندی میں لیتا ہوں اور تم کو ایک سبق پڑھاتا ہوں اگر تم اس کی پابندی اور مواظبت کرو گے، تو تمام اسرار باطنی تم پر کھل جائیں گے۔" پھر حضرت خضر علیہ السلام نے آپ کو وقوفِ عددی کی تعلیم دی اور فرمایا۔ حوض میں غوطہ لگاؤ اور دل سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہو۔" چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور اس کا ورد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ پر اسرار و رموز منکشف ہونے لگے۔" (صوفیائے نقشبندیہ ص ۱۳۵)

یہ وقوفِ عددی کیا بلا ہوتے ہیں؟ یہ تو کوئی علم لدنی کا ماہر ہی بتلا سکتا ہے۔ ہمارے ناقص خیال میں اس سے مراد عملیات کا وہ حصہ ہے۔ جس میں خانے بنا کر اس کو اعداد سے پُر کیا جاتا ہے[1]۔

۶۔ باطنی علم کا حصول بذریعہ باطنی معانی

ان لوگوں نے قرآن و حدیث کے لفظوں کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک ظاہری معانی، دوسرے اس کے باطنی یا اصلی معانی یا اس کی روح۔ باطنی معانی کو باطنی علم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ مولانا جلال الدین رومی اپنی مثنوی میں فرما رہے ہیں:

من ز قرآن مغز را برداشتم　　استخوان پیش سگاں انداختم

ترجمہ: میں نے قرآن سے مغز (اصل مطالب) اخذ کر لئے ہیں اور ہڈیاں جو بچ گئیں وہ میں نے کتوں (اہلِ ظاہر) کے آگے پھینک دی ہیں۔ اور مولانا روم نے اس "مغز" سے جو مثنوی تصنیف فرمائی اس کے متعلق عبدالرحمٰن جامی نے یہ دعویٰ کیا کہ:

مثنوئ معنوئ مولوی　　ہست قرآن در زبان پہلوی

مولوی (جلال الدین رومی) کی یہ مثنوی ہی حقیقت میں فارسی زبان میں قرآن ہے۔ حالانکہ لوگ اس مثنوی کو "فتوحاتِ مکیہ در فارسی" کہتے ہیں۔

پھر ان حضرات نے ان باطنی معانی کے لئے ایک حدیث بھی وضع کر ڈالی، جو یہ ہے:

اِنَّ الْقُرْاٰنَ لَہٗ ظَھْرًا وَ بَطْنًا وَ لِبَطْنِہٖ بَطْنٌ اِلٰی سَبْعَۃِ　　بیشک قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ پھر اس کے باطن کا ایک اور باطن ہے۔ سات بطنوں

---

[1] وقوف عددی کے متعلق مزید معلومات اس کتاب کے ساتویں باب "ولایت کی تعلیم" میں ملاحظہ فرمائیے۔

ابطنٍ وَفِي رِوَايَةٍ اِلٰى سَبْعِيْنَ تک اور ایک روایت میں ہے کہ یہ بطن ستر بطنوں

بَطْنًا (ریاض السالکین، ص ۳۰۲) تک ہے۔

دیکھا آپ نے ان صوفیاء نے اس وضعی حدیث کے ذریعہ باطنی معانی کے لئے کس قدر گنجائش پیدا کرلی ہے۔

کسی عمل کے ظاہر اور باطن کے ہم بھی قائل ہیں۔ مثلاً نماز کی ظاہری صورت وہ ہے، جو رسول اللہ نے سکھلائی اور نماز کا باطن یہ ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (۲۹/۴۵) نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ بالفاظ دیگر تقویٰ پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح روزہ کی ظاہری شکل سحری سے افطاری تک کچھ نہ کھانا پینا ہے جبکہ اس کا باطنی معنی ضبطِ نفس ہے۔ جو حدیث میں بالوضاحت مذکور ہے۔ گویا ہر عمل کا ظاہر بھی اور اسی طرح باطن بھی شریعت نے خود ہی بتلا دیا ہے۔ باطنی معنی باہر سے تلاش کرنے کی کسی مسلمان کو قطعاً ضرورت نہیں۔ لیکن ان حضرات نے باطنی معنی کے لئے تصوف کی نئی اصطلاحات اور اسرار و رموز کا ایک ڈھیر سامنے لاکھڑا کیا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے اسرار و رموز اور پہیلیوں کی زبان)۔

باطنی علم کو قلبی علم بھی کہتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں ظاہری علم کو قلمی علم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علمائے ظاہر کو اہل قال اور صوفیوں کو اہل حال سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان صوفیوں کے ہاں مشہور مقولہ ہے:۔

علم درسی نہ بود در سینہ بود یعنی علم پڑھانے کی چیز نہیں (اصلی علم تو سینہ میں ہوتا ہے۔

پھر مولانا روم نے یوں بھی فرمایا کہ:

علم حق در علمِ صوفی گم شود ایں سخن کے باورِ مردم شود

ترجمہ: لوگوں کو اس بات کا کیونکر یقین ہو کہ حقیقی علم تو صوفی کے علم میں گم ہوتا ہے۔

یعنی حقیقی علم انہی صوفیوں کے پاس ہوتا ہے۔ جس کا شریعت یا کسی نبی اور رسول کی تعلیم سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ اس بات کو دوسرے لوگ کیسے باور کر سکتے ہیں۔؟

حصولِ علم کا ذریعہ صرف تعلیم و تعلّم ہے

اب مولانا روم کے اس فکر کے علی الرغم رسول اللہ کا ارشاد ملاحظہ ہو آپ نے فرمایا:

اِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ (بخاری تعلیقاً، ص۱، ج۱) یعنی علم پڑھنے پڑھانے سے حاصل ہوتا ہے۔

آپ کے اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ علم کے حصول کا ذریعہ تعلیم و تعلم ہے۔ جسے صوفیاؔ درخورِ اعتنا سمجھتے ہی نہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ صوفی نے علومِ شریعت پر جو تعلیم و تعلم سے حاصل ہوتے ہیں۔ یوں تبصرہ فرمایا کہ:

اِذَا رَأَیْتَ الصُّوْفِیَّ یَشْتَغِلُ بِحَدَّثَنَا فَاغْسِلْ یَدَكَ مِنْهُ

جب تم کسی صوفی کو دیکھو کہ وہ حدثنا اور اخبرنا کے چکر میں پڑگیا ہے تو بس اس سے ہاتھ دھولو۔

(مدارج السالکین، ص ۲۱۹، ج ۴، بحوالہ تزکیہ نفس، ص ۵۶)

اب فرمائیے ایسا اعتقاد رکھنے والے حضرات کو شرعی علوم بھلا کیسے ہضم ہو سکتے ہیں؟ اسی لئے صوفیوں میں یہ مقولہ بھی بہت مشہور ہے۔

اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَكْبَرُ

یعنی علم (شریعت) ہی ادین طریقت یا مشاہدہ حق میں اسب سے بڑا حجاب ہے۔

اور کسی صوفی نے یہ بھی کہہ دیا کہ:

اَلْجَهْلُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الْعِلْمِ

یعنی جہالت مجھے علم سے زیادہ عزیز ہے۔

کشفی علوم اور لطائف

یہ تفصیل تو علمِ ظاہر یا شریعت کی نفی تھی۔ اب باطنی علم کا اثبات ملاحظہ فرمائیے۔ عبدالعزیز قادری فرماتے ہیں:

"علم تصوف نے اس دولت کا اتا پتا لگایا کہ جسمِ انسانی میں اندرونی اعضاء، معدہ، جگر، تلی وغیرہ کے علاوہ سات[1] غیر مادی لطیف اعضا بھی پائے جاتے ہیں، جو یہ ہیں۔ نفس، روح، قلب، سر، خفی، اخفی، انا۔

اگر اللہ اللہ کی ضربوں سے ایک لطیفہ بھی روشن کر لیا جائے، تو کشف حاصل ہو۔ کائنات کی چیزیں فرمانبرداری کریں، ساتوں (؟) روشن ہو جائیں تو کیا کہنا۔"

باطنی علوم کی کتب اور ان کے مصنفین

"تصوف کی کتابیں غیر مادی بھی ہوتی ہیں جو ان مادی کاغذوں پر چھاپہ خانوں میں

[1] اکابر صوفیاء لطائفِ خمسہ کا ذکر کرتے ہیں، جو یہ ہیں: (۱) قلب اس کا فعل ذکر ہے (۲) روح کا فعل حضور ہے (۳) سری کا مکاشفہ (۴) خفی کا شہود و مشاہدہ اور فنا اور (۵) اخفیٰ کا معائنہ اور فنا الفنا۔ (دلائل السلوک ص ۴۱) لیکن قادری صاحب کے لطائف زیادہ بھی ہیں اور مختلف بھی۔

نہیں چھپتیں۔ ان کتابوں کو نطابت کہتے ہیں۔ نطابت وہی شخص حاصل کر سکتا اور پڑھ سکتا ہے جو اپنے لطائف کو روشن کرے۔ چند ایک نطابوں کے نام ملاحظہ ہوں:

شبابُ المعرفت، مصنفہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، مجاہدۃ الوحدۃ، مصنفہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، کلیاتِ حیات، مصنفہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ، نوی القدرۃ، مصنفہ مولائے علی رضی اللہ عنہ، کربۃُ الوحدت، مصنفہ غوث پاکؒ"

(سرچشمۂ حیات، عبدالعزیز قادری، ص ۶۸، مطبوعہ تبلیغ سوسائٹی، قصور پورہ، لاہور)

دیکھا آپ نے کس طرح ان لوگوں نے خلفائے راشدینؓ کو بھی اس میدان میں لاگھسیٹا ہے اور یہ کتابیں بھی وہی شخص پڑھ سکتا ہے، جو دینِ طریقت پر ایمان لاچکا ہو اور اسی راہ پر گامزن ہو۔ ان صوفیاء کے تمام اسرار و رموز، خواہ کسی بھی لطیفہ سے متعلق ہوں، انہی مادی کاغذوں اور کتابوں میں ثبت ہو چکے ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے عارف نے بھی ان نطابات کا ذکر تک نہیں کیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان نطابات اور ان کے مصنفین کا ماخذ و مرجع کیا ہے۔

باطنی علوم کیوں افضل ہیں؟

عِلمِ حدیث مُردوں کا علم ہے

صوفیوں کے "سلف صالحین" کی زبان سے ملاحظہ فرمالیجئے۔ بایزید بسطامی شریعتِ اسلامیہ پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اَخَذْتُمْ عِلْمَكُمْ مَيْتًا عَنْ مَيِّتٍ وَ اَخَذْنَا عِلْمَنَا عَنِ الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ: يَقُوْلُ اَمْثَالُنَا: حَدَّثَنِيْ قَلْبِيْ عَنْ رَبِّيْ وَ اَنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ حَدَّثَنِيْ فُلَانٌ وَ اَيْنَ هُوَ؟ قَالُوْا مَاتَ، عَنْ فُلَانٍ وَ اَيْنَ هُوَ؟ قَالُوْا مَاتَ (فتوحاتِ مکیہ، ص ۳۶۵، ج ۱)

تم نے اپنا علم فوت شدہ لوگوں سے حاصل کیا ہے اور ہم نے اپنا علم اس ذات سے حاصل کیا ہے، جو ہمیشہ سے زندہ ہے اور اس پر کبھی موت نہیں آئے گی۔ ہم لوگ کہتے ہیں کہ میرے دل نے اپنے رب سے بیان کیا اور تم کہتے ہو کہ فلاں نے مجھ سے حدیث بیان کی، وہ کہاں ہے؟ جواب ملتا ہے مرگیا، پھر اس فلاں نے فلاں سے بیان کیا، تو وہ کہاں ہے؟ جواب وہی کہ مرگیا ہے۔

اور جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں:

اَحَبُّ لِلْمُبْتَدِيْ اَنْ لَّا يَشْتَغِلَ قَلْبُهٗ

بتدی کے لئے مستحب ہے کہ اس کا دل تین چیزوں میں

بِهٰذِهِ الثَّلَاثِ وَ اِلَّا تَغَيَّرَتْ حَالُهٗ :	مشغول نہ ہو (۱) کمائی کرنا (۲) علمِ حدیث طلب کرنا
الکسبُ وطلبُ الحدیثِ والتزوّج	(۳) نکاح کرنا۔ اور صوفی کے لئے یہ بھی مستحب ہے کہ
وَاَحَبَّ لِلصُّوفِیِ اَنْ لَا یَقْرَءَ وَلَا یَکْتُبَ۔	وہ لکھنا پڑھنا ترک کر دے۔ (قوت القلوب، ص ۱۳۵، ج ۴)

واضح رہے کہ قوت القلوب للشیخ ابو طالب مکی (م ۳۸۴ھ) تصوف کی امہاتِ کتب سے ہے تصوف کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کے لئے خورشید احمد گیلانی صاحب نے جن چودہ کتب کا انتخاب کیا ان میں سے ایک یہ قوت القلوب ہے۔

اب دیکھئے تین باتوں سے جنید بغدادیؒ بندی کو منع فرما رہے ہیں اور چوتھی بات کو مستحب قرار دے رہے ہیں کیا یہ چاروں باتیں شریعتِ اسلامیہ کی صریح خلاف ورزی نہیں۔ پھر جو لوگ طریقت کو شریعت کے تابع ثابت کرنے بیٹھ جاتے ہیں ان کی اس نیک آرزو کی خوشی ضرور ہے مگر بمصداق ؎

بہ بین تفاوت راہ از کجا ست تا بہ کجا

یہ وسیع خلیج کیونکر پاٹی جا سکتی ہے۔

اور شاہ ولی اللہ صاحب نے ان قلبی واردات کو بنیاد قرار دے کر ایک چہل حدیث کا مجموعہ مسمّٰی الدر الثمین بھی تیار کیا ہے، جو آپ کے والدِ ماجد شیخ عبدالرحیم حضور اکرم ﷺ سے علم حاصل کرتے تھے۔ اس مجموعہ میں سے بطور نمونہ ایک حدیث درج ذیل ہے سلسلہ اسناد بھی بغور ملاحظہ فرمایئے:

الحدیث الخامس عشر: اخبرنی	پندرھویں حدیث: مجھے میرے والد نے
والدی، انه کان مریضا فرای	خبر دی۔ وہ بیمار ہوئے تو حضور اکرم
النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی النوم	ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ حضور اکرم
فقال: کیف حالک یا بنی؟ ثم بشرہ	ﷺ نے پوچھا: بیٹا! کیا حال ہے؟ پھر
بالشفاء و اعطاہ شعرتین من شعور	مجھے شفا کی خوشخبری دی اور اپنی داڑھی کے دو بال
لحیته فتعافی عن المرض فی	بھی عنایت فرمائے۔ جب بیدار ہوئے
الحال و بقیت الشعرتان عندہ فی	تو وہ موجود تھے۔ ان میں سے ایک مجھے دیا
الیقظة فاعطانی احدھما فھی عندی	جو میرے پاس موجود ہے۔

اب بتلایئے جب باطنی علم میں اتنی خوبیاں ہوں تو روایت و درایت کے طول طویل چکروں میں

پڑھنے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ مسلمانوں کے جن کارناموں پر غیر مسلم بھی داد دینے پر مجبور تھے۔ ان صوفیوں نے اُن سب پر پانی پھیر دیا۔ اب نہ اس علم کے پڑھنے کی ضرورت ہے، نہ اس پر عمل کرنے کی۔ پھر باطنی علم افضل بھی ہے کیونکہ وہ مردوں سے نہیں، بلکہ خُدا یا نبی جیسی ہستیوں سے بلاواسطہ حاصل ہوتا ہے۔ اور اِن کے خواب میں دیئے ہوئے تبرکات بیداری میں بھی ان کے پاس موجود ہوتے ہیں۔

احادیث کو پرکھنے کا معیار

اور اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ احادیث کی صحت کو پرکھنے کا معیار صوفیاء کے نزدیک ان کا کشف ہے۔ وہ اپنے کشف کی رُو سے ایک صحیح الاسناد حدیث کو ضعیف اور ایک ضعیف یا موضوع حدیث کو صحیح قرار دے دیتے ہیں اور اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ اور اُن کی اپنی موضوعات بھی محض اسی لئے مقبول ہیں کہ ان پر ان کے اکابر نے مہرِ تصدیق ثبت کی ہے۔ یہ موضوع ہم تفصیل سے کسی دوسری جگہ زیرِ بحث لائے ہیں۔

برزخی احادیث اور عقیدہ حیات النبی

تمام تر صوفیاء میں یہ عقیدہ مسلّم ہے کہ پیر، فقیر اور عارف حضرات مرتے نہیں، بلکہ اس مادی عالم آب و گل سے پردہ فرما لیتے ہیں۔ اُن کی رُوح اصلاح اہلِ دنیا کے کاموں میں پہلے سے زیادہ مستعد ہو جاتی ہے۔ جب عام اولیاء اللہ کی زندگی کا یہ حال ہے، تو انبیاء اور بالخصوص آنحضور ﷺ تو اس طرح کی زندگی کے بہت زیادہ حقدار ہیں۔ مولانا اللہ یار خان صاحب نے اس سلسلہ میں اس حدیث سے استدلال فرمایا ہے کہ "جب آنحضرت ﷺ کی وفات ہو گئی، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے، آپؐ کے چہرہ سے کپڑا اٹھایا، بوسہ دیا اور فرمایا: موت واقع ہو گئی اب دوبارہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو موت نہیں دے گا" اس کا مطلب صحابہ نے تو یہ سمجھا کہ اب یوم البعث کو آپ اٹھائے جائیں گے۔ موت یہی تھی، جو واقع ہو چکی۔ پھر اس کے بعد دوسری موت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ قاعدہ صرف حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ہی مختص نہیں بلکہ قانون یا سنتِ الٰہی ہی یہ ہے کہ مرنے کے بعد دوسری بار موت کسی عام مسلمان تو درکنار، کسی کافر کو بھی نہیں آئے گی۔ لیکن مولانا موصوف نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے یہ نتیجہ نکالا کہ موت ایک لمحہ کے لئے واقع ہو چکی ہے۔ اب آپ کو دوبارہ زندگی مل چکی ہے اور دوبارہ

موت کبھی نہ آئے گی۔ اگر آپ کے اس استدلال کو درست فرض کر لیا جائے، تو بھی حضور اکرم ﷺ یا پیروں فقیروں کی کوئی مابہ الامتیاز نشانی واضح نہیں ہوتی کیونکہ کافر بھی مرنے کے ساتھ برزخی زندگی میں زندہ ہوتے ہیں، جنہیں عذاب دیا جاتا ہے۔

اس سے آگے صوفیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ بجسدِ عنصری اپنی قبر میں زندہ ہیں، پھر اس دنیا میں آتے جاتے ہیں۔ کسی مقام پر دربار بھی منعقد کرتے ہیں۔ جہاں اولیاء اللہ، جن کی دل کی آنکھیں وا ہوتی ہیں، وہاں جاتے اور آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کرتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ بجسدِ عنصری ان اولیاء اللہ کے پاس آتے ہیں اور ان اولیاء اللہ کو زیارت اور کلام سے مشرف فرماتے ہیں۔ اولیاء اللہ جیسے ملائکہ یا جنات کو دیکھتے اور ہم کلام ہوتے ہیں۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ کو بھی دیکھتے اور ان سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ اور روحانی بیعت بھی کرتے ہیں۔

اس عقیدہ پر یہ اعتراض ہوا کہ "اگر صوفیاء رسول کریم ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں، تو صحابی ہوئے اور جو کلام ان سے سنتے ہیں وہ حدیث ہوئی۔ پھر صوفیاء میں اور صحابہ میں فرق کیا رہ گیا؟ اس اعتراض کے جواب میں مولانا اللہ یار خان فرماتے ہیں کہ صحابیت کے لئے دو شرائط ہیں: (۱) احکامِ شرع کی پابندی اور (۲) اسی عالم آب و گل میں رسول اللہ کا شرف حاصل ہونا۔ لہٰذا صوفیاء صحابی کی تعریف میں نہیں آتے۔ رہا حدیث کا معاملہ، تو اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ اسی طرح کی "برزخی حدیث" سے کوئی نیا حکم ثابت نہیں ہو سکتا۔ سابقہ احکام کی تائید و تصدیق ہو سکتی ہے اور یہی کچھ صوفیاء کرتے ہیں کہ بیداری کے واقعہ کی تصدیق کرا لیتے ہیں۔" (دلائل السلوک، ص ۱۹۳)

چلئے یہ بھی طے ہوا کہ آپ کی مادی زندگی میں بیان کی ہوئی احادیث برزخی ملاقات میں تصدیق کرائی جا سکتی ہیں۔ کوئی نیا حکم ثابت نہیں ہو سکتا۔ اب مشکل یہ ہے کہ مولانا اللہ یار خان خود ہی اپنے بیان کردہ اصول کی خلاف ورزی کر جاتے ہیں۔ مثلاً اپنی اسی کتاب دلائل السلوک کے صفحہ ۱۵۶ پر فرماتے ہیں:

"سید محمد شاذلی کثرت سے حضور اکرم ﷺ کی زیارت کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور ﷺ! لوگ میری اس رویت کا انکار کرتے ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس نے تیری تکذیب کی وہ نصرانی، یہودی یا مجوسی ہو کر مرے گا۔" (دلائل السلوک ص ۱۵۶، بحوالہ طبقات شعرانی ج ۲، ص ۷۷)

واضح رہے کہ یہ برزخی حدیث مولانا اللہ یار خان اپنے عقیدہ کی تائید میں پیش فرما رہے ہیں اور آپ کی زیارت

فی الدنیا کے منکرین کا انجام بھی ایسا عبرت ناک بتلایا ہے جو شریعت میں فریضۂ حج کی استطاعت رکھنے کے باوجود حج نہ کرنے والوں کا بتلایا گیا ہے۔

دوسری برزخی حدیث بھی طبقاتِ شعرانی سے (۲: ۷۵) انہی شاذلی صاحب کی ہے اور اسی عقیدہ حیات النبیؐ کی مؤید ہے اور وہ یہ ہے:

"میں نے حضور اکرم ﷺ کی زیارت کی، مجھے حضور نے فرمایا "میں مُردہ نہیں ہوں۔ میری موت عبارت ہے۔ اس شخص سے پوشیدہ ہونا، جس کو اللہ کی طرف سے بصیرت حاصل نہیں ہے اور جسے اللہ تعالیٰ بصیرت دے، تو میں اسے دیکھتا ہوں اور وہ مجھے دیکھتا ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۱۶۷)

اب دیکھئے ان برزخی احادیث کے ذریعے احکام کا اثبات تو درکنار، عقائد کی بنیاد استوار ہو رہی ہے۔ اب یہاں سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ صحابہ کرام ؓ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی بصیرت دی تھی یا نہیں؟ اگر ان سے ایسی برزخی احادیث دجوان سے کم از کم اپنے اقوال تو ہو سکتے ہیں) کیوں منقول نہیں؟

۵۔ شریعت پر طریقت کی بالادستی

دینِ طریقت کا شریعت پر بول بالا کرنے کے لئے

۱۔ پہلے علمِ شریعت کو محو کرنا پھر علمِ طریقت حاصل کرنا

پہلا طریق یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ یہ صُوفی لوگ اِس میدان میں ہر نووارد کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ پہلے وہ علمِ شریعت کو دِل سے محو کر ڈالے۔ ورنہ وہ اس حلقہ میں شامِل نہیں ہو سکتا۔ یہاں ہم خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا ارشاد پیش کریں گے، جو اس حقیقت کی پوری وضاحت کر رہا ہے۔

۲۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کا ارشاد

"الغرض خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے یہ حکایت بیان فرمائی اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمایا کہ پیرانِ راہ میں سے ایک پیر تھا اور اس کا بیٹا محمد نامی صاحبِ علم اور مردِ اہل تھا۔ جب اُس نے چاہا کہ میں عالمِ طریقت میں آؤں، تو اس نے اپنے باپ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ درویش بنوں۔ اس کے باپ نے کہا کہ پہلے تو ایک چلّہ کر۔ اس نے کہا بہت اچھا۔ باپ کے فرماتے ہی چلّہ میں بیٹھ گیا۔ جب وہ تمام ہوا تو باپ کی خدمت میں آیا۔ باپ نے اس سے چند مسائل پوچھے۔ اُس نے سب کا جواب دیا۔ باپ نے

کہا ایک اور چلہ کرو۔ یہ چلہ تمہارے لئے سُودمند نہیں ہُوا۔ اس نے ایک چلہ اور کیا۔ پھر باپ کی خدمت میں آیا۔ باپ نے اس سے پھر چند مسئلے پوچھے۔ اُس نے کچھ کچھ جواب دیا۔ باپ نے کہا، بیٹا! ایک چلہ اور کرو۔ پھر اس نے تیسرا چلہ پورا کیا اور باپ کی خدمت میں آیا اور اس نے کچھ مسائل پوچھے۔ وہ لڑکا حق میں کچھ ایسا مشغول ہو گیا تھا کہ کسی کا بھی کچھ جواب نہ دے سکا۔ (فوائد الفواد، حصہ دوم۔ نظام الدین اولیا، مرتبہ خواجہ حسن دہلوی۔ ترجمہ غلام احمد بریاں، مطبع مجتبائی دہلی ۱۹۱۴ء، ص ۱۹۵)

اقتباس بالا سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ باپ کو اس بات کا خُوب علم تھا کہ قرآن و حدیث سے جب تک پیچھا نہ چھڑایا جائے۔ طریقت کی طرف پیش رفت محال ہے۔

۲۔ کم از کم تین چلوں میں شرعی علوم از خود محو ہو جاتے ہیں اور شرعی علوم کو محو کرنے کے لئے چلہ کشی ہی اس کا واحد علاج ہے۔

۳۔ پہلا چلہ تو بے کار ہی گیا کیونکہ لڑکے نے سب مسائل کے جواب دے دیئے اور ابھی اسے شرعی مسائل یاد تھے۔ دوسرے چلے کے بعد آدھا علم بھول چکا تھا اور تیسرے چلے کے بعد جب شرعی علوم کو یکسر بھُول چکا، تو یہی وقت حق میں مشغول ہونے کا مناسب وقت تھا۔ بالفاظِ دیگر شرعی علوم کے مقابلہ میں حق صرف علم طریقت ہے جو علوم شرعیہ کو بھلائے بغیر ہاتھ نہیں آتا۔

۴۔ علمِ طریقت کے حصول کے لئے جاہل لوگ زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ دینِ طریقت جہلائے کے طبقوں میں خُوب پنپتا ہے۔ کیونکہ یہی اُس کا صحیح میدان ہے۔

اب چند مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے۔

شیخ عبد القادر جیلانیؒ اور سابقہ علم

شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے متعلق مشہور ہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی کو ان کے چچا ابوالنجیب سہروردی شیخ موصوف کے پاس لائے اور عرض کیا میرا یہ بھتیجا علمِ کلام میں مشغول رہا کرتا ہے۔ ہر چند روکتا ہوں۔ اثر نہیں ہوتا۔ حضرت نے اُن سے مخاطب ہو کر پوچھا: "عمر! کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں انھوں نے نام سناتے۔ حضرت نے سُن کر اپنا دستِ مبارک ان کے سینہ پر پھیرا، روایت کے راویوں نے آگے خود شیخ کا پیغام نقل کیا ہے کہ:

"ہاتھ کا پھیرنا تھا کہ بخدا مجھے ایک لفظ بھی اِن کتابوں کا یاد نہ رہ گیا۔ خُدا نے تمام مسائل کلامیہ میرے دِل سے محو کر دیئے اور قلب علم لدُنی سے لبریز کر دیا۔" (تصوفِ اسلام، عبدالماجد دریا بادی، ص ۹۱)

مولانا عبدالماجدؒ اس پر حاشیہ لکھتے ہیں:

"غالباً غلط (روایت) ہے۔ اس لئے کہ علم کلام بہرحال دین ہی کی خدمت اور اہم خدمت کیلئے ہے۔ اگر اس کے بجائے فلسفہ کا نام ہوتا، تو روایت قرینِ قیاس ہو جاتی۔"

اور یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ یہ روایت، جو عبدالماجدؒ دریاآبادی کو غلط معلوم ہوئی۔ مندرجہ ذیل تذکرہ نگاروں نے اسے درج فرمایا ہے:

۱۔ بہجۃ الاسرار ——— نورالدین علی شنطوفی، ص ۳۲، ۳۳

۲۔ قلائد الجواہر ——— علامہ محمد بن یحیی الحلبی، ص ۳۰

۳۔ نفحات الانس (فارسی) ——— عبدالرحمٰن جامی، ص ۳۵۷

۴۔ تحفہ قادریہ ——— شاہ ابوالمعالی، ص ۲۶، ۲۷

(بحوالہ سیرت غوث الثقلین، ص ۱۴۴)

یہ بھی خیال رہے کہ عبدالماجد صاحبؒ خود بھی اسی طبقہ صوفیاء سے تعلق رکھتے ہیں اور اس موضوع پر کتاب تصوفِ اسلام بھی تالیف فرمائی ہے۔

سریؒ سقطی کا راہِ عام اور خاص کا معیار

"فرمایا اس منزل کی طرف ایک راہِ عام ہے اور ایک راہِ خاص ہے۔ راہِ عام تو یہ ہے کہ پانچ وقت نماز باجماعت ادا کی جائے۔ مال ہو تو اس کی زکوٰۃ دی جائے۔ ماہ رمضان کے روزے رکھے جائیں۔ حج بیت اللہ کیا جائے۔ خدا کی توحید اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کیا جائے اور راہِ خاص یہ ہے کہ ان کے ساتھ ترکِ دنیا کی جائے۔ کسی آرام و آسائش کی طرف توجہ نہ دی جائے اگر کچھ دیا بھی جائے، تو نہ لیا جائے۔ غیراللہ سے پوری طرح رُوگردانی کی جائے۔ دل کو اللہ کے ساتھ لگایا جائے۔"

"یہ سن کر شیخ احمد نے کہا: "اے استاد! اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ میں دوسرا راستہ اختیار کرتا ہوں چند روز بعد ایک بوڑھی عورت بدحال و گریاں خدمتِ شیخ میں آئی اور کہا "اے امام اہل اسلام

میرا جواں ہمت بیٹا ایک روز تیری مجلس میں آیا اور دیوانہ ہو کر گیا۔ اب میں نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہے۔ اور کس حال میں ہے؟ اس عورت کی حالتِ زار پر شیخ کا دل پسیجا۔ کہا "غم نہ کھا، تیرا بیٹا ملا، تو تجھے ضرور اطلاع دوں گا۔ ایک رات شیخ احمد، خدمتِ شیخ میں حاضر ہوا۔ آپ نے اپنے خادم سے کہا۔ جاؤ اس کی ماں کو بلا لاؤ۔ جب اس کی ماں اس کے اہل و عیال کے ساتھ آئی، تو سب نے شیخ احمد کو دیکھ کر نالہ و فریاد شروع کر دیا۔ ہر چند کہا کہ شیخ احمد ان کے ساتھ گھر چلے، مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ بلکہ شیخ سے کہا "آپ نے ان لوگوں کو بلا کر میرا وقت خراب کیا۔ یہ تو میرے لئے وبالِ جان بن گئے ہیں" اس پر اس کی بیوی بولی۔ تو نے اپنا بنا بنایا کام خراب کر دیا ہے۔ مجھ پہ جو بیتے گی، اس کو خوش و ناخوش اپنے سر پر لوں گی۔ اس اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لیتا جا" احمد نے کہا: "بہت خوب! اسی وقت لڑکے کا لباس اتروا کر گدڑی پہنا دی اور ہاتھ میں زنبیل دے دی۔ لڑکے کی ماں نے جو یہ صورت دیکھی، تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئی اور شیخ احمد نے اپنی راہ دشت لی۔" (خزینۃ الاصفیاء ص ۱۴۳)

یہ سری سقطی (م ۲۵۰ھ) تیسری صدی کے صوفی ہیں۔ جب کہ ابھی تصوف کی کتب تصنیف بھی نہ ہوئیں تھیں۔ گویا اسی دور سے ان صوفیہ کا طور طریق شریعت اسلامیہ سے الگ ہو گیا تھا۔

بوعلی فارمدی (م ۴۷۷ھ) اور امام قشیری

"آپ نے (امام قشیری نے) مجھے (بوعلی فارمدی کو) فرمایا "اے نوجوان جاؤ تحصیلِ علم کرو۔ میں مزید تین سال تک تحصیلِ علم میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ میں نے جب دوات سے قلم نکالا، تو وہ سیاہ کے بجائے سفید نکلا۔ میں نے حضرت امام ابو القاسم قشیری کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ سنایا، تو آپ نے فرمایا" اس بات کا مطلب یہ ہے کہ علم تجھ سے دستبردار ہو گیا تو تو بھی اب علم سے دست بردار ہو جا اور طریقت کا راستہ اختیار کر لے اور اس میں مشغول ہو جا۔" (صوفیائے نقشبند ص ۱۲۴)

امام قشیری کی اس تعبیر واقعہ سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ طریقت کا علم شریعت کے علم سے افضل ہوتا ہے۔ کیونکہ شریعت کا علم سیاہی سے لکھا جاتا ہے اور سیاہ ہوتا ہے۔ جب کہ طریقت کا علم سفید ہوتا ہے۔ البتہ یہ سمجھ نہیں آئی کہ دوات سے قلم سفید کیسے نکلا؟ یہ تو ہو سکتا ہے کہ قلم کو سیاہی نہ لگے اور خشک ہی باہر نکل آئے۔ لیکن وہ سفید کیسے ہو گیا تھا؟ یہ راز صوفیاء ہی سمجھ سکتے ہیں۔

۲۔ شیخ کی غیر مشروط اطاعت کی پابندی

مُرید کو شریعتِ اسلامیہ سے برگشتہ کرنے کا دوسرا طریق یہ ہے کہ صوفی لوگ (یا دینِ طریقت کے دوسرے مذہبوں کے گرو) اپنے نئے مُرید سے سب سے پہلے غیر مشروط اطاعت کا عہد لیتے ہیں اور اگر کہیں کوئی درمیان میں اللہ و رسول ﷺ کے احکام کا ذکر کر دے تو وہ راندۂ درگاہ قرار دیا جاتا ہے۔ حافظ شیرازی اس مفہوم کو مندرجہ ذیل شعر میں ادا فرما رہے ہیں۔

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید — کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزل ہا!

ترجمہ: اگر تجھے بزرگ پیر اپنے مصلّٰی کو شراب میں رنگین کرنے کا حکم دے، تو ضرور ایسا کر کہ سالک (سلوک کی) منزلوں کے آداب و مراسم سے ناواقف نہیں ہوتا۔

تصوف، سلوک اور اطاعتِ شیخ

اطاعتِ شیخ کے متعلق مولانا اللہ یار خان فرماتے ہیں کہ:

"تصوف اور تزکیۂ باطن میں سالک اور شیخ کا تعلق بڑا نازک ہے۔ ظاہری علوم میں معاملہ اور قسم کا ہے۔ استاد سے نفرت اور اس کی مخالفت کے باوجود آدمی ظاہری علم حاصل کر لیتا ہے۔ مگر اس راہ میں شیخِ کامل میسر آجائے، تو اس کی مخالفت مانعِ فیض ہی نہیں، بلکہ حرام ہے۔ شیخِ کامل کی مخالفت دراصل تزکیۂ باطن اور رضائے الٰہی کے حصول سے نا فرمیدہ ہونے کی دلیل ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۱۵۱)

اب دیکھئے اقتباسِ بالا میں کئی باتیں محلِ نظر ہیں:

۱۔ معصوم اور مبرا عن الخطاء صرف انبیاء کرام کی ذات ہوتی ہے۔ شیخ خواہ کامل سے کامل تر کیوں نہ ہو۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق وہ معصوم اور مُبرا عن الخطا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ایسی غیر مشروط اطاعت قرآن کریم کی رُو سے صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہی ہو سکتی ہے۔ باقی سب سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور مخالفت بھی۔ جیسا کہ حضرت امام مالکؒ نے آپ کی قبر کی طرف اشارہ کر کے واضح طور پر کہا: "کہ اس صاحبِ قبر کے سوا ہر کسی کی بات کو قبول بھی کیا جا سکتا ہے اور رَد بھی۔ مگر آپ کی کسی بات کو رَد نہیں کیا جا سکتا۔"

۲۔ یہ شیخ کامل حضرات جس طرح سے سالکین کی تربیت فرماتے ہیں اس کی مثالیں ہم کسی دوسرے مقام پر پیش کر رہے ہیں۔ ان میں سے بے شمار باتیں صریحاً خلافِ شریعت ہوتی ہیں۔ اب اگر ان کی مخالفت کو کو حرام قرار دیا جائے، تو بتلائیے شخصیت پرستی اور کسے کہتے ہیں؟ یہی بات تصورِ شیخ کا پہلا زینہ

ہے جسے آپ خود بھی حرام فرماتے ہیں۔

۳۔ آپ نے حصولِ علم وفیض کی منطق بیان فرماتے ہوئے افراط وتفریط سے کام لیا ہے۔ استاد سے اگر نفرت اور مخالفت ہو تو ظاہری علوم میں بھی کسبِ علم وفیض مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ بھلا جو شاگرد اپنے استاد سے متنفر ہے اور مخالف بھی ہے وہ اس کے پاس کیا لینے جائے گا اور جائے گا بھی، تو استاد اسے جس شفقت سے کچھ بتلائے گا، وہ سب کو معلوم ہے۔

۴۔ چونکہ آپ نے شیخ کامل کی مخالفت کو حرام قرار دیا ہے۔ یہی اس بات کی قوی دلیل ہے کہ ایسے علم وفن کا اکتساب، جس میں اللہ اور رسول کے علاوہ کسی دوسرے کی غیر مشروط اطاعت کو لازمی قرار دیا جائے، از روئے شریعت حرام ہے۔

صادق فرغانی کی زائد شرط

حدائق الاخبار کے مترجم اس غیر مشروط اطاعت کے علاوہ کچھ نذر و نیاز کی بھی ہدایت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب سالک مرشد کے ہاتھ میں ہاتھ دے چکے، تو اسے چاہیئے کہ اس کے آگے بے اختیار ہو جائے، جیسے مردہ غسال کے سامنے بے اختیار ہوجاتا ہے۔ یعنی اسے کسی بات کا اختیار نہ رہے اور جب کبھی اپنے پیر کی خدمت میں جائے خالی ہاتھ نہ جائے اگرچہ تھوڑی چیز دے مگر دے ضرور، کیونکہ یہ اس کی محبت اور اخلاص کی علامت ہے۔" (تلقین مرشدِ کامل، ترجمہ حدائق الاخبار، ص ۱۴۰، مطبوعہ شیخ محمد بشیر اردو بازار، لاہور)

اس غیر مشروط اطاعت کا اثر سالک یا مرید پر جو ہو سکتا ہے، وہ تو فرغانی صاحب نے بتلا دیا ہے۔ کہ مرید، پیر کے ہاتھوں میں یوں بے بس و بے اختیار ہونا چاہیئے، جیسے غسال کے ہاتھوں میں مردہ۔ اور مرشدانِ کامل پر یہ اثر ہوا کہ وہ پہلے ہی اپنے آپ کو نبی یا رسول سے کم تر نہ سمجھتے تھے۔ اب اپنا کلمہ بھی پڑھوانے لگے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

اللہ کے نئے نئے رسول

خواجہ فریدالدین گنج شکر فرما رہے ہیں:

"کیونکہ پیر کے کام میں مستعد ہونا عین دین کے کاموں میں

مُستند ہوتا ہے۔ پھر فرمانے لگے ، ایک مرتبہ میں شیخ معین الدین (اپنے دادا پیر مؤلف) کی خدمت میں حاضر تھا اور اہلِ صُفہ بھی موجود تھے۔ اولیاء اللہ کا ذکر ہو رہا تھا کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور بیعت کے لئے پابوسی کی۔ آپ نے اس کو بٹھالیا۔ اُس نے عرض کی میں مُرید ہونے آیا ہوں۔ فرمایا، جو کچھ ہم کہیں گے کرے گا۔ اگر یہ شرط منظور ہے، تو بیشک میں مرید کر لوں گا۔ اس نے کہا جو کچھ آپ کہیں گے وہی کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ تو اس طرح کلمہ پڑھتا ہے "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ مُحمّد رّسُول اللّٰہ" ایک بار اس طرح پڑھ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ چشتی رسُول اللّٰہ"۔ چونکہ راسخ العقیدہ تھا، اس نے فوراً پڑھ لیا۔ خواجہ نے بیعت لی اور بہت کچھ خلعت و نعمت عطا کی اور فرمایا میں نے فقط تیرا امتحان لیا تھا کہ تجھ کو مجھ سے کس قدر عقیدت ہے۔ ورنہ میرا مقصود نہ تھا کہ تجھ سے اس طرح کلمہ پڑھواؤں۔" (فوائد السالکین ملفوظات قطب الدین بختیار کاکی۔ مرتبہ فریدالدین گنج شکر، ترجمہ غلام احمد بریان۔ ص ۱۲۶، ۱۲۷)

ملاحظہ فرمایا آپ نے پیر کا مقام منصبِ رسالت تو یہ تھا کہ جب رسول ﷺ بلائیں مومنوں کو فوراً آنا چاہئیے اور رسول کی اطاعت بھی اتنی غیر مشروط نہیں کہ دنیوی کاموں میں بھی آپ کی اطاعت لازم ہو جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کئی بار آپ سے پوچھ لیا کہ آپ کی رائے ہے یا حکم۔ اور اگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ میری رائے ہے، تو صحابہؓ نے اختلاف کیا۔ لیکن یہاں غیر مشروط اطاعت اور پیر کے کاموں میں مشغول رہنے کو عین عبادت قرار دیا جاتا ہے۔

پھر اگر پیر صاحب نے اس نئے مرید کی اطاعت و عقیدت کا ٹیسٹ لینا ہی تھا تو یہ تو کسی اور طریقے سے بھی ہو سکتا تھا۔ کیا اس ٹیسٹ کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ اسلام کے بنیادی کلمۂ شہادت پر ہی یہ وار چلایا جائے اور مُرید کے راسخ العقیدہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ ایسا کلمۂ کفر کہہ دے۔ یہ تو وہی بات ہوتی، جو بابل میں ہاروت، ماروت جادو سکھلانے سے پیشتر کہہ لیا کرتے تھے کہ یہ کُفر اختیار نہ کر۔ پھر بھی اگر کوئی راسخ العقیدہ ہوتا اور کلمۂ کُفر پڑھ لیتا، تو اسے جادو سکھا دیتے اور یہ سب اللہ کی طرف سے آزمائش اور فتنہ تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان پیروں میں ایسا کلمہ پڑھانا اور آزمائش لینا ایک پرانا دستور ہے۔ کیونکہ شیخ شبلی نے بھی ایک شخص سے ایسا ہی ٹیسٹ لیا تھا۔ (فوائد الفواد۔ ملفوظات خواجہ نظام الدین اولیاء۔ مرتبہ خواجہ حسن دہلوی۔ ترجمہ پروفیسر محمد سرور علما اکیڈمی اوقاف، پنجاب، لاہور)

ان واقعات کی تصدیق حکیم الامت اشرف علی تھانوی صاحب نے بھی فرمادی ہے۔ وہ اپنی کتاب التکشف میں لکھتے ہیں کہ تھانہ بھون کے پیر صادق صاحب کلمہ لا الٰہ الا اللہ صادق رسول اللہ کو آزمائش کے طور پر استعمال کرتے تھے اور پھر چشتی رسول اللہ اور شبلی رسول اللہ کی طرح اس کے بعد معذرت بھی نہیں کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک یہ کلمہ بالکل صحیح تھا کیونکہ ان کے خیال میں صادق رسول اللہ یا رسول اللہ صادق ایک ہی بات تھی۔

علاوہ ازیں مولانا موصوف اس کلمہ کے معاملہ میں اپنی ذات کے لئے خاصی لچک رکھتے تھے۔ مولانا محمد سعید اکبر آبادی، جو دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے اپنے رسالہ 'برہان' فروری ۱۹۵۲ء کے صفحہ ۱۰۷ پر رقمطراز ہیں کہ:

"اپنے معاملات میں تاویل و توجیہہ اور اغماض و مسامحت کی مولانا میں جو خو تھی اُس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی مرید نے ان کو لکھا کہ رات خواب میں مَیں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ ہر چند کلمۂ شہادت صحیح صحیح ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن ہر بار یہ ہوتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کے بعد اشرف علی رسول اللہ منہ سے نکل جاتا ہے۔"

"ظاہر ہے کہ اس کا صاف اور سیدھا جواب یہ تھا کہ یہ کلمۂ کفر ہے۔ شیطان کا فریب اور نفس کا دھوکہ ہے۔ تم فوراً توبہ استغفار کرو۔ لیکن مولانا تھانوی صاحب صرف یہ کہہ کر بات آئی گئی کر دیتے ہیں کہ تم کو مجھ سے غایت محبت ہے۔ یہ سب کچھ اسی کا ثمرہ ہے۔" (برہان، فروری ۱۹۵۲ء، ص ۱۰۷)

۳۔ غیر شرعی احکام کی تلقین

اسلام جس چیز کو توحید قرار دیتا ہے وہ صوفیاء کی نظروں میں شرک ہے اور جس چیز کو شرک قرار دیتا ہے۔ وہی دینِ طریقت کی بنیاد ہے۔ عموماً صوفیاء کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ باطنی علم تقویٰ شریعتِ اسلامیہ کی پابندی، تسبیح و تحمید اور اصلاحِ نفس سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ یہ محض ایک فریب ہے حقیقت یہ ہے کہ باطنی علم بھی جادو ہی کی طرح کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ جس طرح ہاروت اور ماروت لوگوں کو کہتے تھے کہ اگر کفر و شرک کی باتیں منظور ہیں، تو تم جادو کا علم سیکھ سکتے ہو ورنہ اس کام کے نزدیک نہ جاؤ۔ بعینہٖ یہی صورت اس دینِ تصوف میں ہے۔ چنانچہ امام غزالی احیاء العلوم (ج ۴، ص ۳۵۸) پر ایک حکایت نقل کرتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) کا طریقِ تربیت

ایک شخص تیس سال ابویزید بسطامی کی خدمت کرتا رہا

ایک روز اس نے شکایت کی یا حضرت! میں تیس[۳۰] سال آپ کی خدمت میں رہا۔ رات کبھی نہیں سویا اور ہمیشہ روزے بھی رکھتا ہوں، مگر میرے دل میں باطنی علم کے آثار نظر نہیں آتے۔ حالانکہ میں اس کا قائل بھی ہوں ابویزید نے کہا تم تین سو سال بھی لگے رہو، تو یہ علم حاصل نہ کر سکو گے۔ مُرید نے پوچھا، اس کا کوئی علاج؟ بایزید نے فرمایا، تم وہ علاج کر نہ سکو گے۔ مرید نے جب اصرار کیا، تو فرمایا: "اپنی داڑھی اور سر منڈوا دو، گدڑی پہن لو۔ باداموں کا ایک کشکول اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے گرد بچوں کو جمع کرو اور کہو جو بچہ مجھے ایک گھونسا مارے گا، اُسے ایک بادام دوں گا۔ اسی طرح گلی گلی پھرو۔" مُرید نے کہا: "سبحان اللہ! یہ کیا علاج ہے؟" بایزید نے کہا، "تیرا سبحان اللہ کہنا بھی شرک ہے کیونکہ یہ کلمہ تو اپنی پاکیزگی بیان کرنے کے لئے کہہ رہا ہے۔" مُرید نے کہا: "مجھ سے یہ علاج تو نہیں ہو سکتا کوئی اور بات بتلایئے۔" بایزید نے کہا: "اگر یہ علاج نہیں کر سکتا، تو دوسرا کوئی علاج نہیں۔ (احیاء العلوم، ج ۴، ص ۳۵۸)

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد امام غزالیؒ لکھتے ہیں: "جس شخص کا دل بیمار ہے اور وہ اپنے نفس کے تابع ہے اس کا علاج وہی ہے جو بایزید نے تجویز کیا۔"

ان واقعات سے آپ اس باطنی علم کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں کہ کس انداز میں مرید کو اعلانیہ خلافِ شریعت کاموں اور اپنی غیر مشروط اطاعت اور شرکیہ عقائد کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے۔ جب انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے، تو بس شیطانی تجلیات، قلبی واردات، ہاتفِ غیبی کی آوازوں اور مشاہدات و مکالماتِ حق تعالیٰ کے لئے دروازے کھلتے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس مرید بیچارے نے تین خلافِ شریعت کام، تو پہلے ہی سر انجام دے لئے تھے۔ (۱) رات کو بالکل نہ سونا۔ (۲) ہمیشہ روزہ رکھنا۔ (۳) دینِ طریقت پر ایمان۔ اب چوتھی بات پیر کی غیر مشروط اطاعت میں فیل ہونے کے باعث نامراد ہی رہا۔

۴۔ قرآن و سنت سے دُور کرنا

اور اس کے کئی طریقے ہیں مثلاً:

۱. رات کو قرآن پڑھنے سے منع کرنا۔

عبدالوہاب شعرانی اپنی کتاب کبریتِ احمر بر حاشیہ الیواقیت والجواہر کے صفحہ ۱۲ پر لکھتا ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ نے ندائے غیب کے ذریعہ فرمایا: "اے بندو! رات میرے لئے ہے نہ اس لئے کہ اس میں

قرآن پڑھا جائے۔ تیرے لئے دن میں بہت کام ہوتے ہیں۔ میں یہ اس لئے کہتا ہوں کہ جب تو رات کو قرآن پڑھے گا، تو اس کے معانی تجھے مشاہدہ سے تفرقہ کی طرف لے جائیں گے۔ پھر کوئی آیت تجھے میری جنت، اور جو کچھ میں نے اس میں پیدا کیا ہے، کی طرف لے جائے گی۔ تو پھر جب تو اپنی جنت میں حوروں کے ساتھ استبرق کے بچھونوں سے تکیہ لگائے ہو گا، تو میرا خیال کہاں ہو گا؟ پھر کوئی آیت جہنم کی طرف تجھے لے جائے گی اور اس میں طرح طرح کے عذاب کا معائنہ کرے گا۔ تو جب تو ان باتوں میں مشغول ہو گا، تو میرا خیال کب ہو گا؟ پھر کوئی آیت تجھے قصہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام صالح علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام کی طرف لے جائے گی۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ میں نے تجھے تدبر کا حکم نہیں دیا، بلکہ یہ کہ تو اپنے دل کے خیالات کو مجھ پر مجتمع کرے۔ رہیں استنباط احکام والی آیات تو ان کے لئے دوسرا وقت ہے۔" (فضائح صوفیاء، ص ۸)

اب دیکھئے شعرانی صاحب کس خطرناک انداز سے مسلمانوں کی توجہ قرآن کی تلاوت سے ہٹا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرمائیں کہ :

۱۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۴۷/۲۴) — کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے ؟ یا ان کے دلوں پر قفل لگ گئے ہیں۔

۲۔ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (۵۰/۴۵) — پس (اے محمد ﷺ) جو شخص ہمارے (عذاب کی) وعید سے ڈرتا ہے ان کو قرآن سے نصیحت کرتے رہو۔

۳۔ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (۷۳/۱-۴) — (اے محمد ﷺ) جو کپڑے میں لپٹ رہے ہو۔ رات کو قیام کرو مگر تھوڑی سی رات، نصف یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔

لیکن یہ حضرت توجہ الی اللہ کی آڑ میں رات کو قرآن پڑھنے اور اس میں غور و تدبر کرنے سے منع فرما رہے ہیں۔

ب۔ اپنے بنائے ہوئے اوراد و وظائف اور اعمال کو قرآن سے بہتر قرار دینا۔

اور عام مشاہدہ ہے کہ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے حضرات اوراد و وظائف، درود لکھی، درود تاج، قصیدہ غوثیہ، ششش قفل، ہفت ہیکل وغیرہ وغیرہ کی تلاوت ضرور کرتے ہیں۔ قرآن خواہ پڑھیں یا نہ

پڑھیں۔ اسی طرح انہوں نے کئی طرح کی نمازیں بھی ایجاد کر رکھی ہیں۔ مثلاً صلوٰۃ فاتح، صلوٰۃ غوثیہ، خضر کی نماز وغیرہ وغیرہ۔ اور احمد تیجانی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "صلوٰۃ الفاتح کا ثواب، جو کچھ زمین بھر میں ذکر اذکار پڑھے جاتے ہیں ان کو چھ ہزار سے ضرب دی جائے، تو اس کے برابر ہے۔" (فضائح صوفیاء، ص ۱۰)

ج قرآن سے دُور رکھنے کا تیسرا طریق یہ ہے کہ انہوں نے قرآن اور اسی طرح حدیث کو بھی اسرار و رموز کا مجموعہ قرار دے دیا ہے۔ پہلے الفاظ کے ظاہری اور باطنی معانی کی تفریق پیدا کی۔ پھر باطنی معانی کو ظاہری پر ترجیح دے کر یوں گویا ہوئے۔

خُضْنَا بَحْرًا وَ وَقَفَ الْاَنْبِیَاءُ بِسَاحِلِہٖ ہم تو سمندر میں کود گئے اور انبیاء ساحل پر ہی کھڑے رہے۔

یعنی انبیاء ظاہری معانی پر ہی لگے رہ گئے۔ جب کہ ہم لوگ اِن کے باطنی معانی تک پہنچ گئے۔

اور ابن سبعین نے تو کتاب و سنت کی مخالفت میں یہاں تک کہہ دیا:

لَقَدْ حَجَّرَ ابْنُ اٰمِنَۃَ وَاسِعًا اِذْ ابن آمنہ (یعنی رسول اللہ ﷺ) نے اللہ کی وسیع رحمت

قَالَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ کو یہ کہہ کر مقید کر دیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ (فضائح صوفیاء، ص ۱۰)

ابنِ سبعین کو یہ خرافات کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ یہ حضرات نہ تو اپنے آپ کو انبیاء سے کمتر سمجھتے ہیں اور نہ اپنے مکشوفات و مشاہدات کو شریعت سے کمتر سمجھتے ہیں اور اس کی تفصیل آپ کو مناسب مقامات پر اس کتاب میں مل جائے گی۔

امام ابنِ قیم نے مدارج السالکین (جو اسماعیل ہروی (م ۴۸۱ھ) کی کتاب منازل السائرین کی شرح اور اس پر تبصرہ ہے) میں سلوک کے مقامات پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر فلاں چیز کی حقیقت یہ ہے، جو اربابِ تصوف پیش کرتے ہیں، تو پھر اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس مقام کو صحابہ، بلکہ انبیاء بھی حاصل نہ کر سکے۔" (تزکیۂ نفس، ص ۲۰۷)

"ابو اسمٰعیل ہروی (م ۴۸۱ھ) نے توبہ، توکل، صبر، رضا وغیرہ وغیرہ کی شرح میں تین درجے مقرر کئے ہیں۔ پہلا درجہ عوام کا، دوسرا خواص کا، تیسرا اخص الخواص کا۔ پہلے درجہ کا معیار ہی وہ اتنا اونچا بیان کرتا ہے۔ جتنا کہ قرآن کسی کو لے جانا چاہتا ہے۔ اور اگر کوئی کسر رہ جائے، تو وہ دوسرے میں بہر حال پوری ہو جاتی ہے۔ رہا تیسرا درجہ تو وہ صاف ما فوق البشریت درجہ معلوم ہوتا ہے اور شیخ کے نزدیک یہی درجہ کاملین کا ہے، اب اگر کوئی شخص کتاب و سنت کو معیار بنا کر اس کا تجزیہ کرے، تو وہ یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ

اس مقام کا اگر کوئی وجود ہے، تو وہ شیخ کے ذہن میں ہے۔ کتاب وسنت سے ثبوت تو کیا اس کا سراغ تک نہیں ملتا۔" (حوالہ ایضاً)

۶۔ صُوفیاء کا باطنی سیاسی نظام

باطنی نظام کے قیام کی ضرورت

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم زمین کی حکومت اپنے صالح بندوں کو عنایت فرماتے ہیں۔ جب صوفیاء نے، جو خود کو صالحین کا جانشین تصور کرتے ہیں، دیکھا کہ ان کے پاس تو صرف عزلت اور گوشہ نشینی یا غیب دانی اور تصرفات ہی رہ گئے ہیں۔ رہی زمین کی حکومت یا سلطنت، تو اس سے ان کا کسی دور میں کوئی واسطہ نہیں رہا، تو اس مشکل کا حل انہوں نے یہ سوچا کہ ایک تو دنیوی سلطنت کی بھرپور تنقیص کی جائے، دوسرے اپنا الگ باطنی نظام قائم کر کے اس کو ظاہری حکومت سے برتر ثابت کیا جائے۔ تو جس طرح شیعہ حضرات نے اپنا الگ باطنی نظام قائم کر کے اس نظام کا پیشوا امام معصوم کو قرار دیا۔ اسی طرح صوفیاء نے اپنا الگ باطنی نظام قائم کیا جس کا پیشوا "غوث" کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔

باطنی نظام کا صدر دفتر اور عہدیداروں کے مساکن

باطنی مناصب، ان کی تعداد اور طریق کار کے سلسلہ میں عبدالرحمٰن عبدالخالق مصنف "فضائح الصوفیاء" کی تحقیق یہ ہے کہ "تمام عالم میں 'غوث' ایک ہوتا ہے۔ جس کے ماتحت چار 'قطب' ہوتے ہیں اور عالم کے چاروں کونوں پر 'غوث' کے حکم سے مامور ہوتے ہیں پھر سات 'ابدال' ہیں، جو 'غوث' کے حکم سے سات پہاڑیوں پر رہتے ہیں۔ پھر ان کے بعد 'نجیب' کا کا درجہ ہے اور یہ ہر شہر میں ایک ایک ہوتا ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے ساری دنیا پر اپنا جال پھیلا رکھا ہے اور ان کا دفتر 'غارِ حرا' میں ہے۔ جہاں یہ سب حضرات ہر رات کو اکٹھے ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی قدر وقضا پر نظر رکھتے ہیں۔" (فضائح الصوفیاء عبدالرحمٰن عبدالخالق، ص ۴۵، مطبوعہ کویت)

اور دائرۃ المعارف الاسلامیہ (مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور) میں اولیائے کے ان باطنی مناصب اور فیوض

کی تفصیل ایک ذیلی عنوان "طبقات رجال الغیب" کے تحت کچھ اس طرح دی گئی ہے۔

طبقات رجالُ الغیب

صوفیاء کے نزدیک دنیا اس لئے قائم ہے کہ اولیاء اللہ کے ایک مستور مگر منظم سلسلے کی شفاعت سے اس کی بلائیں ٹلتی رہتی ہیں۔ دنیا میں اِن اولیاء اللہ کی تعداد مقرر ہے۔ جب ایک ولی کا انتقال ہو جاتا ہے، تو دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اس کی تعداد تین سو نقباء، چالیس اَبدال، سات امناء، چار عمود اور اُن کا قطب شامل ہیں۔ (قطب یعنی وہ محور، جس کے گرد بخیال صوفیاء سارا نظام گردش کرتا ہے یغوث)

(دائرہ مج ۶، ص ۴۲۶، زیرِعنوان تصوف)

مناصب اولیآ اللہ کی شرعی بنیادیں

مندرجہ بالا سرسری معلومات کے بعد اب ہم آپ کو اللہ یار خان صاحب کی تفصیلی معلومات سے متعارف کرائیں گے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی کتاب 'دلائل السلوک' میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے فرماتے ہیں کہ یہ سب اصطلاحات احادیث سے ماخوذ ہیں۔ پھر اس سلسلہ میں آپ نے چودہ احادیث ابونعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ) کی کتاب حلیتہ الاولیاء سے درج فرمائی ہیں۔ اس کتاب کے متعلق بھی ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ اس دس جلدوں پر مشتمل مبسوط کتاب میں رطب و یابس سب کچھ شامل ہے۔ موضوع احادیث کی بھرمار ہے اور بہ تکلف خلفائے اربعہ اور بعض دوسرے صحابہ کو بھی اس زمرۂ صوفیاء میں شامل کر لیا گیا ہے اب مولانا موصوف اس کتاب سے چودہ احادیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

"مذکورہ بالا احادیث کے رواۃ پر جرح کی گئی ہے۔" (د۔س، ص ۶۸) پھر اس سلسلے میں جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ)، جو خود اسی طبقہ صوفیاء سے تعلق رکھتے ہیں) کی تحقیق ملاحظہ ہو۔ اور وہ تحقیق یہ ہے کہ:

"علامہ سیوطی نے قریباً بیس کتب ورواۃ سے ابدال کی احادیث نقل کی ہیں اور تمام کو صحیح اور حسن فرمایا ہے۔ تمام طرقِ احادیث کو جمع کرنے پر قدرِ مشترک یعنی ابدال کا وجود یقیناً تسلیم کرنا پڑے گا جس مستقل کتاب کا حوالہ علامہ موصوف نے دیا ہے اس کا نام "الخبر الدال علیٰ وجود القطب والنجبا والابدال" ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۴۹)

اب دیکھئے کہ اس اقتباس میں:

۱۔ مولانا اللہ یار خان نے تسلیم کرلیا ہے کہ ان تمام احادیث کے رواۃ مجروح ہیں۔

۲۔ علامہ جلال الدین سیوطی بیس احادیث نقل کرکے فرمارہے ہیں کہ احادیث صحیح بھی ہیں اور حسن بھی۔ لیکن اس دعوے کے باوجود ان میں سے کوئی ایک حدیث بھی صحاح ستہ میں مذکور نہیں۔ لہٰذا یہ حسن اور صحیح کا دعوے محل نظر ٹھہرا۔

۳۔ جس مستقل کتاب "الخبر الدال علی وجود القطب والنجبأ والابدال" سے علامہ سیوطی نے یہ بیس (۲۰) احادیث نقل فرمائیں، وہ خیر سے اُن کی اپنی تصنیف ہے۔ (دلائل السلوک، ص ۲۱۵)

۴۔ ان تمام احادیث میں چونکہ قدر مشترک "ابدال" کا لفظ ہے، لہٰذا سفارش کی گئی ہے کہ کم از کم اس ابدال کو تو ضرور تسلیم کرلیا جائے۔

گویا ایسی معتبر احادیث سے مناصب اولیاء اللہ ثابت ہوگئے۔ اب جن اُمور پر ان احادیث سے مزید روشنی پڑتی ہے، وہ درج ذیل ہیں:

احادیث متعلقہ قطب ابدال وغیرہ

حدیث (۱) کے مطابق ۵۰۰ اخیار اور ۴۰ ابدال ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ابدال مرجائے، تو ان ۵۰۰ میں سے کوئی ایک ترقی کرکے "کمی" پُر کردیتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا "خیر" آجاتا ہے۔

حدیث ۲ ــــ احمد کی حدیث ہے، اس میں ابدال کی تعداد ۳۰ ہے۔ ان کے قلوب ابراہیم خلیل اللہ کے قلب پر ہیں۔

حدیث ۳ ــــ طبرانی کی حدیث ہے۔ اس میں ابدال ۳۰ ہیں اور ان کی برکات یہ ہیں کہ (۱) ان کے دم قدم سے زمین قائم اور (۲) بارش ہوتی ہے۔

حدیث ۴ ــــ ابنِ عساکر کی حدیث ہے۔ اس میں ابدال ۴۰ ہیں مگر ہیں سب علاقہ شام کے۔ اُن کی برکت سے (۱) بارش ہوتی ہے۔ (۲) دشمن پر فتح ہوتی ہے۔ (۳) اہلِ زمین سے تکالیف اور مصائب دُور کئے جاتے ہیں۔

حدیث ۵ ــــ (طبرانی) اس حدیث میں ابدال کی تعداد مذکور نہیں، البتہ علاقہ شام مذکور ہے ان کی برکت سے (۱) نہیں مدد دی جاتی ہے۔ (۲) رزق ملتا ہے۔

حدیث ۶ ــــ (احمد) یہ ابدال علاقہ شام کے ۴۰ مرد ہیں۔ ان کی تعداد پوری کردی جاتی ہے۔ ان کی برکت سے (۱) بارش ہوتی ہے۔ (۲) دشمنوں کے مقابلہ میں مدد دی جاتی ہے اور (۳) صرف شام کے علاقہ کو عذاب سے دُور کیا جاتا ہے۔

(معلوم ہوتا ہے کہ آجکل یا تو شام میں ابدال نہیں رہے یا پھر اُن کی برکات ختم ہو چکی ہیں کہ مسلمان وہاں محکوم و مقہور ہیں اور یہودیوں کے ہاتھوں عذابِ شدید بھی اٹھا رہے ہیں)

حدیث ۷ ــــ خلال کی حدیث میں ابدال تو ۴۰ ہیں مگر ان میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ مجموعی تعداد ۴۰ ہے۔ الگ الگ تعداد مذکور نہیں۔

حدیث ۸ ــــ (حاکم) ابدال موالی میں سے ہیں (یعنی یہ ابدال عربی النسل نہیں ہوتے۔ یا تو اُن کے غلام ہوتے ہیں یا اُن کے ہاتھ پر اسلام لانے پر اُن کے قبیلہ سے منسلک ہو جاتے ہیں۔)

حدیث ۹ ــــ (ابن ابی الدنیا) ابدالوں کی علامت یہ ہے کہ وہ کسی پر لعن طعن نہیں کرتے (اب بتلائیے کہ اس ایک نشانی سے آپ کسی ابدال کی شناخت کر سکتے ہیں ؟)

حدیث ۱۰ ــــ (ابنِ حبان) ابراہیم خلیل جیسے ۳۰ اور اسّی سے زمین خالی نہ رہے گی۔ ان کی برکات یہ ہیں۔ (۱) فریاد رسی ہوگی (۲) رزق دیا جائے گا (۳) بارش ہوگی۔ (اس تیس اور اسّی کی تعداد کی ہمیں تو سمجھ نہیں آئی۔ ممکن ہے آپ کچھ سمجھ کر اس حدیث صحیح اور حسن سے کچھ نتیجہ اخذ کر سکیں)

حدیث ۱۱ ــــ (بیہقی) اس حدیث میں نہ تعداد ہے نہ علاقہ کا تعیّن ہے نہ برکات کا۔ مذکور یہ ہے کہ میری اُمت کے ابدال اپنے عملوں کی وجہ سے نہیں، بلکہ اللہ کی رحمت، نفسوں کی سخاوت اور سینوں کی سلامتی کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے۔

حدیث ۱۲ ــــ (ابنِ عدی) ابدال چالیس ہیں۔ ۲۲ شام میں اور ۱۸ عراق میں اور ان کی علاقہ وار تعداد پوری رکھی جاتی ہے۔

حدیث ۱۳ ــــ (طبرانی) طبرانی کی حدیث ۱۲ میں ابدال ۳۰ تھے۔ اس حدیث ۱۳ میں ۴۰ ہیں اور ان کی برکات مذکورۃ الصدر ہی ہیں۔

حدیث ۱۴ ــــ (حدیث ابو نعیم سب مندرجہ بالا احادیث کے بلا مکمل حوالہ راوی ہیں) ابدال ۴۰ مرد ہیں اور برکات یہ ہیں کہ اہل زمین کی تکالیف دُور ہوتی ہیں۔ سو یہ ہے وہ سرمایۂ احادیث جن کے

ذریعہ مناصب اولیاء کو مشروع ثابت کیا جا رہا ہے۔ سچ کہا تھا علامہ سیوطی نے کہ ان سب روایات میں صرف ایک لفظ "ابدال" بطور قدر مشترک آتا ہے۔ نہ ان کی تعداد پر اتفاق نہ جنس پر، نہ علاقہ پر نہ مناصب پر، ان احادیث سے البتہ اس طبقہ صوفیاء کے معیارِ صحت کا ضرور پتہ چل جاتا ہے۔

ان میں قطب کے بارے میں کوئی حدیث مذکور نہیں۔ چنانچہ اللہ یار خان لکھتے ہیں کہ:

"اور قطب کے متعلق جو بیان ہوا۔ جیسا کہ بعض محدثین نے لکھا ہے۔ ابونعیم نے حلیہ میں بیان کیا ہے کہ بہت سی حدیثیں اس کی تائید میں وارد ہو چکی ہیں۔ جن کا ذکر ہو چکا (وہ غالباً درج بالا ہی ہیں) اور وہ بھی جو مذکور نہیں۔ مثلاً حکیم ترمذی (م ۲۸۵ مصنف کتاب ختم الولایۃ) اور ابونعیم کہ ہر زمانہ میں میری امت میں سابقون ہوں گے اور ہر زمانہ کے لئے سابقون ہوں گے۔" (دلائل السلوک، ص ۶۸، بحوالہ فتاوی الحدیثیہ، ص ۲: ۲۷۷، لابن حجر کی، م ۹۷۵)

گویا جس شخص کو حکیم ترمذی اور ابونعیم، سابق سے تعبیر کرتے ہیں وہی شخص ابن حجر کی کے نزدیک قطب ہے۔ لہٰذا قطب کا منصب بھی احادیث سے ثابت ہو گیا۔

رہے دوسرے مناصب مثلاً ابرار، اوتاد، نجیب، نقیب، اعماد، غوث وغیرہ، تو ان کے متعلق مولانا اللہ یار خان صاحب فرماتے ہیں:

"صوفیاء کی بعض اصطلاحات کی اصل تو خود قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ جیسے ابرار، اخیار، نقباء، علامہ سیوطی نے ان اصطلاحات پر ایک مستقل رسالہ (وہی رسالہ 'الخبر الدال علی وجود القطب والنجباء والابدال' جس کا ذکر پہلے سے چل رہا ہے) بھی لکھا ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۷۰)

بات یہ ہے کہ قرآن میں فی الواقع ابرار، اخیار، اور نقباء کے الفاظ ضرور موجود ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ الفاظ صوفیاء کے انہی اصطلاحی معنوں اور مناصب کے لئے استعمال کئے گئے ہیں؟ اب اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہو اور یقیناً نفی میں ہے، تو آخر یہ صوفیاء اس طرح کی فریب دہی کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟ مثلاً قرآن کی رو سے انبیاء سب کے سب اخیار ہیں۔ اب صوفیاء کے عقیدہ کی رو سے ہر وقت ۷، اخیار موجود رہتے ہیں۔ ان کے اوپر ۴ قطب اور ایک غوث ہوتا ہے اور نیچے ۷۰، نجیب اور ۳۰۰ نقیب، تو کیا یہ انبیاء اسی طرح کے اخیار کے مناصب پر فائز تھے؟

نیز قرآن میں ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کے ۱۲ قبیلوں کے ۱۲ نقیب (سردار چودھری ٹائپ کے) صوفی

نائب) مقرر کر دیئے، تو کیا یہ سردار ایسے ہی نقیب تھے، جو صوفیاء کو درکار ہیں ؟

اس کے بعد سیوطی صاحب نے صوفیاء کے ان مناصب کے ثبوت میں جو دو احادیث بیان فرمائیں وہ درج ذیل ہیں :

۱ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "خدا کے ۳۰۰ بندے مخلوق ہیں جن کے قلوب حضرت آدم علیہ السلام کے قلب کی مانند ہیں۔ ۴۰ کے قلوب حضرت موسٰے علیہ السلام کے قلب کی مانند ہیں۔ ۷ کے قلوب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب کی مانند ہیں۔ ۵ کے قلوب حضرت جبرائیل کے قلب کی مانند ہیں۔ ۳ کے قلب حضرت میکائیل علیہ السلام کے قلب کی مانند ہیں۔ اور ایک ایسا بندہ ہے جس کا قلب حضرت اسرافیل علیہ السلام کے قلب کی مانند ہے۔"

۲ ۔ خطیب نے بذریعہ ابوبکر ابن ابی شیبہ حدیث کا اخراج کیا کہ میں نے کنانی سے سنا کہ "نقباء ۳۰۰ ہیں۔ نجباء ۷۰ ہیں، ابدال ۴۰ ہیں، اخیار ۷، قطب ۴، اور غوث ایک ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۱۷)

ان دونوں احادیث کے تقابل سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں :

۱ ۔ اولیاء اللہ کے مناصب کی تعداد ۶ ہے۔ سب سے اعلیٰ منصب غوث کا ہے، جس کا دل حضرت اسرافیل علیہ السلام کے قلب کی مانند ہے۔

۲ سب سے نچلا منصب نقیب کا ہے۔ یہ کُل ۳۰۰ سیٹیں ہیں اور ان کا دِل حضرت آدم علیہ السلام کے قلب کی مانند ہوتا ہے۔

۳ ۔ باقی چار مناصب کی نشستوں میں اختلاف ہے اور اسی طرح اس بات میں بھی کہ ان کے قلوب کس علیہ السلام کے قلب کی مانند ہیں۔

۴ انبیا کے قلوب سے ملائکہ کے قلوب بہت افضل ہوتے ہیں۔ سب سے کم تر درجہ کا قلب نقیب یا حضرت آدم علیہ السلام (نعوذ باللہ من ذلک الھفوات) کا دِل ہے۔ پھر اس کے اوپر حضرت موسٰے علیہ السلام پھر اس سے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دل ہے۔ اس کے بعد فرشتوں کی باری آتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اوپر حضرت جبرائیل علیہ السلام کا دل ہے۔ پھر اس کے اوپر حضرت میکائیل علیہ السلام کا، پھر اس سے اوپر حضرت اسرافیل علیہ السلام کا دل ہے، جو غوث کے قلب کی مانند ہے۔

یہ نو ایسے مناصب تھے، جن کا ثبوت "سرمایۂ احادیث" سے مہیا کر دیا گیا ہے۔ یہ احادیث خواہ کیسی

ہی مجروح اور موضوع ہوں۔ سب کچھ ان کے لئے قابلِ قبول اور قابلِ حجت ہیں۔ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد ان کے ہاں کئی ایسے مناصب بچ جاتے ہیں جن کے لئے آپ کو کوئی موضوع حدیث بھی نہیں مل سکی اور ان کا ثبوت ان کے بزرگان کرام کے اقوال ہیں۔ مثلاً :

اولیاء اللہ کے اعلیٰ مناصب

(۱) قطب کی اقسام اور ان کے فیوض حسبِ ذیل ہیں :

(ا) قطبِ ابدال عالم کے وجود اور اس کی بقاء سے تعلق رکھنے والے امور میں فیض کا واسطہ ہے۔ پیدائش، رزق، مصائب کے دور ہونے اور صحت و آرام کے حاصل ہونے کا تعلق قطب ابدال کے فیض کے ساتھ مخصوص ہے۔"

(ب) قطب ارشاد۔ "ہدایت و ارشاد سے متعلق امور میں وصولِ فیض کا ایک واسطہ ہے۔ ایمان ہدایت، نیک کاموں کی توفیق اور توبہ وغیرہ کا تعلق قطبِ ارشاد کے فیض کا نتیجہ ہے۔" (معارف لدنیہ، امام ربانی، ص۱۴۴ بحوالہ دلائل السلوک، ص ۲۷)

(ج) "حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا" اللہ تعالیٰ نے ہم کو قطب مدار کا معاون بنایا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے بقا کا سبب بنایا ہے۔ اس کی برکت کی وجہ سے بقائے عالم ہے اور فرمایا کہ اس وقت قطبِ مدار یمن میں ہے اور وہ شافعی فقہ کا متبع ہے اور ہم ان کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔" (تفسیر مظہری، ۱۵: ۶۲، بحوالہ دلائل السلوک، ص ۲۷)

ان اقتباسات سے معلوم ہوا کہ :

۱۔ امام ربانی کا قطب ابدال اور قاضی ثناءاللہ پانی پتی کا قطبِ مدار ایک ہی چیز ہیں، کیونکہ ان دونوں کا فیض ایک ہی قسم کا ہے یعنی وہ عالم کے بقا کا سبب ہیں اور یہ فیوض اسی قسم کے ہیں، جیسے نجوم پرست کسی مخصوص ستارہ کے اثرات بتلایا کرتے ہیں کہ رزق، پیدائش، مصائب وغیرہ فلاں فلاں ستارہ کی تاثیر ہے۔

۲۔ قطب کے متعلق زیادہ روایات تو یہ ہیں کہ وہ چار ہوتے ہیں، لہٰذا ان کی اقسام بھی چار ہو جاتیں تو اچھا تھا، خواہ اُن کے فیوض ایک ہی جیسے ہوتے۔

منصب داروں کے مساکن اور فیوض

علامہ سیوطی نے کتانی سے جو روایت کی کہ "نقباء ۳۰۰، نجباء ۷۰، ابدال

۴۰، اخیار ۷، قطب ۴، اور غوث ایک ہے۔" تو اس کے آگے یہ روایت یوں چلتی ہے۔" نقباء کا مسکن مغرب (؟) نجباء کا مصر، ابدال کا شام ہے۔ قطب زمین کے گوشوں میں ہوتے ہیں اور غوث کا مسکن مکہ ہے۔ جب مخلوق کو عوامی مصیبت آجائے، تو دعا کے لئے نقباء ہاتھ پھیلاتے ہیں، اگر قبول نہ ہو تو پھر نجباء، پھر اخیار، پھر قطب اگر پھر بھی دُعا قبول نہ ہو، تو پھر غوث دُعا کے لئے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی دُعا قبول ہو جاتی ہے۔" (الخبر الدال، سیوطی ص۲۳، بحوالہ دلائل السلوک، ص ۴۳)

علامہ سیوطی کی اس روایت میں کئی باتیں قابلِ غور ہیں، مثلاً:

۱۔ نقباء کا مسکن مغرب ہے۔ مغرب اسمائے نسبیہ سے ہے، یہ تو وضاحت ہونی چاہئے تھی کہ سیوطی صاحب کے مسکن سے مغرب مراد ہے یا کوئی اور مقام؟

۲۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان صوفیاء نے زمین کو چپٹا مستطیل یا مربع شکل کا تصور کر رکھا ہے۔ جس کے چار گوشے ہیں اور ہر گوشے پر ایک ایک قطب اس زمین کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

۳۔ پیرانِ پیر کو غوث الاعظم کہا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ مکہ میں نہیں رہے۔ ان کا مولد، مسکن، مدفن سب کچھ بغداد ہے، پھر وہ غوثِ اعظم کیسے بن گئے؟

۴۔ اللہ تعالےٰ ان منصب داروں کی دُعا بھی براستہ معروف یا (THROGH PROPER CHANNEL) ہی سنتا ہے۔ پھر وہ عام آدمیوں کی دُعا کیونکر سن سکتا ہے۔؟ اور یہ بات قرآن کریم کے صریح خلاف ہے۔

۵۔ یہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد اگر غوث کی دُعا بھی قبول نہ ہو تو کیا یہ دنیا تباہ ہو جائے گی؟ غوث کی دُعا کی مقبولیت کی کیا ضمانت ہے؟ افضل الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے دُعا کی کہ اُمت تفرقہ کا شکار نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمائی۔ آپؐ نے قبیلہ رعل اور ذکوان کے حق میں ہلاکت کی بددُعا فرمائی، تو اللہ تعالےٰ نے فرمادیا لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ کے بعد ایک نافرمان بیٹے کے حق میں دُعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ کہہ کر رد کر دی، تو یہ غوث بیچارے آخر کس باغ کی مولی ہیں؟

۶۔ دعا بعض دفعہ قبول ہو جاتی ہے، لیکن اس کا اثر بہت مدت بعد ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت موسےٰ کی دُعا قبول ہوگئی مگر اثر چالیس سال بعد ہوا، اور چالیس سال بعد بنی اسرائیل کو حکومت ملی۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی دُعا قبول ہوگئی مگر تیرہ سال بعد بیٹا پیدا ہوا۔ اب نقیبوں کو یہ کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہماری

دُعا قبول نہیں ہوئی اب فوراً نجیبوں کو دُعا کرنا چاہئے۔ بہرحال اِن اولیاء کے پاس دُعا قبول ہونے یا نہ ہونے کو معلوم کرنے کے لئے انتظار کی مدت کیا ہے؟

قیوم یا انسان کامل

عام اہلِ تصوف تو قطب کو سب سے بڑا اور آخری منصب قرار دیتے ہیں۔ اور چونکہ غوث ایک ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ مناصب ختم ہو بھی جانے چاہئیں، مگر بلند پایہ عارفین کے ہاں اس کے آگے بھی کئی مناصب ہیں اور وہ ہیں، قیوم، فرد، قطب وحدت اور صدیق۔

قیوم کے متعلق امام ربّانی مجدد الف ثانی فرماتے ہیں:

"وہ عارف، جو قیوم کے منصب پر فائز ہو، وزیر کا حکم رکھتا ہے کہ مخلوق کے اہم اُمور کا تعلق اسی سے ہے، گو انعام تو بادشاہ کی طرف سے ہوتے ہیں، مگر وزیر کی وساطت سے ملتے ہیں... معلوم ہوا کہ قیوم انسان کامل ہوتا ہے اور کُل احکامِ ظاہری اور باطنی قیوم کی ذات سے وابستہ ہیں۔ یہ مفہوم حدیث سے بھی متبادر ہوتا ہے" قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ مُعْطِيْ یعنی میں تو تقسیم کنندہ ہوں۔ دینے والا اللہ ہے۔" (مکتوبات ۲:۷، بحوالہ دلائل السلوک، ص ۴۴)

امام ربّانی کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ افضل الانبیاء ان کے نزدیک ان کے مقرر کردہ منصبِ قیومیت پر فائز تھے۔ دیکھا آپ نے حضور ﷺ کو کس گھٹیا مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔

پھر مولانا اللہ یار خان فرماتے ہیں:

"قیوم اولوالعزم رسول کا نائب ہوتا ہے وہ کل انعامات کا سبب ہوتا ہے۔ جب کہ قطب ابدال اور قطبِ ارشاد خاص ایک ایک انعام کا ذریعہ ہیں۔"

فرد اور قطب وحدت

"فرد اور قطب وحدت کا تعلق براہِ راست ذاتِ باری سے ہوتا ہے (یعنی اس میں رسول ﷺ کا واسطہ نہیں ہوتا۔ مؤلف) اس لئے ان کا مرتبہ غوث اور قیوم سے بہت بلند ہوتا ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۴۴)

فرد اور قطبِ وحدت کے ثبوت میں مولانا اللہ یار خان نے ایک صحیح حدیث سے جس طرح استدلال فرمایا ہے اب وہ ملاحظہ فرمائیے، لکھتے ہیں:

"فرد اور قطبِ وحدت کا مفہوم بعینہٖ وہ حدیث ہے، جو رسول اللہ ﷺ سے بطور دُعا غزوۂ بدر

میں زبان پر آئی:

اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِكْ ھٰذِهِ الْعِصَابَةَ — الٰہی! اگر آپ نے اس جماعت (صحابہ کرامؓ) کو ہلاک کر دیا

لَا تُعْبَدُ فِي الْاَرْضِ اَبَدًا — تو پھر زمین پر کبھی بھی آپ کی عبادت نہ کی جائے گی۔

معرفتِ توحید، فیضان کا عام ہونا اور جلد ہونا قطبِ وحدت اور افراد کی خصوصیات میں سے ہے اور معرفت ذات باری تعالیٰ اس سے وابستہ ہوتی ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۸۳)

دیکھا آپ نے دعوے اور دلیل میں کتنا زبردست تعلق ہے۔ اب اگر ایسی نص قطعی کے باوجود بھی اولیاء اللہ کے ان مناصب یعنی فرد اور قطبِ وحدت پر ایمان نہ لائیں، تو اس میں مولانا موصوف کا کیا قصور ہے؟ پھر مولانا نے تشریح میں توحید کے ساتھ معرفت اور فیضان کا عام اور جلد ہونا اور ان منصب والوں کا ذات باری تعالیٰ سے وابستہ ہونا کے الفاظ شامل کر کے سب کچھ اس حدیث سے ثابت کر دکھایا ہے۔

غوث قطب، ابدال کا ثبوت پیرانِ پیر کی زبان سے

"اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں شمشیر برہنہ اور چڑھی ہوئی کمان ہوں، میرا تیر نشانہ پر لگنے والا، میرا نیزہ بے خطا اور میرا گھوڑا بے زین ہے میں عشقِ خداوندی کی آگ، حال واحوال کا سلب کرنے والا، دریائے بیکران، رہنمائے وقت اور غیر سے باتیں کرنے والا ہوں۔ ایک دفعہ آپ نے کیفیتِ حال میں فرمایا کہ میں ہوں محفوظ، میں ہوں ملحوظ، اے روزہ دارو، اے شب بیدارو! اے پہاڑوں پر بیٹھنے والو، خدا کرے تمہارے پہاڑ بیٹھ جائیں، اور اے خانقاہ نشینو! خدا کرے تمہاری خانقاہیں زمین دوز ہو جائیں، حکم خدا کے سامنے آؤ۔ میرا حکم خدا کی طرف سے ہے۔ اے رہروانِ منزل، اے ابدال، اے اقطاب و اوتاد، اے بیہوالو، اور اے نوجوانو! آؤ اور دریائے بیکراں سے فیض حاصل کر لو۔ عزتِ پروردگار کی قسم! تمام نیک بخت اور بد بخت میرے سامنے پیش کئے گئے اور میری نظر لوح محفوظ میں جمی ہوئی ہے۔ میں دریائے علم و مشاہدہ الٰہی کا غوطہ خور ہوں، میں تم سب پر اللہ کی حجت، رسول کا نائب اور اس کا دنیا میں وارث ہوں۔ پھر فرمایا کہ انسانوں کے بھی پیر ہوتے ہیں، جنات اور فرشتوں کے بھی، لیکن میں تمام پیروں کا پیر ہوں۔" (اخبار الاخیار، مصنفہ عبدالحق محدث دہلوی ترجمہ مولانا سبحان محمود صاحب، ص ۴۹)

یہ ہیں پیرانِ پیر عبدالقادر جیلانی، اس قدر جاہ وجلال کے مالک، جو جنوں انسانوں اور حتیٰ کہ فرشتوں اور جنوں کے بھی پیر ہیں، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی وفات کے چند ہی سال بعد عبداللہ بن یونس بن احمد وزیر جلال الدین ابوالمظفر نے آپ کے مکان کو مسمار کرکے آپ کی اولاد کو در بدر کردیا۔ حتیٰ کہ آپ کی قبر کھود ڈالی اور آپ کی ہڈیاں دریا (دجلہ) کی لہروں میں پھینک دیں اور کہا کہ یہ وقف کی زمین ہے۔ اس میں کسی کا دفن کیا جانا حلال نہیں ہے، تو آپ اس کا کچھ بگاڑ بھی نہ سکے۔ (بحوالہ النجوم الظاہرہ، ص ۱۴۲، ج ۶)

اس تاریخی حقیقت کا اعتراف ضیاءُ اللہ صاحب قادری نے اپنی کتاب "سیرۃ غوث الثقلین" میں ص ۲۴۱ ان الفاظ میں کیا ہے:

"ابنِ یونس نے سیدنا غوث اعظم کی اولاد کو طرح طرح کی اذیت اور تکلیف پہنچائی، یہاں تک کہ اُس نے بغداد شہر سے بھی جلا وطن کیا۔ تو اللہ تعالےٰ نے اس کے خاندان کو تباہ و برباد کردیا۔ وَاَقْبَحَ مَوْتَہٗ اور اس کی بُری طرح موت ہوئی (قلائد الجواہر، ص ۵۶) حضور غوث پاک کا ارشاد ہے:

وَنَحْنُ لِمَنْ قَدْ سَاءَنَا سُمٌّ قَاتِلٌ فَمَنْ لَمْ یُصَدِّقْ فَلْیُجَرِّبْ وَیَعْتَدِیْ

یعنی جو کوئی ہمیں اذیت پہنچائے ہم اس کے لئے سم قاتل ہیں۔ جس کو یقین نہ ہو، وہ اذیت پہنچا کر تجربہ کرلے۔" (سیرۃ غوث الثقلین، ص ۲۴۲)

اس اقتباس سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ ابنِ یونس کا آپ کی اولاد کو جلاوطن کرنے کا واقعہ درست ہے اور اس کی وجہ صاحب النجوم الظاہرہ نے بیان کردی ہے۔

۲۔ جلاوطنی کی پاداش میں ابنِ یونس کے خاندان کی تباہی صاحب غوث الثقلین کا اپنا خیال ہے جس کا کوئی تاریخی ثبوت انہوں نے پیش نہیں کیا نہ ہی جلاوطنی کی وجہ بیان فرمائی ہے۔

۳۔ عبدالقادر جیلانی ؒ نے اذیت دینے والے کے لئے انتقام کا جو خطرناک نقشہ اپنے شعر میں بیان فرمایا ہے ہمیں افسوس ہے کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے بالکل مخالف اور متضاد ہے۔

ولایت اور اس کے مناصب کا عزل و نصب

جس طرح سیاسی نظام میں بڑے افسر کی طرف سے کسی چھوٹے افسر کی تقرری ہوتی ہے اور نا اہل ہونے پر اسے معزول کردیا جاتا ہے۔ ولایت کے

سیاسی نظام میں بھی بالکل یہی صورتِ حال ہے۔ درج ذیل واقعہ سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے۔

"ایک واقعہ ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ سے آپ کا ایک مُرید کچھ بد اعتقاد ہوا اور اس غلط فہمی میں پڑا کہ اب میں بھی کسی مقام پر فائز ہو چکا ہوں۔ حضرت جنیدؒ سے کچھ اعراض کر لیا۔ چند روز بعد اس غرض سے آیا کہ تجربہ کرے اور دیکھے کہ میرا خیال جنید پر منکشف ہوا یا نہیں؟ اور حضرت جنیدؒ اپنے نورِ فراست سے اس کی حالت ملاحظہ فرما رہے تھے، جب وہ مرید آیا آپ سے کچھ سوال کرنے لگا۔ آپ نے فرمایا کیسا جواب چاہتا ہے۔ الفاظ و عبارات میں یا حقیقتِ معنی میں؟ مرید نے عرض کی، دونوں طرح۔ آپ نے فرمایا: عبارتی جواب تو یہ ہے کہ اگر میرا تجربہ کرنے کی بجائے اپنا تجربہ کر لیتا، تو میرے تجربہ کا محتاج نہ ہوتا اور اس جگہ تجربہ کی غرض سے نہ آتا۔ اور معنوی جواب یہ ہے کہ میں نے تجھے منصبِ ولایت سے معزول کیا۔ یہ فرمانا تھا کہ مُرید کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ چیخنے لگا اور پکارا کہ حضور راحت یقین میرے دل سے جاتی رہی۔ توبہ کرنے لگا اور پہلی بکواس سے ہاتھ اٹھایا۔ اس وقت حضرت جنید نے فرمایا، تو نہیں جانتا کہ اللہ کے ولی والیانِ اسرار ہوتے ہیں۔ تجھ میں ان کی ضرب کی برداشت نہیں۔ پھر ایک پھونک اس پر ماری۔ وہ پھر اپنے درجہ پر متمکن ہوا۔ اس وقت سے خاصانِ بارگاہ کے معاملات میں دخل دینے سے بھی توبہ کی اور پختہ عہد کر لیا۔" (کلام المرغوب اردو ترجمہ کشف المحجوب مصنفہ علی ہجویری صاحب، ص ۲۷۰، ۲۷۱)

اقتباس بالا سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ آپ خاصانِ بارگاہ میں سے تھے (گو صحیح منصب متعین نہیں ہو سکتا کہ کون سے منصب پر پہنچ کر ولی خاصانِ بارگاہ بنتے ہیں تاہم) وہ اپنے سے چھوٹے ولی کو معزول کر سکتے تھے۔

۲۔ اپنے سے بڑے مرتبے والے کے متعلق دل میں شک لانے سے بھی اتنی سزا مل سکتی ہے۔

۳۔ ولی اللہ واقفِ اسرار نہیں بلکہ والیانِ اسرار ہوتے ہیں، جبکہ صحابہؓ کو اور بعض دفعہ خود حضور اکرم ﷺ کو بھی ایسے باطنی امور کا پتہ نہ چلتا تھا۔

۴۔ ان کا تصرف و اختیار اور ان کی مار اتنی شدید ہوتی ہے کہ ان سے کمتر درجہ کے ولی بھی وہ ضرب برداشت نہیں کر سکتے۔

قاسمِ ولایت کون؟

علامہ عبدالقادر الاربلی مصنف تفریح الخاطر (ص ۳۵-۳۹، مطبوعہ مصر) بحوالہ سیرۃ غوث الثقلین ص ۲۲۴ زیرِ عنوان قاسم ولایت)

فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالٰی اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو ولی بنانا چاہتا ہے، تو حکم فرماتا ہے کہ اسے حضرت محمد ﷺ کی بارگاہ میں پیش کرو۔ (کسے حکم فرماتا ہے؛ علامہ اربلی غالباً یہ بات بتلانا بھول گئے۔ مؤلف) جب آپ کی بارگاہ میں پیش کیا جاتا ہے، تو آپ فرماتے ہیں کہ اسے میرے بیٹے عبدالقادر جیلانی کے پاس لے جاؤ، تاکہ وہ اس کی اہلیت دیکھیں اور یہ بھی دیکھیں کہ منصب ولایت کا مستحق ہے یا نہیں؛ چنانچہ وہ دربارِ غوث اعظم میں پیش کیا جاتا ہے۔ آپ اس کو اگر منصبِ ولایت کے قابل دیکھتے ہیں، تو اس کا نام دفترِ محمدیہ ﷺ میں لکھ کر مہر لگا دیتے ہیں۔ پھر اسے حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں پیش کیا جاتا ہے اور غوث اعظم کی تحریر کے مطابق نبی پاک ﷺ کا فرمان لکھا جاتا ہے۔ پس اس کو ولایت کی خلعت سے سرفراز کیا جاتا ہے، جو غوث پاک کے دستِ مبارک سے دی جاتی ہے۔ جب وہ اسے پہن لیتا ہے تو عالمِ غیب و شہادت (یعنی آدمیوں اور رجال الغیب) میں مقبول و مسلّم ہو جاتا ہے۔ پس اس عہدہ پر حضرت غوث پاک قیامت تک فائز رہیں گے اور اس مقام میں کوئی ولی آپ کے مماثل اور شریک نہیں ہے ہر زمان اور آن میں قطب، غوث اور تمام اولیاء اللہ آپ کی ذات منبع برکات سے مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔" (تفریح الخاطر، ص ۳۸، ۳۹)

اب دیکھئے جنید بغدادی (م ۲۹۸ھ) بھی اسی منزل عزل و نصب پر فائز تھے اور یہ سلسلہ سہروردیہ کے جدِ اعلیٰ ہیں، لہٰذا علامہ اربلی صاحب غالباً انہیں معاف کر ہی دیں گے کیونکہ یہ غوثِ اعظم سے بہت پہلے کے ہیں۔ اسی طرح ایک اور صاحب ابوسعید چشتی بھی نظر آتے ہیں۔ جو اسی عزل و نصب کے منصب پر فائز ہیں (تفصیل آگے آئے گی) یہ ایک تو چشتی ہیں، دوسرے پیرانِ پیر کے تقریباً ہم عصر ہیں۔ اصل معاملہ تو بابا فریدالدین گنج شکر کا ہے، جو اسی سلسلہ قادریہ میں منسلک اور تیسری پشت میں آپ کے مرید بھی ہیں۔ انہوں نے آخر یہ عزل و نصب کے اختیارات (جو تا قیامت عبدالقادر جیلانی کے لئے مخصوص تھے) کیوں غوث پاک سے چھین کر ان پر خود قبضہ کر لیا؟ (واقعہ کی تفصیل آگے آئے گی۔ بلحاظ ترتیب زمانی)

پیرانِ پیر کا ایک چور کو ابدال بنا دینا

اب عبدالقادر جیلانی ؒ نے ان اختیارات عزل و نصب کو جس طرح استعمال کیا وہ بھی درج ذیل واقعات سے ملاحظہ فرمائیے:

"شاہ ابوالمعالی ؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ شیخ داؤد فرماتے تھے کہ ہمارے پیر جہانگیر (عبدالقادر جیلانی)

کے درِ دولت پر تمام اہلِ دولت و ثروت بھی آتے تھے۔ ایک چور نے سمجھا بڑے مالدار ہوں گے اور ارادہ کیا کہ گھر میں گھس جاؤں اور دلی مُراد پاؤں۔ وہ گھر میں داخل ہوا کچھ بھی نہ پایا اور اندھا ہو گیا۔ آنجناب پر اس سیاہ بے نور کا حال روشن تھا۔ خیال فرمایا کہ یہ بات مروّت سے بعید ہے کہ ہمارے گھر میں کامیابی کی خواہش سے آکر ناکام چلا جائے۔ آپ ابھی اسی خیال میں تھے کہ حضرت خضر علیہ السلام آئے اور عرض کی کہ اے عالی ممالک کے والی! ایک ابدال اس وقت قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا ہے۔ جس کے لئے آپ حکم دیں اُس کی جگہ مقرر کیا جائے۔ آپ نے فرمایا ایک شکستہ دِل ہمارے گھر میں پڑا ہے۔ جاؤ اس کو لے آؤ تاکہ اسے بلند مرتبہ پر فائز کر دیں اور حضرت خضر علیہ السلام گئے اور اس شخص کو آپ کے حضور میں پیش کیا گیا۔ جس کو آپ نے ایک ہی نگاہِ لطف سے ابدال بنا دیا" (تحفہ قادریہ، ص ۱۹، ۲۰، خزینۃ الاولیاء فارسی، ج ۱، ص ۹۷، بحوالہ سیرۃ غوث الثقلین، ص ۲۰۸)

اب دیکھئے اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ علامہ اربلی کے بیان کردہ دستورِ ولایت کو توڑنے والے خود غوثِ اعظم ہیں۔ اس چور کو نہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا نہ اُدھر سے آرڈر ہوا کہ اسے عبدالقادر جیلانی کے پاس لے جاؤ کہ وہ اس کی ولایت کی اہلیت کو ٹیسٹ کریں، تو پھر غوث پاک نے ایک چور کو ابدال بنا کر دھاندلی نہیں کی؟

۲۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ مرنے والے ابدالوں کی اطلاع غوثِ اعظم کو دیا کریں اور نئے بننے والے ابدالوں کو غوث پاک کی بارگاہ میں حاضر کیا کریں۔

۳۔ جب چور گھر میں پہلے ہی موجود تھا، غوث پاک بھی گھر پر ہی تھے، تو حضرت خضر نے کس مقام سے اس چور کو آپ کے پاس حاضر کیا؟

اب دیکھئے اسی واقعہ کو باختلافِ روایت صاحب تفریح الخاطر (ص ۲۲) نے یوں بیان فرمایا ہے جو کچھ اس طرح ہے:

"غوثِ اعظم مدینہ منورہ سے حاضری دے کر ننگے پاؤں بغداد کی طرف آرہے تھے۔ راستہ میں ایک چور کھڑا کسی مسافر کا انتظار کر رہا تھا کہ اُسے لُوٹ لے، آپ جب اس کے قریب پہنچے، تو پوچھا تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا: بدو ہوں۔ آپ نے کشف کے ذریعے اس کی بدکرداری کو لکھا ہوا دیکھا۔ اتنے میں اُس چور کے دِل میں بھی خیال آیا کہ شاید یہ غوث اعظم ہیں۔ آپ کو چور کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے کا علم ہو گیا۔

اور فرمایا میں عبدالقادر ہوں، چور یہ بات سنتے ہی آپ کے قدموں پر گر پڑا اور اس کی زبان پر "یا سَیِّدِیْ عَبْدُ الْقَادِرِ شَیْئًا لِلّٰہ" جاری ہو گیا۔ آپ کو اس کی حالت پر رحم آ گیا اور اس کی اصلاح کے لئے بارگاہِ الٰہی میں متوجہ ہوئے تو غیب سے ندا آئی: "اے غوثِ اعظم اس چور کو سیدھا رستہ دکھا دو اور ہدایت کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے اسے قطب بنا دو۔ چنانچہ آپ کی ایک نگاہِ فیض رساں سے وہ قطب کے درجے پر فائز ہو گیا۔" (سیرۃ غوث، ص ۱۴۰، بحوالہ تفریح الخاطر ص ۲۲)

۱۔ اب دیکھئے کہ پہلی روایت کے مطابق چور آپ کے گھر کو لوٹنے آیا، لیکن اس روایت میں وہ راہ میں اسی غرض سے کھڑا تھا۔

۲۔ پہلی روایت میں آپ نے حضور اکرم ﷺ کے واسطہ کو تو ختم کیا تھا مگر حضرت خضر علیہ السلام سے کچھ کام لیا تھا مگر اس روایت میں اُن کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ حالانکہ چور دونوں واقعات میں پاس موجود تھا۔

۳۔ پہلی روایت میں آپ نے چور کو ابدال بنایا تھا اس روایت کے مطابق قطب بنا دیا اور اس کی سابقہ اہلیت کو ہر دو بار ٹیسٹ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

۴۔ پہلی روایت کے مطابق آپ کو اس لئے رحم آیا تھا کہ گھر سے خالی واپس نہ جائے اور دوسری روایت کے مطابق اس کے شَیْئًا لِلّٰہ کے وظیفہ سے آپ کا دل پسیج آیا۔ گویا آپ کی زندگی میں ہی اس وظیفہ کا رواج ہو چکا تھا جسے آپ بہت پسند فرماتے تھے۔

اب یہ واقعہ ایک ہی تھا جس میں تذکرہ نگاروں نے اتنا اختلاف پیدا کر دیا یا واقعات ہی دو الگ الگ ہیں، یہ فیصلہ تو تذکرہ نگار ہی کریں گے۔ بظاہر یہ واقعہ ایک ہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ چوروں کو قطب یا ابدال بنا دیا کرتے تھے۔

پیرانِ پیر کا ایک کافر کو ابدال بنا دینا

ضیاء اللہ قادری صاحب اپنی کتاب "سیرۃ غوث الثقلین" کے صفحہ ۱۸۵ پر رقمطراز ہیں:

"ملک شام میں ایک ابدال انتقال کر گئے، تو آپ سرزمین عراق سے فوراً وہاں تشریف فرما ہوئے بعد ازیں حضرت خضر علیہ السلام اور دیگر ابدال بھی تشریف لے آئے سب حضرات نے ان کا جنازہ پڑھا بعد از جنازہ حضرت غوث پاک نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا کہ قسطنطنیہ میں فلاں کافر کو یہاں لے آئیں۔ حضرت خضر نے فی الفور اس کو حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے اس کافر کو کلمہ پڑھا کر مسلمان

کیا۔ اُس کی مونچھوں کو پست کیا اور اپنی ایک ہی نظرِ کرم سے اُسے مقامِ ابدال پر فائز فرما دیا اور سب ابدالوں سے فرمایا کہ انتقال کرنے والے ابدال کے مقام پر اسے مقرر کرتا ہوں، جس پر سب ابدالوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔" (تتمہ شرح سلم الثبوت، ص ۴۲۶، سفینۃ الاولیاء، ص ۶۵)

اس اقتباس سے درج ذیل اُمور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ آپ اکثر چور اور کافر قسم کے لوگوں کو ہی ابدال بنایا کرتے تھے۔

۲۔ علامہ اربلی کے بیان کردہ دستورِ ولایت کی خلاف ورزی کیا کرتے تھے۔

۳۔ حضرت خضر اس معاملہ میں آپ کے کارندے کی حیثیت رکھتے تھے کہ نئے بننے والے ابدال کو آپ کے حضور پیش کیا کریں۔

اللہ تعالیٰ نے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اُولوالعزم پیغمبر کو اُن کی خدمت میں بھیجا تھا، لیکن ان تذکرہ نگاروں نے مزید ڈھائی ہزار سال تک انہیں زندہ رکھ کر اُن کو غوث پاک کی چاکری پر مامور کر دیا ہے۔

۴۔ کسی بزرگ کا بیک وقت کئی مقامات پر بجسدِ عنصری موجود ہونا اور موجود ہو جانا گو کتاب و سنت کے صریح خلاف ہے تاہم اس طبقہ میں یہ مسئلہ "مُجمَعٌ عَلَیہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔

معین الدین چشتی اجمیری کو ہندوستان کس نے بھیجا؟

"شیخ نور اللہ لطائف القادریہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ معین الدین نے غوثِ اعظم سے عراق کا علاقہ مانگا، تو آپ نے ارشاد فرمایا: "کہ عراق میں نے شہاب الدین سہروردی کو عطا کر دیا ہے اور تم کو ہندوستان کا علاقہ عطا کرتا ہوں۔" (تفریح الخاطر، ص ۲۱۔ بحوالہ سیرۃ غوث الثقلین، ص ۲۴۳)

اب دوسری روایت ملاحظہ فرمائیے:

"مشہور ہے جب خواجہ (معین الدین) صاحب مدینہ منورہ کی زیارت کے لئے گئے، تو وہاں آپ کو ہندوستان کے کفار میں تبلیغِ اسلام کا حکم ملا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں تشریف لائے اور ان سے فرمایا کہ "خدا نے ہندوستان کا ملک تیرے سپرد کر دیا ہے، وہاں جا اور اجمیر میں سکونت اختیار کر۔ خدا کی مدد سے دینِ اسلام تیرے اور تیرے ارادتمندوں کے تقوے سے اس سرزمین میں پھیل جائے گا۔" (روحِ تصوف، ص ۱۰۰۔ بحوالہ دعوتِ اسلام، پروفیسر آرنلڈ، ترجمہ عنایت اللہ، ص ۲۷۸، مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب، لاہور)

اس روایت کی تائید شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب اپنی تصنیف تاریخ مشائخ چشت میں ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"آپ دس محرم کو اجمیر رونق افروز ہوئے۔ وہاں سب سے پہلے سید میر حسن بیعت ہوئے اس کے بعد ہزار ہا خلقت داخل سلسلہ ہوئی۔ حضور اکرم ﷺ کے حکم کی بناء پر ہندوستان تشریف لائے۔"

(تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۶۸)

اب تیسری روایت ملاحظہ فرمائیے۔ یہی شیخ الحدیث اسی کتاب کے صفحہ ۱۶۷ پر پہلے یوں لکھ چکے ہیں کہ :

"حضرت شیخ (عثمان ہارونی) ہندوستان کی ولایت پر آپ کو مامور کر کے حج کو تشریف لے گئے۔"

اب تینوں متضاد روایات سے مندرجہ ذیل باتیں مستفاد ہوتی ہیں :

۱۔ خواجہ صاحب کو ہندوستان کس نے بھیجا ؟ یہ فیصلہ آپ خود کر لیجئے۔ البتہ یہ بات ضرور کھٹکتی ہے کہ آپ کے پیر و مرشد عثمان ہارونی ہندوستان جانے کا آرڈر دے چکے تھے، تو آپ نے غوثِ اعظم سے عراق کا علاقہ کیوں طلب کیا ؟

۲۔ پہلی روایت غوثِ اعظم کو قاسمِ ولایت تسلیم کرتی ہے، لیکن باقی دونوں روایات اربلی صاحب کے بیان کردہ دستورِ ولایت پر خطِ تنسیخ پھیر دیتی ہیں کہ آپ قیامت تک کے لئے قاسمِ ولایت ہیں۔

پھر بعد میں آنے والوں نے بھی اس دستورِ ولایت کی چنداں پرواہ نہ کی، جس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کسی کو ولایت اسمِ اعظم کے طفیل ملتی رہی، کسی کو شیخ کے حکم سے اور کسی کو بحکم الٰہی براہِ راست۔ درمیان سے پیرانِ پیر کا واسطہ بالکل ساقط کر لیا جاتا رہا۔

لمحہ بھر میں ضربِ شدید کے ذریعہ ولایت کی عنایت

اب ایک تیسرے ولی اللہ ابو سعید چشتی صابری گنگوہی کا عام شخصوں کو ولی بنانے اور اس منصب پر فائز کرنے کا طریقہ بھی ملاحظہ فرمائیے : ان کا طریقہ واردات بالکل جداگانہ ہے۔ صاحب حدیقۃ الاولیاء رقمطراز ہیں کہ :

"سواطع الانوار میں لکھا ہے کہ ایک شخص منکرِ حال ان (ابو سعید چشتی صابری گنگوہی، م ۱۰۴۰ھ) کے پاس آیا اور عرض کی میں طالب خدا ہوں مگر طاقت محنت، عبادت و ریاضت کی مجھ میں نہیں ہے۔

چاہتا ہوں کہ آپ کی نظرِ فیض اثر سے مقصودِ دل حاصل کر لوں۔ حضرت کے ہاتھ میں اس وقت عصا تھا۔ فرمایا کہ ہاں ہم اس عصا کی تین ضرب سے طالب کو خدا تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر ایک ضرب عصا کی اس کے سر پر لگائی، عالمِ ملکوت اس پر کھل گیا، دوسری ضرب میں عالمِ جبروت، تیسری ضرب میں عالمِ شہود اس پر منکشف ہو گیا۔ تین دن تک بے ہوش رہا۔ جب ہوش میں آیا، صدقِ دل سے مُرید ہو گیا۔" (حدیقۃ الاولیاء، ص ۳۰)

ہمارے خیال میں تو وہ کوئی بڑا ہی سخت جان مُرید تھا جس کو سر میں تین عصا کھانے سے صرف عالمِ ملکوت، جبروت اور شہود ہی روشن ہوئے، اس پر تو چودہ طبق روشن ہو جانے چاہئیں تھے۔ البتہ اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ جب اس پر یہ تینوں عالم منکشف ہو گئے اور وہ خدا تک بھی پہنچ چکا، تو پھر بعد میں مرید کس غرض سے ہوا۔

احکامِ ولایت کو چاک کر ڈالنا

اب پیرانِ پیر کے پوتے مُرید بابا فرید الدین گنج شکر کے عزل و نصب کا طریقہ ملاحظہ فرمائیے:

"حضرت فرید الدین گنج شکر کا دستور تھا کہ جس خلیفہ کو کسی ملک کو روانہ کرتے، فرمان اپنے دستخط سے لکھ کر فرماتے کہ خواجہ جمال الدین ہانسوی سے جا کر مہر کر لو۔ اس رسم کے بعد جب علاؤ الدین علی احمد صابر بھی ہانسی پہنچے، چونکہ یہ خواجہ فرید الدین گنج شکر کے بھانجے، داماد اور ولایت میں سب سے بڑھ کر تھے، ان کے استقبال کے لئے خواجہ جمال الدین ہانسی سے دو میل باہر آئے۔ انہوں نے ان کی تکریم کی مگر جنڈول سے نیچے نہ اُترے اور خواجہ جمال الدین پاپیادہ ان کی سواری کے ساتھ رہے اور انہیں مسجد میں لے جا کر اتارا۔ شام کا وقت تھا۔ خواجہ جمال الدین نے انہیں مسجد میں امام بھی کیا۔ نماز کے بعد علاؤ الدین نے خواجہ جمال الدین سے فرمان پر مُہر کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے کہا اب شام کا وقت ہے کل صبح کر دوں گا۔ یہ بات سنتے ہی علاؤ الدین نے داہنے ہاتھ کی بڑی انگلی کو پھونکا۔ اس پھونک سے انگلی شمع کی مانند روشن ہو گئی۔ فرمایا، "اب روشنی ہو گئی ہے۔ فرمان پڑھ کر مُہر کر دو۔" یہ بات سن کر خواجہ جمال نے فرمان پھاڑ کر کہا کہ "دلّی بیچاری تیری ایسی آتشِ دمِ ولایت سہارنے کی قوت نہیں رکھتی۔" اس بات پر علاؤ الدین کمال ناراض ہوئے اور فرمایا "تو نے میرے فرمان کو پھاڑ ڈالا، میں نے تیری ولایت کو پھاڑ ڈالا۔" جمال الدین نے کہا "اوّل سے یا آخر سے؟" کہا "آخر سے۔"

"یہ بات کہہ کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خواجہ فرید کی خدمت میں آکر کُل حال بیان کیا۔ انہوں نے کہا" پارہ کردۂ جمال را فرید نتواں دوخت "(یعنی جمال کے پھاڑے ہوئے فرید سی نہیں سکتا)" (حدائقۃ الاولیاء، ص ۹۷)

اب دیکھئے اس عزل ونصب کے تنازعہ میں تین فریق ہیں۔(۱) فریدالدین آرڈر دینے والے۔ (۲) جمال الدین ہانسوی اور (۳) علاؤالدین صاحب، مہر لگوانے والے۔ فریدالدین صاحب، علاؤالدین صاحب کو مہر لگوانے بھیجتے ہیں، تو علاؤالدین شام کے بعد انگلی روشن کرکے اصرار کرتے ہیں کہ ابھی مہر کردو۔ جمال الدین صاحب اس بیجا تقاضا پر برافروختہ ہوکر آرڈر ہی پھاڑ دیتے ہیں، تو اب مُہر کروانے والے علاؤالدین اگرچہ غرض مند ہیں تاہم فریدالدین فرمان کنندہ کے بھانجا ہونے کی بنا پر جمال الدین مُہر کنندہ کی ولایت ہی پھاڑ دیتے ہیں، لیکن اس کی ولایت کو آخر سے پھاڑتے ہیں، اول بچا رہتا ہے۔ یہ کارنامہ سرانجام دے کر یہ علاؤالدین بھانجہ صاحب' اپنے ماموں بابا فریدالدین، فرمان کنندہ کے پاس پہنچے مگر یہ فرمان کنندہ بھی معذوری کا اظہار کرتے ہیں کہ جس فرمان کو جمال الدین نے پھاڑ دیا اسے فرید سی نہیں سکتا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ علاؤالدین علی احمد صابری ولی تھے یا نہیں؟ اور انہوں نے جو جمال الدین کی ولایت کو آخر سے پھاڑ ڈالا تھا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؛ وہ ولی رہے یا نہیں؛

پھر یہ بھی غور فرمائیے کہ بابا فریدالدین یہ خیال نہیں فرماتے کہ عزل و نصب کا یہ مقام تو اب قیامت تک اُن کے دادا پیر یعنی پیران پیر کو حاصل ہے۔ آپ خواہ مخواہ ان کا یہ منصب اور حق غصب فرما رہے ہیں اور علامہ اربلی کے بیان کردہ دستور کی بھی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔

دورِ نبویؐ کا باطنی نظام

اب اس باطنی سیاسی نظام کی تفصیل جناب عبدالعزیز قادری مصنفہ "سرچشمۂ حیات" کی زبان سے سنئے۔ ساتھ ساتھ کتابوں کے دیئے گئے حوالہ جات بھی ملاحظہ فرماتے جائیے؛

"اسلام سے پہلے اس جہان کا اندرونی نظام فرشتوں اور اولیائے جنات کے سُپرد تھا۔ آنحضرت نے انسانوں کو بھی اس کا باقاعدہ حصہ دار بنایا اور پانچ سال قبل از ہجرت پندرہ ممالک کا انتظام حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سُپرد فرمایا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور دیگر کئی صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اس نظام میں منسلک کیا۔" (حقیقت گلزار صابری، صفحہ درج نہیں، بحوالہ سرچشمۂ حیات، ص ۶۶)

دیکھ لیا آپ نے کس قدر مستند، مدلل اور بصیرت افروز بیان ہے گلزار صابری صاحب کا۔ اس کی کس کس بات پر تبصرہ کیا جائے، نشان زدہ نکات خود دیکھ لیجئے۔

باطنی نظام کا ثبوت قرآن سے

پھر قادری صاحب اس باطنی نظام کا ثبوت قرآن کریم سے یوں پیش فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ○ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ	ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا کہ بے شک زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے، سو میرے اس فرمان میں عبادت گزاروں کے واسطے بشارت (۹) ہے۔

بَلٰغًا کا ترجمہ 'بشارت' کرنے کی مصلحت قادری صاحب ہی سمجھتے ہیں۔ پھر اس آیت کی تشریح فرماتے ہیں:

"زمین کی اس وراثت سے مراد سلطنتِ کاملہ اور حکومتِ باطن ہے اس کے حاکم (یعنی قطب ابدال وغیرہ) چاہیں تو دنیا کے بادشاہوں کو بادشاہت سے معزول کر دیں۔[1] رہی حکومتِ ناقصہ (یعنی ظاہری حکومت) تو وہ مشرکوں، کافروں، بے دینوں، سب کے لئے عام ہے۔" (سر دری کلاچوی)

پھر اس بیان مذکورہ پر قادری صاحب خود ہی ایک اشکال پیش کرتے ہیں کہ: صحابہ جیسے اہلِ باطن کا باہمی جنگ و جدل بعید نظر آتا ہے، تو اس کا حل یہ پیش کرتے ہیں:

"شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے موقع پر اور اس کے بعد جتنے واقعات پیش آئے تھے، ان میں سے ایک ایک کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بہم پہنچا چکے تھے۔ اس لئے ان واقعات کو خدا تعالیٰ کی اٹل تقدیرات سے سمجھا جا چکا تھا اور ایسے موقع پر اہل باطن امرِ تقدیری کو پورا کر دینے کے لئے پُرجوش ہوتے ہیں۔" (فتوحات مہاجر مکی)

یہ حل ہے یا مزید الجھاؤ؟ کیا سب صحابہ اہلِ باطن اور جبریہ عقیدہ کے قائل تھے؟ جو تقدیر کو پورا کرنے کے لئے دیدہ دانستہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے پر تُل گئے تھے۔

پھر قادری صاحب فرماتے ہیں: "یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگِ اُحد میں تشریف لے گئے حالانکہ آپ کی ذاتی رائے میدانِ اُحد میں جانے کے خلاف تھی اور اس لئے لڑائی کے لئے کوئی دُعا نہ

---

[1] اس کے مقابلہ میں قرآن کریم کا ارشاد بھی ملاحظہ فرمائیے: قل اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء

مانگی۔ حالانکہ بدر کے لئے آپؐ نے خضوع و خشوع سے دعا مانگی تھی۔" (مثنوی شریف)

پھر قادری صاحب دوسرا اشکال پیش فرماتے ہیں۔ "اولیاء اللہ کافروں کی فوجیں معنوی طاقتوں سے تباہ کر دیا کریں، تو لڑائی کی نوبت ہی نہ آئے۔" اس کا حل یہ بتاتے ہیں کہ "باطن بغیر ظاہر کے مکمل نہیں۔"

(سرچشمۂ حیات، از عبدالعزیز قادری، ص ۶۹ تا ۱۷، مطبوعہ تبلیغ سوسائٹی، قصور پورہ، لاہور)

اب سوال یہ ہے کہ اگر باطن، ظاہر کے بغیر مکمل نہیں اور ظاہر باطن کے بغیر سب کچھ کر رہا ہے، تو اس باطن کا فائدہ کیا ہے؟ حقیقت یہی ہے کہ ان اہلِ باطن کے ریت پر تعمیر کئے ہوئے محل محض پروپیگنڈا اور جہلاء کی اندھی عقیدت کے سہارے قائم ہیں۔ جن کے پیچھے کوئی ٹھوس بنیاد نہیں۔ شرعی دلائل کے ایک ہی جھونکے سے یہ محل زمین بوس ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ان کے بلند بانگ دعوے یہ ہیں کہ بقول مولانا رومؒ

اولیاء را ہست قدرت از الٰہ　　تیرِ جستہ باز گردانند زراہ

ترجمہ: اولیاء اللہ کو اللہ کی طرف ایسی قدرت (تصرف) حاصل ہوتی ہے کہ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس لا سکتے ہیں۔

اولیاء اللہ کی بے بسی

اور جو لوگوں کی موت و حیات پر تصرف کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ جب خود ان پر کوئی حادثہ پیش آتا ہے، تو فوراً راہِ فرار اختیار کر جاتے ہیں۔ اس وقت نہ اُن کی دعا کام آتی ہے اور نہ کرامت۔ مثلاً حدیقۃ الاولیاء کے مصنف مفتی غلام سرور صفحہ ۸۰ پر شیخ کرم شاہ قریشی حارثی ہکاری کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"پہلے ان کی سکونت لاہور میں تھی۔ جب غارت گر قوم سکھ نے پنجاب میں ہنگامۂ غارتگری گرم کیا، تو یہ بزرگ لکھنؤ چلا گیا اور چند سال اپنے نانا شیخ نور الحسن قریشی کے ساتھ بسر کئے۔ مراجعت کے وقت متصل شاہ جہان پور ۱۲۰۱ھ میں قزاقوں کے ہاتھوں شہید ہوا۔ رضی اللہ عنہ ۱۲۰۱، اس کا سال وفات ہے۔"

اور معروف کرخیؒ (م ۲۰۶ھ) کی وفات یوں ہوئی کہ آپ وفات سے چند روز پہلے اپنے پیرِ طریقت امام موسیٰ رضا (شیعوں کے آٹھویں امام) کی ملاقات کے لئے گئے۔ دربانوں نے اندر نہ جانے دیا۔ جب اصرار پر نوبت پہنچی، تو پاسبانوں نے شیخ معروف کو زد و کوب کیا جس سے اُن کی پسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہی صدمہ آپ کی موت کا باعث ہوا۔ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۳۱) اس وقت نہ امام صاحب کا "نورِ باطن" کام آیا نہ معروفؒ کرخی کا نہ ہی امام موصوف کی دعا اور دم جھاڑ اپنے خلف الرشید کے کسی کام آسکے۔

بابا نور محمد تیراہی المعروف باباجیو (م ۱۲۸۴ھ) کا فرار یا ہجرت؟

آپ مادر زاد ولی تھے آپ پر الزام لگایا گیا کہ آپ کا طریقہ جوگیانہ ہے اور آپ اپنے مریدوں کو ایک ہزار مرتبہ یومیہ 'یا ابلیس' پڑھنے کو بتاتے ہیں۔ افغانی یہ باتیں سن کر آپ کے خلاف ہوگئے اور آپ کے مریدوں کو لوٹنے لگے، کچھ عرصہ تو آپ برداشت کرتے رہے بالآخر تیراہ شریف سے موضع اڑاوڑ چلے گئے۔ (صوفیائے نقشبند، ص ۲۹۱)

اور یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ان اولیاء کے شیخ اکبر پر بھی مصر میں کفر کا فتویٰ لگا اور ان کے قتل کا حکم حاصل کرلیا گیا، تو انہوں نے بھی چپکے سے راہِ فرار اختیار کی اور دمشق میں آکر پناہ لی تھی۔ غرض اس طرح کے واقعات بھی بے شمار ہیں جن سے ان کی خدائی کی اصل حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے اور جن میں سے چند واقعات آپ کو اس کتاب میں دیگر مقامات پر مل جائیں گے۔

اہلِ باطن پر علمائے حق کی گرفت

اب سوال یہ ہے کہ اگر ان صوفیائے کرام کا مذہب ایسے ہی مشرکانہ عقائد و اعمال کا مرقع ہے، تو اہلِ ظاہر نے اِن پر کوئی گرفت بھی کی یا نہیں؟ اس سوال کا جواب مختصراً حسبِ ذیل ہے:

حکومتوں سے سزا دلوانا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں عبداللہ بن سبا یہودیوں کے چیلوں یعنی حلولیوں نے اپنے عقائد کا اظہار کیا، تو انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زندہ جلا دیا تھا۔ اس سخت سزا کی وجہ سے یہ فتنہ کافی عرصہ دبا رہا۔

اس کے بعد جب منصور حلاج نے یہی بات کہی، تو علمائے حق نے اس پر بھی بروقت گرفت کی خلیفہ مقتدر باللہ نے ۳۰۹ھ میں اور بقول بعض ۳۱۰ھ میں اسے قتل کرا دیا۔ پھر اسے دفن نہیں کیا گیا بلکہ اسے جلا کر اس کی راکھ دریا میں پھینک دی گئی۔

ابو عبداللہ الحکیم ترمذی نے تیسری صدی کے آواخر میں جب نظریۂ ختم الولایۃ پیش کیا اور تصوف کے بعض دوسرے مسائل پر روشنی ڈالی تو علمائے وقت نے بڑی شورش کی اور اس پر کفر کا فتویٰ بھی لگایا آخر اُس نے اپنی جان بچانے کی خاطر ترمذ سے راہِ فرار اختیار کی اور جلاوطن ہو کر بلخ میں جا کر پناہ لی۔

پھر ہمیں تاریخ میں ایک اور صوفی بزرگ شہاب الدین سہروردی المقتول کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بزرگ ایک صوفی اور فلسفی کی حیثیت سے پہلے اصفہان میں رہے پھر بغداد بعد ازاں وہاں سے حلب چلے گئے۔

جب ان کے صُوفیانہ عقائد نے مسلمانوں کے دِل میں اُن کی طرف سے شبہات پیدا کر دیئے اور راسخ الاعتقاد علماء نے ان پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا، تو ابو الملک الظاہر نے ۵۸۷ھ میں ان کو بعمر ۳۶ یا ۳۸ سال قتل کر دیا۔ (دائرۃ المعارف، ج ۱۱، ص ۷۰۴ زیرِ عنوان شہاب الدین سہروردی المقتول)

ابنِ عربی پر بھی وحدت الوجود کی اشاعت وتشہیر کی پاداش میں کفر کا فتوےٰ لگایا گیا اور اسے زندیق، ملحد اور کذاب جیسے بدترین القاب سے نوازا گیا اور مصر میں ان کے قتل کا حکم بھی حاصل کر لیا گیا۔ ان کو اس کا پتہ لگ گیا تو چپکے سے راہِ فرار اختیار کی اور دمشق میں آکر دَم لیا۔

عفیف الدین تلمسانی قرآن وحدیث کے خلاف خرافات بکتا تھا مگر نہایت رازداری سے اور جب اُسے یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں کمال الدین اس کا راز فاش نہ کر دے، تو اپنے اس شاگرد کے پاس آیا اور منت ومعذرت سے اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس کے یہ خرافات پردۂ راز میں رہنے دے۔

اس کے بعد امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کا دور آتا ہے انہوں نے اپنے وقت کے موجودہ رفاعی، بدعتی اور مشرک فرقے سے حکومتی سطح پر مناظرہ ومباہلہ کیا، جس میں یہ رفاعی بزرگ ہار گئے (حالانکہ حکومت کے اکثر اہلکاروں پر ان رفاعی شعبدہ بازوں کا اچھا خاصا اثر تھا) اور معذرت طلب کی اور وعدہ کیا کہ آئندہ ایسی بدعات وخرافات سے باز آئیں گے اور خلافِ شریعت کام نہیں کریں گے۔

ہند میں اورنگزیب عالمگیر کے زمانہ میں حکیم سرمد نے خدائی کا دعوےٰ کیا، تو اسے ۱۰۷۰ھ میں قتل کیا گیا۔

یہ تو تعزیری اقدامات تھے، اب تحریری بھی سُن لیجئے:

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ پہلی اور دوسری صدی میں ایسے بزرگوں کو زاہد، عابد یا صالح کہا جاتا تھا، صوفیاء کی اصطلاح بعد میں وضع ہوئی۔ یہ لوگ چونکہ فقر وفاقہ، دنیا سے بے رغبتی اور نفلی عبادت مثلاً نماز، روزہ میں سنت سے آگے بڑھ گئے اور غلو سے کام لیتے تھے۔ لہٰذا ان لوگوں یا ان کے معتقدین میں اپنے نظریات کو صحیح ثابت کرنے کی خاطر موضوعات اور جھوٹ کا بھی رواج ہو گیا تھا۔ چنانچہ امام مسلم اپنی کتاب 'مسلم' کے مقدمہ میں مندرجہ ذیل روایت درج فرماتے ہیں:

امام مسلم اور صالحین

قال محمد بن یحیٰی بن سعید القطان عن ابیہ قال: لم نر الصالحین فی شیئ اکذب	محمد بن یحیٰی بن سعید القطان کہتے ہیں کہ میرے باپ یحییٰ نے کہا: "ہم نے صالحین سے زیادہ کسی کو حدیث

منهم فی الحدیث " قال ابن ابی عتاب فلقیت انا محمد بن یحییٰ بن سعید القطان فسألته عنه فقال عن ابیه : " لم تر اھل الخیر فی شیءٍ اکذب منھم فی الحدیث " قال مسلم یقول یجری الکذب علی لسانھم ولا یتعمدون الکذب (مقدمہ صحیح مسلم، ص۱۲، ج۱، مصری)

کے معاملہ میں جھوٹ بولنے والا نہیں دیکھا۔" ابن ابی عتاب کہتے ہیں کہ پھر مجھ سے محمد بن یحییٰ بن سعید القطان کی ملاقات ہوئی۔ اور میں نے ان سے یہی بات پوچھی، تو کہنے لگے: "ہاں میرے والد فرماتے تھے کہ تو ان اہل خیر (صوفیاء) سے زیادہ کسی کو بھی حدیث کے معاملہ میں جھوٹا نہ دیکھے گا۔" امام مسلم کہتے ہیں کہ "جھوٹ ان کی زبانوں سے بے ساختہ جاری ہو جاتا ہے۔ چاہے جھوٹ بولنے کا ارادہ نہ بھی رکھتے ہوں۔"

صالحین سے حدیث قبول کرنے میں تامل

چنانچہ آئمہ حدیث اس طبقہ صالحین سے حدیث قبول کرنے میں متامل رہتے تھے۔ ان حضرات میں زہد اور عبادات میں غلو کی وجہ سے ان کی روایات کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ اُن کا ظن اور ضرورت سے زیادہ احتیاط "علم" کے نکات پر حاوی رہتے تھے۔ چنانچہ مشہور حدیث "پانی پاک ہے جب تک اس کا رنگ، ذائقہ اور بو متغیر نہ ہو" کے سلسلہ میں "رشدین بن سعد" کی روایت کو محض "اَخَذَتْهُ غَفْلَةُ الصَّالِحِيْنَ" کی بنا پر قبول نہیں کیا گیا۔ (متفرق کتب اسمائے الرجال) حالانکہ یہ حدیث صحیح ہے مگر سلسلۂ اسناد میں ایسے صلحاء کا نام آنے سے محدثین پرہیز کرتے تھے اور جب تک دوسرے ثقہ راویوں سے توثیق نہ ہو اسے قبول نہ کرتے تھے۔

صوفیا کا شجرہ طریقت

امام مسلمؒ کہتے تھے کہ اس دین (طریقت) کے ذریعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطے سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا جاتا ہے یہ بالکل جھوٹ ہے۔ آپ مقدمہ مسلم میں فرماتے ہیں:

حدثنی حسن بن علی الحلوانی قال حدثنا یزید بن ھارون اخبرنا ھمام قال دخل ابو داؤد الاعمی علی قتادۃ فلما قام قالوا ان ھٰذا یزعم انه لقی ثمانیة عشر بدریًا فقال قتادۃ ھٰذا کان سائلاً قبل الجارف

مجھ سے حسن بن علی حلوانی نے بیان کیا ان کو یزید بن ہارون نے، ان کو ہمام نے خبر دی کہ داؤد اعمٰی (نابینا) قتادہ (تابعی) کی محفل میں داخل ہوا۔ جب جانے لگا تو اہل مجلس نے کہا کہ یہ داؤد اعمٰی دعویدار ہے کہ اس نے اٹھارہ بدری صحابیوں سے ملاقات کی ہے۔ قتادہ نے فرمایا "یہ تو طاعون جارف سے

لایعرض فی شیئٍ من ھٰذا ولا یتکلم فیہ و اللہِ ما حدثنا الحسن عن بدریٍ مشافہۃ ولا حدثنا سعید بن المسیب عن بدریٍ مشافہۃ اِلّا عن سعد بن مالکؓ (مقدمہ صحیح مسلم ص۱، مصری)

پہلے مانگتا پھرتا تھا۔ اس وقت تو اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہ کی تھی۔ خدا کی قسم! حسن (بصری) اور سعید بن المسیب (جو داؤد ائمی سے عمر میں بڑے تھے) نے بھی سوائے سعد بن مالک کے کسی بدری صحابی سے کوئی حدیث ہم تک نہیں پہنچائی۔

ملّا علی قاری نے بھی اپنی تصنیف "موضوعات" میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ صوفیاء جو اپنی نسبت حضرت حسن بصری کے ذریعہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاتے ہیں، تو ائمہ حدیث کے ہاں حضرت حسن بصری کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تو ملاقات بھی ثابت نہیں۔ تحصیلِ علم تو بڑی بات[1] ہے

(بحوالہ اسلامی تصوف، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ص ۱۲۰)

دائرۃ المعارف الاسلامیہ (مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی) میں صوفیاء کے شجرہ طریقت پر طویل بحث کی گئی ہے

---

[1] مولانا اللہ یار خان اپنی تصنیف دلائل السلوک کے صفحہ ۲۴۳ پر اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"صوفیاء کرام تو سب کے سب حضرت حسن بصری اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ملاقات پر متفق ہیں۔ اہلِ حدیث کے ہاں ملاقات اور رؤیت بالاتفاق ثابت ہے ہاں صحبتِ طویلہ کی بالاتفاق نفی ہے۔ اگر فیض کے لئے صحبتِ طویلہ کو شرط قرار دیا جائے، تو پھر بھی فیض باطنی بالواسطہ تو ممکن ہے، محال نہیں۔ ہاں فیض بلاواسطہ کی نفی ہو گی مگر بالواسطہ کی نفی کہاں لازم آئی ۔۔۔۔ اب رہا یہ سوال کہ اگر کسب فیض بالواسطہ کا اصول تسلیم کر لیا جائے، تو وہ واسطہ کون سا ہے؟ جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ سے فیض لینے والے ہزاروں صحابی حضرت حسنؒ سے ملے تھے۔ کسی سے فیض حاصل کر لیا ہو۔ یہ کوئی ظاہری چیز تو ہے نہیں کہ ظاہری چیز کی نفی سے باطنی فیض کی نفی ہو جائے۔"

اور یہی کچھ ہم کہتے ہیں کہ یہ صوفیاء اپنا شجرہ نسب ملانے کے لئے ظاہری صحبت کے محتاج نہیں۔ بھلا جن کے ہاں نسبتِ اویسیہ جیسا کارگر ذریعہ موجود ہو، انہیں اس ظاہری ملاقات یا صحبت کو ثابت کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ یہ جواب دینے کے بعد آپ نے سید احمد شاہ نقشبندی، شاہ ولی اللہ دہلوی، تہذیب التہذیب اور جلال الدین سیوطی کے چند اقتباسات اور روایات سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ملاقات، سماع اور روایت ثابت ہے۔ اب ایک طرف ان حضرات کے اقوال سامنے رکھئے اور دوسری طرف یہ دیکھئے کہ:

۱ امام مسلمؒ خدا کی قسم اٹھا کر کہتے ہیں کہ حسن (بصری) اور سعید بن المسیب نے بھی کسی بدری صحابی سے کوئی حدیث ہم تک نہیں پہنچائی۔ (مقدمہ صحیح مسلم، ص ۱۷، مصری)

۲ اور ملّا علی قاری مصنف "موضوعاتِ کبیر" ان کی ملاقات بھی تسلیم نہیں کرتے (اسلامی تصوف، یوسف سلیم چشتی، ص ۱۲۰)

۳ اور دائرۃ المعارف الاسلامیہ اس سلسلہ نسب کو اپنی پوری تحقیق کے بعد مخدول قرار دیتا ہے۔

اندریں صورت جو بات راجح ہو سکتی ہے اس کا آپ خود اندازہ فرما لیجئے۔

کیونکہ اس میں بہت سے اختلافات ہیں۔ بالآخر جو نتیجہ پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے آخر میں چودھویں صدی عیسوی میں استاد ابن ابی اُصیبعہ نے جو شجرہ طریقت مرتب کیا ہے اسے اس وقت سے بہت بڑے بڑے صوفی سلسلے تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اور وہ شجرہ طریقت یوں ہے:

۱۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ۲۔ حسن بصری (م ۱۱۰ھ) ۳۔ حبیب الاعجمی (م ۱۵۶) ۴۔ داؤد طائی ۵۔ معروف کرخی (م ۲۰۶ھ) ۶۔ سری سقطی (م ۲۵۳ھ) ۷۔ جنید بغدادی (م ۲۹۸ھ) ۸۔ رُوذباری ۹۔ ابوعلی کاتب زجاجی ۱۰۔ مغربی ۱۱۔ جرجانی۔

یہ شجرہ درج کرنے کے بعد دائرۃ المعارف میں ساتھ ہی یہ تبصرہ بھی درج ہے:

"ابن الجوزی اور ذہبی نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس شجرہ میں قدیم ترین چار واسطے یعنی ۱ تا ۴ منحول (کمزور) ہیں۔ یہ بزرگ آپس میں ملے ہی نہیں تھے۔ بعض طریقت کے سلسلے ایسی اسناد استعمال کرتے ہیں۔ جن میں معروف کرخی سے پہلے نو شیعی[1] امام آتے ہیں۔

اس سلسلہ اسناد کی صحت اور بھی زیادہ مشکوک ہے۔" (دائرۃ المعارف الاسلامیہ، زیرعنوان تصوف، ج ۶، ص ۴۲۶)

صوفیائے پر محدثین کی گرفت کے اثرات

اہلِ تصوف کی اوّلین کتابوں میں سے ایک مستند کتاب ابونصر سراج کی کتاب "اللمع" ہے۔ اس کے متعلق دائرہ معارف اسلامیہ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور (جلد ۱۴/۱، ص ۱۲۵ زیرِعنوان علمِ تصوف) پر درج ہے کہ:

"کتاب اللمع تصوف کی اوّلین کتابوں میں سے ہے۔ اس پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے زمانہ میں تصوف کے خلاف اعتراض میں خاصی شدت آگئی تھی جن کے ازالے کی اس نے خاص ضرورت محسوس کی۔ ان شکوک کی خاصی طویل فہرست کتاب کی ابتدائی فصل میں موجود ہے۔۔۔۔

"ابونصر سراج (م ۳۷۸ھ) سب سے زیادہ اصحاب الحدیث کے اعتراضوں سے خوفزدہ معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہیں کو سب سے زیادہ مطمئن کرنا چاہا ہے۔ یہاں تک کہ نعت طبقات اہل الحدیث کے لئے ایک

---

[1] یعنی ۱۔ حضرت علیؓ (م ۴۰ھ) ۲۔ حضرت حسنؓ ۳۔ حضرت حسینؓ (م ۶۱ھ) ۴۔ زین العابدین (م ۹۵ھ) ۵۔ امام باقر (م ۱۱۴ھ) ۶۔ جعفر صادق (م ۱۴۹ھ) ۷۔ موسیٰ کاظم (م ۱۸۳ھ) ۸۔ موسیٰ رضا (م ۲۰۳ھ) ۹۔ محمد بن علی نقی (م ۲۲۱ھ) قادری اور سہروردی اپنا سلسلہ آٹھویں امام موسیٰ رضا سے ملاتے ہیں جبکہ چشتی حضرت علی ۔ حسن بصری سے آگے عبدالواحد بن زید کی طرف منتقل کرتے ہیں

پورا باب وقف کیا گیا ہے۔"

پھر اسی عنوان کے تحت ایک دوسرے مقام پر درج ہے کہ:

"ابونصر سراج کے ہاں اس امر کی کوشش نظر آتی ہے کہ تصوف کے اصولوں اور عقیدوں کو محدثین اور فقہاء کے طریقے پر بیان کیا جائے تاکہ طریقت کو شریعت کا ہم خیال بلکہ اس کے تابع ثابت کیا جاسکے۔" کوشش یہ کی گئی ہے کہ تصوف کو علوم شریعت میں مقام مل جائے اسی لئے تطبیق و موافقت کی سعی ہر جگہ نمایاں ہے۔ کتاب کے آخر میں اکابر صوفیاء کے بعض الفاظ سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو صاف کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ دینی حلقوں کے لئے قابل قبول بنایا جائے۔"

صوفیاء پر فقہائ کی گرفت

دائرۃ المعارف الاسلامیہ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی (جلد ۱۲، زیر عنوان طریقت، ص ۴۹) پر درج ہے کہ:

"راسخ العقیدہ فقہاء نے ان بدعتوں کے خلاف، جن کی تبلیغ بعض صوفی طریقے کرتے رہے، ہمیشہ جنگ جاری رکھی، یعنی ان کی نفلی عبادتوں، ان کے مخصوص لباس (خرقہ وغیرہ) ان کی مستثنیات، منشی اشیاء (قہوہ، حشیش، افیون) ان کی شعبدہ بازی اور ان کے عقیدے کے خلاف اسناد بیعت پر مؤرخانہ تنقید پر خاص توجہ کی ہے اور ان کے سلسلوں کے رخنوں اور نقائص کو ظاہر کر کے ان کی صحت کو غیر اغلب قرار دیا ہے۔"

اس کے بعد سلف اور خلف میں بے شمار ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اہل حمیت اور محافظین شریعت نے جب کسی کا کوئی ایسا قول دیکھا جو اس کو شریعت کے نصوص اور اس کے متواتر و قطعی عقائد کے خلاف نظر آیا، تو انہوں نے اس قول کی تردید کی اور صاحب قول کی عظمت و شہرت اور اس کی ولایت و مقبولیت کے آثار بھی اس کو اس تردید سے باز نہ رکھ سکے۔ ایسے محافظین شریعت میں سے بعض لوگوں نے اس موضوع پر مستقل رسائل بھی تصنیف کئے ہیں۔ صاحب جلاء العینین نے صفحہ ۴۳، ۴۴ پر ایسے اصحاب کے کارنامے درج کئے ہیں۔ اس فہرست میں ہم کو علامہ سخاوی، علامہ سعدالدین تفتازانی، ملا علی قاری، حافظ ابن حجر عسقلانی، ابوحیان مفسر، شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام، حافظ ابوذر، (شیخ) الاسلام سراج الدین البلقینی جیسے نامور علماء و آئمہ فن نظر آتے ہیں۔ (تاریخ دعوت و عزیمت، ج ۲، ص ۱۵۲، از ابوالحسن علی ندوی)

امام ابنِ تیمیہؒ اور مجددِ الف ثانیؒ کے کارنامے

اور ان سب میں ہمیں امام ابنِ تیمیہؒ سرفہرست نظر آتے ہیں مندرجہ بالا سب حضرات ان کے ہمنوا تھے۔ امام ابنِ تیمیہؒ نے جس طرح تقریر و تحریر اور حکومتی سطح پر مناظرہ و مباہلہ کرکے ان صوفیوں کے مشرکانہ عقائد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اسے ہم پہلے مناسب مقام پہ درج کر آئے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ امام ابنِ تیمیہؒ خود بھی زاہد تھے، ان سے کرامات کے صدور کے واقعات بھی ملتے ہیں اور ان کی بعض تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی ان منازل سلوک کو ذاتی تجربہ کی بنا پر خوب سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے صوفیوں کے ان سب مشرکانہ عقائد و بدعات کا نہایت سختی سے رد کیا جن کی شریعتِ اسلامیہ میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ خود اتباعِ سنت اور عقائدِ سلفیہ میں نہایت تشدد تھے۔

امام ابنِ تیمیہؒ نے کئی محاذوں پہ ان وجودیوں کا مقابلہ کیا۔ انہیں نجی طور پر خطوط بھی لکھے کہ وہ ایسے عقائد اور خلافِ سنت اعمال سے باز آئیں۔ پھر ایک رسالہ "فی ابطال وحدت الوجود" بھی لکھا اور ایسے مشرکانہ عقائد رکھنے والوں کے حق میں دوٹوک فتوے دیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

"ایک اسلامی مملکت میں صرف تین فرقے ہی ہو سکتے ہیں۔ (۱) مسلمان (۲) ذمی جیسے یہود و نصاریٰ یا دوسرے کافر۔ یہ لوگ اپنے مذہب کی عبادت کی ادائیگی کی حد تک تو آزاد ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے دین کی کھلم کھلا تبلیغ نہیں کرسکتے۔ پھر وہ چونکہ جزیہ ادا کرتے ہیں لہذا وہ بھی مسلمانوں ہی طرح محفوظ و مامون ہوتے ہیں۔ (۳) مشرک و مرتد اور زندیق وغیرہ۔ یہ لوگ چونکہ مسلمانوں میں شامل ہوتے ہیں، لیکن اپنے مشرکانہ عقائد اور بدعات پھر ان نظریات کی علی الاعلان تبلیغ کی وجہ سے وہ واجب القتل ہوتے ہیں اس کے علاوہ ان کا کوئی علاج نہیں۔ ان سے پہلے توبہ کروائی جائے اگر باز نہ آئیں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ اور نہ ہی ایک اسلامی مملکت میں کسی چوتھے فرقہ کی گنجائش ہے۔"

(امام ابنِ تیمیہؒ، کوکن عمری، ص ۱۶۶)

امام ابنِ تیمیہؒ کے شاگرد رشید امام ابنِ قیم بھی اپنے استاد کی طرح جہاں ایک متبحر عالم، محدث اور فقیہہ تھے، ساتھ ہی ساتھ صوفی بھی تھے۔ انہوں نے بھی جہاں سلوک پر متعدد کتب و رسائل لکھے۔ وہاں ابواسمٰعیل عبداللہ ہروی رم ۴۸۱) کی کتاب منازل السائرین کی شرح مدارج السالکین بھی لکھی ہے۔ اس کتاب میں صوفیاء کے غلط عقائد اور غلو کی جا بجا نشان دہی کرکے شدید گرفت کی ہے۔

صاحبِ جلاء العینین نے جن علماء کے نام گنوائے ہیں۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل علماء بھی بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ جنہوں نے ان مشرکانہ عقائد کے خلاف بھرپور جدّ وجہد کی ہے۔ علاّمہ ابن خلدون، علامہ ذہبی، ابن المقری، ابراہیم البقاعی اور مجدّد الف ثانی رح

مجدّد الف ثانی رح کا کمال یہ ہے کہ جہاں وہ متبع سنت اور عالم دین تھے وہاں طریقت میں بھی بلند مقام پر فائز تھے۔ انہوں نے بربنائے کشف نظریہ وحدت الوجود اور شہود کو ہیچ قرار دیا اور اس کا ابطال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوفیاء میں سے بھی کسی کو کھل کر آپ کے نظریات کے خلاف لکھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ آپ نے اپنے کارہائے نمایاں سے اس بے دینی اور بدمذہبی کا رُخ بدل دیا، جو اکبر کے زمانہ سے چلی آ رہی تھی مجدّد صاحب نے ابن عربی شیخ اکبر کے اس نظریے کا بھی رد کیا کہ نبوت وہبی نہیں بلکہ کسبی ہوتی ہے۔ (حضرت مجدد کا نظریہ توحید ص ۳۶)

مجدّد الف ثانی رح کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب کا نام اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ صوفیاء میں جو پیر پرستی اور گور پرستی کے رجحانات پائے جاتے ہیں ان کے خلاف انہوں نے بھرپور جدّ وجہد کی ہے۔ لیکن ان کا یہ پہلو کمزور رہے کہ وہ خود ان نظریات کے قائل رہے ہیں اور مجدّد الف ثانی کے نظریات سے تطبیق کی کوشش کی ہے۔

اسی طرح ایک بزرگ اشرف علی تھانوی قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے تصوّف میں غیر اسلامی عقائد و اعمال کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے مگر ان کا دوسرا پہلو شاہ ولی اللہ صاحب سے بھی زیادہ کمزور نظر آتا ہے وہ صرف ان نظریات کے قائل ہی نہیں اکابر اور بدنام صوفیاء کے خلافِ شریعت اقوال و افعال کی ہر ممکن تاویل و تعبیر سے تنزیہہ کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

البتہ عبداللہ غزنوی جن کے متعلق نواب صدیق حسن خان لکھتے ہیں کہ وہ جامع حدیث نبوی اور علمِ سلوک تھے۔ انتہا درجہ کے متبع سنت بزرگ تھے۔ انہوں نے بھی کھل کر وحدت الوجود کے نظریہ کی مخالفت کی ہے۔

الغرض علمائے شریعت نے ہر دور میں ان مشرکانہ عقائد کی بیخ کنی کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آج بھی ان کے خلاف بھرپور جدوجہد کی ضرورت ہے۔

باب ۴

صوفیاء کے مخصوص مسائل (۱)

۱۔ اولیاء اللہ اور ان کی گرفت

اولیاء اللہ کون ہیں؟ اولیاء اللہ کی فضیلت میں عموماً یہ آیت پیش کی جاتی ہے:

اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۱۰/۶۲)
سن رکھو کہ جو خدا کے دوست ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ان اولیاء اللہ سے یہی لوگ مراد ہیں، جو چلہ کشی اور قبروں پر مراقبے کرتے، خوارق عادات امور کا اظہار کرتے اور صاحب تصرف و اختیار بنے ہوئے ہیں۔ قرآن اولیاء اللہ کی اس تعریف کا انکار کرتا ہے۔ وہ اولیاء اللہ کی تعریف اس سے اگلی آیت میں یوں بیان کرتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ (۱۰/۶۳)
یعنی وہ جو ایمان لائے اور پرہیزگار رہے۔

اولیاء اللہ کی بعینہٖ یہی تعریف درج ذیل آیت میں بھی بیان ہوئی ہے۔ اب دیکھئے کہ اس آیت کے مخاطب کون لوگ ہیں:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)
جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے گی۔ پھر جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، تو ان پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

مندرجہ بالا دونوں آیتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں، جو اللہ کی ہدایت پر ایمان لائے اور اس کی پیروی کرتے ہیں، نہ کہ وہ لوگ جو خود خدائی کے دعویدار بن بیٹھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ولی کو مومنین کی صفت قرار دیا تھا۔ ان صوفیاء نے ولی کو ایک منصب میں تبدیل کر دیا۔

اولیاء اللہ والیانِ اسرار ہوتے ہیں

سید الطائفہ جنید بغدادیؒ ولی کی یہ تعریف بیان کرتے ہیں کہ " ولی والیانِ اسرار[1] ہوتے ہیں۔" یعنی وہ خدا کے سربستہ رازوں کے مالک ہوتے ہیں۔ پھر یہ تعریف عوام میں اتنی مقبول ہوئی کہ وہ سمجھنے لگے کہ جس طرح لڑکی کا ولی یا سرپرست اس کے نکاح کا مختار ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ خدا کے ولی اور سرپرست ہوتے ہیں۔ اور اس سے حسبِ منشا کام کرواسکتے ہیں۔

بلاشبہ اولیاء کا لفظ قرآن میں سرپرست یا صاحبِ اختیار کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، جو کسی کی بگڑی بنا سکتا ہو یا کسی کی حاجت پوری کرسکتا ہو۔ لیکن اس صورت میں یہ ہمیشہ منفی پہلو لئے ہوتے ہوتا ہے۔ یعنی لوگوں کا یہ گمان باطل ہوتا ہے کہ وہ لوگ صاحبِ تصرف و اختیار رہیں۔ مثلاً:

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ	اور جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اس کے سوا دوسرے
اللَّهُ حَفِيظٌ عَلَيْهِمْ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم	سرپرست بنا رکھے ہیں۔ اللہ ہی ان پر نگران ہے اور آپ
بِوَكِيلٍ (۴۲:۶)	کسی کے وکیل نہیں۔

یعنی پیر اور مرید کے ان احوال کا محاسبہ اور سزا دینا اللہ ہی کا کام ہے۔ اے پیغمبر تمہارے ذمہ یہ بات نہیں کہ جو بات نہ مانے اس کو تہس نہس کرسکو۔

اس آیت کے حاشیہ میں مولانا مودودیؒ تفہیم القرآن کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

" اگرچہ اس آیت کے مخاطب بظاہر حضور ہی ہیں، لیکن اصل مدعا کفار کو یہ بتلانا ہے کہ اللہ کا نبی اس طرح کا کوئی دعوٰی نہیں رکھتا، جیسا کہ جاہلیت کے معاشروں میں بالعموم یہ خیال پایا جاتا ہے کہ "یہ حضرت" قسم کے لوگ ہر اس شخص کی قسمت بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں، جو اُن کی شان میں گستاخی کرے۔ بلکہ مرنے کے بعد ان کی قبر کی بھی اگر کوئی توہین کرگزرے یا اور کچھ نہیں، تو ان کے متعلق کوئی بُرا خیال ہی دل میں لے آتے تو اس کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں۔ یہ خیال زیادہ تر ان "حضرتوں" کا اپنا پھیلایا ہوا ہوتا ہے اور نیک لوگ جو خود ایسی باتیں نہیں کرتے ان کے نام اور ان کی ہڈیوں کو اپنے کاروبار کا سرمایہ بنانے کے لئے کچھ دوسرے ہوشیار لوگ ان کے متعلق اس خیال کو پھیلاتے ہیں۔ بہرحال عوام میں اسے روحانیت اور خدارسیدگی کا لازمہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی فریب کا طلسم توڑنے کے لئے اللہ تعالٰی، حضور ﷺ سے فرما رہے ہیں کہ آپ

[1] کلام المرغوب اردو ترجمہ کشف المحجوب، ص ۲۷۱۔

کا کام صرف لوگوں کو راہ دکھانا ہے ان کی قسمتیں تمہارے حوالہ نہیں کی گئیں۔ ان کے اعمال کو دیکھنا اور ان کو عذاب دینا ہمارا اپنا کام ہے"۔

اسی طرح درج ذیل آیت میں بھی اولیاء سے مراد یہی "حضرت" قسم کے لوگ ہیں، فرمایا:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۷/۳)	جو تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کی پیروی کرو (یہی اصل ولایت ہے) اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ مگر تم کم ہی نصیحت مانتے ہو۔

ولی کے مفہوم میں تبدیلی کب ہوئی؟

قرآن کی رُو سے تمام بنی نوع انسان دو فرقوں میں منقسم ہے۔ ایک اولیاء اللہ یا اولیائے الرحمٰن، دوسرے اولیاء الشیطان۔ ہر وہ شخص جو اللہ کے دین کو قبول کرتا ہے اور اس کی سربلندی کے لئے کام کرتا ہے، وہ اللہ کا ولی ہے۔ خواہ یہ کوشش کم ہو یا زیادہ۔ اور جو اللہ کی اطاعت نہیں کرتا اور بغاوت کرتا ہے وہ شیطان کا ولی ہے۔ تمام کے تمام انسان ولی ضرور ہیں۔ کوئی اللہ کا ولی ہے اور کوئی شیطان کا۔ اور اس کی دلیل یہ آیت ہے:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ (۲/۲۵۷)	جو لوگ ایمان لائے اللہ ان کا ولی ہے کہ اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور جو کافر ہیں ان کے ولی شیطان ہیں، جو ان کو روشنی سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں۔

گویا مومنوں کا اللہ اور وہ اللہ کے ولی اور کافروں کے شیطان ولی اور یہ شیطان کافروں کے ولی ہوتے ہیں لیکن اس طبقہ نے اولیاء سے مراد صرف وہ فرقہ سمجھ رکھا ہے، جس سے کشف و کرامات یا شعبدہ بازیوں کا ظہور ہو۔ پھر اسی طبقہ میں سے کسی کو اللہ کا ولی کہہ دیتے ہیں اور کسی کو شیطان کا۔

ولی کا مفہوم کب سے بدلا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مفہوم کی تبدیلی تیسری صدی ہجری میں پیدا ہوئی۔ دوسری صدی تک ایسے لوگوں کو زہاد، عباد یا صالحین تو کہا جاتا تھا مگر اولیائے اللہ کسی نے نہ کہا تھا جب چوتھی صدی ہجری میں صوفیاء کے طبقہ کے مختلف رسائل ضبطِ تحریر میں آئے، تو ان حضرات نے ولی

کہ لفظ کو اس مفہوم کے لئے مختص کر لیا۔ پھر اس کے بعد ان اولیاء اللہ کے مناصب اور اسامیاں مقرر کی گئیں، جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

ذاتی اور عطائی کا فلسفہ

طریقت کے نظریات کے مطابق (خواہ حلول کے نظریہ سے ہو یا وحدت الشہود کے نظریہ سے) سب عارف باللہ اور فنا فی اللہ لوگ انسانی رُوپ میں چلتے پھرتے خُدا ہوتے ہیں۔ جن کا علم اور تصرف خدا ہی کے برابر ہوتا ہے فرق صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ خدا کا علم غیب یا تصرف تو اس کا ذاتی ہے اور ان اولیائے کرام کا علم غیب یا تصرف خدا کا عطا کیا ہوا یا عطائی ہوتا ہے۔ اب اس ذاتی اور عطائی کے متعلق بھی شریعت کا فیصلہ سن لیجئے۔ مشرکین مکہ بھی جو فرشتوں، بزرگوں اور بتوں میں علم غیب یا تصرف کا عقیدہ رکھتے تھے، وہ حج کے دوران تلبیہ ان الفاظ میں کہا کرتے تھے:

لَبَّیْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ اِلَّا شَرِیْكًا	میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک جو
هُوَ لَكَ تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ	تیری مِلک ہے اور تو اس کا مالک ہے اور وہ شریک تیرا مالک نہیں۔

(مسلم، کتاب الحج، باب التلبیہ ....)

گویا ایسے ذاتی اور عطائی کا نظریہ رکھنے والوں کو بھی مشرک ہی قرار دیا گیا۔ اب مولانا رُوم کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیے، جو ان صُوفیہ کے مسلّمہ عقیدہ کی ترجمانی کرتا ہے:

اولیاء راہست قدرت از اِلٰہ   تیرِ جُستہ بازگردانند ز راہ

ترجمہ: اولیاء اللہ کو اللہ سے یہ قدرت حاصل ہوتی ہے کہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس موڑ لائیں۔

خداؤں کی تعداد

اب اس کا دوسرا پہلو سامنے لائیے، کیا بیک وقت اتنے صاحب تصرف حضرات کی موجودگی کا امکان بھی ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ	اگر آسمان اور زمین خدا کے سوا اور معبود ہوتے، تو نظام
لَفَسَدَتَا (۲۱/۲۲)	کائنات درہم برہم ہو جاتا

یہاں اللہ کا لفظ صاحبِ تصرف و اختیار کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنے سوا ہر کسی میں تصرف کی نفی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر ایک کے بجائے دو بھی ایسی صاحب تصرف و

اختیار ہستیاں ہوں تو زمین و آسمان اور کائنات کا نظام درست رہنا ناممکن ہے۔ چہ جائیکہ سینکڑوں بیک وقت موجود ہوں۔

دوسرے مقام پر ان صاحب تصرف و اختیار ہستیوں کے تصرف کی نفی ان الفاظ میں بیان فرمائی:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	جن لوگوں کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ تو ایک مکھی
لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ	بھی نہیں بنا سکتے، خواہ سب اکٹھے ہو جائیں اور اگر ان
وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا	سے مکھی کچھ چھین لے جائے، تو اس سے واپس بھی
یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ	نہیں لا سکتے۔ طالب اور مطلوب (مرید اور پیر)
وَالْمَطْلُوْبُ (۲۲/۷۳)	دونوں کمزور ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کسی دوسرے کے تصرف و اختیار کا مسئلہ ایک اور مثال سے بھی سمجھایا ہے۔ فرمایا:

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ	اللہ تعالیٰ تمہارے حسب حال ایک مثال فرماتا ہے، کہ
هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ	بھلا جن (نوکروں وغیرہ) کے تم آقا ہو، تم انہیں اس
مِّنْ شُرَكَآءَ فِیْ مَا رَزَقْنٰكُمْ	حال میں شریک بناتے ہو، جو ہم نے تم کو دیا ہے تاکہ
فَاَنْتُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ	نوکر اور آقا برابر حیثیت کے بن جائیں؟ تم اس معاملے میں
كَخِیْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ (۳۰/۲۸)	ان سے یوں ڈرتے ہو جیسے اپنوں سے۔

تو بھلا جب تم آقا کی حیثیت سے غلام کی شراکت گوارا نہیں کر سکتے، تو جس خدا کے سب غلام ہیں۔ وہ ان کی شراکت کب گوارا کر سکتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ اولیاء اللہ کا صاحب تصرف ہونا ایک بیہودہ سی بات اور صریح شرک ہے۔

ولایتِ عامہ اور ولایتِ خاصہ کا عقیدہ

اب چونکہ قرآن ہر مسلمان اور مومن کو اللہ کا ولی قرار دیتا ہے۔ لہٰذا ولایتِ عامہ اور ولایتِ خاصہ کا عقیدہ تراشا گیا۔ ولایتِ عامہ تو عام مسلمانوں کے لئے رہنے دی گئی اور ولایتِ خاصہ ان صاحب تصرف "اولیاء اللہ" کے لئے۔ اب دیکھئے کہ ایمان بھی مسلمانوں میں کم و بیش ہوتا ہے۔

کوئی کمزور ایمان والا ہوتا ہے کسی کا اس سے پختہ ہوتا ہے کسی کا اس سے بھی زیادہ پختہ اور اکمل، لیکن ایمان کو دو یا زیادہ حصوں تقسیم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، تو پھر آخر اس ولایت کی یہ تقسیم کیوں کی گئی پھر اس تقسیم کے لیے کوئی خطِ امتیاز بھی ہونا چاہیے کہ ولایتِ خاصہ کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہ خطِ امتیاز منصوص تو ہے نہیں اور ان کا اپنا معیار یہ ہے کہ جن لوگوں سے کشف و کرامات سرزد ہوں تو وہ ولایتِ خاصہ کے مالک ہوتے ہیں اور عام مومن یا مسلمان ولایت عامہ کے مستحق۔ اگرچہ عرفِ عام میں انہیں ولی نہیں کہا جاتا۔

پھر جب کشف و کرامات ہی ولایتِ خاصہ کا معیار ٹھہرا، تو اس کشف و کرامات کی حقیقت کا حال بھی راہِ طریقت کے ایک جادہ پیما اور عارف باللہ خواجہ حکیم انصاری کی زبان سے سن لیجئے:

"دورانِ سلوک میں ہر قسم کے صوفیوں اور فقیروں کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ مجھے بڑی عجیب معلومات حاصل ہوتیں۔ میں نے ہر طرح اور ہر رنگ کے فقیر دیکھے۔ مثلاً قلندر، ملنگ، رنڈولی، رقص و سرود کے رسیا مئے ناب کے متوالے اور خصوصاً رسول شاہی، جو نماز روزے سے منع کرتے، شراب اور چرس وغیرہ کو جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں اور خلاف شرع اعمال کرتے ہیں۔ کشف و کرامات ان سے بھی سرزد ہوتی ہیں۔ مزید تحقیق پر پتہ چلا کہ یہ سب وحدت الوجود کو ماننے والے ہیں، جن کو اسلامی تصوف اور فقر محمدی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہندوؤں کے لوگ اور دوسری مشقوں کے ذریعے روحانی طاقت پیدا کر لیتے ہیں۔" (حقیقت وحدت الوجود، ص ۲۱)

تو یہ ہے کشف و کرامات کی حقیقت جسے ولایتِ خاصہ کا معیار قرار دیا گیا ہے اور ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ تذکروں میں مذکور اکثر اولیائے کرام اسی نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ تبع سنت اور مشرکانہ عقائد سے مبرا اولیائے کرام کی اگر چھان بین کی جائے تو شاید وہ پانچ فیصد بھی نہ نکلے۔

اولیاء اللہ کی گستاخی کا انجام

۱۔ امام جعفر صادق کی بے ادبی کا انجام

ایک اور راوی نے بیان کیا "میں امام جعفر کے ساتھ جا رہا تھا۔ برسرِ راہ ایک

خشک کھجور کا درخت نظر پڑا آپ نے فرمایا: "اے کھجور! ہمارے لئے کھانے کا بندوبست کرو۔ کھجور اُسی وقت سرسبز ہو گئی۔ اُس پر خوشے لگ گئے اور امام کی طرف جھک گئے۔ ہم دونوں نے کھجوریں کھائیں جو اتنی میٹھی تھیں کہ میں نے زندگی بھر ایسی کھجوریں نہ کھائی تھیں۔ ایک اور شخص وہاں کھڑا تھا۔ کہنے لگا "کیا زُود اثر جادو ہے۔" آپ نے فرمایا" یہ جادو نہیں دُعا ہے جسے اللہ تعالےٰ نے قبول فرمایا۔ تم چاہو تو ابھی دُعا کروں اور تم کُتا نظر آنے لگو۔" اعرابی اپنی سنگ طبعی کے باعث کہنے لگا" اچھا کر لو" حضرت نے دُعا کی، تو وہ کتا بن کر اپنے گھر جانے لگا۔ حضرت امام نے مجھے حکم دیا کہ" اس کتے کے پیچھے پیچھے جاؤ۔" جب وہ اعرابی اپنی اہلیہ کے پاس گیا، تو دُم ہلانی شروع کر دی۔ اس نے ڈنڈا اٹھایا اور گھر سے نکال دیا۔ وہاں سے نکل کر پھر امام کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے قدموں میں لیٹنے لگا اور آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ حضرت کو اُس کی حالت پر رحم آگیا اور دُعا کی تو وہ اپنی اصلی حالت میں آگیا۔" (خزینۃ الاصفیائ، ص ۸۸)

اب یہ بھی غنیمت سمجھئے کہ اس "ایک اور راوی" کو اس اعرابی پر رحم آگیا۔ وگرنہ اگر وہ یوں لکھ دیتا کہ جب کتا آکر آپ کے قدموں میں لیٹنے لگا، تو آپ کہہ دیتے کہ" اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔" جیسا کہ کئی اولیاء ایسا بھی کہہ دیتے ہیں اور ہمیشہ کُتا ہی رہتا، تو وہ 'ایک اور راوی' اس بات کے بھی پورے حقوق رکھتا تھا۔ غور فرمایئے ان راویوں نے اولیاء اللہ کی عوام پر ہیبت بٹھلانے میں کیسا مؤثر کردار ادا کیا ہے اور کیسے کیسے افسانے تراشے ہیں۔

۲۔ امام موسیٰ رضا اور قالین کے شیر

امام موسیٰ رضا کو مامون الرشید نے ولیعہد مقرر کیا تھا۔ ایک دن آپ خلیفہ مامون کے پاس اپنی مسندِ آرام پر بیٹھے تھے کہ ایک حاسد اور بدخواہ بھی آگیا اور امام صاحب کو کہنے لگا کہ" اگر تم اتنے ہی صاحبِ کرامت ہو، تو خلیفہ کے دربار میں بچھی ہوئی قالین پر شیروں کی تصویر کو زندہ کر کے دکھاؤ اور انہیں مجھ پر مسلط کر دو۔ اگر ایسا کرو تو یہ کرامت اور معجزہ ہوگا۔" اس بدگفتار کی یہ گفتگو سنتے ہی حضرت امام نے غضبناک ہو کر شیروں کو للکارا اور کہا کہ اس کذاب اور دشمنِ اہل بیت کو پکڑ کر اپنا تر نوالہ کر لو۔ حکم ملتے ہی دونوں تصویریں شیر بن کر جھپٹیں اور شہنشاہِ ولایت کے اس بدگو کو اپنے خونیں پنجوں میں دبا کر اس کا ہڈی گوشت سب چبا گئے۔ پھر فرش پر گرے ہوئے خون کے قطروں کو چاٹنے لگے۔ خلیفہ مامون یہ منظر دیکھ کر زمین پر گر گیا دونوں شیر اب امام کی پابوسی کے لئے آئے اور زبانِ حال سے کہنے لگے۔" اگر آپ حکم فرمائیں تو اس غدار

خلیفہ کو جو ظاہر میں آپ کی دوستی کا دم بھرتا ہے مگر دلی طور پر دشمنِ اہلِ بیت ہے، کیفرِ کردار تک پہنچا دیں۔" آپ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کو ابھی اس کی زندگی مطلوب ہے۔ تم جس طرح تھے اسی طرح ہو جاؤ۔" چنانچہ دونوں بہادر شیر اپنی اصلی حالت پر چلے گئے اور شیر قالین بن گئے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۰۳)

دیکھا آپ نے کیسا ہولناک انجام ہوتا ہے اولیاء اللہ کی بے ادبی کرنے والوں کا۔ یہ سب کچھ درست مگر دو باتیں کھٹکتی ہی رہ گئیں:

۱۔ دربار میں فرش پر قالین بچھے ہوتے تھے۔ جب شیر نے اس بدگفتار کو تر نوالہ بنایا، تو اس کے خون کے قطرے تو قالینوں میں جذب ہو گئے ہوں گے۔ بعد میں شیر کون سے فرش سے خون کے قطرے چاٹنے لگے تھے۔

۲۔ امام موسیٰ کے والد موسےٰ کاظم نے ہارون الرشید کی جیل میں وفات پائی۔ اُنہیں زہر دیا گیا۔ پھر آپ کو بھی زہر دیا گیا۔ پھر آپ کے بیٹے امام تقی کو بھی زہر دیا گیا، تو اگر امام موصوف کو اللہ نے کرامات کی اتنی قوت بخشی تھی، تو آپ کے خاندان کا یہ حال کیوں ہوا؟

۳۔ جنید بغدادیؒ اور جلوہ گری

ایک بار شیخ جنید کے ایک مرید سے کوئی بے ادبی سرزد ہو گئی۔ وہ ندامت کے مارے باہر چلا گیا اتفاقاً راہ میں شیخ سے دوچار ہو گیا۔ شیخ کی نظر پڑی تو ہیبت سے ایسا گرا کہ سر پھٹ گیا۔ چند قطرے خون کے زمین پر گرے جن سے لفظ "اللہ" لکھا گیا۔ شیخ نے جب یہ دیکھا تو فرمایا: "اچھا! میرے سامنے جلوہ گری کرتا ہے۔" خدا کی قسم! یہ بچے جو میرے سامنے کھیل رہے ہیں، اس مقام میں تیرے برابر ہیں۔" شیخ کی یہ بات اتنی گراں گزری کہ جاں بحق ہو گیا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۴۱)

شاید جنید بغدادی صاحب کو اس اپنے گناہ پر نادم مرید کے مرنے کے بعد کچھ رحم آگیا ہو اور اس کے حق میں دعائے مغفرت کر دی ہو، تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں فرمایا۔ وہ اس لئے کہ اس طرح جو دھاک وہ اولیاء اللہ کی عوام پر بٹھانا چاہتے ہیں، اس میں کمی واقع ہونے کا امکان تھا۔

۴۔ عبدالواحد کی گستاخی کا انجام

حدیقۃ الاولیاء کے مصنف مفتی غلام سرور اس کتاب کے صفحہ ۱۲۹ پر ایک بزرگ "شیخ عبدالواحد" کا ذکر فرما رہے ہیں:

"ایک بے ادب عورت نے جس کا بیٹا حضرت کی بیعت میں آکر تارک الدنیا و مجذوب ہو گیا تھا، حضرت کے رُوبرو بے ادبی کے کلمات کہنے شروع کئے۔ حضرت نے صبر کیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ آخر جب دیکھا کہ غیرتِ الٰہی درپے انتقام ہے، تو اپنے خادم کی طرف اشارہ کیا کہ اس عورت کو ایک طمانچہ مار۔ خادم نے زبانی عورت کو منع کیا اور طمانچہ لگانے میں متامل رہا۔ عورت اسی وقت گری اور مر گئی۔ حضرت اپنے خادم پر بکمال غضب ناک ہوئے اور فرمایا کہ اگر تو طمانچہ لگانے میں دیر نہ کرتا، تو اس عورت کی جان برباد نہ ہوتی، کیونکہ اس حالت میں اِس بدگوئی شدید کا انتقام میری طرف سے ہو جاتا اور اب منتقم حقیقی نے یہ انتقام لیا اور جان اس کی جاتی رہی۔ خون اس عورت کا تیری گردن پر ہے۔"

غور فرمایا آپ نے عوام کو اولیاء اللہ کے باطنی تصرف سے بھی اور ان کی بے ادبی کرنے سے مرعوب کرنے کے لئے کیسا افسانہ تراشا گیا ہے کہ آئندہ سب لوگ عبرت حاصل کر لیں۔

بخاری و مسلم دونوں میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ "کسی شخص نے حضور اکرم ﷺ سے کچھ قرض لینا تھا اس نے آکر شدید تقاضا کیا اور سخت سُست الفاظ کہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سخت ناگوار گزرا، تو انہوں نے جوابی کارروائی کا ارادہ کیا، تو آپؐ نے فرمایا "اسے چھوڑ دو، کیونکہ صاحبِ حق کو باتیں کرنے کا حق ہوتا ہے۔" دیگر بہت سے انبیاء کی لوگ بے اُدبی، گستاخی تذلیل، مار پیٹ حتیٰ کہ انہیں قتل بھی کرتے رہے لیکن بسا اوقات غیرتِ الٰہی یوں جوش میں نہ آئی، صرف اس بزرگ پر کیوں اتنی جوش میں آگئی کہ پل بھر میں اس عورت کو جان سے ختم کر ڈالا؟

۵۔ انتقام سے بچئے

اب ایک دوسرے بزرگ "خواجہ علاؤالدین صابر کلیری" کے غضب کا واقعہ سنیئے:

آپ کو خواجہ فریدالدین گنج شکر نے کلیر بھیجا۔ چند ماہ گزر گئے لوگ کچھ متوجہ نہ ہوتے۔ ایک دن آپ جمعہ کی نماز پڑھنے گئے، تو امام کے مصلّی پر بیٹھ گئے۔ لوگوں نے کہا: "یہ قاضی کی جانماز ہے۔ کسی دوسری جگہ بیٹھ جاؤ۔" آپ نے فرمایا: "قاضی سے بڑھ کر رتبہ قطب کا ہے اور ہم اس سرزمین کے قطب ہیں۔" لوگوں نے یہ بات ہنسی میں اڑا دی اور زبردستی وہاں سے اُٹھا دیا۔ آپ پیچھے آکھڑے ہوئے۔ حضرت کو کوئی جگہ نماز پڑھنے کو نہ ملی، تو مسجد کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: "لوگ سجدہ کرتے ہیں تو بھی سجدہ کر۔" یہ بات سنتے ہی مسجد مع چھت اور دیوار کے ان پر گر پڑی اور سب لوگ نیچے آکر ہلاک ہو گئے۔" (مدینۃ الاولیاء، ص۰)

اب گستاخی کا قصور تو تین چار آدمیوں کا ہوگا، لیکن آپ نے غضب میں آکر سب لوگوں کو ہلاک کر دیا، اور ساتھ ہی ساتھ مسجد کو بھی۔ اور ان کا قصور فقط یہ تھا کہ وہ اس بزرگ صاحب کی طرف متوجہ نہ ہوئے تھے

ستوں چشم بد دور ہیں آپ دیں کے　　نمونہ ہیں خُلقِ رسولِؐ امیں کے

۶۔ جانوروں سے بھی انتقام

اور پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر کے کسی کا بیڑہ غرق کرنے کا قصہ تو زبانِ زد خاص و عام ہے۔ پورے بارہ سال بعد آپ نے پھر اپنی "نظرِ کرم" سے اس غرق شدہ بیڑے کو تار دیا۔ آپ کی یہ "نظرِ کرم" جانوروں کو بھی معاف نہیں کیا کرتی تھی۔ مثلاً چند درج ذیل واقعات ملاحظہ فرمایئے :

۱۔ ایک دفعہ ایک چیل آپ کی مجلس وعظ کے اُوپر منڈلانے لگی اور چلّانے لگی، آپ نے ہوا کو حکم دیا کہ اُس کا سر پکڑ لے۔ آپ کا یہ فرمانا تھا کہ اس بیچاری چیل کا سر جُدا ہو کر زمین پر گر پڑا۔ پھر آپ منبر شریف سے اُترے اور سر اور دھڑ دونوں ملا کر بسم اللہ پڑھا اور اپنا ہاتھ مبارک پھیرا، تو وہ اللہ کے اذن سے زندہ ہو کر اڑنے لگی اور لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا۔" (بہجۃ الاسرار، ص ۶۵ کے علاوہ متعدد کتب کے حوالے۔ بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۱۹۲)

۲۔ اسی طرح ایک روز ایک چوہے کی شامت آگئی۔ جو چھت سے مٹی گرا رہا تھا۔ تین دفعہ آپ پر مٹی گری، چوتھی دفعہ جو گری، تو آپ نے جلالت سے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا طَارَ رَأسك آپ کا یہ فرمانا ہی تھا کہ چوہے کا سر ایک طرف اور دھڑ ایک طرف جا گرا۔ (تحفہ قادریہ، ص ۲۲، قلائد الجواہر، ص ۲۵ بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۲۱۱)

۳۔ ایک دفعہ وضو کے دوران ایک چڑیا نے آپ پر بیٹ کر دی، تو آپ نے جلالیت سے دیکھا، تو سَقَطَ مَیِّتًا یعنی وہ اسی وقت گر کر مرگئی۔ (حوالہ ایضاً)

گویا جو چیز بھی آپ کی طبعِ نازک پر گراں گزرتی۔ آپ فوراً اپنی نظرِ کرم سے اس کو جان ہی سے ختم کر ڈالتے تھے۔ غور فرمایئے اس انتقامی کارروائی کی رحمۃ للعالمین کے اسوۂ حسنہ سے کچھ مشابہت ہے؟

۷۔ مُردہ ولی کے انتقام سے بھی بچیئے

یہ تو خیر زندہ ولیوں کی گستاخی کی بات تھی۔ اب دیکھئے۔ ان کے مزارات سے گستاخی کا بھی یہی انجام ہوتا ہے۔ ذکر "حضرت ایشاں" کا ہو رہا ہے :

"خان دوران صوبہ دار لاہور جو خشک مُلّا تھا اور مشائخ عظام کے ساتھ اس کو کمال عداوت تھی برسرِ پرخاش ہوا اور مجاور کو بلا کر کہا کہ اس روضے کو گرا دیا جائے۔ مجاور نے جواب دیا مجھ کو گرانے کا اختیار نہیں، آپ کو اختیار ہے تو گرا دو۔ دوسرے دن صوبہ دار وہاں آیا اور اسے گرانے کا حکم دیا مگر جب وہاں سے لوٹ کر شالامار باغ کو چلا، تو راستہ میں گھوڑے نے ناخن لیا، گھوڑے سے گرا، گردن ٹوٹ گئی تین دن زندہ رہ کر مر گیا۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ غَضَبِ الْاَوْلِیَاءِ" (حدیقۃ الاولیاء، ص ۱۲۲)

اب دیکھئے کہ فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں خود حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس مہم پر روانہ کیا، جو روضے، قبے، مزار اور ایک بالشت سے اونچی قبریں ہیں، سب کو گرا کر ہموار کر دیا جائے اور ان خداؤں کی خدائی کا خاتمہ کیا جائے۔ آج پھر کیسے حیلوں بہانوں سے یہ خدائی پھر عوام پر مسلط کی جا رہی ہے۔

۲۔ عشق و مستی

دینِ طریقت کا پہلا زینہ عشقِ الٰہی قرار دیا گیا ہے، بلکہ صوفیاء ایمان کی تشریح ہی عشق و محبت سے کرتے ہیں (حدائق الاخیار، صادق فرغانی، ترجمہ بنام تلقین مرشد کامل، ص ۲۴۸)۔ عشق عربی زبان کا لفظ ہے۔ لیکن یہ لفظ عموماً بُرے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم یا احادیثِ صحیحہ میں کہیں بھی یہ لفظ مذکور نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے یا اس کے رسولِ اکرم ﷺ سے محبت خواہ کتنی ہی زیادہ ہو اس کے لئے حُبّ کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے۔ حتیٰ کہ قرآن کریم نے اسے سورۂ یوسف میں، جبکہ زلیخا کو واقعی حضرت یوسف علیہ السلام سے جنسی عشق تھا اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کیا اور اس کی جگہ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا (یعنی محبت زلیخا کے دل کے پردے تک پہنچ گئی تھی یا گھر کر گئی تھی) کے الفاظ استعمال کئے۔ اس لئے کہ عشق کے لفظ سے غیر شعوری طور پر طبیعت فحاشی اور بہیمیت کی طرف مائل ہو جاتی ہے، لیکن دینِ طریقت کا مدار ہی 'عشق' پر ہے اور اس لفظ کو بڑے فخریہ انداز میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو اگر تم خدا سے محبت چاہتے ہو، تو میری پیروی کرو، خدا تم سے محبت رکھے گا۔ (۳/۳۱)

بتلایئے بھلا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حضور اکرم ﷺ سے زیادہ بھی کوئی اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا کون ہو سکتا ہے، لیکن یہاں بھی لفظ محبت ہی استعمال ہوا ہے مگر متصوفین اور شاعروں نے اس لفظ کا پروپیگنڈا اس رنگ میں کیا کہ یہ لفظ "ایمان" کا مترادف اور ایک بہت اچھی صفت قرار دیا گیا۔ مولانا روم، حافظ شیرازی اور علامہ اقبالؒ نے اس لفظ کو دوام بخشا۔ مثلاً علامہ اقبال کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ حضور اکرم ﷺ کی مدح بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر — وہی قرآں، وہی فرقاں وہی یٰسین، وہی طٰہٰ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوتِ ایمانی کی تعریف بھی اس لفظ سے کی جارہی ہے اور اس کے مقابل عقل کو لاکھڑا کیا گیا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اسی طرح عام مسلمانوں کی قوتِ ایمانی کو بھی اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدہ عالم دوامِ ما (حافظ شیرازی)

ترجمہ: وہ شخص کبھی نہیں مرتا جس کا دل عشق سے زندہ ہے۔ صحیفۂ کائنات پر ہمارا دوام اسی عشق کی برکت سے ثبت ہو چکا ہے۔

عشق اور معرفتِ الٰہی

اب ہم دیکھیں گے کہ دینِ طریقت میں عشق کی مداخلت کیوں ضروری قرار دی گئی۔ ابنِ عربی جو ہمارے صوفیاء کے شیخ اکبر ہیں۔ اس کا فلسفہ یوں بیان کرتے ہیں:

"اللہ نے انسان کے وجود سے ایک دوسرے وجود کو، جو اسی کی شکل پر تھا، نکالا۔ اور اس کا نام عورت رکھا۔ یوں سمجھئے کہ عورت آدمی کا ظہور ہے۔ جب انسان عورت کی طرف جھکتا ہے، تو گویا اپنے نفس کی طرف شوق کرتا ہے اور عورت، جو آدمی کی طرف مائل ہوتی ہے، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مسافر اپنے اصلی وطن کی طرف کشش رکھتا ہے۔ اسی لحاظ سے رسول اکرم ﷺ کو عورتیں زیادہ محبوب تھیں۔ پھر اللہ کی محبت جس مخلوق کے ساتھ زیادہ تھی۔ اللہ نے اس مخلوق کو اپنی شکل پر پیدا فرمایا اور فرشتوں سے سجدہ کروایا۔ اس میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انسان کو معلوم ہو کہ اللہ اور انسانوں میں کس قدر مناسبت ہے اور شکل و صورت کے لحاظ سے کس قدر ہم آہنگی ہے۔" (فصوص الحکم، ص ۲۱۶)

"پھر جس طرح عورت ہم شکل اور وطن ہونے کی وجہ سے مرد سے محبت کرتی ہے۔ اسی طرح انسان خدا سے محبت کرتا ہے اور جس طرح مرد۔ اس کا جزو اور ہم شکل ہونے کی بناء پر عورت کی طرف مائل ہوتا اور محبت کرتا ہے۔ اسی طرح خدا بھی انسان کی طرف مائل ہوتا اور محبت کرتا ہے پس تین چیزیں سامنے آئیں۔ خدا، مرد اور عورت۔ گویا جس طرح عورت کو مرد کی کشش ہوتی ہے۔ اسی طرح مرد کو اپنے رب کی کشش ہوتی ہے" گویا کسی عورت کے ساتھ محبت بھرے الفاظ و اخلاق کو تخلقوا باخلاق اللہ کی منزل قرار دیا جارہا ہے۔

عشقِ مجازی اور حقیقی کی تقسیم

آپ نے یہ بات تو صوفی لوگوں سے اکثر سنی ہو گی کہ عشقِ حقیقی کی ابتدا عشقِ مجازی یعنی عورت کے عشق سے ہوتی ہے۔ اس کے تحت میں بھی یہی فلسفہ کام کر رہا ہے۔ ابنِ عربی کا کہنا ہے کہ "جب مرد عورت سے محبت اور مجامعت کرتا ہے، تو یہ مشاہدۂ حق کی اکمل ترین صورت ہوتی ہے اور وہ عورت میں خدا کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یعنی عورت جو منفعل ہے۔ اس میں اس کو خدا نظر آرہا ہے اور ظاہر ہے کہ مادیات سے ہٹ کر خدا کا مشاہدہ تجریدی صورت میں نہیں ہو سکتا۔" (فصوص الحکم، ص ۲۱۷)

عشقِ مجازی اور امرد پرستی

ابنِ عربی نے تو مشاہدۂ حق کے لئے عورت کا وجود ضروری سمجھا، خواہ کوئی عورت ہو، مگر دوسرے صوفی اکثر امرد یا بے ریش لڑکے کو پسند فرماتے ہیں۔ اس بارہ میں اُن کا ایک مقولہ بھی ہے، یعنی:

اَلنَّظَرُ اِلٰی وَجْهِ الْاَمْرَدِ عِبَادَةٌ — یعنی بے ریش لڑکے کے چہرے کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔

چنانچہ شبلی خود بیان کرتے ہیں کہ "مجھے اس وقت تک سکون حاصل نہیں ہوتا، جب تک کسی بے ریش لڑکے کو نہ دیکھ لوں۔" (الطبقات الشعرانی، ص ۱۰۴)

اور یہی تیسری صدی کے صوفی ابو بکر شبلی روایت کرتے ہیں کہ "میں نے ایک بار ابلیس کو دیکھ کر آواز دی، تو اس نے کہا، مجھے تجھ سے کچھ کام نہیں، میں تمہاری گمراہی سے فارغ ہو چکا ہوں۔ میں نے پوچھا، وہ کیسے؟ ابلیس کہنے لگا، تم نوخیز لڑکوں کے ساتھ محبت کرتے ہو؟" شبلی نے بیان کیا کہ واقعتاً یہ ایسی چیز ہے جس سے کوئی صوفی محفوظ رہا ہو" (الطبقات الشعرانی، ص ۱۰۴)

اللہ تعالیٰ پر الزام

اب صوفی عبدالغنی نابلسی کے عشقِ مجازی کے متعلق ارشادات ملاحظہ فرماتے:

اِلٰہِیْ لَیْسَ لِلْعُشَّاقِ ذَنْبٌ لِاَنَّکَ اَنْتَ تَبْلِیْ الْعَاشِقِیْنَا

اے میرے خدا! عاشقوں کا کیا گناہ ہے، جبکہ تُو خود ہی عشاق کو عشق میں مبتلا کرتا ہے۔

وَ تَخْلُقُ کُلَّ ذِیْ وَجْہٍ جَمِیْلٍ تَکَادُ لَہٗ تُصَلِّیْ الْعَابِدِیْنَا

اور تو ہی خوبصورت چہروں کا خالق ہے۔ جن کی خوبصورتی کی وجہ سے عبادت گزار ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

وَ تَامُرُنَا بِغَضِّ الْبَصَرِ مِنْہُمْ کَاَنَّکَ مَا خَلَقْتَ لَنَا عُیُوْنَا

پھر ہمیں حکم دیتا ہے کہ ان سے نگاہیں نیچی رکھیں، کیا تو نے اُن کو دیکھنے کے لیے ہمیں آنکھیں عطا نہیں کیں۔ (الفتح الربانی للفیض الرحمانی، ص ۲۷)

یہ اشعار محض شاعرانہ تصوّرات نہیں، بلکہ عشقِ مجازی، حقیقی اور معرفت کی جان ہیں۔ جو ایک صاحبِ حال متصوف نے کہے ہیں۔

عشقِ مجازی کے فضائل

بعد میں عشقِ مجازی کا یہ نظریہ آہستہ آہستہ دینِ طریقت کی بنیاد قرار پا گیا۔ عارف جامی فرماتے ہیں:

متاب از عشق او گرچہ مجازی ست کہ آں بہرِ حقیقت کارسازی ست

ترجمہ: عشق سے روگردانی نہ کر اگرچہ وہ مجازی ہو۔ کہ یہ حقیقت (عشقِ حقیقی) کے لئے ایک حیلہ ہے۔

اور اس سلسلہ میں ایک موضوع حدیث بھی پیش کی جاتی ہے:

مَنْ عَشِقَ فَعَفَّ وَکَتَمَ فَمَاتَ مَاتَ شَہِیْدًا

جو شخص کسی پر عاشق ہو جائے، پھر عفیف رہے اور پوشیدہ رکھے، پھر مر جائے، تو وہ شہید مرے گا۔ (تجدید تصوف و سلوک ص۱۳۱)

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب یہ حدیث درج کرنے کے بعد اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "یہ عشق غیر اختیاری ہوا (خود پیدا کردہ نہ ہو) پھر اس کی بات کسی سے نہ کرے، نہ کسی سے اُس کی بات سُنے نہ ہی دل میں اس کا خیال لائے۔" سوال یہ ہے کہ وہ عشق ہی کیا ہوا جس کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ آگے چل کر تھانوی صاحب لکھتے ہیں:

"اور بعض مشائخ نے جو بعض طالبین کو عشقِ مجازی پیدا کرنے کا مشورہ دیا ہے اس سے عشقِ حلال (مثلاً بی بی سے) مراد ہے نہ کہ حرام (ایضاً ص ۱۳۲)

غور فرمائیے ! اپنی بی بی سے پیار و محبت کرنے کو کوئی ان اصطلاحی معنوں میں عشق کہتا ہے ؛ بی بی سے پیار و محبت تو ایک فطری داعیہ اور منصوص طریقہ ہے ، جس کی خود اللہ تعالیٰ نے تلقین کی ہے ۔ اُس کا عشقِ مجازی سے کیا تعلق ؛ غرض مجدد صاحب موصوف اپنے اکابر کے اس مسئلہ پر بڑے اُلجھے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ پھر اس عشقِ مجازی کا فائدہ یہ بتلاتے ہیں کہ جب قلب کا انجن گرم ہو جائے ، تو پھر اس کا رُخ عشقِ الٰہی کی طرف بآسانی موڑا جا سکتا ہے ۔ یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عشق ہی کیا جس کا رُخ موڑنا اپنے بس میں ہو ۔ پھر فرماتے ہیں کہ صُوفیاء کے دِل کی گرمی اور سوز وہ گوہرِ نایاب ہے ، جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے ۔ تصوف کے سینہ بہ سینہ ہونے کے یہی معنی ہیں (ص ۱۴۱) گویا آپ نے پوری طرح اعتراف کر لیا کہ تصوف کا اصل جوہر دِل کی گرمی ہے ، جو عشقِ مجازی سے پیدا ہوتی ہے ۔

عاشقِ الٰہی کا جنازہ یا عرشِ الٰہی ؟

عشق کے منجملہ فضائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عاشقِ الٰہی کا جنازہ فی الحقیقت عرشِ الٰہی ہی ہوتا ہے ۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ :

" ابو موسےٰ کہتے ہیں کہ رات میں نے خواب دیکھا عرشِ الٰہی سر پر اُٹھائے اُڑ رہا ہوں ۔ اس خواب سے سخت متعجب ہوا اور اس کی تعبیر پوچھنے کے لئے بایزید بسطامی کے پاس جانے کا ارادہ کیا ۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آپ کا وصال ہو گیا ہے اور بے شمار مخلوق ہر طرف سے جمع ہو رہی ہے ۔ جنازہ اٹھایا گیا ، تو میں نے چاہا کہ اسے کندھا دوں ، مگر کثرتِ ہجوم کی وجہ سے میری باری نہ آتی تھی ۔ بالآخر جنازہ کے نیچے گھس کر اُسے اپنے سر پر اٹھا لیا ، تو ناگہاں اس وقت کیا سنتا ہوں کہ کوئی کہہ رہا ہے ۔ "اے ابُو موسےٰ ! یہی تیرے خواب کی تعبیر ہے ۔ وہ عرشِ الٰہی تو یہی عاشقِ الٰہی کا جنازہ ہے ۔" (صوفیائے نقشبند ، ص ۹۵)

اس لحاظ سے جتنے عاشقانِ الٰہی اس طبقہ میں پائے جاتے ہیں ۔ انہیں بھی اور ان کے سینوں کو بھی عرشِ الٰہی ہی سمجھا جاتا ہے ۔

اس عشق کی گرمی سے متعلق بھی صوفیاء میں درج ذیل مقولہ زبانِ زدِ خاص و عام ہے :

اَلْعِشْقُ نَارٌ یُحْرِقُ مَا سِوَی اللّٰہِ — عشق ایک ایسی آگ ہے جو اللہ کے سوا ہر چیز کو جلا دیتی ہے

پھر اس مقولہ کی عملی تفسیر و تعبیر جو پیرانِ پیر نے واقعاتی دنیا میں پیش فرمائی ، وہ بھی ملاحظہ فرمائیے :

العشقُ نارٌ کی عملی تعبیر

صاحب "مناقبِ غوثیہ" حضرت شیخ محمد صادق شیبانی فرماتے ہیں: "ایک روز میں غوث الاعظم کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ نے اپنے ایک خادم سے کہا: "سید احمد رفاعی (م ۵۷۲ھ) کے پاس جا اور پوچھ کہ عشق کیا ہے؟ اور اس کا جواب مجھے لا کر دے۔ خادم ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت کا پیغام دیا۔ یہ سنتے ہی انہوں نے ایک آہِ جاں کاہ اپنے سینہ پُرسوز سے کھینچی اور کہا کہ عشق ایسی آگ ہے، جو ماسوا اللہ کو جلا ڈالتی ہے۔ ان کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ جس درخت کے نیچے آپ بیٹھے ہوئے تھے وہ جل اُٹھا اور سید احمد رفاعی بھی اُس کے ساتھ جل کر خاکستر ہو گئے۔ پھر وہی راکھ پانی ہو کر برف کی مانند جم گئی۔ خادم خوفزدہ ہو کر خدمتِ غوث الاعظم میں حاضر ہوا اور تمام ماجرا بیان کیا۔ فرمایا: پھر اُسی جگہ جا اور اس کو بخور اور عطر سے معطر کر۔ جسم سید احمد کا اس عالم عنصری کی طرف عود کرے گا۔ چنانچہ خادم اسی جگہ واپس آیا۔ اس جگہ کو معطر کیا تو جو پانی سید احمد کی جگہ جما ہوا تھا۔ اس نے جسم کی صورت اختیار کر لی اور سید احمد دوبارہ زندہ ہو گئے۔"

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۷۱)

یہ قصہ تو بہت اچھا ہے مگر یہ سمجھ نہیں آئی کہ:

۱۔ عشق کی اس آگ سے سید رفاعی بھی جل کر خاکستر ہوئے اور درخت بھی۔ مگر پاس کھڑا خادم صحیح وسلامت بچ گیا، کیا وہ ماسوا اللہ نہیں تھا؟

۲۔ عشق کا کام تو ماسوا اللہ کو جلا ڈالنا ہے۔ پھر اسے پانی اور پھر برف میں تبدیل کرنا نہیں۔ پھر یہ عمل اکیلے سید رفاعی پر ہوا۔ درخت پر نہیں ہوا۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایسے عشق کے جلے ہوتے لوگوں کا علاج بخور اور عطر ہوتا ہے۔

بہرحال صادق شیبانی صاحب کی داد دیجئے کہ انہوں نے العشق نارٌ یحرق ما سوا اللہ کی عملی تعبیر پیش کر دی۔

اِن اولیاء اللہ نے ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق عشقِ مجازی کے اس کارِ خیر میں حصہ لیا۔ ان میں چند ایک کا ذکر ہم یہاں کریں گے۔ اس سے پہلے ہم حکیم سرمد دہلوی کا ذکر پہلے باب میں کر چکے ہیں کہ وہ کس طرح ایک ہندو لونڈے پر عاشق ہوئے۔ اس کے عشق میں دیوانہ ہو گئے، تو انہیں "مجذوب" کا مقدس لقب مل گیا تھا۔

شیخ حسین لاہوری (م ۱۰۵۲ھ) کا عشق

بہلول دریائی (م ۹۸۲ھ) کے خلیفہ تھے۔ ۳۶ سال ویرانے میں ریاضت و مجاہدہ کیا۔ رات کو داتا گنج بخش کے مزار پر اعتکاف میں بیٹھتے۔ آپ نے طریقہ ملامتیہ اختیار کر لیا۔ دارا شکوہ نے انہیں ملامتیوں کے گروہ کا سردار لکھا ہے۔ چار ابرو کا صفایا۔ ہاتھ میں شراب کا پیالہ، سرود و نغمہ، چنگ و رباب، تمام قیودِ شرعی سے آزاد، جس طرف چاہتے، نکل جاتے۔"

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۱۸)

"روایت ہے کہ ایک شخص حاجی یعقوب نامی مدینہ منورہ کا رہنے والا تھا۔ وہ ہمیشہ شیخ حسین کو روضۂ نبوی میں معتکف دیکھتا۔ وہ ایک مرتبہ لاہور آیا، تو ایک جگہ بازار میں دیکھا کہ ڈھول بج رہا ہے اور شیخ شراب کے نشہ میں چور رقص کر رہا ہے۔ دیکھ کر شیخ حسین کو پہچان لیا، مگر سخت حیران ہوا کہ یہ کیا بات ہے؟ شیخ نے کہا "آنکھیں بند کرو۔" اس نے آنکھیں بند کرتے ہی اپنے آپ کو مدینہ منورہ میں اور حسین کو روضۂ نبوی میں معتکف پایا۔" (ایضاً، ص ۲۲۱)

"نقل ہے کہ حسین کے دشمنوں نے اکبر بادشاہ سے شکایت کی کہ "لاہور میں ایک شیخ حسین نامی ہے، داڑھی مونچھیں منڈواتا ہے۔ سرخ لباس پہنتا ہے اور تمام دن خلافِ شریعت امور کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک حسین لڑکے مادھو کو اپنے پاس رکھتا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈھول کی آواز پر رقص کرتا ہے۔ اس کے باوجود باطنی ولایت کا دعویدار بھی ہے۔ بادشاہ نے اسے بلایا، تو حسین اسی طرح مست و مخمور جام و صراحی لئے دربار میں حاضر ہوئے۔ اکبر نے کہا "تو سلسلہ قادریہ کا پیرو ہو کر یہ مے نوشی اور امرد پرستی کیوں کرتا ہے؟" اس کے جواب میں حسین نے اپنی صراحی سے ایک پیالہ اکبر کے سامنے پیش کیا۔ اکبر نے دیکھا وہ سرد پانی تھا۔ دوسرا پیالہ پیش کیا، تو وہ شربت سے پُر تھا۔ اسی طرح تیسرا پیالہ دودھ سے۔ اکبر سخت حیران ہوا اور بغرضِ امتحان جیل بھجوا دیا کہ اگر صاحب کرامت ہے، تو زنداں میں نہیں رہ سکتا۔ اکبر جب اسے جیل بھجوا کر زنان خانہ میں گیا، تو شیخ حسین کو بادشاہ بیگم کے پاس کھڑا دیکھا۔ پھر قید خانہ میں گیا، تو حسین کو وہاں بھی موجود پایا۔ یہ دیکھ کر اکبر نے اسے رہا کر دیا۔" (ایضاً، ص ۲۲۲)

"صاحب حقیقت الفقراء لکھتے ہیں کہ شیخ حسین کے مرید نو ہزار کے قریب تھے، جو ان کے ذریعے کامل و اکمل ہوئے۔ بعض نے شیخ کے مریدوں کی تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار لکھی ہے۔ ان میں سے سولہ خلفا

زیادہ مشہور ہوئے۔ ان میں سے چار کا خطاب غریب ہے، چار کا دیوان، چار کا خاکی اور چار کا بلاول۔
دیوان یہ ہیں :

"پہلا دیوان مادھو۔ (مادھولال ہندو لڑکا، جو آپ کا معشوق تھا، ولی کامل ہوا۔ اور آپ کے ساتھ لاہور میں مدفون ہے) دوسرا دیوان گورکھ، تیسرا دیوان بخش، چوتھا اللہ دیوان، لاہور میں مدفون ہے۔"

(ایضاً ۲۲۳)

"جب تک کوئی شخص داڑھی مونچھ کا صفایا نہ کرا دیتا، اس وقت مرید نہ سمجھا جاتا۔ وہ اپنے ہاتھ سے مرید کو شراب کا پیالہ دیتے۔ اگر وہ پی لیتا، تو مریدوں میں سمجھا جاتا (گویا یہی اس کی بیعت تھی) ورنہ مجلس سے باہر نکال دیا جاتا۔ ان ظاہری بدعتوں اور خلافِ شریعت باتوں کے باوجود ولی سمجھے جاتے تھے..... داراشکوہ نے "حسنات العارفین" میں اُن کی بڑی تعریف کی اور ایک دو کراماتوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ اپنی تصنیف "شطحیات" میں لکھتا ہے کہ "شہزادہ سلیم اور اکبر کی اکثر بیگمات اس کی عقیدت مند تھیں، سلیم نے خاص کر ایک درباری بہار خان نامی کو مقرر کر رکھا تھا جو اُن کا روزنامچہ لکھتا ہے۔ اور یہ روزنامچہ رسالہ بہاریہ کے نام سے مشہور ہے۔" (ایضاً، ص ۲۱۸ کا حاشیہ)

ذکر معشوق شیخ مادھو لاہوری

"شیخ مادھو حسین لاہوری کے خلفائے ارجمند اور محبوبانِ دلپذیر میں شمار ہوتے ہیں۔ شاہدرہ کے ایک برہمن کے لڑکے تھے۔ بڑے صاحبِ جمال اور خوش شکل تھے۔ ایک دن گھوڑے پر سوار جا رہے تھے کہ شیخ حسین کا دل موہ لیا۔ بس پھر کیا تھا، شیخ حسین لاہور چھوڑ کر شاہدرہ میں آگئے۔ ساری رات مادھو کے مکان کا طواف کرتے اور ان کے متعلق جہاں سے خبر ملتی کہ مادھولال فلاں جگہ ہے، وہاں چلے جاتے۔ اِن حالات نے شاہ حسین کے عشق کو زمانہ میں مشہور کر دیا۔ آخر اس عشق کے اثرات مادھولال کے دِل پر وارد ہونے لگے اور وہ بھی شیخ حسین کے پاس آنے لگا۔ والدین آڑے آئے مگر بے سود۔ آخر مادھو سے کہنے لگے۔ ہم گنگا اشنان کرنے جا رہے ہیں، تم بھی ہمارے پاس چلو۔ مادھولال، شیخ حسین کے پاس اجازت کے لئے گیا، تو شیخ حسین نے کہا۔ والدین سے کہہ دو۔ "تم جاؤ، بوقتِ غسل میں موجود ہوں گا۔" مادھولال اس کرامت کے مظاہرہ کے لئے لاہور رہ گئے۔ جب غسل کا وقت تھا، تو شیخ حسین نے مادھولال سے کہا آنکھیں بند کر کے میرے قدم پر قدم رکھتے آؤ۔ تھوڑی دیر بعد شیخ حسین نے کہا اب آنکھیں کھول لو۔

مادھو نے دیکھا کہ وہ دریائے گنگا میں اپنے والدین کے ساتھ غسل کر رہے ہیں اور شاہ حسین بھی کنارے پر موجود ہیں۔ مادھو والدین سے ملاقات کے بعد اسی طرح شیخ حسین کے قدم پر قدم رکھ کر واپس لاہور پہنچ گئے اور مسلمان ہو گئے۔ دو ماہ بعد ہولی اور بسنت کے تہوار آئے، تو شیخ حسین نے مادھو لال کی دلجوئی کے لیے مجلس سماع و سرود منعقد کی اور عالم مستی میں ایک دوسرے پر بسنتی رنگ پھینکا، چنانچہ تاحال یہ رسم جاری ہے اور شیخ حسین کے معتقدین آپ کے مزار پر گلابی رنگ پھینکتے ہیں۔ اس مجلس میں مادھو لال نے شیخ حسین کی بیعت ہوا اور شیخ کی نگاہِ کیمیا اثر نے مادھو لال کو کمالاتِ فقر پر پہنچا دیا۔"

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۵۰، ۲۵۱)

مادھو لال حسین کے عشق کی داستان ہم نے ذرا تفصیل سے اس لئے لکھی ہے کہ اس سے مروجہ ولایت کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ ایسا بے دین، امرد پرست اور اباحت کا مرتکب بھی ولی ہو سکتا ہے اور ایک نگاہِ کیمیا اثر سے کمالاتِ فقر تک پہنچا سکتا ہے۔ یعنی کمالات کا معنیٰ شعبدہ بازیاں اور ولی بمعنی شعبدہ باز۔

۲۔ ایسے اولیاء اللہ بھی تذکروں کی زینت اور قابلِ احترام قدس سرہ سمجھے جاتے ہیں۔

۳۔ ولایت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ورنہ مادھو لال کا کم از کم نام ہی تبدیل کر دیا جاتا۔

۴۔ جو لوگ ان اولیاء کے ہاتھ پر مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ دراصل شعبدہ بازیوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایسا ہی اسلام انہیں بھی پسند ہے۔

تاج محمود قادری نوشاہی

صاحب تذکرہ نوشاہی آپ کے صاحبزادے شیخ آفتاب کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ ایک روز شیخ محمود بحالت سکر و استغراق کنوئیں پر بیٹھے تھے کہ ایک نئی دلہن کی ڈولی ادھر سے گزری، آپ چونکہ حسن پرست اور عشق پرست تھے۔ اس ڈولی کے پاس جا کر اس سے کہا کہ "اس ڈولی کا پردہ اٹھا، تا کہ میں صانع حقیقی کا جلوہ اس آئینہ قدرت میں دیکھوں۔" دلہا یہ سن کر بڑے غصہ میں آیا اور بدکلامی سے مخاطب ہوا اور آگے بڑھ گیا۔ ابھی تھوڑی ہی راہ طے کی تھی کہ دلہن خود بخود دیوانہ وار نکل آئی اور زمین پر تڑپنے لوٹنے لگی اور کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اس کا شوہر بے حد پریشان ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی گستاخی کی معافی چاہی۔ آپ نے فرمایا۔ "جاؤ! تمہاری دلہن اب اصلی حالت پر آ گئی ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۸۵)

دیکھا آپ نے کس طرح ان اولیاء اللہ کے ہاتھوں قرآن کے احکامِ پردہ کی مٹی پلید ہوتی ہے۔ حیرت یہ ہے کہ ایسے شعبدہ بازوں کو بھی تذکرہ نگار قدس سرہٗ کے القاب سے نوازتے اور ان کی داستانوں کو اپنے تذکروں کی زینت بناتے ہیں اور یہ اولیاء اللہ خود ہی مجرم نہیں ہوتے، بلکہ شعبدہ بازیاں دکھلا کر دوسروں کو اپنا معتقد بناتے اور اپنی بے ہودگیوں کے لئے راہ ہموار کرتے پھرتے ہیں۔

حاجی محمد قادری نوشاہی

"مشہور یہ ہے کہ حضرت نوشاہ قوم گلگو (کہار) سے تعلق رکھتے ہیں، مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ آپ قوم کھکر (کھوکھر) سے تھے۔ اس قوم (گلگو، کہار) سے مشہور ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے بزرگوں میں سے کوئی بزرگ اس قوم (گلگو، کہار) کی ایک حسین و جمیل لڑکی پر عاشق ہو گئے تھے اور اس کے عشق میں ایسے خود رفتہ ہوئے تھے کہ اسی قوم کے طور طریقے اختیار کر لئے۔ آخر یہ عشقِ مجازی عشقِ حقیقی میں تبدیل ہو گیا اور آپ زمرۂ اولیاء میں آ گئے۔" (خزینۃ الاولیاء، ص ۲۶۹)

ہمارے خیال میں زمرۂ اولیاء میں شامل ہونے کا یہ نسخہ بڑا دل لگتا بھی ہے، آسان بھی اور بہترین بھی۔

میاں شیر محمد شرقپوری (م ۱۳۲۱ھ)

آپ قطب العالم، غوثِ ربانی، بشیرِ یزدانی اور مادر زاد ولی تھے۔ خزینۂ معرفت کا مصنف بیان کرتا ہے کہ "ایک مرتبہ آپ کو ایک نوعمر لڑکے غلام محمد کٹاریہ سے محبت ہو گئی۔ اس کے عشق میں اس درجہ محویت ہوئی کہ آپ ہر وقت اسے یاد کرتے رہتے۔ جب اسے نہ پاتے، تو بے چین ہو کر اُسے ڈھونڈنے نکل جاتے اور تلاش کر کے لاتے اور جب کبھی وہ چلا جاتا، تو اکثر فرماتے۔ ادھر عشق ستا رہا ہے اُدھر غلام محمد یاد آ رہا ہے۔ بہت عرصہ دراز تک میاں صاحب اس نوجوان کے عشق میں مبتلا رہے اور آہ و فغاں کرتے رہے۔ پھر کافی مدت بعد آہستہ آہستہ اس سے کسی قسم کا تعلق نہ رہا۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۲۶۵)

ان واقعات سے آپ کو یہ تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اگرچہ یہ اولیاء اللہ غیر محرم عورتوں سے بھی عشق فرماتے ہیں، تاہم لونڈوں کو زیادہ پسند فرماتے ہیں اور اگر کوئی لڑکا ہندو بھی ہو، تو پھر عشقِ مجازی اپنی پوری بہار دکھلاتا ہے اور یہ سب کام متبرک اس لئے ہے کہ یہ عقیدہ بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ عشقِ مجازی ہی عشقِ حقیقی یا معرفت کا پہلا زینہ ہے۔ پھر ان لوگوں نے عشقِ مجازی کی آڑ میں حیوانات کو بھی نہ چھوڑا۔

عشق مجازی اور حیوانات

ان صوفیوں میں ایک صوفی "سید علی وحیش" ہیں وہ کسی کو گدھی پر سوار دیکھتے، تو اترنے کا حکم دیتے اور کہتے کہ اس کا سر تھام رکھو تاکہ میں اس سے بدفعلی کروں۔ اگر وہ انکار کرتا تو زمین سے چمٹ جاتے اور وہ ایک قدم نہ چل سکتا سوائے بیچارا مجبوراً یا تو ایک طرف نظر کر لیتا یا پھر یہ نظارا قہراً برداشت کرتا۔ جبکہ دوسرے لوگ پاس سے گزر رہے ہوتے۔ (فضائح صوفیہ ، ص ۱۳۶ (عربی مطبوعہ کویت)

اب دیکھئے۔ یہ بزرگ وحیش تو اس لئے کہلائے کہ وحشی جانوروں سے صحبت فرمایا کرتے تھے: تاہم صوفیاء کے طبقہ میں ان حضرت کی بزرگی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

پھر ان لوگوں کی مکاری ملاحظہ ہو۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو ملامتیہ کہلانا شروع کر دیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی ملامت سے بھی ان کے معرفت کے دروازے کھلتے ہیں۔ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ أَعْمَالَهُمْ (۲۷/۲۴)

اسی طرح کا ایک واقعہ تذکرہ غوثیہ میں بھی مذکور ہے، جو بلا تبصرہ حاضر خدمت ہے:

"فقیر صاحب نے فرمایا کہ بعد نمازِ عشاء ہماری روٹی مسجد میں لے آنا۔ جب ہم روٹی لے کر مسجد میں پہنچے تو دیکھا کہ میاں صاحب ایک گدھی سے مصروف ہیں۔ میں نے منہ پھیر لیا، پھر جو دیکھا تو نماز پڑھتے ہیں۔ بعد فراغت کھانا کھایا، باتیں کرنے لگے۔" (تذکرہ غوثیہ بحوالہ الانسان فی القرآن طبع اول، ص ۲۵۳ تا ۲۵۴)

واضح رہے کہ محولہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن سے یہ عبارت حذف کر دی گئی ہے۔

۳۔ جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر

صوفیاء کا طبقہ ریاضت ومجاہدہ کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے درج ذیل حدیث کا سہارا لیتا ہے:

وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللهِ — مجاہدہ وہ ہے، جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے۔

اس حدیث میں فی طاعۃ اللہ کے الفاظ صوفیاء کے اس گمانِ باطل کو رد کرنے کے لئے کافی ہیں کیونکہ ان کے ریاضت ومجاہدہ میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو صریحاً کتاب وسنت کے خلاف ہیں۔ ان کا مجاہدہ

نفس نہیں بلکہ نفس کشی ہوتی ہے اور فی معصیتہ اللہ ہوتی ہے اور اللہ کی اطاعت اور اس کا اسلامی نقطۂ نگاہ سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔

پھر یہ حدیث بیہقی نے شعب الایمان میں فضالہ سے روایت کی ہے۔ جس کے پورے الفاظ یہ ہیں:
"اور مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کیا اور مہاجر وہ ہے جس نے چھوٹے اور بڑے گناہوں کو ترک کر دیا"

ظاہر ہے کہ اس حدیث میں جہاد اور ہجرت کے اس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس طرف ذہن عموماً منتقل نہیں ہوتا۔ بتلایا یہ گیا ہے کہ جہاد اور ہجرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے ورنہ جس طرح ہجرت وہی ہے۔ جو مسلمانوں نے فتح مکہ سے پہلے کی ہے یا ایسے حالات میں مسلمان اعلائے کلمۃ الحق کے لیے کریں۔ اسی طرح جہاد حقیقتاً وہی ہے جسے جہاد بالسیف کہا جاتا ہے اور ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

جہاد بالسیف کی فضیلت

ارشادِ باری ہے:

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً (۴/۹۵)

جو مسلمان بغیر عذر کے گھروں میں بیٹھ رہتے ہیں اور جو اللہ کی راہ میں جان اور مال سے جہاد کرتے ہیں، یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ نے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت بخشی ہے۔

اور امام بخاری نے کتاب الجہاد والسیر میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے، جس کا عنوان ہے:

أَفْضَلُ النَّاسِ مُؤْمِنٌ يُجَاهِدُ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

سب لوگوں میں افضل وہ ہے، جو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرے۔

مولانا اللہ یار خاں صاحب نے کتاب الاذکار (محی الدین ابوزکریا نوری، م ۶۷۶) میں سے دو احادیث ایسی نقل فرمائی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر الٰہی ہر طرح کی جانی اور مالی عبادتوں حتیٰ کہ جہاد بالسیف سے بھی افضل ہے۔ پھر جو روایت ذکرِ الٰہی کو جہاد سے افضل قرار دیتی ہے۔ اتفاق سے اس پر ترمذی کا حوالہ بھی دیا گیا ہے اور وہ روایت اس طرح ہے:

"حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ قیامت کے دن اللہ کے

ہاں کونسی عبادت سب سے افضل ہوگی ؟ فرمایا " اللہ کو یاد کرنے والوں کا درجہ سب سے بلند ہوگا۔" میں نے عرض کیا، "کیا مجاہد فی سبیل اللہ سے بھی ؟" فرمایا " اگر مجاہد فی سبیل اللہ کفار اور مشرکین پر تلوار چلائے ۔ حتیٰ کہ وہ تلوار ٹوٹ جائے اور خون سے لتھڑ جائے ، تو بھی اللہ کا ذکر کرنے والے افضل ہیں۔" (دلائل السلوک ، ص ۱۰۷)

اب دیکھئے ذکرِ الٰہی کی انتہائی فضیلت سے ہمیں بھی انکار نہیں ، لیکن اس وقت سوال یہ ہے کہ اس حدیث کا درجہ کیا ہے ۔ یہ حدیث فی الواقع ترمذی ، کتاب الدعوات ، باب ماجاء فی فضل الذکر میں موجود ہے ۔ مگر امام ترمذی یہ حدیث درج کرنے کے بعد اس پر یوں تبصرہ کرتے ہیں " هٰذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ اِنَّمَا نَعرِفُهُ مِنْ حَدِيثِ دَرَّاجٍ ۔" اب یہ تو واضح ہے کہ یہ تبصرہ چونکہ ان صوفیاء کے عقیدہ کے خلاف پڑتا تھا ، لہٰذا اسے عمداً درج نہیں کیا گیا۔

دوسری حدیث جس میں ذکرِ الٰہی کو تمام جانی اور مالی عبادتوں سے افضل قرار دیا گیا ہے ۔ اس کا صاحب کتابُ الاذکار نے حوالہ درج ہی نہیں فرمایا ۔ یا پھر شاید مولانا اللہ یار خان چھوڑ گئے ہوں۔

پھر صوفیاء نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ جہاد بالنفس کو مجاہد بالسیف کے مثل قرار دیں ، بلکہ ریاضت و مجاہدہ کی افضلیت ثابت کرنے کے لئے ایک وضعی حدیث بھی پیش کر دی اور نعرہ لگایا کہ :

صوفیاء کی موضوع حدیث

رَجَعنَا مِنَ الجِهَادِ الاَصغَرِ اِلَى الجِهَادِ الاَكبَرِ ۔ ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آتے ہیں۔

حسین احمد مدنی کہتے ہیں ، صوفیاء اس کو صحیح حدیث کہتے ہیں ، لیکن امام عسقلانی کا قول ہے کہ امام نسائی ؒ نے اسے ابراہیم بن عبلہ کا کلام بتایا ہے ۔ الفاظ کی رکاکت زبردست قرینہ ہے کہ یہ آں حضرت ﷺ کا قول نہیں ہوسکتا اور نہ حدیث کی کتابوں میں شاہ عبدالعزیز جیسے متبحر محدث نے دیکھا ہے ۔ پس احادیث کا فیصلہ محدثین کے اصول و قواعد کی رُو سے کیا جائے گا ۔ بیچارے صوفیاء جن پر حسنِ ظن کا غلبہ ہوتا ہے ، ان حضرات کو تنقید و تفتیش کی فرصت کہاں ؛ ان کے حسنِ ظن سے کسی قول کا حدیثِ رسول ہونا ثابت نہیں ہو جائے گا ۔" (مکتوباتِ شیخ الاسلام ، ص ۳۰۷، ۳۰۸ ، ج ۱ ، بحوالہ اسلامی تصوف ، یوسف سلیم چشتی ، ص ۱۲۳)

عبدالکریم جیلی کا فلسفۂ جہاد

عبدالکریم جیلی اس مجاہدۂ نفس کے "جہادِ اکبر" ہونے کی توجیہہ پیش فرماتے ہوئے لکھتا ہے :

"نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ بخار ہر مومن کا آگ سے حصّہ ہے۔ جب بخار آگ کا قائم مقام ہو سکتا ہے، تو کیا مجاہدات، ریاضات، مخالفات، جن سے تزکیۂ نفس حاصل ہوتا ہے اور جن میں ہر تکلیف سے بڑھ کر تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے، دوزخ کی آگ کا قائم مقام نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجاہدات کا نام جہادِ اکبر رکھا ہے اور تلوار کے جہاد کا نام جہادِ اصغر ہے اور اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ بخار بمقابلہ دشمن سے لڑنے مارنے اور نیزہ لگانے وغیرہ سے زیادہ آسان ہے اور یہ تمام جہادِ اصغر ہے۔ ان مجاہدات و مخالفات کی سختیوں کے مقابلہ میں جن کو اہل اللہ اُٹھاتے ہیں۔"

(الانسان کامل، ص ۳۰۲)

عبدالکریم جیلی کے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان صوفیاء کے مجاہدہ و ریاضت اور مخالفتِ نفس یہ بدعیہ طریقے، جہاد بالسیف کے مثل یا اس سے افضل تو در کنار، الٹا اللہ کی معصیت اور گمراہی کا سبب ضرور بن سکتے ہیں، کیونکہ یہ سنتِ رسُول کے خلاف ہیں۔

پھر ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ:

"شہادت کی دو قسمیں ہیں، شہادتِ کبریٰ اور شہادتِ صغریٰ۔ شہادتِ صغریٰ کی چند قسمیں ہیں۔ اور حدیث اس کے متعلق وارد ہو چکی ہے کہ جو شخص مسافرت میں یا ڈوب کر یا دستوں وغیرہ کی بیماری سے مر گیا، وہ شہید ہے اور شہادتِ صغریٰ کا اعلیٰ درجہ جہاد فی سبیل اللہ میں قتل ہو جانا ہے اور شہادتِ کُبریٰ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اعلیٰ اور ایک ادنیٰ۔ اعلیٰ یہ ہے کہ عین الیقین سے تمام مخلوقات میں حق کا شہود ہو۔ مثلاً مخلوقات میں سے جب کوئی چیز دیکھے، تو اس شے میں بدوں حلول و انفصال و اتصال حق کو مشاہدہ کرے، بلکہ حق کا شہود ایسا ہو جیسا کہ حق سبحانہٗ و تعالےٰ نے اپنے قول میں خبر دی ہے فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ۔ اس کی شرطوں میں سے ایک شرط بدوں مستی و کیفت کے دوام مراقبہ ہے۔ جب یہ شہود بندہ کے لئے صحیح ہو گیا، تو پھر وہ اللہ تعالےٰ کو مشاہدہ کرنے والا ہے۔ یہ شہادت کا اعلیٰ منظر ہے۔ اور ادنیٰ قسم بدوں کسی علت (یعنی دوزخ کا خوف یا جنت کی حرص) کے محبتِ الٰہی کا انعقاد ہے کہ اللہ تعالےٰ کی محبت اس کی صفات کے لئے ہو اور اس وجہ سے ہو کہ وہی محبت کرنے کے لائق ہے۔" (انسان کامل، ص ۴۳۸)

دیکھا اس اقتباس کی رُو سے صُوفیاء کا یہ اعتقاد کیسے کُھل کر سامنے آگیا۔ جہاد بالسیف کو وہ شہادت

ادنیٰ کی اچھی قسم قرار دے رہے ہیں۔ رہی شہادتِ اعلیٰ، تو ان کے خود ساختہ طور طریقے، ریاضیات و فلسفہ اور اس کی اصطلاحات ہیں جن کا شریعت نبویہ میں کوئی سراغ ہی نہیں ملتا۔

صُوفیہ کے اس گوشہ نشینی کے نظریہ نے مسلمانوں کو جتنا نقصان پہنچایا شاید ہی کسی اور وجہ سے پہنچا ہو۔ اس نظریہ نے مسلمانوں سے جہاد کی رُوح کو ختم کر کے دنیا میں ذلیل اور رُسوا قوم بنا دیا اور ایسے افعال سے مجاہدہ نفس شروع کیا جس سے انسانیت کو بھی شرم آنے لگے اور ان کی یہ تعلیم پوری قوم کے لئے مارفیا کے انجکشن کی حیثیت رکھتی ہے

دسویں صدی ہجری کے آواخر میں اس نظریہ نے مسلمانوں کو اس قدر مفلوج، کاہل اور بے فہم بنا دیا تھا کہ وہ فرانسیسی فاتحین کے حملوں کا دفاع جامعہ ازہر میں بیٹھ کر اوراد و وظائف سے کر رہے تھے۔ نابلیون کا انتخاب کر کے اسے صوفیاء کی گوڈری پہنائی گئی اور اس کی رہنمائی میں ذکر و فکر کی مجالس قائم کی گئیں۔ بخاری شریف کا ختم بھی کرایا گیا، لیکن ان سب باتوں کا کچھ بھی فائدہ نہ ہوا اور مسلمان مار کھاتے رہے۔ بالآخر جب مسلمان مجاہدین نے یورپ کی سرزمین میں لوگوں سے جنگیں کیں۔ تب جا کر حالات نے پلٹا کھایا۔ (مقدمہ " الفکر الصُوفی"، ص ۲۰۔ از عبدالرحمٰن عبدالخالق مطبوعہ کویت)

اس گوشہ نشینی کا جو اثر ان صوفیاء کی ذات پر مرتب ہوتا ہے، وہ ابوبکر شبلی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

" روایت ہے کہ کچھ عرصہ شبلی اپنے مقام سے غائب رہے۔ ہر چند تلاش کیا پتہ نہ چلا۔ ایک روز مخنثوں کے گروہ میں دیکھے گئے۔ لوگوں نے پوچھا: "اے شیخ! یہ کیا بات ہے؟" فرمایا: "یہ گروہ دنیا میں نہ مرد ہے نہ عورت۔ میں بھی اسی حالت میں گرفتار ہوں، نہ مرد ہوں نہ عورت۔ پس ناچار میری جگہ انہی میں ہے۔"

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۴۷)

جنید بغدادیؒ کے مُرید اور جہاد بالسیف

ابوبکر شبلی کے پیر و مرشد جنید بغدادی کے مریدوں کو ایک دفعہ جہاد بالسیف کا شوق چرایا۔ یہ داستان اس طرح ہے کہ:

"شیخ جنید کے آٹھ مُرید تھے جو سب کے سب کامل و اکمل تھے۔ ایک روز انہوں نے خدمتِ شیخ میں عرض کی کہ اے شیخ شہادت ایک عجیب نعمتِ جانفزا ہے، اسے حاصل کرنا چاہتے۔ شیخ نے ان کی تائید کی اور اُن کے ساتھ ملکِ رُوم کی طرف جہاد کے لئے چل پڑے۔ ایک جگہ کفار سے مقابلہ ہو گیا ایک گبر

(آتش پرست) کے ہاتھوں شیخ کے آٹھوں مرید ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ شیخ فرماتے ہیں: "میں نے اس وقت ہوا میں نو کجاوے معلق دیکھے۔ میرے ساتھیوں میں سے جو شہید ہوتا تھا، اس کی رُوح ایک کجاوے میں رکھتے اور آسمان کی طرف لے جاتے۔ آخر ایک کجاوہ باقی رہ گیا۔ میں سمجھا یہ میرے لئے ہے۔ اور جنگ میں مشغول ہو گیا۔ دورانِ جنگ وہی گبر جس نے میرے ساتھیوں کو شہید کیا تھا۔ میرے پاس آیا اور کہا، "ابوالقاسم! یہ آخری کجاوہ میرے لئے ہے۔ تو واپس بغداد چلا جا۔ اپنی قوم کی قیادت و سیادت کر اور اپنا مذہب میرے سامنے پیش کر۔ میں نے اسے تلقینِ اسلام کی وہ مسلمان ہوا اور کفار سے لڑتا ہوا شہید ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اس آخری کجاوے میں اس کی رُوح کو آسمان کی طرف لے گئے ہیں۔" (خزینۃ الاصفیاء ص ۴۲)

اس روایت سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ابتداءً ایمان کا یہ معیار بتلایا تھا کہ ایک مومن دس کافروں پر غالب ہونا چاہیے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے اس میں تخفیف فرما کر یہ معیار مقرر کیا تھا کہ ایک مومن کم از کم دو کافروں پر ضرور بھاری ہونا چاہیے، مگر یہاں یہ صورتِ حال ہے کہ شیخ جنید کے آٹھ کامل واکمل مرید ایک کافر کے ہاتھوں شہید ہو رہے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اگر شہادت کا اتنا ہی شوق زیادہ تھا، تو بیس پچیس کافروں کو مار کر خود شہید ہوتے، مگر یہ سب ایک کافر کے ہاتھوں یوں مارے جا رہے ہیں جیسے قصاب بکروں کو ذبح کرتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ معیار کے مطابق ان میں ایمان کا جتنا حصہ تھا وہ آپ خود اندازہ لگا لیجئے۔ یہی وہ قباحت ہے جس کی بناء پر اسلام نے رہبانیت یا طریقت کو مذموم قرار دیا۔

۲۔ شیخ جنید کو خود اپنی شہادت کا خطرہ بھی لاحق ہو چلا تھا، وہ تو خیریت گزری کہ اس گبر کا "نورِ فراست" شیخ جنید کے "نور فراست" سے زیادہ تھا اور اس گبر کو شیخ جنید سے پہلے معلوم ہو گیا کہ نواں کجاوہ جنید کے لئے نہیں بلکہ میرے لئے ہے۔

۳۔ اسلام لانے کا یہ بھی کیسا انوکھا طریقہ ہے کہ کافر خود کسی مسلمان کو کہے کہ "میرے سامنے اسلام پیش کر تا کہ میں اسلام لاؤں"۔ بہرحال ولایت کی دنیا الگ ہے اور بمصداق ؎

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند

یہ بات بھی تسلیم کر ہی لینا چاہیے۔

۴۔ البتہ یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ روم تو سارا عہد فاروقی اور عثمانی میں فتح ہو چکا تھا اور شیخ جنید کے زمانہ

میں بغداد سے لے کر رُوم تک کا سارا علاقہ اسلامی مملکت میں شامل تھا۔ رُوم کے راستے میں ان کو کافروں کا لشکر ملا کہاں تھا؟

بہر حال اس راوی کی داد ضرور دینا چاہیئے، جس نے اس قصہ میں اولیاء اللہ کی کرامات سمو کر یہ لاجواب شاہکار تراشا ہے۔

گوشہ نشینی کا رد

اسلام نے ہمیں مل جل کر رہنے سہنے، معاشرتی زندگی گزارنے، خانہ داری اور کسبِ حلال کے آداب و احکام سکھلائے ہیں لیکن صوفیاً اپنا سارا زور ترکِ دنیا، خود کسب کرنے اور عائلی زندگی سے فرار پر صرف کرتے ہیں۔ کیونکہ یہی چیزیں ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھی جاتی ہیں۔ تاہم صوفیاء میں سے ہی کچھ ایسے بزرگ بھی ہیں، جنہوں نے اس بنیادی ضرورت کو محسوس کیا اور ایسے واقعات انہی تذکروں میں کہیں نہ کہیں نظر آجاتے ہیں مثلاً:

ابراہیم ادہم پہلے بلخ کے بادشاہ تھے۔ ان کے بادشاہی چھوڑ کر فقر اختیار کرنے کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ انہوں نے خود تو ترکِ دنیا کر کے گوشہ نشینی اختیار کی تھی مگر ایک شخص کے سوال کرنے پر وہ جواب یوں ارشاد فرماتے ہیں:

"نقل ہے کہ ایک شخص نے چاہا کہ وہ بھی اہل و عیال چھوڑ کر ابراہیمؒ کی طرح عبادت گزار بن جائے آپ نے سنا تو فرمایا: "واللہ اگر اسے معلوم ہوتا کہ وہ پریشانی اور غم جو اہل و عیال کی خبر گیری میں ہے میری عبادت سے بڑھ کر فضیلت رکھتی ہے، تو وہ یہ خواہش ہرگز نہ کرتا۔" اسی میں ایک اور عیالدار شخص جسے ایک دن کوئی مزدوری نہ ملی تھی، فکر و غم میں جا رہا تھا کہ بچوں کو کیا کھلائے گا۔ راستہ میں حضرت ابراہیمؒ کو بے فکر بیٹھے ہوئے دیکھا اور کہنے لگا "مجھے آپ پر رشک آتا ہے، آپ غمِ عیال سے فارغ بیٹھے ہیں۔" آپ نے فرمایا "بھئی! مجھے تو آج کے غم کا ثواب دے دے۔ بخدا میں اپنی ساری عمر کا ثواب تجھے دیتا ہوں۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک تیرا غم عیال میری عبادت سے زیادہ وقعت رکھتا ہے۔" یہ سن کر اس کا دل خوش ہوا اور وہ چلا گیا۔" (مقربانِ حق، ص ۱۰۱)

اسی طرح عبداللہ منازلؒ کہتے ہیں کہ: "جو شخص کسب و ہنر کرتا ہے اور خدا پر بھروسہ رکھتا ہے۔ وہ اس شخص سے ہزار گنا بہتر ہے، جو کسب و ہنر نہیں کرتا اور خلوت نشین ہو کر اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالتا ہے۔" (ایضاً، ص ۲۰۹)

۴۔ سماع اور وجد

محفلِ سماع کے انعقاد اور حرمت کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہے کہ علمائے شریعت تو ایک طرف صوفیوں ہی کے بعض سلسلے اسے ناجائز بلکہ حرام قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں مشرکین مکہ کی یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ وہ خانہ کعبہ کے پاس غناء و موسیقی کی محفلیں برپا کرتے تھے۔ ارشادِ باری ہے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ	اور ان لوگوں کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں
إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً	(۸/۳۵) بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔

موسیقی کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ساز اور آواز۔ خدا تعالیٰ نے مُكَاءً وَتَصْدِيَةً کے الفاظ میں پوری موسیقی ساز اور آواز دونوں کی مذمت کر دی ہے۔ موسیقی کی سُریں اور نغمے مکاءً کی اور ساز و مزامیر تصدیۃً کی ذیل میں آتے ہیں۔ اور حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ موسیقی سے دِل میں نفاق یوں ابھرتا ہے۔ جیسے بارش سے گھاس اُگ آتی ہے۔ نیز حضورِ اکرم ﷺ نے گانا بجانے والیوں کی خرید و فروخت اور انہیں موسیقی کی تعلیم دلانے سے منع فرما دیا ہے۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

سرود و رقص کے دلائل

اب ان صوفیوں کی خود تراشیدہ احادیث بھی سُن لیجئے
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ اَلسَّمَاعُ مُبَاحٌ لِمَنْ كَانَ قَلْبُهُ حَيًّا عَنِ الدُّنْيَا مَيِّتًا	جس کا دل (خدا کی محبت میں) زندہ اور دنیا کی طرف سے مردہ ہو اس کے لئے سرود مباح ہے۔
۲۔ اَلسَّمَاعُ مُبَاحٌ لِاَهْلِهٖ	سماع اس شخص کے لئے مباح ہے، جو اس کا اہل ہے

(مرشدِ کامل ترجمہ حدائق الاخیار، ص ۱۵۱، از صادق فرغانی)

واضح رہے کہ سماع کا لفظ دورِ نبویؐ میں صرف سننے کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا جیسے سماعِ موتیٰ، سرود کی محفلوں کے لئے سماع کا لفظ بہت بعد کی پیداوار اور صرف صوفیوں کی قوالیوں کے لیے وضع کی گئی۔

پھر وجد اور رقص کے جواز میں یہی فرغانی صاحب فرماتے ہیں:

"وجد کئی قسم کے ہیں۔ عوام کو بھی وجد ہوتا ہے۔ مگر جو لوگ خدا کی ذات میں فنا ہو جاتے ہیں ان کو وجد سے بہت سے اسرار منکشف ہوتے ہیں۔ دیکھو جب مصر کی عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو بے ہوش ہو کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے مگر ان کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فنا فی اللہ نہیں۔ جب

کسی پر وجد اس قدر طاری ہو جاتے کہ وہ بے اختیار ہو کر رقص کرنے لگے، تو وہ معذور ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا "اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْکَ" تو آپ بے اختیار ہو کر رقص کرنے لگے۔ پھر جب آپؐ نے حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کو فرمایا کہ اَنْتَ مَعِیَ فِی الْجَنَّۃِ تو آپ نے بھی ایسا ہی کیا۔ پھر جب حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا اَنْتَ اَخِیْ (تو میرا بھائی ہے) تو آپ نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ رقص کے اہل ہیں، ان کے لئے رقص مباح ہے۔" (ایضاً، ص ۱۵۳)

دلائل کا جائزہ

اب دیکھئے کہ رسول اللہ ﷺ تو ۱۱ھ میں فوت ہو گئے اور امام جعفر صادق ۱۲ر رجب ۸۰ھ کو پیدا ہوئے لیکن فرغانی صاحب فرما رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جعفر کو فرمایا اَنْتَ مَعِیَ فِی الْجَنَّۃِ تو آپ نے ایسا ہی کیا (یعنی رقص) کیا۔ اب یہ تو رہی آپ کی تاریخ دانی۔ رہے دوسرے اکاذیب تو یہ ان حضرات کو ورثہ میں ملے ہیں۔ جیسا کہ امام مسلم نے بروقت مطلع فرما دیا تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ فرغانی صاحب نے بھی ابن عربی کی طرح یہ دعوےٰ کیا ہے کہ اس کتاب کے مندرجات رسول اللہ ﷺ پر بحالت کشف پیش کئے گئے اور ان کی توثیق کے بعد شامل کتاب کئے گئے ہیں۔

پھر فرغانی صاحب فرماتے ہیں:

"اگر سرود سنتے وقت بے اختیار ہو کر ہاتھ پاؤں مارنے سے اس کا عمامہ گر پڑے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ جب حضور اکرم ﷺ معراج سے واپس آئے تھے، تو دوسرے روز اصحاب صفہ کے پاس گئے وہ نہایت بلند آواز سے باتیں کر رہے تھے جس سے آپ پر وجد طاری ہونا شروع ہوا اور بڑھتا بڑھتا یہاں تک پہنچا کہ آپ ہاتھ پاؤں مارنے لگے اور آپ کا عمامہ مبارک سر سے گر گیا۔ جب آپ اصلی حالت میں آئے، تو اصحاب نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جو یہ حالت آپ پر طاری ہوئی ہے۔ اس میں سے ہم کو بھی کچھ عنایت کیجئے۔ آپؐ نے اپنی دستار پھاڑ کر ان میں تقسیم کر دی۔" (ایضاً، ص ۱۵۴)

این گل دیگر شگفت

فرغانی صاحب کی افسانہ نگاری قابلِ داد ہے۔ البتہ اگر یہ خیال کر لیتے کہ معراج مکہ میں ہوا تھا اور اصحابِ صفہ مدینہ میں مسجدِ نبوی کے چبوترہ پر بیٹھنے والے صحابہؓ تھے، تو اُن کی دروغ گوئی پر شاید

کچھ پردہ رہ جاتا۔

پھر فرماتے ہیں : "جو لوگ اولیاء اللہ کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ صُوفی نے اس شعر کا مطلب کیا سمجھا جو اسے وجد ہو گیا۔ ایسے لوگوں کو چاہئے کہ اونٹ پر بھی اعتراض کریں کہ رجز سے اسے وجد تو ہو جاتا ہے، حالانکہ نہ وہ زبان جانتا ہے نہ اُن کا مفہوم سمجھتا ہے۔"

آخر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے سچی بات فرغانی صاحب کے منہ سے نکل ہی گئی۔ اچھی آواز سفلی جذبات کو اُبھارتی اور ہر ایک کو، حتیٰ کہ جانوروں کو بھی اچھی لگتی ہے۔ ریڈیو کی دھنوں پر بچے بھی جھُومنے لگتے ہیں۔" ہم پوچھتے ہیں پھر اس سے معرفتِ الٰہی کا کیا تعلق ہے؟ کیا اونٹ پر بھی اسرار منکشف ہوتے ہیں، جو صُوفی پر ہوتے ہیں؟ یا ان بچوں پر جو بغیر مطلب سمجھے ریڈیو کی آواز پر جھومنے لگتے ہیں۔

سیدھے اور صاف لفظوں میں اعتراف کر لینا چاہئے کہ صوفیوں میں ایک طبقہ عیاش طبقہ ہے جو عشق بازی، کانوں کی عیاشی اور ہوس رانی کے لئے تقدس کے پردوں میں یہ محفلیں رچاتا ہے۔ اب ہم اپنے اس دعوئے کے ثبوت میں انہی صوفیوں کے مصنف صالحین کے اقوال پیش کرتے ہیں :

اللمع فی التصوف کے مصنف ابو النصر سراج طوسی اس کتاب کے صفحہ ۵۳۰ پر لکھتے ہیں :

"کچھ لوگ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ تصوّف سے مقصود صرف یہ ہے کہ قوالی کی مجلسوں میں شریک ہوا جائے اور بہ تکلف وجد طاری کیا جائے اور پُر تکلف کھانوں کے ساتھ رفقاء کو جمع کیا جائے اور درد انگیز عشق آفرین قصائد ترنم آمیز لہجہ میں پڑھے جائیں خصوصاً ایسے اشعار، جو صوفیاء کی عشق بازی اور ہوس رانی کی عکاسی کرتے ہوں۔ حالانکہ تصوف سے یہ مقصود نہیں نہ یہ ہے کہ تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کھُلے بندوں عشق بازی کا بازار گرم کیا جائے اور موسیقی کے نغمات پر حال کھیلا جائے۔ اور ہا و ہو کا نعرہ بلند کیا جائے۔"

اس کے برعکس جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں :

"صوفی پر تین حالتوں میں رحمتِ خداوندی کا نزول ہوتا ہے (۱) جب وہ گانا سنتا ہے اور اس پر کیف و مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ (۲) جب منہ میں لقمہ ڈالتا ہے اور (۳) جب زبان سے کچھ کہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ نہ تو بلا ضرورت کچھ کھاتا ہے اور نہ بات کرتا ہے اور نہ سنتا ہے۔"

(الفکر الصوفی، ص ۱۰۸)

گویا جنیدی صاحب کے نزدیک وجد و سماع و رقص صرف جائز ہی نہیں بلکہ رحمتِ خداوندی

کے نزول کا وقت ہوتا ہے۔

سماع کے لئے کسی شرعی دلیل کی ضرورت نہیں

حضرت علی ہجویریؒ کا ذکر ہو رہا ہے:

"آپ خود سماع سنتے تھے اور اسوۂ رسول ﷺ اور آثارِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سند اپنے عمل کی تائید میں لاتے تھے۔ فرماتے ہیں مشائخ صوفیا۔ اباحتِ سماع کے متلاشی نہیں رہے اس لئے کہ کسی عمل کو اس کی اباحت کی بناء پر نہیں فوائد کی بنا پر اختیار کرنا چاہئے۔ تلاشِ اباحت میں عوام رہے ہیں۔ سندِ جواز چار پایوں کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔" (خلاصہ تصوفِ اسلام از آقا بیدار بخت، ص ۱۵)

ملاحظہ فرمائیے، اباحت کے لئے سندِ جواز تلاش کرنے کی علی ہجویریؒ کے نزدیک کیا وقعت ہے۔ ان کے خیال میں سماع کے لئے سندِ جواز تلاش کرنا عوام کالانعام کا کام ہے۔ ان جیسے اولیاء اللہ کو اس کی کیا ضرورت ہے؟

بعض صوفیہ وجد و حال کو ایک اضطراری کیفیت بتلاتے ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا تصریحات سے واضح ہے کہ یہ بھی ان لوگوں کی عیاری ہے۔ وہ صرف تقدس کے جامہ میں ہر طرح کی عیاشی سے محفوظ ہونا چاہتے ہیں۔ جب رفاعی فرقہ کے فقیروں کا امیر افرم کے سامنے امام ابن تیمیہؒ سے مناظرہ ہوا تو ان فقیروں نے بھی یہی بات کہی تھی کہ:

"یہ اقوال و افعال ہم سے اضطراراً سرزد ہوتے ہیں۔ ہم پر حال اور وجد طاری ہو جاتا ہے۔ ان کا روکنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ اسی طرح جس طرح چھینک کا روکنا ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا اور یہ حال اور وجد بھی اللہ ہی طرف سے ہے، تو امام موصوف نے جواب دیا کہ چھینک تو خدا ہی کی طرف سے ہے مگر یہ اقوال و افعال خبیثہ شیطان کی طرف سے ہیں۔ خدا اور اس کا رسول ان کاموں سے منع کرتا ہے اور وہ جن باتوں سے ہم کو منع کر دیں وہ کبھی محبوب نہیں ہو سکتی۔ امام موصوفؒ نے کہا کہ اس کی مثال یہ ہے کہ کفر اور فسق کا صدور بھی خدا کی مشیت ہی سے ہوتا ہے۔ لیکن کوئی شخص اسے جائز نہیں سمجھتا۔

وجد اور حال کا علاج

رفاعی شیخ نے پوچھا کہ پھر اس اضطراری وجد و حال کو کیونکر روکا جا سکتا ہے۔ امام موصوف نے فوراً جواب دیا "شرعی کوڑوں سے" اس پر امیر افرم ہنس پڑا۔ امام موصوف نے کہا۔ "ہاں! پھر اگر شرعی کوڑوں سے کام نہ چلے، تو تلوار محمدی ﷺ سے۔" یہ کہہ کر امیر افرم کے ہاتھ سے تلوار لے لی اور اسے ہوا میں

بلند کر کے کہا یہ شخص (امیر افرم) رسول اللہ ﷺ کا نائب اور ادنیٰ غلام ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کی تلوار ہے۔ اب جو شخص کتاب و سنت سے رُوگردانی کرے گا، اس کو موت کے گھاٹ اتارا جائے گا۔" (امام ابن تیمیہؒ، از کوکن عمری، ص ۱۶۵)

رفاعی شیخ نے یہ بھی کہا کہ ہمارے کچھ باطنی امور و احوال ہیں، جن کو اہلِ نظر نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے ان سے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ امام ابن تیمیہؒ نے کہا کہ "ظاہر و باطن، شریعت و طریقت، حقیقت و مجاز سب کچھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹایا جائے گا عام اس سے کہ وہ مشائخ ہوں یا فقیر، بادشاہ ہوں یا اُمراء، علماء ہوں یا قاضی۔ اس لئے کہ ساری مخلوق پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت واجب ہے۔ یہ اہلِ باطن بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔" (ایضاً، ص ۱۶۴)

سماع کے متعلق صوفیائے حق کا فتویٰ

ایک اور بزرگ شیخ احمد بن ابراھیم واسطی ہیں، جن کو شیخ عبدالحق دہلوی عالم عامل اور عارفِ کامل کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "یہ جو کہا جاتا ہے کہ شعر کو، نہ کہ قرآن کو طبیعت بشری سے خاص مناسبت ہے۔ اس لئے اشعار سُن کر دل میں قدرتاً تحریک پیدا ہوتی ہے۔ سو یہ قول لغو و بے حقیقت ہے۔ اس لئے کہ شعر کے وزن اور سُر تال پر حرکت کرنا جبلتِ حیوانی کا تقاضا ہے۔ چنانچہ حیوانات اور بچے سب اچھی موسیقی سے اثر قبول کرتے ہیں۔ یہ فطرتِ حیوانی ہے انسان کی اعلیٰ فطرت کا درجہ اس سے کہیں بلند ہے۔ جن کے دلوں میں محبتِ الٰہی حلاوت کر چکی ہے جیسا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد آنے والوں کا حال تھا۔ سو اُن کے قلوب کو حرکت میں لانے والی اور ان کے شوق و وجد، رقت اور خشوع کو بڑھانے والی شئے قرآن پاک کی سماعت ہی ہو سکتی ہے۔" (تصوف اسلام ص ۱۵۶)

بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ سماع میں اصل وجد میں لانے والی چیز موسیقی کی بجائے شعر کی شعریت اور حقیقت ہوتی ہے، تو ہم عرض کریں گے کہ دورِ جاہلیت میں لبیدؓ ہی ایک ایسا شاعر تھا جس کے کلام کو حضور اکرم ﷺ پسند فرماتے تھے۔ مثلاً اس کا یہ شعر آپ کو بہت پسند آیا: (بخاری، کتاب المناقب باب ایام الجاہلیہ)

اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ ۔۔۔ وَكُلُّ نَعِيْمٍ لَا مَحَالَةَ زَائِلٌ

سن لو کہ اللہ کے سوا جو چیز بھی ہے وہ باطل ہے اور ہر ایک نعمت لامحالہ زائل ہونے والی ہے

انہیں لبیدؓ کو ایک دن حضرت عمرؓ نے کہا کہ اپنا کوئی کلام سناؤ، تو کہنے لگے جب سے قرآن دل

میں رچ بس گیا ہے میں نے شعر و شاعری کو دل سے نکال دیا ہے۔

سماع کے شرعاً حرام ہونے کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ بعض اکابر صوفیاء نے بھی اس کی حرمت کا فتوے دیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی اسے شرعاً ناجائز قرار دیتے ہیں۔ (تصوف اسلام، ص ۱۲۱)

۲۔ خود حضرت علی ہجویری سماع سنتے تھے، لیکن شرعاً اسے ناجائز سمجھتے تھے (ایضاً، ص ۵۸)

۳۔ عبداللہ غزنویؒ نے سماع کو ناجائز قرار دیکر قرآن سننا ہی اپنا شعار بنالیا تھا۔ (سوانح، مرتبہ عبدالجبار غزنوی ص۴۵)

سماع کی دلدادگی

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بعض اکابر صوفیاء ایسے بھی ملتے ہیں جو سماع کے اتنے رسیا تھے کہ مرتے دم بھی قرآن سننے کی بجائے کسی قوال کو بلانے کی تاکید کرتے یا سماع سن کر جان دیتے رہے ہیں۔ مثلاً:

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے متعلق منقول ہے کہ ان کے یہاں مجلس سماع گرم تھی۔ قوال، احمد جام کی غزل گا رہا تھا۔ جب یہ غزل گاتے گاتے نوبت اس شعر پر پہنچی:

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

تو حضرت کا حال برگشتہ ہو گیا اور اسی حالت میں جان دے دی۔ (حدیقۃ الاولیاء، ص ۴۷) اور بعض روایات میں ہے کہ تین دن اسی حالت میں رہ کر وفات پائی۔

ایک اور بزرگ فیض بخش صابری چشتی ہیں جب ان کی موت کا وقت قریب آیا۔ قوالوں کو بلایا، ایک قوال قادر بخش کو نعت پڑھنے کو کہا۔ اس نے یہ غزل شروع کی:

منم خاکِ درِ کوئے محمدؐ اسیرِ حلقۂ موئے محمدؐ
قتیلِ نوکِ شمشیرِ نگاہش شہیدِ تیغِ ابروئے محمدؐ

تو آپ پر وجد طاری ہوا اور اسی حالت وفات پائی۔

کجا رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ اپنے مرنے والوں کو کلمہ شہادت کی تلقین کرو اور ان کے پاس سورۂ یٰسین پڑھو اور کجا ان اولیاء اللہ کی قوالیوں سے یہ دلدادگی۔

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا

اب فرقہ نوشاہیہ کے سماع و وجد کا حال بھی ذرا سن لیجئے:

پوشیدہ نہ رہے کہ فرقہ عالیہ نوشاہیہ میں سب لوگ صاحب وجد و سماع و شوق و ذوق و مستی

ہیں مگر فقرائے سلسلہ پاک رحمٰن سماع کے وقت سب سے زیادہ مست ہو جاتے ہیں جب تک اُن کے پاؤں میں رسہ ڈال کر الٹا نہ لٹکائیں اور ساعت دو ساعت اسی حالت میں رقص نہ کر لیں سرد نہیں ہوتے اور اگر اس عمل سے ہوش میں نہ آئیں، تو اسی حالت میں ان کو زمین پر کھینچتے ہیں جب تک وہ ہوش میں نہ آ جائیں۔ رسی ان کے پاؤں سے نہیں کھولا جاتا۔" (حدیقۃ الاولیاء، ص ۶۹)

ان نوشاہی "اولیاء اللہ" پر سماع کی محفل کے بغیر بھی وجد طاری ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ سُن لیجئے:

حافظ برخوردار قادری نوشاہی کا سماع

"تذکرہ نوشاہی میں ہے کہ ایک روز حافظ صاحب اپنے خُسر کے ہاں حالتِ جذب واستغراق میں بیٹھے تھے۔ گھر کے سامنے ایک زمیندار کی لڑکی چرخہ کات رہی اور ساتھ کچھ گا بھی رہی تھی۔ اس کے سرود نے حافظ صاحب پر حالتِ وجد طاری کر دی۔ لڑکی کے خاموش ہونے پر فرمایا۔ "اے لڑکی! ایک بار پھر اسی طرح نغمہ سرائی کر۔" لڑکی شرم کے مارے اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس کے پیٹ میں سخت درد اُٹھا اور حالتِ نزع تک جا پہنچی۔ علاج معالجہ سے فائدہ نہ ہوا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس کے والدین آپ کے پاس آئے اور معذرت چاہی۔ آپ نے فرمایا۔ "اسے میرے روبرو لاؤ۔" جب لڑکی آپ کے سامنے حاضر ہوئی تو فرمایا: "اے لڑکی! پھر اسی طرح نغمہ گا۔ انشاء اللہ اچھی ہو جائے گی۔" چنانچہ اس لڑکی نے وہی نغمہ اسی انداز میں گایا۔ آپ کی توجہ سے اسی وقت صحت یاب ہو گئی۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۸۸)

دیکھ لیجئے دوسرے لوگوں کو اپنے شعبدہ کے دام میں پھنسا کر ان اولیاء اللہ کو اپنی حیوانی خواہشات کو پورا کرنے کا کیسا فن آتا ہے۔ ایک بات البتہ کھٹکتی ہی رہی کہ جب لڑکی ابھی تک ٹھیک بھی نہ ہوئی تھی، تو اُس نے اسی انداز اور سُر میں گا کیسے لیا؟

ابوسعید اور ابوالحسن خرقانی کا سماع

"روایت ہے کہ شیخ ابوالحسن خرقانی سماع نہیں سنا کرتے تھے۔ ایک روز ابوسعید آپ کی زیارت کے لئے خرقان آئے اور کھانے سے فارغ ہو کر سماع کی اجازت طلب کی۔ آپ (ابوالحسن خرقانی) نے فرمایا: "ہم سماع نہیں سنا کرتے، آپ کی وجہ سے سُن لیتے ہیں۔" قوالوں نے ایک شعر پڑھا،

تو ابوسعید نے کہا "اے شیخ! اب وقت ہے آپ اٹھیں۔" ابوالحسن اُٹھ کھڑے ہوئے اور تین بار اپنی آستین کو وجدانہ حرکت دی اور سات بار حالتِ وجد میں زمین پر اپنے پیر مارے۔ آپ کا وجد میں آنا تھا کہ خانقاہ کی دیواریں آپ کے ساتھ ہلنے لگیں۔ ابوسعید نے کہا: "حضرت! بس کیجئے کیونکہ ساری عمارت گر جائے گی۔ اور قسم ہے اس ذات وحدہٗ لاشریک کی کہ آسمان و زمین بھی آپ کے ساتھ رقص کرنے لگیں گے۔" اس پر ابوالحسن خرقانی نے اپنے مریدوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: "سماع اس شخص کے لئے جائز ہے، جو اوپر عرش تک اور نیچے تحت الثریٰ تک دیکھتا ہو۔" آپ نے مزید فرمایا: "اگر تم سے کوئی دریافت کرے کہ رقص کیوں کرتے ہو، تو کہنا گزرے ہوئے لوگوں کی موافقت میں اور جن لوگوں کے لئے سماع جائز ہے، وہ ایسا کرتے ہیں۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۱۱)

غور فرمایئے ابوالحسن خرقانی جب سماع و وجد سنا ہی نہ کرتے تھے، ابوسعید کی درخواست پر پہلی ہی دفعہ سماع سنا اور وجد میں آتے، تو کیسا زلزلہ بپا کر دیا۔ پھر آپ نے سماع کے جواز کی شرائط اور دلائل بھی کتنے شاندار فراہم کر دیئے ہیں۔

واقعی ایسے لوگوں کا علاج وہی ہے، جو امام ابن تیمیہؒ نے تجویز کیا۔ اور ان لوگوں کا خواجہ عبدالحکیم انصاری مصنف حقیقت وحدت الوجود نے صحیح تعارف کرا دیا ہے، کہ "یہ لوگ شرابی، کبابی ہوتے ہیں اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہندو جوگیوں سے یوگ وغیرہ سیکھ اور ریاضتیں کر کے لوگوں کو شعبدے دکھاتے پھرتے ہیں۔"

۵۔ جام و مے کی شاعری

بسطامی، شبلی اور ابویزید کے زمانہ سے عصرِ حاضر تک بعض صوفیاء اور مجذوبوں نے تکالیف شرعیہ کو غیر ضروری قرار دینے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ اس کا مذاق بھی اڑایا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جمالیاتی وسائل کی مدد سے وجدانی ہیجان پیدا کر کے سامعین میں جذب و مستی کی ایک مصنوعی کیفیت پیدا کی جاتے۔ اس مقصد کے لئے بالخصوص شاعری کا سہارا لیا گیا۔ یہ شاعری تصوف کی زبان (اسرار و رموز) میں شراب کی مدح سرائی کرتی ہے۔ حالانکہ شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ اس میں محبت کے پیالے کو ساقی (شمس الدین) گردش میں لاتا اور پیش کرتا ہے۔ مثلاً حافظ شیرازی کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

الا یا ایہا الساقی اَدِر کاساً و ناوِلہا   کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکل ہا

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید   کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ رسم منزل ہا

ترجمہ: اے ساقی! جام کو گھما اور پیش کر کہ عشق پہلے پہل تو آسان معلوم ہوتا ہے۔ پھر بہت سی مشکلات آپڑتی ہیں۔ اگر تجھے پیرِ مغاں (شراب خانہ کا شیخ) کہتا ہے کہ اپنا مصلیٰ شراب سے رنگین کر تو ایسا ضرور کر۔ کیونکہ سالک منازلِ سلوک کی راہ و رسم سے بے خبر نہیں ہوتا۔

دیکھئے اِن اشعار میں تصوف اور شراب کو لازم و ملزوم کر کے پیش کیا گیا ہے۔

فارسی زبان میں اس قسم کی شاعری کو رواج دینے والے مندرجہ ذیل شعراء ہیں۔ (۱) جلال الدین رومی (مثنوی) (۲) شیخ فرید الدین عطار (مثنوی) (۳) ابوسعید (رباعیات) (۴) حافظ شیرازی (غزلیں) اور (۵) عبدالرحمٰن جامی (نظمیں)

عربی زبان میں ابن الفارض اور تستری کی نظمیں یہی موضوع پیش کرتی ہیں۔ عربی کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے:

تَعَالَوْا نُخَرِّبُ الْجَامِعْ   وَنَجْعَلُ فِيهِ خَمَّارَهْ

آؤ ہم لوگ مسجد کو ویران کریں اور اس میں شراب خانہ بنائیں۔

وَنَحْنُ نَكْسِرُ الْمِنْبَرَ   وَنَجْعَلُ مِنْهُ طَنْبَارَهْ

اور منبر کو توڑ کر اس سے ساز و مزامیر بنائیں۔

وَنَحْنُ نُخَرِّقُ الْمُصْحَفْ   وَنَجْعَلُ مِنْهُ ذَمَّارَهْ

اور قرآن کو پھاڑ کر اس کی بانسری بنائیں

وَنَنْتِفُ لِحْيَةَ الْقَاضِيْ   وَنَجْعَلُ مِنْهُ اَوْتَارَهْ

اور قاضی کی داڑھی کو اکھاڑ کر اس سے تانت بنائیں

(تاریخ دعوت و عزیمت۔ ص ۱۹۳، ج ۲)

دیکھا آپ نے شراب اور رقص و سرود کی محفلیں سجانے کے لئے کس طرح کتاب اللہ اور شعائر اللہ کا تمسخر اڑایا گیا ہے۔

پھر اسی قسم کی صوفیانہ شاعری ہندوستان میں بھی پہنچی اور اُردو کے شعرائنے بھی اس موضوع پر جی بھر کر طبع آزمائی کی۔ کسی شاعر نے تو یوں کہا:

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر یا وہ جگہ بتا دے جس جا خدا نہیں

اور کسی نے یوں کہا ۔

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق

پھر کوئی صاحب ساقی کے بدیں الفاظ مشکور ہوتے ہیں :

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو پلا کے مجھ کو مئے لَا اِلٰـہَ اِلاَّ اللّٰہ

نہ مے نہ شعر، نہ ساقی، نہ شورِ چنگ و رُباب سکوت کوہ و لب جوئے و لالۂ خود رو !

مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانے میں کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو !

پھر کسی نے یوں آرزو کی ۔

لا اک بار پھر وہی بادہ و جام اے ساقی ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی !

پنجابی زبان میں جن متصوف شعراء نے اس میدان میں طبع آزمائی کی ان میں بلھے شاہ اور خواجہ فرید کے نام قابل ذکر ہیں، مثلاً بلھے شاہ فرماتے ہیں :-

۱۔ پھوک مصلیٰ بھن سٹ لوٹا، نہ پھڑ تسبیح، عاصا، سوٹا، عاشق کہندے دے دے ہوکا، ترک حلالوں کھا مردار

۲۔ بلھیا! پی شراب تے کھا کباب ہیٹھ بال ہڈاں دی اگ، چوری کر تے بھن گھر رب دا، اوس ٹھگاں دے ٹھگ نوں ٹھگ

غرض تصوف کی اس شاعری کا جس میں شراب معرفت کا ذکر ہوا اور ساقی، جام و سبو وغیرہ الفاظ کو تلمیحات اور تلویحات کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔ ہر طرف چرچا ہو گیا اور وہ شراب جس کی تیاری اور فروخت تک کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے دس متعلقہ آدمیوں پر لعنت فرمائی تھی۔ تصوف کی دنیا میں شراب اور اس کے متعلقات تقدس کا جامہ اوڑھ کر جب سامنے آئے، تو نفرت کے بجائے ان الفاظ اور اشیاء سے موانست پیدا ہونے لگی۔

وجد و سماع کی محفلوں میں قوالیوں کا رواج ہوا تو قوالوں کی ایک فوج ظفر موج پیدا ہوئی۔ جنہوں نے عوام میں اس شاعری کو مقبول بنایا۔ ادھر وجد و سماع کی محفلوں میں ایسی قوالیاں لازم قرار پائیں، اور یہ بزرگانِ دین اس ذریعہ سے سلوک کی منازل طے کرتے رہے اور نوبت بایں جا رسید کہ بعض بزرگ تو مرتے وقت بھی کلمۂ شہادت یا قرآن کی تلقین کی بجائے کسی قوال کو بلانے کی تلقین کرنے لگے۔ جیسا کہ وجد و سماع کے سلسلہ میں ایک دو اولیاء اللہ کے واقعات پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

شراب کی دلدادگی

پھر کچھ اولیاء ایسے بھی گزرے ہیں جنہیں سرخ شراب بہت پسند آئی تھی چنانچہ غلام محی الدین قادری جالندھری نے اس پر پورا قصیدہ ہی لکھ ڈالا جس میں سے چند اشعار حسب ذیل ہیں: (ماخوذ از ریاض السالکین، ص ۲۶۵)

ساقی پلادے جام مے خوشگوار سرخ — تا میری چشم کو کرے اُس کا خمار سرخ

ہر شش طرف جو نظر کروں آنکھ کھول کر — آوے جہاں نظر مجھے چوں لالہ زار سرخ

حیوان و جن، کان، نباتات سربسر — دریا و دشت، بیشہ و ہر کوہ و غار سرخ

محفل میں جاکے دیکھوں تو مطرب ہو سرخ پوش — طنبورہ سرخ، چنگ کی ہر تار تار سرخ

یا در ہو بخت گر مرا تو کچھ عجب نہیں — اے قادری جو دیکھوں میں ایسی بہار سرخ

پھر کئی تذکروں میں اولیاء اللہ ایسے بھی ملتے ہیں جو فی الواقعہ اور علی الاعلان شراب پیا کرتے تھے۔ اور یہ شیخ حسین لاہوری تو اس وقت تک کسی کو مرید بھی نہ بناتے تھے جب تک وہ ان کے ہاتھوں شراب کا جام نوش نہ فرمالے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ طریقت کو شریعت سے ماخوذ بنانے والے صوفیاء نے بھی ایسے لوگوں کو دنیائے ولایت سے خارج نہیں کیا۔ ان کے نام بدستور تذکروں میں عزت و تکریم سے لئے جاتے انہیں قدس سرہٗ لکھا جاتا ہے اور پوری عقیدت سے ان کا ذکر خیر کیا جاتا ہے۔

۶۔ تصورِ شیخ

تصورِ شیخ خدا سے دُور رکھنے کا ذریعہ ہے

صوفیاء نے سلوک کی منازل طے کرانے کے لئے تین درجے مقرر کر رکھے ہیں۔ (۱) فنافی الشیخ (۲) فنافی الرسول (۳) فنافی اللہ۔ فنافی الشیخ کے درجہ کی ابتداء "تصورِ شیخ" سے کرائی جاتی ہے۔ تصورِ شیخ سے مراد صرف پیر کی "غیر مشروط اطاعت" ہی نہیں ہوتی، بلکہ اسے یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ اس کا پیر ہر وقت اس کے حالات سے باخبر رہتا ہے اور بوقت ضرورت اس کی مدد کو پہنچتا ہے۔ اس عقیدہ کو مرید کے ذہن میں راسخ کرنے کے لئے اسے یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ ہر وقت پیر کی شکل کو اپنے ذہن میں رکھے۔ یہی واہمہ اور مشق بسا اوقات ایک حقیقت بن کر سامنے آنے لگتا ہے۔

مسلمانوں کو صرف حضور اکرم ﷺ کی "غیر مشروط اطاعت" کا پابند کیا گیا ہے، کیونکہ وہ جو

کچھ کہتا ہے اللہ کے حکم سے کہتا ہے، لیکن صوفیاء کی یہ تعلیم مرید اور پیر کو 'عبد اور معبود' کے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔ جس کا حضور اکرم ﷺ یا کسی دوسرے نبی کو بھی حق نہ تھا۔ صوفیاء نے پیری کے فن کو ایک خاص تیکنیک دے کر عوام پر اس طرح مسلط کر دیا ہے کہ کوئی آدمی اس وقت تک خدا کے ہاں رسائی نہیں پا سکتا جب تک باقاعدہ کسی سلسلہ طریقت میں داخل نہ ہو۔ پہلے تصورِ شیخ کی مشق کرے، حتیٰ کہ فنا فی الشیخ ہو جائے، یعنی اسے اپنی ذات کے لئے حاضر ناظر، افعال و کردار اور گفتار کو دیکھنے اور سننے والا سمجھنے لگے۔ تب جا کر یہ منزل ختم ہوتی ہے اور عملاً ہوتا یہ ہے کہ مرید بیچارے تمام عمر فنا فی الشیخ کی منزل میں ہی غوطے کھاتے کھاتے ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ گویا اللہ اور اس کے رسول سے بیگانہ کر کے اپنا غلام بنانے کا کارگر اور کامیاب حربہ ہے۔ یہ کوئی مبالغہ آرائی کی بات نہیں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کا درج ذیل اقتباس اس حقیقت پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے:

"ان (صوفیاء) کے طرق میں بعض ایسی چیزیں، جو منصوص میں وارد نہیں، شرطِ طریق ہیں اور شرط بھی اعظم واہم، چنانچہ تصورِ شیخ باوجودیکہ صریحاً نص میں وارد نہیں اور پھر خطرناک بھی ہے اور بعض کو اس میں غلو بھی ہو گیا ہے اور اسی خطرہ و غلو کے سبب مولانا شہیدؒ اس کو منع فرماتے ہیں مگر باوجود اس کے اکابر نقشبندیہ اس کو مقصود فرماتے ہیں۔ چنانچہ انوار العارفین ذکر تصورِ شیخ میں کنز الہدایہ بحوالہ مکتوبات مجدد صاحب کا ارشاد نقل ہے کہ:

"ذکر تنہا بے رابطہ و بے فنا فی الشیخ موصل نیست ذکر ہر چند از اسباب وصول است لیکن غالباً مشروط برابطہ محبت و فنا فی الشیخ است۔" (تجدید تصوف و سلوک، ص ۴۴۲)

(ترجمہ) "فنا فی الشیخ ہونے کے بغیر تنہا ذکر سے خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی، اگرچہ ذکر بھی رسائی کا ایک سبب ہے، لیکن اس کی غالب شرط (پیر سے) محبت کا تعلق اور اس میں فنا ہونا ہے۔"

اقتباس بالا سے صاف واضح ہے کہ (۱) تصورِ شیخ کے عقیدہ کا قرآن و سنت میں کہیں سراغ نہیں ملتا۔ (۲) یہ عقیدہ انتہائی خطرناک اور گمراہ کن ہے۔ (۳) صوفیاء اور خصوصاً نقشبندیوں سے اسے اللہ کی رسائی کا سب سے بڑی اور اہم شرط قرار دیا گیا ہے۔

تصورِ شیخ اور بزرگوں کے اقوال

اب دیکھئے مولانا رومؒ فلسفہ تصورِ ثلاثہ کی اہمیت کے لئے بیان فرما رہے ہیں:

پیرِ کامل صورتِ ظلِّ الٰہ یعنی دیدِ پیر دیدِ کبریا !
ہر کہ پیر و ذاتِ اورا یک نہ دید نے مرید و نے مرید و نے مرید

یعنی پیرِ کامل فنافی الوجود سے فنافی الشیخ کا مقام عطا کرتا ہے اور فنافی الشیخ سے نکال کر فنافی الرسول کا مرتبہ عطا کرتا ہے۔ بعدازاں فنافی اللہ کے مقام میں منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ سب مقام پیرِ مرشد کے طفیل ہی حاصل ہوتے ہیں، جو مرید ایسا نہیں سمجھتا وہ قطعاً مرید نہیں ہے۔" (ریاض السالکین، ص ۲۲۵)

اور معین الدین اجمیریؒ نے فرمایا کہ: "اگر روزِ قیامت خدا تعالیٰ کا جمال میرے پیر کی صورت میں ہوگا، تو دیکھوں گا، ورنہ اس کی طرف منہ بھی نہ کروں گا۔" (ریاض السالکین، ص ۲۳۱)

اور بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے فرمایا کہ: "اگر قیامت کے دن خدا تعالیٰ میرے پیر کی صورت کے سوا کسی دوسری صورت میں اپنا جمال یا کمال دکھائے گا، تو میں اس طرف آنکھ بھی نہ کھولوں گا۔" (اقتباس الانوار، ص ۲۹۰، مطبوعہ مجتبائی دہلی بحوالہ ایضاً)

اور شیخ محمد صادق نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کا دیدار بھی اگر پیرِ دستگیر کی صورت میں ہوا، تو دیکھوں گا۔ ورنہ اسے بالکل نہ چاہوں گا۔" (ریاض السالکین، ص ۲۳۱)

دیکھا آپ نے تصورِ شیخ کا یہ فارمولا کیسے شاندار نتائج پیدا کر کے مرید کو بس شیخ ہی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔

اندھی عقیدت

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ عقیدہ کس طرح ایک طرف تو پیر کو خدائی تقدس عطا کرتا ہے اور دوسری طرف مرید کو اندھی عقیدت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ حکیم فیض عالم صدیقی مصنف کتاب "اختلافِ اُمت کا المیہ" کے صفحہ ۹۴ پر لکھتے ہیں:

"میں آپ کے سامنے اپنا ایک واقعہ حلفیہ پیش کرتا ہوں۔ چند روز ہوتے میرے پاس ایک عزیز رشتہ دار آئے، جو شدت گزشتہ پیری ہیں، میں نے باتوں باتوں میں کہا کہ "فلاں پیر صاحب کے متعلق اگر چار عاقل بالغ گواہ پیش کر دوں، جنہوں نے انہیں زنا کا ارتکاب کرتے دیکھا ہو، تو پھر ان کے متعلق کیا کہو گے؟" کہنے لگے: "یہ بھی کوئی فقیری کا راز ہوگا، جو ہماری سمجھ میں نہ آتا ہوگا۔" پھر ایک پیر صاحب کی شراب خوری اور بھنگ نوشی کا ذکر کیا، تو کہنے لگے: "بھائی جان! یہ باتیں ہماری سمجھ سے باہر ہیں وہ بہت بڑے ولی ہیں۔"

راہِ سلوک کی منازل طے کرنے کے لئے

جنید بغدادی کے مُرید کا دریا میں غوطے لگانے کی وجہ

تصورِ شیخ کے عقیدہ کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جس کے راوی امام اہلسنّت احمد رضا خاں مُجدّد مائۃ حاضرہ ہیں اور غالباً "حدیقہ ندیہ" کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادی یا اللہ یا اللہ کہہ کر دریا عبور کر گئے۔ لیکن مرید کو یہ کہا کہ یا جنید یا جنید کہہ کر چلا آ۔ پھر شیطان لعین نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ کیوں نہ میں بھی یا اللہ کہوں، جیسا کہ پیر صاحب کہتے ہیں۔ یا اللہ کہنے کی دیر تھی کہ ڈوبنے لگا۔ پھر جنید کو پکارا، جنید نے فرمایا: "وہی کہہ یا جنید یا جنید۔" جب پار لگا، تو پوچھا: "حضرت! یہ کیا بات ہے؟" فرمایا: "اے نادان! ابھی تو جنید تک تو پہنچا نہیں اور اللہ تک رسائی کی ہوس ہے۔" (ملفوظات احمد رضا خاں بریلوی، ص ۱۱۷)

یہ ہیں اس تصورِ شیخ جیسی بدعت اور لعنت کے کرشمے۔ اللہ تعالےٰ نے تو فرمایا کہ "جب بھی مجھے کوئی پکارے میں اس کے قریب ہوں، پکارنے والے کی دُعا اور جواب دیتا ہوں۔" پھر یہ بھی کہا ہے کہ: "میں تمہاری رگِ جان سے بھی قریب ہوں۔" اور یہ لوگ ایسے افسانے تراش کر لوگوں کو شرک میں مبتلا کرتے اور اللہ سے دُور رکھتے ہیں اور اپنی پرستش کرواتے ہیں۔ طرفہ تماشا یہ کہ اگر اس بیچارے کے ضمیر سے حق کی آواز اٹھی بھی، تو اسے شیطانِ لعین کی آواز قرار دے کر آگے ایسا افسانہ جوڑا کہ وہ واقعی شیطانِ لعین کی ہی آواز معلوم ہونے لگے۔

۷۔ حضرتِ خضر علیہ السلام کی شخصیت

حضرت خضر علیہ السلام کون ہیں؟

حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ہم پہلے تفصیلی بحث کر آئے ہیں کہ ان کی شخصیت آج تک مختلف فیہ رہی ہے، کہ وہ نبی تھے یا ولی، کوئی جن یا کوئی فرشتہ تھے۔ جو ندابیر مشیتِ الٰہی پر مامور تھے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُن کی لغزش کی وجہ سے عتاب فرماتے ہوئے بغرضِ تادیب حضرت خضر علیہ السلام کے پاس بھیجا تھا، لیکن ہمارے صوفیائے نے ان کو ولی قرار دے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے افضل ثابت کرنے کی کوشش کی اور یہ کوششیں اُس وقت شروع ہوئیں جب اُن میں

یہ عقیدہ رائج ہوا کہ "ولایت نبوت سے افضل ہے۔" پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ لوگ حضرت خضر علیہ السلام کو ایک زندہ وجاوید ہستی تسلیم کر کے اس سے ہر وقت رہبری کے خواہاں رہتے ہیں جب تک حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات اور رہبری حاصل نہ ہو، ولایت مکمل نہیں ہوتی۔ پھر حضرت خضر کی فرضی شخصیت کے متعلق کئی طرح کے افسانے تراشے گئے، جو اتنے عام ہوتے کہ شعر و ادب میں بھی داخل ہو گئے۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

تہیدستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل — کہ خضر از آبِ حیوان تشنہ می آرد سکندر را

ترجمہ: بے نصیب لوگوں کو کامل پیر سے کیا فائدہ؟ خضر بھی تو سکندر بادشاہ کو زندگانی کے چشمہ سے پیاسا ہی واپس لے آیا تھا۔

اس فرضی قصہ کے متعلق مشہور متصوف اور مصنف "انسان کامل" عبدالکریم جیلی کی تحقیق یہ ہے کہ آبِ حیوان فی الواقعہ ایک ایسا چشمہ ہے جس کے متعلق افلاطون نے یہ بات دریافت کی تھی کہ جو اس چشمہ کا پانی پی لے وہ مرتا نہیں۔ افلاطون خود اس مقام پر پہنچا اور اس نے اس سے پانی پی لیا، لہٰذا وہ ایک پہاڑ میں جس کا نام دراوند ہے، اب تک زندہ ہے۔ افلاطون کا شاگرد ارسطو تھا، جو سکندر کا استاد تھا، جو لشکر سکندر نے ترتیب دیا اس میں حضرت خضر علیہ السلام بھی موجود تھے۔ مگر حضرت خضر علیہ السلام باوجود سکندر کی آرزو کے اسے جُل دے گئے اور اس چشمہ کا حال پوشیدہ رکھا۔ حالانکہ اس چشمہ کا حال حضرت خضر علیہ السلام کو معلوم تھا۔ وغیر ذلک من الخرافات۔ (انسان کامل، ص ۲۰۰)

غالب اسی خیال کی تائید میں کہتا ہے:

کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی؟

یہ حضرت خضر علیہ السلام کے فیض سے متعلق شعر تھا اور اب دوسرا شعر ان کی رہبری و راہنمائی اور ہدایت سے تعلق رکھتا ہے۔ اقبال کہتا ہے ؎

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی — رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اور جن صاحب نصیب لوگوں کو حضرت خضر علیہ السلام کی رہنمائی یا ملاقات حاصل ہو جائے، تو اس کی اولیائی میں کیا شک ہو سکتا ہے اب جن خوش قسمت بزرگوں کو یہ سعادت ملی۔ ان کے حالات سنیئے

حضرت خضر سے ملاقات

(۱) حضرت محمد علی ترمذی کا ذکر چل رہا ہے۔
"ایک دن آپ قبرستان میں ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے اپنی بدقسمتی پر آنسو بہا رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ میرے ساتھی تھوڑی مدت کے بعد علم حاصل کر کے آئیں گے اور عزت پائیں گے، میں یونہی گنوار رہوں گا۔ ناگاہ ایک طرف سے ایک پیر مرد نورانی شکل ظاہر ہوئے اور کہنے لگے: "میاں تم علم حاصل کرنا چاہتے ہو؟" آپ نے کہا: "ہاں! یہی آرزو رکھتا ہوں۔" انہوں نے کہا: "تو میں ہر روز یہیں آکر علم پڑھایا کروں گا۔" یہ سن کر آپ خوش ہوئے اور تین برس تک ان سے علم پڑھتے رہے۔ جب فارغ ہوئے، تو انہوں نے پوچھا: "اے عزیز! کیا تم نے سمجھا کہ یہ دولتِ علم تمہیں کس وجہ سے حاصل ہوئی؟" آپ نے نفی میں جواب دیا، تو بولے: "میں اللہ کا بندہ خضر ہوں۔ تم نے اپنی والدہ کو آزردہ نہ کیا تھا، یہ صرف اس کا صلہ ہے کہ میں تمہاری تعلیم پر مقرر ہوا۔" (مقربانِ حق، ص ۱۶۸)

اب دیکھئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو اللہ نے حضرت خضر علیہ السلام کے پاس خود جانے کو کہا تھا لیکن ان بزرگ کے پاس حضرت خضر علیہ السلام خود پہنچ کر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ پھر جو حضرت خضر علیہ السلام کے پاس علم ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو تین واقعات دیکھ کر ہی فیصلہ کر لیا کہ یہ علم میرے بس کا روگ نہیں، لیکن یہ بزرگ متواتر تین سال ان سے علم حاصل کرتے رہے اور انہیں حضرت خضر علیہ السلام کا اس قسم کا علم ہضم ہوتا رہا۔

۲۔ ابوبکر وراق کا ذکر چل رہا ہے۔ "نقل ہے کہ آپ کو مدت سے آرزو تھی کہ حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت ہو۔ ہر روز قبرستان جاتے اور راستے میں ایک جزو قرآن کریم کا پڑھتے۔ ایک دن گھر سے نکلے ہی تھے کہ ایک نورانی شکل بزرگ سے ملاقات ہو گئی، جو کہنے لگے کہ اگر آپ پسند کریں، تو میں بھی تھوڑا سا وقت آپ کے ساتھ گزار لوں۔" آپ نے اجازت دے دی۔ دونوں قبرستان گئے۔ راہ میں آپ اس بزرگ سے عمدہ عمدہ باتیں کرتے رہے۔ جب وہ جانے لگے، تو انہوں نے کہا: "آپ نے مجھے پہچانا کہ میں کون ہوں؟ اے وراق! میں خضر ہوں، تو مدت سے چاہتا تھا کہ مجھ سے ملے۔ آج میں تیرا مصاحب ہوا، لیکن قرآن کریم کا جو جزو تو راستے میں پڑھا کرتا تھا میری باتوں کے سبب اس کی سعادت سے محروم رہا۔ اب سمجھ لے کہ جب صحبتِ خضر سے یہ نقصان ہوا، تو دوسرے لوگوں کی صحبت سے کتنا نقصان ہو

ؔ حضرت خضر علیہ السلام کی تعلیم کیسی تھی۔ یہ "اولیاء اللہ کی اقسام" کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

گا بس تنہائی سب سے اچھی چیز ہے۔" (مقربانِ حق، ص ۲۰۷)

معلوم ہوتا ہے کہ (۱) حضرت خضر علیہ السلام اکثر قبرستان میں ہی ملتے ہیں، نورانی شکل میں (۲) وہ اپنا تعارف خود کرواتے ہیں تاکہ شبہ نہ رہے۔ (۳) ان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص میری ملاقات کا مشتاق ہے۔

صوفیاء اور حضرت خضر علیہ السلام کی تاریخ

سلسلہ چشت میں غالباً خواجہ حذیفہ المرعشی (م ۲۰۲ھ) وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے ۱۶ سال کی عمر میں علومِ ظاہریہ کی تکمیل فرمائی۔ اس کے بعد حضرت خضر علیہ السلام کی رہنمائی سے سلطان ابراہیم بن ادھم (م ۱۶۲ھ) تک رسائی کی۔ (تاریخ چشتیت، مولانا زکریا، ص ۱۴۵)

پھر ان کے بعد دوسرے بزرگ، علو ممشاد دینوری (م ۲۹۷ھ) ہیں، جو "بیعت سے قبل حضرت خضر علیہ السلام کی صحبت میں تھے اور ان ہی کے اشارہ سے بیعت ہوئی تھی۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۴۹)

پیرانِ پیر سے پہلی ملاقات

"غوث الاعظم قدس سرہ سے منقول ہے کہ ابتدائے حال میں میں نے خدا تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ "میں اس وقت تک نہ کھاؤں گا جب تک وہ خود نہ کھلائیں پلائیں گے اور میرے منہ میں لقمہ نہ رکھیں گے۔" چالیس دن بعد میرے پاس ایک شیخ آیا اور میرے پاس کھانا رکھ کر چلا گیا۔ بھوک کی شدت کے باوجود میں نے اپنے عہد کو یاد رکھتے ہوئے اس کھانے کی طرف توجہ نہ دی۔ اچانک میں نے آواز سنی، کوئی زور زور سے الجوع الجوع (بھوک، بھوک) پکار رہا ہے۔ اتنے میں شیخ ابوسعید اُدھر سے گزرے اور پوچھا: "عبدالقادر! یہ آواز کیسی ہے؟" میں نے کہا: "یہ میرے نفس کا اضطراب ہے مگر رُوح اپنی جگہ پر قائم اور مشاہدہ انوارِ خداوندی میں محو ہے۔" فرمایا میرے گھر چلو، عرض کی اس جگہ سے باہر قدم نہ رکھوں گا۔ وہ چلے گئے، تو ابوالعباس خضر تشریف لائے۔ فرمایا: "اٹھو ابوسعید کی خدمت میں جاؤ" میں اُن کی طرف چل پڑا، انہوں نے مجھے دیکھ کر فرمایا: "اے عبدالقادر! جو کچھ میں نے کہا تھا وہ کافی نہ تھا۔ تو نے خضر کو خواہ مخواہ تکلیف دی۔" پھر آپ مجھے مکان کے اندر لے گئے، کھانا تیار تھا، وہ لقمہ لقمہ میرے منہ میں ڈالتے جاتے تھے، یہاں تک کہ میں اچھی طرح سیر ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے خرقہ پہنایا اور میں ان کی صحبت

میں رہنے لگا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۵۰)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ حضرت خضر علیہ السلام کی کنیت ابو العباس ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا کوئی لڑکا عباس ہو، جس کے نام پر آپ نے یہ کنیت پسند فرمائی ہو۔

۲۔ اولیاء اللہ کے ہاں خضر کی بات کی اس قدر وقعت ہے کہ وہ اپنے خدا سے کئے ہوئے عہد کا بھی پاس نہیں کرتے اور اُن کا حکم مانتے ہیں۔

۳۔ دو ہی باتیں ممکن ہیں، یا تو یہ تسلیم کیا جائے کہ ابوسعید کا ہاتھ جس سے وہ لقمہ ڈالتے تھے، دراصل اللہ ہی کا ہاتھ تھا یا یہ کہ پیرانِ پیر نے اپنے عہد کی خلاف ورزی کی۔

حضرت خضر علیہ السلام کی اضافی ڈیوٹی

قادری صاحب اپنی کتاب "سیرۃ غوث الثقلین" کے صفحہ ۹۷ پر فرماتے ہیں کہ:

"ایک دن حضرت غوث اعظم منبر پر علوم و معارف بیان فرما رہے تھے۔ اثنائے وعظ میں اُٹھ کر چند قدم ہوا میں چلے اور زبان مبارک سے فرمایا یَا اِسْرَائِیْلِیُّ قِفْ فَاسْمَعْ کَلَامَ الْمُحَمَّدِیِّ یعنی اے اسرائیلی ٹھہر جاؤ اور محمدی کا کلام سنو۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا واقعہ تھا، تو آپ نے ارشاد فرمایا: "کہ حضرت خضر علیہ السلام یہاں سے گزر رہے تھے، تو میں اُن کو اپنا کلام سنانے کے لئے ٹھہرانے گیا تھا، تو آپ ٹھہر گئے۔" (مکتوبات الف ثانی نمبر ۵۵، ج ۲۔ بہجۃ الاسرار، ص ۴۷۔ اخبار الاخیار فارسی، ص ۱۹)

اب دیکھئے کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام بھی کیسی پُراسرار شخصیت ہیں۔ یہ ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مجمع البحرین پر انسانی صورت میں ملے تھے۔ چوتھی صدی قبل مسیح سکندر رومی کے لشکر میں بصورت انسانی شامل ہوئے، جو کہ کافر تھا۔ اور اسے آبِ حیات کے چشمہ سے پانی پینے سے بے نیل و مرام ہی واپس لے آئے۔ محمد علی صاحب ترمذی اور ابوبکر وراق کو قبرستان میں بصورتِ انسانی ملتے ہیں کسی کو وقوفِ عددی کی تعلیم دیتے ہیں اور کسی کو مکتب چھوڑ بھی جاتے ہیں۔ پھر چھٹی صدی ہجری میں عبدالقادر جیلانی کو بصورتِ رجال الغیب ہوا میں اڑتے ہوئے ملتے ہیں اور وہ بھی زمین سے صرف چند قدم کے فاصلے پر۔ عبدالقادر جیلانی چند قدم ہوا میں چل کر اور انہیں ٹھہرا کر اپنا کلام سنا کے چھوڑتے ہیں

پھر تو حضرت خضر علیہ السلام آپ کے ایسے مُرید ہوئے کہ انہیں کے ہو رہے۔

اب اُن کی ڈیوٹی یہ تھی کہ ایک تو خود اکثر اوقات آپ کی مجلس شریف میں شامل ہوتے اور مشائخ زمانہ میں سے جس سے بھی حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات ہوتی، تو اس کو آپ کی مجلس میں حاضر ہونے کی تاکید فرماتے۔ (سیرۃ غوث الثقلین، ص ۴۷) اور دوسری یہ کہ جب کوئی ولی یا ابدال فوت ہو جاتا، تو آپ اس کی خبر عبدالقادر جیلانی کو دیتے۔ پھر خواہ کسی چور یا کافر کو عبدالقادر جیلانی ابدال بنانے کا ارادہ کرتے، حضرت خضر علیہ السلام اس متعلقہ شخص کو اس کے علاقہ سے اٹھا کر آپ کے پیش کر دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم اس کتاب میں مناسب مقام پر دو واقعات تذکرہ نگاروں کے حوالوں سے پیش کر چکے ہیں۔

قطبُ الدّین بختیار کاکی (م ۶۳۴ھ) کو معلم کے پاس لے جانا

۱½ سال کی عمر میں آپ کے والد فوت ہو گئے۔ جب پانچ سال کے ہوئے، تو والدہ نے اپنے کسی ہمسایہ کو کہا کہ آپ کو کسی معلم کے پاس چھوڑ آئیں۔ راستہ میں ایک بزرگ ملے، اُنہوں نے دریافت کیا کہ اس لڑکے کو کہاں لے جاتے ہو؛ اور یہ جواب سن کر کہ تعلیم کے لئے مکتب لے جا رہا ہوں، فرمایا کہ میرے حوالہ کر دو، میں ایک معلم کے پاس بٹھا دوں گا۔ ہمسایہ نے ان کے حوالہ کر دیا، وہ بزرگ خواجہ ابو حفص اوشی کے پاس لے گئے اور فرمایا: "احکم الحاکمین کا حکم ہے اس لڑکے کو توجہ سے پڑھاؤ۔" اور یہ فرما کر چلے گئے۔ استاد نے دستِ شفقت پھیر کر شاگرد سے فرمایا: "بڑے صاحبِ نصیب ہو کہ حضرت خضر علیہ السلام تمہیں میرے حوالہ فرما گئے ہیں۔" (تاریخ مشائخ چشتیت، مولانا زکریا، ص ۱۷۱)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ قطبُ الدین کی تعلیم کے لئے اللہ تعالےٰ نے جو ابو حفص اوشی کو منتخب کیا اور حضرت خضر علیہ السلام کو استاد تک پہنچانے کا حکم دیا تھا اور نیز یہ بھی کہ ابو حفص اوشی پہلے سے ہی حضرت خضر کو جانتے تھے۔ اب یہ اللہ احکم الحاکمین کا حکم کس طرح پورا ہوا ؟ یہ بھی شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی زبانی سنیئے:

"آپ (قطب الدین) حضرت شیخ (ابو حفص اوشی) کی خدمت میں علمِ ظاہری کی تحصیل کے لئے حاضر ہوئے۔ حضرت نے تختی لے کر کچھ تحریر فرمانے کا ارادہ کیا ہی تھا، کہ ندائے غیبی سے معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب کی تحصیل ظاہری قاضی حمید الدین ناگوری کے حوالہ ہے۔"

گویا اس ندائے غیبی نے اللہ احکم الحاکمین کے ارشاد اور حضرت خضر ؑ کی تکلیف فرمائی سب پر پانی پھیر کر قطب الدین کا اُستاد ہی بدل دیا۔ یہ ہے ہاتفِ غیبی اور حضرت خضر ؑ کی حقیقت، جن سے ان اولیاء اللہ کو اکثر سابقہ پڑتا رہتا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام سے ایک روایت

امام اہل سنت احمد رضا خاں فرماتے ہیں:۔

"حضرت خضر" علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو شخص اشھد ان محمدا رسول اللہ سن کر اپنے انگوٹھوں کو چومے گا۔ اور پھر اپنی آنکھوں پر لگائے گا۔ اس کی آنکھیں کبھی نہ دکھیں گی۔

(فتاوٰی رضویہ ص ۳۸۲ بحوالہ بریلویت ص ۲۳۹)

امام اہل سنت نے اس روایت کو امام سخاوی سے نقل کیا ہے جبکہ امام سخاوی خود یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "اس روایت کو کسی صوفی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے اس کے راوی محدثین کے نزدیک مجہول اور غیر معروف ہیں۔ نیز حضرت خضرؑ سے کس نے سنا اس کا کوئی ذکر نہیں ہے"

گویا جس روایت کو امام سخاوی درج کر کے اسے مردود قرار دے رہے ہیں۔ امام اہل سنت اس بدعت کو رواج دینے کے لیے اسی مردود روایت سے استدلال فرما رہے ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام کی نماز

ہمارے اکثر صوفیاء اور اولیاء قبرستانوں اور جنگلوں میں انہیں تلاش کرتے اور ان سے فیضیاب ہونے کو بہت بڑی سعادت سمجھتے ہیں اور ان سے ملاقات کے لئے بے قرار رہتے ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے اوراد وظائف کے علاوہ ایک مخصوص قسم کی نماز بھی وضع کی گئی ہے۔ اب اس نمازِ خضر کا طریقہ صادق فرغانی صاحب سے سنیے۔ تلقین مرشدِ کامل کے صفحہ ۲۴۰ پر رقمطراز ہیں:

"اس کے بعد اگر ہو سکے تو حضرت خضر ؑ کی نماز کی بارہ رکعتیں پانچ سلاموں کے ساتھ پڑھے۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد ایک مرتبہ سورۂ فیل، دوسری میں لایلاف، تیسری میں ماعون، چوتھی میں کوثر، پانچویں میں کافرون، چھٹی میں نصر، ساتویں میں تبت، آٹھویں میں اخلاص، نویں میں فلق، دسویں میں سورۃ ناس پڑھے۔ (گیارھویں بارھویں کے متعلق کچھ ارشاد نہیں ہوا) جو شخص اس نماز کو ہمیشہ پڑھے، اس کو حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات حاصل ہو جاتی ہے۔"

غور فرمایا آپ نے، نماز جیسی عبادت بھی غیر اللہ کے لئے پڑھنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ اس سے

زیادہ صریح شرک بھی کوئی ہو سکتا ہے۔ پہلے اپنے ایمان کی خیر منائیے، پھر حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات فرمائیے۔ اور ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں، کہ اس طرح جو صورت آپ سے ملاقات فرمائے گی وہ شیطان ہی ہوگا، جو اپنے آپ کو خضر ظاہر کرے گا۔ کچھ بھی ہو، ملاقات تو ہو ہی جائے گی۔ اور اس پُراسرار ہستی کے حالات سے آپ مطلع ہو جائیں گے اور اس سے "فیض" بھی حاصل کر سکیں گے۔ لیکن یاد رکھئے! حضرت خضر علیہ السلام ہرگز زندہ نہیں ہیں۔ وہ فوت ہو چکے ہیں اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ دورِ نبوی علیہ السلام میں زندہ ہوتے، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور ملتے، جہاد میں شرکت فرماتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملاقات کرتے مگر کسی کمزور سی روایت سے بھی اس قسم کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

حضرت خضر علیہ السلام کی ابدی زندگی کا عقیدہ

دائرۃ المعارف الاسلامیہ
مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی

زیرِ عنوان طریقت، ج ۱۲، ص ۴۶۰ پر درج ہے کہ:

"راسخ العقیدہ فقہاء نے اہلِ تصوف کے استناد الہامی (روحانی) کے خلاف بھی آواز بلند کی ہے۔ جس کی بنا پر سلسلہ تصوف کو ایک ایسی مقدس ہستی کے مظاہر سے فیضان حاصل ہوتا ہے، جو پُراسرار اور غیر فانی ہے یعنی الخضر، جن کی ہادیٔ طریقہ کی حیثیت سے سب سلسلے توقیر و تعظیم کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رہنما اور صوفی کی روح کو حقیقتِ علیا سے آشنا کرانے کے اہل ہیں۔ یہ عقیدہ غالباً تصوف کی کسی مستند کتاب میں نہیں پایا جاتا۔" (دائرۃ المعارف، بحوالہ بالا)

پھر اسی دائرۃ المعارف میں خواجہ خضر کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ:

"ہندوستان میں انہیں کنوؤں اور چشموں کی روح کا روپ سمجھا جاتا ہے۔ دریائے سندھ کے آس پاس انہیں دریا کا اوتار سمجھا جاتا ہے۔ ایک شاعر نے حضرت خضر علیہ السلام کا نام میکائیل کے نام کی جگہ بطور ایک بڑے فرشتہ کے لیا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام کی خانقاہ سندھ کے ایک جزیرے میں بھکر کے پاس ہے جہاں ہر مذہب کے عقیدت مند زیارت کو جاتے ہیں۔" (دائرۃ المعارف، ج ۹، ص ۲۲)

۸۔ رجال الغیب سے استفادہ

رجال الغیب کی تسخیر

ہم پہلے باب میں بیان کر آتے ہیں کہ ریاضت و مجاہدہ اور چلہ کشیوں کے ذریعہ انسان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ عالم

ارواح میں بے شمار قسم کی رُوحیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً فرشتے، جن، فوت شدہ انسانوں کی نیک اور بد رُوحیں شیطانی اور خبیث رُوحیں سب اس عالم میں پائی جاتی ہیں۔ انسان نے اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق کئی قسم کے جنتر منتر اوراد وظائف ان روحوں کو قابو کرنے کے لئے ایجاد کر لئے اور ان کو مسخر کر کے کئی قسم کی شعبدہ بازیاں دکھانا شروع کیں۔ ایسی رُوحوں کو عام طور پر رجال الغیب کے نام سے پکارا جاتا ہے اور دورِ نبوی ﷺ میں اِن رُوحوں سے کام لینے والے تین گروہ تھے۔ (۱) رہبان (۲) کاہن اور (۳) جادوگر۔ اور شریعت نے ایسے سب علوم و فنون کو کفر قرار دیا ہے۔

پھر آپ نے کئی ایسے فقیروں اور درویشوں کو بھی دیکھا ہوگا جو کسی ویرانے یا لبِ دریا ڈیرہ ڈال کر عموماً رات کو چلّہ کشی کرتے۔ اپنے گرد حصار کھینچتے اور کوئی جنتر منتر یا قرآن کی آیت یا دوسرے اوراد وظائف پڑھتے ہیں اور مقررہ چلّہ پورا کرتے ہیں۔ رات کو اس وظیفہ کی مقررہ تعداد کے پڑھنے کے دوران کئی قسم کی بد رُوحیں یا جنّ وغیرہ انہیں ڈرانے دھمکاتے ہیں۔ اگر چلّہ کاٹنے والا اِن سے نہ ڈرے اور چلّہ پُورا کرے، تو وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور ان خبیث رُوحوں کا حاکم بن جاتا ہے۔ ورنہ دورانِ چلّہ یہ رُوحیں اسے سخت اذیتیں پہنچاتی ہیں اور بعض دفعہ اسے ہلاک بھی کر دیتی ہیں۔ اب جو شخص اس چلّہ میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کو پڑے ہوئے جن نکال بھی سکتا ہے۔ کسی چنگے بھلے انسان پر جن ڈال بھی سکتا ہے۔ لوگوں کو تعویذوں اور جنتروں کے ذریعے تکلیفیں بھی پہنچا سکتا ہے اور اُن رُوحوں کی وساطت سے غیب کی خبریں بھی دیتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل اس کاروبار کے پیچھے پڑ گئے تھے جسے اللہ نے کُفر قرار دیا۔ اور یہی حال دورِ نبوی ﷺ کے رہبانوں، کاہنوں اور ساحروں کا تھا۔

آپ حیران ہوں گے کہ اس طبقہ صوفیا میں سے اکثر حضرات کا کاروبار بھی اسی قسم کا ہوتا ہے۔ ان کے کشفِ قبور کے سلسلے، ریاضات، مجاہدات، چلّہ کشیاں وغیرہ بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں اور ان کے ثمرات (عوام کی زبان میں کرامات) بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ اب یہ مسئلہ چونکہ بہت نازک ہے۔ اس لئے ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہیں گے۔ صرف ان اولیاء اللہ کے تذکرہ نگاروں کی عبارت پیش کر دیں گے۔ نتیجہ آپ خود نکال لیجئے گا۔

پیران پیر کی ریاضت

اس سلسلہ میں ہم طبقہ صوفیاء کی آفتاب و ماہتاب ہستی شیخ عبدالقادرؒ کے واقعات پیش کریں گے۔

اور ان کے سیرۃ نگار، محقق ضیاء اللہ قادری کی کتاب سیرۃ غوث الثقلین سے اقتباس پیش کریں گے، یہ بھی خیال رہے کہ اس کتاب کے ابتداء میں 'نو' ایسے مشہور مشائخ عظام وعلمائے کرام کی تقاریظ بھی درج کی گئی ہیں جنہوں نے اس کتاب کو ایک تحقیقی کتاب قرار دے کر بہ نظر استحصان خامہ فرسائی فرمائی ہے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ عبدالقادر جیلانیؒ کو غوث الثقلین کہا جاتا ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ثقلین سے مراد انسان اور جن ہیں نہ کہ انسان اور فرشتے یا فوت شدہ انسانوں کی روحیں۔ چنانچہ قادری صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۸ پر ایک عنوان "جنوں پر حکومت" قائم کر کے اس اشتباہ کو دور کر دیا ہے۔ آپ کو یہ جنات پر حکومت کیسے ملی۔ اس کے متعلق قادری صاحب "سیرت غوث الثقلین" کے صفحہ ۱۲۰ پر لکھتے ہیں:

"حضرت کو نفسانی خواہشات کے علاوہ شیاطین اور جنات کے ساتھ بھی سخت مقابلہ سے سینہ سپر ہونا پڑا۔" چند ایک واقعات ملاحظہ فرمائیے:

۱ شیخ عثمان الصیرفینی فرماتے ہیں کہ میں نے غوث اعظم کی زبان سے سنا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: "میں شب و روز بیاباں[1] اور ویران جنگلوں میں رہا کرتا تھا، تو میرے پاس شیاطین مسلح ہو کر ہیبتناک صورتوں میں صف بہ صف آتے اور مجھ سے مقابلہ کرتے مجھ پر آگ پھینکتے مگر میں اپنے دل میں بہت زیادہ ہمت اور طاقت محسوس کرتا اور غیب سے کوئی مجھے پکار کر کہتا۔ اے عبدالقادر! اٹھو ان کی طرف بڑھو۔ مقابلہ میں ہم تمہیں ثابت قدم رکھیں گے۔ پھر جب میں ان کی طرف بڑھتا، تو وہ دائیں بائیں یا جدھر سے آتے اسی طرف بھاگ جاتے۔ ان میں سے کبھی میرے پاس صرف ایک شخص ہی آتا اور ڈراتا اور مجھے کہتا کہ یہاں سے چلے جاؤ، تو میں اسے ایک طمانچہ مارتا، تو وہ بھاگتا نظر آتا۔ پھر میں لاحول پڑھتا، تو وہ جل کر راکھ ہو جاتا۔" (بہجۃ الاسرار، ص ۸۵، ۸۶۔ قلائد الجواہر، ص ۱۱)

پیرانِ پیر کی مجلس میں رجالُ الغیب کی حاضری

قادری صاحب "سیرۃ غوث الثقلین" کے صفحہ ۹۶ پر رقمطراز ہیں:

۱ "حافظ ابوزرعہ طاہر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں غوث پاک کی مجلس میں حاضر تھا، تو آپ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] ابو السعد حریمی بیان کرتے ہیں کہ غوث پاک نے فرمایا ہے کہ: "میں نے ریاضت و مجاہدہ کا کوئی ایسا طریقہ نہیں چھوڑا جس کو اپنے نفس کے لئے نہ اپنایا ہو اور اس پر قائم نہ رہا ہوں۔ مدتِ مدید تک میں شہر کے ویران اور بے آباد مقامات پر زندگی بسر کرتا رہا۔ نفس کو طرح طرح کی ریاضت اور مشقت میں ڈالا پچیس برس تک عراق کے بیابان جنگلوں میں تنہا پھرتا رہا۔ (سیرۃ غوث الثقلین، ص ۸۳)

"کہ میرا کلام رجالُ الغیب سے ہوتا ہے، جو کوہ قاف سے میری مجلس میں شرکت کے لئے حاضر ہوتے ہیں"
شیخ عبدالقادرؒ کے اس دعوے کی تصدیق اُن کے فرزندِ ارجمند شیخ عبدالرزاق ان الفاظ میں فرماتے ہیں: "حضورؒ کے فرمان کے وقت جب میں نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا، تو ہوا میں رجال الغیب کی صفوں کی صفیں[1] نظر آئیں اور ان سے تمام اُفق بھر پُور تھا اور یہ لوگ سروں کو جھکائے ہوئے غوث پاک کا کلام سُن رہے تھے"
(قلائد الجواہر، ص ۵۸)

۲ "ابوالقاسم حسینی سے مروی ہے کہ میں ایک دن مغرب اور عشاء کے درمیان مدرسہ کی چھت پر شیخ عبدالقادرؒ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ کہ ایک شخص کو ہوا میں اڑتا ہوا دیکھا، اس کا لباس سفید اور نہایت ہی عمدہ عمامہ باندھے ہوئے تھا۔ وہ آپ کی خدمت میں مؤدب بیٹھا اور سلام عرض کر کے چلا گیا، تو میں نے حضرت کے مبارک ہاتھ کو بوسہ دے کر پوچھا: "یہ کون شخص ہے؟" آپ نے فرمایا: "یہ رجال الغیب سے تھا، جو کہ ہمیشہ پھرتے رہتے ہیں۔" (قلائد الجواہر، ص ۶۸)

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ ان جنوں یا رجال الغیب کو مسخر کرنے کا کیا طریقہ ہے اور وہ ان سے کیا کام لیتے تھے اور کیسے؟ چنانچہ قادری صاحب (کی کتاب سیرۃ غوث الثقلین، صفحہ ۹۵ تا ۱۰۵) کی مندرجہ ذیل دو مرویات ملاحظہ فرمایئے، لکھتے ہیں:

جنات سے لڑکی واپس لانا

ابوسعید عبداللہ ۵۳۷ھ کا اپنا ذاتی واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میری فاطمہ نامی غیر شادی شدہ سولہ سالہ لڑکی کو چھت سے کوئی جن اٹھا کر لے گیا۔ میں نے پریشانی کے عالم میں یہ واقعہ غوث الثقلین کو بتایا، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ: "تم بغداد کے محلہ کرخ کی ویران جگہ میں پانچویں ٹیلہ کے قریب جا کر بیٹھ جاؤ اور اپنے ارد گرد زمین پر دائرہ کھینچ لینا اور دائرہ کھینچتے وقت بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ عَلٰی نِیَّۃِ عَبۡدِ الۡقَادِرِ پڑھنا جب آدھی رات گزرے گی، تو تمہارے پاس سے مختلف صورتوں میں جنات گزریں گے، تم ان سے بالکل

---

[1] صوفیاء کی تاریخ میں اور بھی بہت سے ولی اللہ ہیں جنہوں نے جنات کو تسخیر کر رکھا تھا اور ان سے مختلف کام لیتے تھے۔ مثلاً عبدالقدوس گنگوہی، غوث محمد گوالیار، عبداللہ شاہ بلوچ وغیرہ۔ ان کا ذکر آگے چل کر مختلف عنوانات کے تحت آئے گا۔ پیرانِ پیر کی زندگی ہی میں خواجہ مودود چشتی کی وفات پر اُن کی نمازِ جنازہ سب سے پہلے رجالُ الغیب نے ہی پڑھی تھی، پھر آدمیوں نے اور ان کا جنازہ اُٹھنے بھی لگا تھا۔ (تاریخ مشائخ چشت مولانا زکریا، ص ۱۶۰)

نہ ڈرنا۔ پھر صبح کو جنوں کے بادشاہ کا ایک عظیم لشکر کے ساتھ تمہارے پاس سے گزر ہوگا۔ وہ تم سے تمہاری ضرورت دریافت کرے گا، تو اسے صرف یہ کہنا کہ مجھے عبدالقادر نے بھیجا ہے۔ بعدازیں اپنی بیٹی کا واقعہ بیان کرنا۔" چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ جنوں کے بادشاہ نے جب آپ کا نام سنا، تو گھوڑے سے نیچے اتر کر بیٹھ گیا اور پوچھا: حضرت نے تمہیں کس لئے بھیجا ہے۔ میں نے مقصد بیان کیا، تو اس نے اپنے لشکر سے پوچھا کہ اس لڑکی کو کون اٹھا لایا ہے؟ سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ بعدازاں ایک سرکش جن حاضر کیا گیا، جس کے پاس لڑکی تھی۔ جنات نے بتلایا کہ یہ جن چین کے جنات میں سے ہے۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا: "تجھے کیا ہوا کہ قطب وقت کے شہر سے لڑکی اٹھالی؟" جن نے جواب دیا: "کہ یہ مجھے اچھی لگی تھی۔" بادشاہ نے حکم دیا کہ اسی وقت اس کا سر قلم کر دیا جائے، چنانچہ اس کی گردن اڑا دی گئی اور لڑکی میرے حوالے کر دی گئی۔ میں (یعنی ابوسعید عبداللہ راوی) نے کہا کہ مجھے آج سے پہلے جنات کا غوث اعظم کی تابعداری کرنے کا علم نہ تھا۔" (بہجۃ الاسرار، ص ۱۰۷، ۔ قلائد الجواہر، ص ۳۱، ۳۲۔ نزہتہ الخاطر، ص ۶۲۔ تحفہ قادریہ، ص ۶۸۔ سفینہ اولیاء، ص ۶۲،۷۔ خزینۃ الاصفیاء، ج ۱، ص ۹۵)

اور صاحب خزینۃ الاصفیاء نے یہ اضافہ بھی فرمادیا:

"کہ اس جنوں کے بادشاہ نے کہا: "ہم ان (پیران پیر) کے فرمانبردار کیوں نہ ہوں۔ جب وہ گھر میں تمام جنات پر نظر ڈالتے ہیں، تو ان کی ہیبت سے جنات تھرا اٹھتے ہیں۔" (خزینۃ الاصفیاء اردو ترجمہ، ص ۱۵۶)

اب دیکھئے اس واقعہ کو چھ تذکرہ نگاروں نے بیان فرمایا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بڑی معتبر ہے مگر ہمیں تو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ جب ابوسعید عبداللہ راوی کی لڑکی چھت سے غائب ہوئی، تو ابوسعید کو کیسے معلوم ہو گیا کہ اسے ضرور کوئی جن ہی اٹھا کر لے گیا ہے؟ جن تو غیر مرئی مخلوق ہوتے ہیں۔ پھر اگر اسے یہ ظن غالب ہو ہی گیا تھا، تو بھی اس کو اس وقت تک یہ تو معلوم نہ تھا کہ جن بھی شیخ عبدالقادر کی تابعداری کرتے ہیں۔ پھر وہ آپ کے پاس جن کے لڑکی اٹھانے کی شکایت لے کر کیسے چلا گیا؟ تاہم اس واقعہ سے چند اور امور پر روشنی ضرور پڑتی ہے، مثلاً:

۱۔ پیران پیر نے بھی جنوں کو مسخر کرنے اور ان سے کام لینے کے وہی طریقے پیش کئے جو آجکل کے جنوں کے عامل کیا کرتے ہیں۔

۲۔ جن خواہ چین کے ہوں یا بغداد کے سب کا بادشاہ ایک ہی ہوتا ہے۔

۳۔ پیرانِ پیر کے زمانہ میں جنوں میں کافرانہ حکومت اور جنگل کا قانون رائج تھا۔ ورنہ جن بھی شریعت کے مکلف ہیں اور جرم اور اس کی سزا کے شرعی تقاضوں کے پابند ہیں۔

آسیب کے دورے

"ایک دفعہ ایک اصفہانی نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: "میری بیوی کو آسیب ہے اور کثرت سے اس کو دَورے پڑتے ہیں۔ تمام عامل عاجز آگئے ہیں"۔ تو حضرت نے ارشاد فرمایا: "کہ یہ سراندیپ کے بیابان کا خانس نامی جن ہے۔ اب جب تمہاری بیوی کو دَورے کی شکایت ہو، تو اس کے کان میں کہنا "اے خانس! عبدالقادر، جو کہ بغداد شریف میں مقیم ہیں۔ اُن کا فرمان ہے کہ سرکشی نہ کر۔ آج کے بعد اگر آئندہ آیا، تو ہلاک کر دیا جائے گا۔" اس کے بعد وہ شخص اصفہان چلا گیا پھر دس برس بعد آیا، اور عرض کیا کہ آپ کے فرمان کے بعد کبھی میری بیوی کو دَورے کی شکایت نہیں ہوئی۔" (بہجۃ الاسرار، ص ۷۰، قلائد الجواہر ص ۳۲، سفینۃ الاولیاء ص ۳۴، تحفہ قادریہ، ص ۶۸)

یہ واقعہ بھی چار تذکرہ نگاروں نے بیان فرما کر اُس کے نہایت معتبر ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ موجودہ طبی تحقیق تو یہ ہے کہ ایسے دورے شادی شدہ عورت کو نہیں پڑتے بلکہ جوان اور کنواری عورت کو پڑتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اصفہانی خود نامرد ہو۔ تاہم یہ مان لیتے ہیں کہ یہ واقعہ چار شہادتوں کی وجہ سے بالکل درست ہے۔ اب اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ جب جنوں کے دوسرے عامل عاجز آجاتے، تو عبدالقادر جیلانی کے پاس آتے تھے، کیونکہ آپ سب سے اونچے درجہ کے جنات کے عامل تھے۔

مزید تفصیل باب ہفتم، زیرِ عنوان "اولیاء اللہ کا مقابلہ" میں دیکھئے۔

باب (۵)

صُوفیائے مخصُوص مسائل (۲)

۹۔ شیعیّت سے لگاؤ

یہ تو شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے ہاں دینِ طریقت کے مروجہ چاروں سلسلے قادری، نقشبندی، چشتی سُہروردی۔ اور اسی طرح کئی غیر ملکی سلسلے بدوی، رفاعی اور یونسی وغیرہ بھی[1] اپنے شجرۂ طریقت کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جا ملاتے ہیں اور بزعم خود انہیں علومِ باطنی کا علمبردار سمجھتے ہیں۔ عبداللہ بن سبا یہودی نے ظاہر اور باطن کا یہ گمراہ کُن عقیدہ جس چابکدستی سے اسلام میں داخل کیا، وہ بھی ہم پہلے بیان کر آئے ہیں اور یہ بھی کہ ہی عبداللہ بن سبا کے پیروکار شیعانِ علی کے نام سے موسوم ہوئے اور انہی لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ میں حلول کا عقیدہ اپنایا۔ یہ باطنیت کے اثرات اور اسی وجہ سے دینِ طریقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور شیعیت سے لگاؤ کا عقیدہ آج تک پایا جاتا ہے اور اس کی وجہ وہ روایات ہیں جو تذکروں اور ملفوظات میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے چند روایتوں کا ہم یہاں ذکر کریں گے:

۱۔ بارہ اماموں کا فیض

ضیاء اللہ قادری صاحب اپنی کتاب "سیرۃ غوث الثقلین کے صفحہ ۱۰۹ اور صفحہ ۲۲۱ پر رقمطراز ہیں کہ:

"حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ وصال سے قبل اس مقام ولایت کے ملجا و ماویٰ تھے اور جس کسی کو اس طریقہ سے فیض پہنچتا تھا، ان ہی کے توسط اور توسل سے پہنچتا تھا۔ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا انتقال ہو گیا، تو یہ بلند درجہ کا منصب حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو بالترتیب حاصل ہوا۔ ان کے بعد بالترتیب بارہ اماموں کو پہنچتا رہا اور اس طرح ان بزرگوں کے وصال کے بعد جس کسی

---

[1] فی الحقیقت ان سلسلوں کی تعداد سو سے متجاوز ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے دائرۃ المعارف الاسلامیہ زیرِ عنوان طریقت۔

کو فیض پہنچتا ہے۔ ان ہی کے توسل سے پہنچتا ہے اور بعدازاں جتنے بھی اقطاب اور نجبائے وقت ہوئے ہیں۔ اُن کے ملجا و ماویٰ بھی وہی ہوئے ہیں، کیونکہ اطراف کو لامحالہ مرکز سے ملنا ہی پڑتا ہے۔ تاآنکہ نوبت سید عبدالقادر جیلانی تک پہنچی اور یہ مرتبہ آپ کو مِل گیا۔ بارہ اماموں اور حضرت شیخ کے درمیان کوئی شخص اس مرتبہ پر نہیں ہے۔ اب اس راستے سے فیوض و برکات جتنے اقطاب، نجباء اور ولیوں کو پہنچتی ہیں، ان کے ذریعے پہنچتی ہیں، کیونکہ فیض کا یہ مرکز ان کے بغیر کسی کو نہیں ملا۔ اسی جگہ غوث پاک نے فرمایا کہ:

اَفَلَتْ شُمُوسُ الْاَوَّلِیْنَ وَشَمْسُنَا   اَبَدًا عَلٰی اُفُقِ الْعُلٰی لَا تَغْرُبُ

یعنی پہلے ولیوں کے سورج ڈوب گئے اور ہمارا سورج ہمیشہ افق بلند پر رہے گا، جو کبھی نہ ڈوبے گا۔

(المکتوبات، ج ۳، نمبر ۱۲۳)

مجدد الف ثانی کے درج بالا اقتباس میں مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں:

۱ عبدالقادر جیلانی کا شجرہ طریقت آٹھویں امام علی موسیٰ (م ۲۰۳ھ) کے بعد معروف کرخی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ باقی چار اماموں کا کہیں ذکر نہیں۔ (حوالہ کے لئے دیکھئے اسی کتاب سیرت غوث الثقلین کے صفحہ ۱۲۸، ۱۲۹ پر غوث پاک کا شجرہ طریقت و خلافت)

۲ خود مجدد الف ثانی نقشبندی بھی ہیں اور اُن کا شجرہ طریقت چھٹے امام جعفر صادق (م ۱۴۹ھ) سے بایزید بسطامی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ باقی چھ اماموں کا ذکر نہیں ملتا۔ تاہم آپ نے پورے بارہ اماموں کا ذکر کر کے شیعہ حضرات کے فرقہ اثنا عشریہ سے لگاؤ کا پورا ثبوت مہیا فرما دیا ہے۔

۳ اگر مرکز فی الواقعہ یہ بارہ امام ہی ہیں تو طریقت کے سارے کے سارے سلسلے اس مرکز کو چھوڑ گئے ہیں اور چشتی حضرات تو اپنا شجرہ طریقت حضرت علی رضی اللہ عنہ (م ۴۰ھ) سے یک لخت حسن بصری (م ۱۱۰ھ) کی طرف موڑ لیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت حسن بصری کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کو بھی محدثین تسلیم نہیں کرتے۔

۴ اس دُنیائے طریقت میں عبدالقادر جیلانی سے پہلے کے کئی حضرات کے سورج طریقت کے آسمان پر آج تک چمک رہے ہیں۔ مثلاً معروف کرخی، سری سقطی، جنید بغدادی، ابوبکر شبلی، منصور حلاج، حسن بصری، ابراہیم ادھم، بایزید بسطامی وغیرہ وغیرہ، کیا اُن سب کے سورج ڈوب چکے ہیں؟

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پہلے درویش تھے

خواجہ فرید الدین گنج شکر، نعتہ معراج پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"پھر کچھ خرقہ کا ذکر ہونے لگا۔ آپ (خواجہ فرید الدین گنج شکر) نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی شبِ معراج میں خرقہ ملا تھا اور آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بلا کر فرمایا کہ میں نے اپنے پروردگار سے خرقہ پایا ہے۔ مجھ کو حکم ہے کہ میں تم سے اسے کسی کو دوں۔ اب میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ جو شخص تم میں سے جواب باصواب دے گا۔ میں یہ خرقہ اسے دوں گا۔ اول آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ: اے ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ خرقہ تجھ کو دوں، تو تو کیا کرے؟ کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میں صدق اختیار کروں اور خدا کی بندگی کروں اور جو کچھ میرے پاس مال و منال ہو، وہ سب اللہ کی راہ میں دوں۔ پھر آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کہا، میں عدل کروں اور بندگانِ خدا کے ساتھ انصاف کروں اور مظلوموں کی داد دوں۔ پھر آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کہا، میں ایک دوسرے میں اتفاق کی کوشش کروں۔ پھر آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔ انہوں نے کہا، کہ میں پردہ پوشی کروں اور خدا کے بندوں کے عیب چھپاؤں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "اے علی رضی اللہ عنہ لے یہ خرقہ میں نے تجھ کو دیا۔ مجھ کو حضرت ربُّ العزت کا فرمان بھی یہی تھا کہ جو تیرے یاروں سے یہ جواب دے، اسی کو یہ خرقہ دیجیے۔"

"یہ حکایت فرما کر شیخ الاسلام آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور ہائے ہائے کر کے رونے لگے اور بیہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے، تو یہ لفظ مبارک زبان پر لائے کہ 'معلوم شد درویشی پردہ پوشی است' یعنی یہ بات معلوم ہوئی کہ درویشی کے معنی یہی ہیں کہ بندگانِ خدا کی پردہ پوشی کرے۔" (راحۃ القلوب، ملفوظات خواجہ فرید الدین گنج شکر، مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیاء، مترجم غلام احمد بریاں، مطبع چھتائی دہلی، ۱۹۱۶ء، ص ۱۳۸)

اس حکایت سے مندرجہ ذیل باتیں مستفاد ہوتی ہیں۔

۱۔ معراج جیسا مشہور واقعہ تقریباً سب محدثین نے ذکر کیا، لیکن اس عظیم الشان خرقہ کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ یہ شاید اہل باطن پر ہی القا ہوا ہو۔

۲۔ اس امت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے پہلے درویش، پردہ پوش اور خرقہ پوش تھے۔

۳۔ یہ کہ صدق اور صدقہ، عدل و انصاف اور اصلاح بین المسلمین یہ سب اعمال پردہ پوشی کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ پہلے تین خلفاء کے جواب کا خرقہ سے کچھ تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ حضرت علی شاید لوگوں کے عیوب پر یہ خرقہ ڈال کر پردہ پوشی فرما لیتے ہوں۔

۳۔ جُبّہ نبوی کی تاریخ

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ عبدالعزیز قادری مصنف سرچشمہ حیات کے بیان کے مطابق (بحوالہ حقیقت گلزار صابری)

حضور اکرم ﷺ نے پانچ سال قبل از ہجرت پندرہ ممالک کا باطنی انتظام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا تھا۔ اور ارشاد اویسی صاحب مصنف الاولیس کے بیان کے مطابق حضور اکرم ﷺ نے بوقتِ رحلت اپنا جُبّہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی علیہ السلام کے حوالہ کر کے فرمایا: "کہ وہ اسے خواجہ اویس قرنی کو پہنچائیں اور ان سے اُمت کی بخشش کے لئے دُعا کروائیں۔ چنانچہ ان دونوں صحابہ کرام نے بڑی جستجو کے بعد دس سال بعد آخر خواجہ اویس کو آخر تلاش کر ہی لیا اور جُبّہ مبارک ہدیہ کیا اور اُمت کی بخشش کے لئے درخواست کی پھر یہی جُبّہ مبارک حضرت علیؓ کے پاس واپس آگیا۔ یہ کیسے واپس آیا؟ یہ ہمیں معلوم نہیں۔ ہمیں تو یہی معلوم ہے کہ جب فرات میں طغیانی آئی تھی اور کوفہ کے لوگوں نے آپ سے اس بات کی شکایت کی تھی تو حضرت علیؓ نے یہی جُبّہ پہن کر دریائے فرات کے کنارے پہنچ دو رکعت نماز ادا فرمائی تھی (خزینۃ الاصفیاء ص ۶۱) پھر ہوتے ہوتے یہی جُبّہ قلعہ لاہور پہنچ گیا تھا چنانچہ آج کل اسی مقام پر ہے۔ (حدیقۃ الاولیاء ص ۲۴۶)

۴۔ ماتم اور تعزیہ داری کی اہمیت

خواجہ فرید الدین سے متعلق دوسرا واقعہ بھی دورِ نبوی کا ایک تاریخی واقعہ ہے، جو ماتم اور تعزیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ پھر آپ (خواجہ فرید الدین گنج شکر) نے اس موقعہ پر فرمایا کہ ایک دفعہ رسول خدا ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یزید پلید کو کندھے پر بٹھائے ہوئے لئے جا رہے تھے۔ رسولِ خدا ﷺ نے تبسم کیا اور فرمایا: سبحان اللہ! دوزخی بہشتی کے کندھے پر سوار ہوئے جا رہا ہے۔ جب یہ کلمہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے سنا، تو حال پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ تو معاویہؓ کا لڑکا ہے۔ دوزخی کہاں سے ہے؟ کہا اے علی رضی اللہ عنہ یہ یزید وہ بدنصیب لڑکا ہے۔ جو میرے حسن و حسین رضی اللہ عنہما اور میری ساری آل کو شہید کرے گا۔ حضرت علی علیہ السلام کھڑے ہو گئے اور تلوار نیام سے نکال لی کہ میں اسے مارے ڈالتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: اے علی رضی اللہ عنہ! ایسا نہ کر۔ خدا کا حکم ایسا ہی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام رونے لگے اور کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! ﷺ! اس وقت آپ سر پر ہوں گے؟ فرمایا: نہیں! کہا یاروں میں سے کوئی ہو گا؟ کہا نہیں! کہا کیا میں ہوں گا؟ کہا نہیں! کہا، فاطمہ ہوں گی؟ کہا وہ بھی نہیں۔ کہا یا رسول اللہ ﷺ! میرے بچوں کی کون ماتم داری کرے گا۔ کہا "میری اُمت"

"پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں گریہ کرنے لگے اور دونوں شاہزادوں سے بغلگیر ہوئے اور نعرہ مارا کہ میں نہیں جانتا کہ اس دشت (کربلا) میں تمہارا کیا حال ہوگا۔"

"اس کے بعد شیخ الاسلام زبان مبارک سے فرمانے لگے کہ جس روز امیر المومنین حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی اس رات ایک بزرگ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خواب میں دیکھا کہ آپ کل انبیأ کی بیویوں کو ساتھ لائی ہیں۔ دامن کمر مبارک سے بندھا ہوا ہے۔ دشتِ کربلا میں جہاں کہ امیر المومنین حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہادت پا دیں گے، جھاڑو دے رہی ہیں اور اپنی آستین مبارک سے صاف کرتی جاتی ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ: "اے خاتونِ قیامت اور اے بنتِ شفیع روزِ محشر! یہ کیا مقام ہے جسے آپ اپنی آستین سے صاف کر رہی ہیں؟" فرمایا: "یہ وہ مقام ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ میرا بیٹا یہاں سر دے گا اور شہادت پائے گا۔"

"اس کے بعد اسی موقع پر آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے یہ حکایت پوچھی کہ جب ان میں سے کوئی بھی نہ ہوگا، تو کون ان کی تعزیت کرے گا؟ کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کی اُمت آپ کے فرزندوں کی تعزیت کرے گی اور ایسی غمخواری کرے گی کہ اس کی صفت بیان نہیں ہو سکتی۔" (راحۃ القلوب، ص ۲۰۶، ۲۰۷، ملفوظات خواجہ فریدالدین گنج شکر، مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیأ، ترجمہ غلام احمد بریاں، مطبوعہ مجتبائی دہلی ۱۹۱۶ء)

اس بیان سے مندرجہ ذیل باتیں مستفاد ہوتی ہیں:

۱ مندرجہ بالا بیان شیخ الاسلام کی تاریخ وجغرافیہ دانی کا ایسا نادر شاہکار ہے کہ خواہ مخواہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً:

ا ــــ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، یزید کو کندھے پر اٹھائے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نکلے حالانکہ یزید تو اس وقت پیدا بھی نہ ہوتے تھے۔ وہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے پندرہ سال بعد ۲۶ھ میں خلافتِ عثمان کے دور میں پیدا ہوتے تھے، تو پھر بہشتی کے کندھے پر دوزخی کا کیا سوال؟

ب ــــ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں شہزادوں سے بغل گیر ہوتے اور فرمایا میں نہیں جانتا دشت میں تمہارا کیا حال ہوگا۔" حالانکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ واقعہ کربلا ۶۱ھ سے گیارہ

سال پہلے ۲۰ صفر ۵۰ھ کو وفات پا چکے تھے۔

ج ۔ جب آپ کی ساری آل کو یزید نے دشتِ کربلا میں شہید کر دیا تھا، تو یہ اتنے کثیر تعداد میں سید کہاں سے تشریف لائے۔

د ۔ دشتِ کربلا تو ریت کا میدان تھا، وہاں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کیا جھاڑ دے کر ریت کے تودے ہٹائے تھے۔

ر ۔ امیر المؤمنین کوئی اعزازی لقب نہیں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ امیر المومنین کیسے ہو گئے جبکہ ان کی خلافت ایک لمحہ کے لئے بھی منعقد نہیں ہوئی۔

۲ ۔ اسی طرح یہ بیان شیعہ نوازی کا بھی شاہکار ہے۔ یزیدؒ کو دوزخی قرار دینا۔ وقوعہ شہادت سے پہلے ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گریہ وزاری کرنا۔ پھر زبانِ نبوت سے اُمت کی طرف سے تعزیہ اور ماتم داری کا اعلان۔ پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے خود خدا کا اعلان کہ یہ ماتم داری صرف جائز ہی نہیں، بلکہ ایک اچھی صفت ہے۔ یہ سب باتیں شیعیت کی پوری پوری تائید کر رہی ہیں۔

۵ ۔ جنوں کا ماتم

مفتی غلام سرور صاحب لاہوری، مصنف خزینۃ الاصفیاء اس کتاب کے صفحہ ۵۸ پر رقمطراز ہیں:

"جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا، تو جنات نے تین دن تک مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی چھت پر ماتم کیا اور آپ کے مرثیہ میں ابیات پڑھتے رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ کو تین روز تک دفن نہ کیا گیا۔ ناگاہ ہاتف نے آواز دی: "اِدْفِنُوْهُ وَلَا الصَّلٰوةَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ صَلّٰى عَلَيْهِ" یعنی انہیں دفنایا جائے اور نماز جنازہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس محبوب کا جنازہ ادا کر دیا ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۵۸)

اب دیکھئے کہ:

۱ ۔ جنات کے کرنے کا کام تو یہ تھا، کہ ان غنڈوں کا جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ گلا گھونٹ دیتے یا کم از کم شہید کرنے کے بعد ہی ان کی خبر لیتے، لیکن انہوں نے بھی کیا کم ہمتی دکھائی کہ بس ماتم پر ہی مطمئن ہو گئے اور یہ بد رسم امتِ محمدیہ میں چھوڑ دی۔ جس کو عملاً شیعہ حضرات نے اور عقیدتاً صوفیاء نے تسلیم کر لیا۔

۲۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دفن کا انحصار ہاتف کی ندا پر تھا۔ اگر یہ ندا دو دن پہلے آجاتی تو آپ دو دن پہلے دفن ہو جاتے اور غنیمت سمجھئے کہ تین دن بعد یہ ہاتف کی ندا آگئی۔ اگر ایک ماہ بعد ندا آتی، تو میت کا جو حال ہوتا وہ معلوم ہے۔ لہٰذا ہمیں اس ہاتف کی آواز کا مشکور ہونا چاہئے۔

۳۔ معلوم ہوتا ہے کہ کرامت نگار تاریخ کے پس منظر سے بالکل بیگانہ ہو کر ہر طرح کے واقعہ کو رجال الغیب، ندائے غیبی کے ذریعے اپنے مخصوص رنگ میں رنگ دینے کے عادی ہوتے ہیں۔ رہی عربی زبان کی فصاحت تو وہ بھی قابل داد ہے۔

۶۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور حوض کوثر

"مولانا جامی (م ۸۹۸ھ) اپنی کتاب شواہد النبوت میں فرماتے ہیں:

"ایک نیک آدمی نے خواب میں دیکھا کہ قیامت برپا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حوض کوثر کے پاس کھڑے ہیں اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما دائیں بائیں کھڑے مخلوقِ خدا کو پانی پلا رہے ہیں۔ میں نے بھی پانی کی درخواست کی، تو فرمایا: "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر پانی نہیں مل سکتا۔" آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ نے فرمایا: "تمہیں پانی نہیں مل سکتا، کیونکہ تمہارے ہمسایہ میں ایک شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہتا ہے اور تم منع نہیں کرتے۔" میں نے عرض کی کہ "مجھے ڈر ہے کہ اگر میں منع کروں، تو مجھے قتل نہ کر دے۔" آپ نے مجھے ایک تیز چھری دی کہ اس سے دشمن علیؓ کا کام تمام کر دو۔" میں نے چھری لی اور آکر اس دشمن مولا علیؓ کو قتل کر کے آپ کو جا کر اطلاع دی، تو آپ نے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سے فرمایا: "اسے آبِ کوثر دے دو اس نے حق محبتِ علی ادا کر دیا ہے۔" میں نے پیالہ لیا مگر یاد نہیں کہ پی سکا کہ نہیں کہ میری آنکھ کھل گئی۔ صبح ہوئی، تو باہر شور برپا تھا کہ فلاں شخص کو کسی نے بستر میں ہی قتل کر دیا ہے۔ صبح پولیس آئی اور بے گناہ ہمسایوں کو گرفتار کر لیا۔ میں نے کہا: "سبحان اللہ! کیا خواب ہے۔ بے گناہ ہمسائے گرفتارِ مصیبت ہو گئے۔ انہیں بے گناہ قید و بند میں رکھنا دین کے خلاف ہے۔ میں نے قاضی شہر کے پاس جا کر اپنے قتل کا اعتراف کر لیا اور رات کا واقعہ سنا کر کہا کہ یہ لوگ بے قصور ہیں، انہیں رہا کر دیا جائے۔" اس نے کہا: "تم بھی اس مقدمہ میں بے گناہ ہو، مقتول اپنی سزا کو پہنچ گیا ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص۹۰)

مولانا عبدالرحمٰن جامی صاحب کی شواہد النبوت کی یہ روایت کئی لحاظ سے محل نظر ہے۔ مثلاً:

۱۔ حوض کوثر سے پانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود پلائیں گے۔ اس میں حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا کوئی واسطہ نہیں۔

۲۔ خود آپؐ کو غیب کا حال معلوم نہ ہوگا۔ حوضِ کوثر کی طرف آنے والے بعض مسلمانوں کو فرشتے دھکیل رہے ہوں گے۔ آپ (ﷺ) فرشتوں سے اس کی وجہ پوچھیں گے، تو فرشتے کہیں گے کہ "آپ کو خبر نہیں کہ آپ ﷺ کے بعد ان لوگوں نے کیا بدعات جاری کیں۔" (مسلم) تو آپؐ کو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ فلاں شخص دشمنِ علی ہے۔ اور یہ پانی کا سائل اپنے اس دشمنِ علی ہمسایہ کو بُرا بھلا کہنے سے منع نہیں کرتا؟

۳۔ خواب حضورِ اکرم ﷺ کو بھی آیا تھا کہ وہ اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سمیت عُمرہ کر رہے ہیں، لیکن یہ خواب کا عُمرہ دو سال بعد واقعاتی دنیا میں وقوع پذیر ہوا، تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: "اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے خواب کو سچ کر دکھایا۔" لیکن اس "نیک شخص" کا خواب اُسی وقت اِس واقعاتی دنیا میں اس کے جاگنے سے پہلے رُونما ہو گیا۔ شاید یہ شخص رسول اکرم ﷺ سے بھی زیادہ پہنچا ہوا ہو۔

۴۔ پولیس بھی عجب بدھو قسم کی تھی کہ دشمنِ علی کے قتل کا شبہ تو کسی مُحبِ علی نیک آدمی پر ہی ہو سکتا تھا اس نے دوسرے ہمسایوں کو خواہ مخواہ قید و بند میں ڈال دیا۔ البتہ اس لحاظ سے باشعور بھی تھی کہ اس خواب کے حوادثات کو عدالت کی بنیاد قرار نہ دے کر اس "نیک شخص" کو بھی چھوڑ دیا۔

۵۔ یہ سارا قصہ آبِ کوثر کے پیالہ پینے کے گرد گھومتا ہے اور یہی بات اس "نیک آدمی" کو یاد نہ رہی کہ پیالہ پیا یا محروم ہی رہا، پھر اس قصہ کا فائدہ ہی کیا تھا؟

بہرحال ہم جامی صاحب کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے حُبِ علی (رضی اللہ عنہ) کی تائید کے سلسلے میں ایسا لاجواب افسانہ تراشا ہے۔

۷۔ حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا اور خونِ کربلا

"حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا (اُم المومنین) بیان فرماتی ہیں کہ ایک رات آپ کافی دیر سے گھر آئے۔ پریشان حال، غبار آلود اور تھکے دکھائی دیتے تھے اور ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ میں نے پوچھا: "یا رسول اللہ! یہ کیا ہے؟ اور آپ اس حال میں کیوں ہیں؟" فرمایا: "آج مجھے کربلا لے جایا گیا جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مقتل ہوگا۔ مجھے اپنی اولاد کے دوسرے افراد بھی دکھائے گئے (جو ابھی پیدا بھی نہ ہوتے تھے) میں اس زمین پر پڑا ہوا خون اکٹھا کر کے لے آیا ہوں۔ آپ ﷺ نے ہاتھ کھول کر مجھے فرمایا: "اس سرخ مٹی کو اپنے پاس محفوظ کر لو۔" میں نے یہ سرخ مٹی ایک شیشی میں ڈال کر

منہ کو خوب بند کر دیا۔ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ سفرِ عراق کو روانہ ہوئے، میں ہر روز اس شیشی کو دیکھا کرتی اور رویا کرتی۔ محرم کی دسویں تاریخ، شام کو میں نے دیکھا کہ وہ مٹی خون بن گئی ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ آج حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے ہیں۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۴۷)۔

یہ "حدیث" چونکہ بلا حوالہ اور بے سند ہے، لہٰذا موضوع اور مردود ہے۔ پھر کئی لحاظ سے محلِ نظر بھی ہے۔ مثلاً یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ میدان کافی رات گئے کیوں دکھایا گیا؟ ہم اس بات کے قائل نہیں کہ آپ اس طرح کے نور تھے کہ آپ کے جسم سے روشنی پھوٹتی تھی۔ بلکہ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ رات کو آپ کے ہاں بھی چراغ جلتا اور بجھتا تھا۔ جیسا کہ بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے ثابت ہے۔ پھر آپ کو اشخاص بھی ایسے دکھائے گئے، جو ابھی پیدا بھی نہ ہوتے تھے اور آپ انہیں جانتے بھی نہ تھے۔ اس رات کے اندھیرے میں آپ نے انہیں کیا دیکھا ہوگا؟

پھر آپ نے کربلا کے میدان سے اکٹھا تو خون کیا تھا، مگر گھر آنے تک وہ سُرخ مٹی میں تبدیل ہو گیا یہ تبدیلی اس لئے کی گئی کہ اگر کرامت تراش اس خون کو پہلے سُرخ مٹی نہ بناتے، تو اگلی کرامت کی بنیاد نہیں بن سکتی تھی۔

۸۔ حضرت زین العابدینؒ کو امامت کیسے ملی؟

"حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد محمد بن حنفیہ (جو حضرت علیؓ کی بیوی حنفیہ کے بطن سے تھے) اور زین العابدین (ابنِ حسین رضی اللہ عنہ) میں امامت کے متعلق جھگڑا ہوا۔ محمد بن حنفیہ کہتے تھے، میں بڑا ہوں، لہٰذا امامت میرا حق ہے اور زین العابدین کہتے تھے کہ میں اہلِ بیت سے ہوں، لہٰذا امامت میرا حق ہے۔ آخر زین العابدین رحؒ نے کہا کہ چلو حجرِ اسود سے فیصلہ کرواتے ہیں۔ دونوں حجرِ اسود کے سامنے پیش ہوئے۔ پہلے محمد بن حنفیہ نے اپنا دعوےٰ پیش کیا، لیکن حجرِ اسود خاموش رہا۔ پھر جب زین العابدین نے دعویٰ پیش کیا، تو حجرِ اسود زور سے ہلا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ اپنی جگہ سے نکل آئے گا۔ پھر فصیح زبان میں کہا: "اللہ تعالےٰ نے امامت اور ولایتِ باطنی کا حق تو زین العابدین کو دیا ہے دوسرا کوئی بھی اس کا شریک نہیں ہو سکتا۔" یہ فیصلہ سنتے ہی محمد بن حنفیہ اپنے حق سے دستبردار ہو گئے۔

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۹)

حجرِ اسود کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مخاطب کر کے کہا تھا کہ "میں خوب جانتا ہوں کہ تو بے جان پتھر ہے جو نہ کسی کا کچھ سنوار سکتا

ہے، نہ بگاڑ سکتا ہے۔ اگر رسُول اللہ ﷺ نے تمہیں نہ چُوما ہوتا، تو میں بھی نہ چُومتا۔" اس وقت حجرِ اسود کچھ نہ بولا۔ لیکن حکم بن کر بلند آواز سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پوتے کو ہی اہل بیت اور امامت کا مستحق قرار دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے کو امامت اور ولایت باطنی سے محروم کر دیا، اور اس طرح اہل بیت کی طرفداری کا ثبوت مہیا کر

۹- اشرف علی تھانوی کی پیدائش

اشرف علی صاحب تھانوی اپنی پیدائش کا واقعہ بیان فرما رہے ہیں:

"میں ایک مجذوب کی دُعا سے پیدا ہوا ہوں، جن کا نام غلام مرتضیٰ ہے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ اس لڑکی، یعنی میری والدہ کی اولاد زندہ نہیں رہتی، تو فرمایا کہ "عمرؓ اور علیؓ کی کھینچا تانی میں ٹوٹ جاتی ہے۔ اب جو اولاد ہو علی کے سُپرد کر دینا۔" اس (رمز) کو کوئی نہیں سمجھا۔ میری والدہ، جن کی نسبت سنا ہے کہ صاحبِ ذوق تھیں، سمجھ گئیں، اور کہنے لگیں کہ باپ فاروقی ہیں اور ماں علوی اور نام بچوں کے والد کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔ اب جو اولاد ہو ماں کے خاندان کے نام پر رکھو یعنی اس میں لفظ علی ہو، وہ مجذوب خوش ہوتے اور فرمایا: "یہ لڑکی بڑی ذہین ہے یہی مطلب ہے۔" نانی صاحبہ نے عرض کیا پھر آپ ہی نام رکھ دیجئے۔" فرمایا: "دو لڑکے ہوں گے، ایک کا نام اشرف علی خان رکھنا اور ایک کا نام اکبر علی خان۔" عرض کیا گیا کہ کیا پٹھان ہیں؟" فرمایا "ہاں ہاں! ایک کا اشرف علی اور ایک کا اکبر علی رکھنا۔ ایک ہمارا ہوگا، وہ حافظ اور مولوی ہوگا اور ایک دُنیا دار ہوگا۔ پھر ہم دونوں بھائی پیدا ہوئے۔" (افاضاتِ یومیہ، ص ۲۰۱، ج ۵، بحوالہ سیرت غوث الثقلین، ص ۲۰۰)

اس اقتباس سے درج ذیل اُمور پر روشنی پڑتی ہے:

۱ مولانا اشرف تھانوی کی والدہ اور نانی دونوں کو اللہ پر توکل نہ تھا اور آج کل کی کمزور عقیدہ والی عورتوں کی طرح ہی تھیں، جو اولاد کے حصول یا زندگی کے لئے پیروں فقیروں کی طرف رجوع فرماتی ہیں۔

۲ مجذوب غلام مرتضیٰ صاحب اسرار و رموز میں بات کیا کرتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفدار تھے۔

۳ ان مجذوب صاحب کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کھینچا تانی کا تو علم ہو گیا، لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ خاندان پٹھان نہیں۔ چنانچہ بعد میں ناموں کی تصحیح بھی فرمائی۔

تصوف پر باطنیت کی چھاپ اور موضوعات

اب حضرت علی اور اہل بیت سے متعلق

ایک حدیث بھی سن لیجئے، جو صوفیاء اور شیعوں میں یکساں مقبول ہے:

مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِي كَسَفِينَةِ نُوحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَىٰ وَ مَنْ تَخَلَّفَ فَقَدْ غَرَقَ وَ هَوىٰ

میرے اہل بیت کی مثال حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی طرح ہے، جو اس میں سوار ہوا نجات پا گیا۔ اور جو پیچھے رہ گیا، غرق ہوا اور گر گیا۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اپنی کتاب "اسلامی تصوف" میں بدلائل یہ بات ثابت کی ہے کہ موجودہ تصوف باطنیت یعنی عبداللہ بن سبا یہودی کی تحریک سے سخت متاثر ہے۔ انہوں نے اس بات پر خاصا زور دیا ہے کہ بے شمار وضعی احادیث شیعوں اور باطنیوں نے وضع کیں، جن کو صوفیاء نے قبول کر لیا ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے الحاقی مضامین بھی اہل تصوف کی تصنیفات میں شامل کر دیتے ہیں۔ وہ اس کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں کہ: "آخر میں ملا علی قاری کی مشہور کتاب موضوعات سے چند اقتباسات درج کر کے اس موضوع کو ختم کرتا ہوں۔

۱۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اولین مصنف ابن اسحاق چونکہ شیعہ تھا اس لئے اس نے اکثر ایسی روایتیں بھی درج کر دی ہیں جن سے اس کے مذہب کی تائید ہو۔ مثلاً خیبر کے دروازہ اکھیڑنے کی روایت۔

۲۔ کُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا حدیث نہیں۔ اکثر صوفیا اسے حدیث سمجھتے ہیں۔

۳۔ تاریخوں میں خلیفہ منتخب ہو جانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خطبہ نہ دے سکنے کی روایت بھی غلط ہے۔

۴۔ آئمہ حدیث کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حسن بصری (م ۱۱۰ھ) کی ملاقات اور تحصیل علم ثابت نہیں۔

۵۔ خرقہ والی حدیث (جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) غلط ہے اور معاندین صحابہ کی وضع کردہ ہے۔

۶۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نماز عصر قضا ہونے پر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سورج کو واپس موڑنے کی روایت بھی غلط ہے۔

۷۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مجمع عام میں فرمانا کہ "حضرت علی رضی اللہ عنہ میرا وصی ہے۔" قطعاً بے بنیاد اور غلط ہے۔

۸۔ یہ روایت کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ

کے خلاف خروج مت کرنا۔" بے بنیاد ہے۔

۹۔ پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خروج کریں، تو تم نرمی کا برتاؤ کرنا۔" سراسر کذب اور افترا ہے۔

۱۰ یہ روایت کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کچھ باطنی اسرار و علوم سکھائے تھے، جو دوسرے صحابہ کو نہیں سکھائے۔ قطعاً غلط ہے۔[1]

ملا علی قاری کے اس قول پر کہ "روافض نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں ۳ لاکھ روایات وضع کی تھیں۔" اس اقتباس کو ختم کرتا ہوں۔" (اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش، یوسف سلیم چشتی، ص ۱۴۹ تا ۱۴۶)

یہی سلیم چشتی آگے چل کر ایک شیعہ مصنف پروفیسر سید حسین نصر کی ایک انگریزی کتاب "اسلام کے مطامح نظر اور حقائق" سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں، مثلاً:

۱۔ منگولوں کے حملے کے دور میں ایران میں تصوف اور اسمٰعیلیت میں اتحاد کی ایک مستقل صورت پیدا ہو گئی تھی، جس کا تحقیقی مطالعہ ابھی تک نہیں کیا گیا۔ (ص ۱۶۰)

۲۔ اثنا عشری شیعیت میں مذہب کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کو بالخصوص اہمیت دی گئی ہے اور اس اعتبار سے وہ تصوف کی ہمنوا ہے۔ (ص ۱۶۰)

۳۔ تصوف اور تشیع دونوں کی تعلیم یہ ہے کہ "نور محمدی" حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ہر نبی کی ذات میں موجود رہا ہے۔ (ص ۱۶۰) (بحوالہ اسلامی تصوف، ایضاً، ص ۱۲۴)

ان اقتباسات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کا موجودہ تصوف باطنیت اور شیعیت کے زیر اثر پرورش پاتا رہا ہے۔ اور ہمارے بڑے بڑے بزرگ بھی تحقیق و تفحص کے بجائے محض اکابر کی پیروی کرتے چلے آتے ہیں۔

۱۰۔ خرقہ کی فضیلت

خرقہ[2]، گدڑی یا مرقع ہمارے صوفیا کے خاص شعائر میں سے ایک ہے اور جو چیز صوفیاء سے تعلق

---

[1] صوفیاء میں رائج شدہ موضوع احادیث اور موضوع واقعات کی مزید تفصیل آگے باب 'نہم' میں آئے گی۔

[2] ان لوگوں کا خرقہ اون کا کوئی موٹا سا چادر نما کپڑا ہے۔ کبھی تو اس کی نسبت حضور ﷺ سے کی جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ

بقیہ اگلے صفحہ پر

رکھتی ہو، وہ بہر حال افضل ہی ہونی چاہیئے۔ پھر کسی کامل پیر کا کسی کو اپنا خلیفہ بناتے وقت بھی اسے خرقہ عطا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اب اس خرقہ کی فضیلت کا مقام یہ ہے کہ بابا فریدالدین گنج شکر کے کشف کے مطابق شب معراج میں اللہ تعالیٰ نے خود حضور اکرم ﷺ کو عطا فرمائی تھی۔ یہ خرقہ آپ نے بھی کسی جانشین کو دینا ہی تھا۔ کیونکہ اللہ کا حکم تھا، تو تمام کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کا امتحان لینے کے بعد بالآخر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر نظر انتخاب پڑی، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ میں یہ خرقہ لے کر لوگوں کی پردہ پوشی کروں گا۔ اور خدا کا حکم بھی یہی تھا کہ جو اس طرح کا جواب دے خرقہ اُسے ہی دیا جائے۔ چنانچہ تاریخ اسلام میں سب سے پہلا خرقہ یہی تھا، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملا (اس خرقہ کی تفصیلی روایت کے لئے "حضرت علی رضی اللہ عنہ اور شیعیت سے لگاؤ" کا عنوان دیکھ لیجئے) اب خرقہ کے دیگر فضائل و برکات بھی ملاحظہ ہوں۔

شیر پر خرقہ کا اثر

حضرت ابراہیم بن داؤد رضی اللہ عنہ کے تذکرہ نگار فرماتے ہیں:

"نقل ہے کہ ایک درویش نے آپ کے پیرہن کا ایک ٹکڑا اپنی گدڑی میں سیا ہوا تھا، وہ جنگل میں جا رہا تھا کہ ایک شیر اس پر حملہ آور ہوا۔ جب اس کی نظر گدڑی پر پڑی تو پلٹ گیا۔ درویش نے سمجھ لیا کہ یہ آپ کے پیرہن کے ٹکڑے کی حرمت تھی، جو شیر نے جان چھوڑ دی اور چلا گیا۔"

(مقربان حق، ص ۱۹۱)

سُلطان محمود غزنوی کی فتح سومنات کا سبب

"نقل ہے کہ جب سلطان محمود نے سومنات پر حملہ کیا، تو چاروں طرف کے ہندو راجے مہاراجے بھاری فوجیں لے کر جمع ہو گئے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ کفار کا لشکر بے شمار تھا اور کسی طرح مغلوب نہ ہوتا تھا۔ اس عالم میں محمود گھوڑے سے اُترا اور وہ پیرہن، جو حضرت ابُوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ سے تبرکاً ساتھ لایا تھا آگے رکھا اور سربسجود ہو کر یہ دُعا کی: " الٰہی! ہم ناتواں ہیں۔ اس خرقہ درویش کے صدقہ میں فتح دے۔" دُعا مستجاب ہوئی۔ کفار کا لشکر بھاگ نکلا اور محمود فتحیاب ہوا۔ اس نے رات کو خواب میں حضرت ابُوالحسنؒ کو دیکھا، جو فرما رہے تھے: "محمود! اتنے ذرا سے کام کے لئے بارگاہ الٰہی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ
موٹا کپڑا پہننا پسند فرماتے تھے مگر آپ ﷺ روئی کا موٹا کپڑا پہنتے تھے نہ کہ اون کا۔ اور کبھی یہ لوگ اس خرقہ کی فضیلت کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہنتے تھے اور کبھی اس کی نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔

حاشیہ صفحہ ہذا
ل مرشد کامل یا حدائق الاخیار کے مصنف صادق فرغانی محمود غزنوی کی اس فتح کے سبب شیخ لقمان سرخسی کی ایک اور ہی کرامت قرار
باقی اگلے صفحہ پر

میں میرا پیرہن پیش کر دیا۔ اے نادان اگر تو یہ کہتا کہ الٰہی! اس خرقہ کی برکت سے یہ سب کافر مسلمان کر دے۔ تو اللہ تعالیٰ انہیں دین سے تیرے بھائی بنا دیتا۔" (مقربانِ حق، ص ۱۳۰)

اس واقعہ سے صرف خرقہ کی برکت و فضیلت ہی ثابت نہیں ہوتی اور بھی کئی باتیں مستنبط ہوتی ہیں مثلاً:

۱ پیراہن تو رسول اکرم ﷺ کا بھی تھا، لیکن انہیں خود یا خلفائے راشدین کو کفار پر فتح حاصل کرنے کے لئے یہ نسخہ ہاتھ نہ آیا۔

۲ 'جہاد بالسیف' یا 'اعلائے کلمۃ الحق' بس 'ذرا سی بات' ہوتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس ذرا سی بات کے لئے اتنے غزوات کئے۔ وہ بھی بس خرقہ اور دعا سے ہی کام چلا لیتے، تو کیا اچھا ہوتا۔

اب دیکھئے اسی خرقہ کے متعلق بایزید بسطامی کیا کہہ رہے ہیں:

"نقل ہے کہ ایک شخص نے آپ سے عرض کیا "مجھے برکت کے لئے پوستین کا تھوڑا سا ٹکڑا اعنایت فرمائیے"۔ آپ نے فرمایا: "بھئی! پوستین کا ٹکڑا کیا ہے اگر بایزید کی کھال بھی پاس رکھے گا، تو کچھ نفع نہ ہو گا، جب تک بایزید جیسے کام نہیں کرے گا۔" (مقربانِ حق، ص ۱۱۷)

۱۱۔ اولیاء اللہ کے جوتوں کے کرشمے

یہ مشہور واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہو گا کہ معین الدین چشتی (م ۶۳۱ھ) ہندوستان میں اسلام پھیلانے کے لئے اجمیر تشریف لائے، تو آپ کا ایک ہندو جوگی سے مقابلہ ہوا۔ ہندو جوگی نے یہ کرشمہ دکھایا کہ اس نے اپنا جوتا اوپر پھینکا۔ پھر وہ جوتا ہوا میں اڑتا ہوا اوپر چلا گیا۔ لوگ حیران و ششدر رہ گئے۔ پھر ہمارے ولی کی باری آئی تو آپ نے بھی اپنا جوتا ہوا میں پھینکا، جو اس جوگی کے جوتے کو مارتے مارتے نیچے اتار لایا۔ حاضرین نے جب یہ دیکھا، تو سمجھ گئے کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے، چنانچہ وہ جوگی، اس کے چیلے آپ کے مرید ہو گئے اور حاضرین

بقیہ صفحہ گذشتہ

دے رہے ہیں۔ (صفحہ ۶۰) پر لکھتے ہیں: "مگر قلعہ کے فتح ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اتنے میں آسمان سے ایک پتھر دیوار پر گرا۔ دیوار ٹوٹ گئی، مسلمان اندر گھس گئے اور قلعہ فتح ہو گیا۔ وہ پتھر سلطان محمود کے پاس لایا گیا۔ اس پر یہ الفاظ لکھے تھے: صاحبہٗ شیخ لقمان سرخسی۔"

میں سے اکثر اسلام لے آئے۔

اس قصہ کا حوالہ مستحضر نہیں اور میں دو وجوہ کی بنا پر اس کے حوالہ کی تلاش کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔ ایک تو ایسے واقعات زبان عام و خاص ہیں کہ ہندوستان میں اسلام اولیاء اللہ کے ذریعے پھیلا اور دوسرے اس لئے بھی کہ نیچے درج شدہ واقعات بھی چونکہ کچھ اسی قسم کے ہیں، تو پھر اس کی ضرورت بھی کیا ہے؛ ثبوت تو صرف اس بات کا درکار ہے کہ کیا اولیاء اللہ کے جوتے یا کھڑاویں بھی بڑے عظیم کارنامے سرانجام دے سکتی ہیں یا نہیں؟ چنانچہ ضیاء اللہ قادری "سیرت غوث الثقلین صفحہ ۱۶۷" پر فرماتے ہیں کہ :

دشمن کی سرکوبی

"شیخ ابو عمرو اور ابو محمد عبد الحق سے مروی ہے کہ ہم غوث پاک کی خدمت میں حاضر تھے کہ اس وقت آپ نے اپنی کھڑائیں پہنیں اور وضو فرمایا، اور دو رکعت نفل پڑھنے کے بعد بلند آواز کرتے ہوئے ایک کھڑاؤں کو ہوا میں زور سے پھینکا۔ پھر اسی طرح دوسری کو بھی پھینک دیا۔ دونوں کھڑائیں ہماری نظر سے غائب ہو گئیں مگر ہم سے کسی کو آپ سے واقعہ معلوم کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ تین دن بعد ایک قافلہ آیا اور کہنے لگا کہ ہم نے غوث اعظم کے حضور نذرانہ پیش کرنا ہے۔ ہم نے اجازت طلب کی، تو آپ نے اجازت دے دی اور کہا کہ جو کچھ نذرانہ دیں، لے لو۔ اس قافلہ نے ہمیں اونی، ریشمی کپڑے، سونا وغیرہ اور آپ کی وہ دونوں کھڑائیں دیں، جن کو آپ نے ہوا میں پھینکا تھا۔ باہر آ کر ہم نے ان سے کھڑاؤں کے متعلق پوچھا کہ کہاں سے ملیں؛ تو انہوں نے بیان کیا کہ تین ۳ صفر کو جا رہے تھے کہ راستہ میں عرب ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور ہمارے قافلہ کے بہت سے افراد کو قتل بھی کر ڈالا۔ اس وقت ہم نے کہا کہ شیخ عبد القادر ہماری دستگیری فرمائیں اور ہم بچ کر نکل جائیں، تو اپنے مال میں سے آپ کی نذر پیش کریں گے۔ ابھی ہم یہ کہہ ہی رہے تھے کہ دو بلند آوازیں سنائی دیں کہ سارا بیابان گونج اٹھا اور وہ ڈاکو بھی ہیبت زدہ ہو گئے۔ ہم نے سمجھا کہ کوئی شخص آ رہا ہے، جو ان ڈاکوؤں سے بھی مال چھین کر لے جائے گا۔ اتنے میں وہ ڈاکو ہمارے پاس آئے۔ اور کہنے لگے کہ آؤ تم اپنا مال اٹھا لو اور دیکھو! ہمارا کیا حال ہوا ہے۔ ہم وہاں پہنچے، تو ڈاکوؤں کے دونوں سرداروں کو مردہ پایا اور ہر ایک کے پاس پانی سے تر ایک ایک کھڑاؤں پڑی ہے اور انہوں نے ہمارا مال واپس کر دیا۔"

دیکھ لیا آپ نے اولیاء اللہ کی کھڑائیں بھی کتنی کام کی چیز ہیں۔ وقت پڑنے پر پورے ہتھیار کا کام دیتی ہیں۔ کھڑاویں دو تھیں اور ڈاکوؤں کے سردار بھی دو تھے اور ان کھڑاؤں میں یہ شعور بھی تھا کہ ہم نے بس سرداروں

کو ہی ہلاک کرنا ہے ،اس کے بعد ہمارا کام ختم ہے ۔ البتہ افسوس کی بات یہ ہے کہ قافلہ والوں نے اپنے بہت سے آدمی مارے جانے کے بعد غوثِ اعظم کو فریاد کے لئے پکارا تھا۔ بروقت پکارتے، تو شاید اُن کے مرے ہوئے لوگوں کی جانیں بھی بچ جاتیں۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی سیرت غوث الثقلین کے صفحہ ۲۰۱ پر یوں منقول ہے کہ :

"ایک عورت آپ کی مُرید ہوئی ۔ اُس پر ایک شخص عاشق تھا۔ ایک دن وہ عورت کسی حاجت کے لئے باہر پہاڑ کی غار کی طرف گئی ، تو اس فاسق کو بھی اس کے جانے کا علم ہوگیا، وہ اس کے پیچھے پیچھے ہوگیا اور اس کو پکڑ لیا۔ وہ اس کی عصمت ریزی کرنا چاہتا تھا کہ اس عورت نے بارگاہِ غوثیہ میں فریاد کی اور کہا" الغیاث، یا سیدی عبدالقادر !" اس وقت حضرت اپنے مدرسہ میں وضو فرما رہے تھے۔ آپ نے اپنی کھڑاؤں کو غار کی طرف پھینکا۔ وہ کھڑائیں اُس فاسق کے سر پر لگنی شروع ہوگئیں، حتیٰ کہ وہ مرگیا۔ وہ عورت آپ کی نعلین مبارک لے کر حاضر ہوئی اور مجلس میں سارا قصہ کہہ سنایا۔ (تفریح الخاطر، ص ۳۰، مطبوعہ مصر)

شمس الدین محمد حنفی کی کھڑاویں

امام اہل سنت احمد رضا خاں بریلوی فرماتے ہیں:

"سیدی محمد شمس الدین محمد حنفی رضی اللہ عنہ اپنے حجرۂ خلوت میں وضو فرما رہے تھے ، ناگاہ ایک کھڑاؤں ہوا پر پھینکی کہ غائب ہوگئی ۔ حالانکہ حجرے میں کوئی راہ اس کے ہوا پر جانے کی نہ تھی ۔ دوسری کھڑاؤں اپنے خادم کو عطا فرمائی کہ اسے اپنے پاس رہنے دے جب تک وہ پہلی واپس نہ آئے ایک مدت کے بعد ملک شام سے ایک شخص وہ کھڑاؤں مع ہدایا کے حاضر ہوا اور عرض کی کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو جزائے خیر دے ۔ جب چور میرے سینے پر مجھے ذبح کرنے بیٹھا، میں نے اپنے دل میں کہا: "یا سیدی محمد حنفی" اسی وقت یہ کھڑاؤں غیب سے آکر اس کے سینے پر لگی کہ غش کھا کر الٹ ہو گیا۔ (انوار الانتباہ ص ۱۸ از احمد رضا خاں بحوالہ بریلویت ۱۰۹)

کھڑاؤں سے قلب جاری ہونا

رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) کا ذکر چل رہا ہے۔

"کوئی صاحب منشی تجمل حسین ، جو امداد اللہ مہاجر مکی کی بیعت تھے۔ بڑی آرزو رکھتے تھے کہ کسی طرح ان کا قلب جاری ہو جاتے۔ ادھر ادھر مارے پھرتے تھے۔ تجمل حسین کی بیوی نے بھی حضرت صاحب سے اس بات کا ذکر کیا۔ حضرت صاحب نے تجمل حسین سے وجہ پوچھی تو فرمایا، "میاں ! اس میں کیا رکھا ہے "، تجمل حسین نے فرمایا : " رکھا تو کچھ نہیں، مگر جی چاہتا ہے ۔" آپ نے فرمایا، " اچھا جاؤ، مسجد میں جا بیٹھو۔ " وہ جا کر مسجد میں جا بیٹھے۔ اِدھر حضرت وضو کر کے کھڑاؤں کو پہن کر

سجد کی طرف چلے، کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ سنی کہ اُدھر تجمل حسین صاحب کا قلب جاری ہوگیا۔ دوڑ کر حضرت کے قدم پکڑ لئے کہ میں جو چاہتا تھا، وہ حاصل ہوگیا۔" (تاریخ مشائخ چشتیہ۔ مولانا زکریا، ص ۲۸۵)

مندرجہ بالا واقعات سے بھی چند مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں:

۱۔ اولیاء اللہ عموماً لکڑی کی کھڑاویں پہنتے ہیں، کیونکہ وہ مارنے کے لئے بھی بہت کارآمد ثابت ہوتی ہیں اور قلب جاری کرنے کے لئے بھی۔

۲۔ پھر ان کھڑاؤں کا وضو سے بھی گہرا تعلق ہے۔ شاید وضو کا پانی کھڑاؤں کے کارناموں کی تاثیر میں دو آتشہ ثابت ہوتا ہو۔

۱۲۔ لوح محفوظ پر نظر

لوح محفوظ کے متعلق قرآن سے تین طرح کی معلومات ملتی ہیں۔ (۱) یہ لوح ہر طرح کی دسترس سے محفوظ ہے (۲) یہ کتاب مکنون بھی ہے۔ یعنی اس طرح پوشیدہ ہے کہ اسے آس پاس کے مقربین فرشتے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ (۳) وہ اُم الکتاب ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ دُوسرا کوئی اُس کے پاس پہنچ بھی نہیں سکتا۔

لیکن ہمارے اس گروہ صوفیاء کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ لوح محفوظ ہر ولی کی نظر کے سامنے ہوتی ہے۔ چنانچہ اس عقیدہ کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا رُوم (م ۶۷۲ھ) نے اپنی مثنوی میں، جسے جامی نے فارسی زبان میں قرآن ہی قرار دیا ہے، فرماتے ہیں:

لوحِ محفوظ است پیش اولیاء   از چہ محفوظ است محفوظ از خطا

حال تو دانند یک یک مُو بہ مُو   زانکہ پُرستند از اسرارِ ہُو

بلکہ پیش از دادنِ تو سال ہا   دیدہ باشندت بچندیں سالہا

ترجمہ: (۱) لوحِ محفوظ اولیاء کے سامنے ہوتی ہے وہ کس چیز سے محفوظ ہے؟ وہ خطا سے محفوظ ہے (یعنی اولیاء اللہ سے نہیں) (۲) یہ اولیاء اللہ تیرے ایک ایک لمحہ اور بال کا حال جانتے ہیں، کیونکہ وہ اللہ کے اسرار پُوچھ سکتے ہیں۔ (۳) بلکہ یہ

حالانکہ ہوں نے تیری پیدائش سے سالہا سال پہلے اسے لوحِ محفوظ پر دیکھ لیا ہوتا ہے۔

اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے فرمایا کہ: "اطلاع بر لوحِ محفوظ بمطالعہ و دیدن نقوش نیز از بعضے اولیاء بتواتر منقول است۔" (تفسیر عزیزی، پ ۲۹، سورہ جن، بحوالہ سیرت غوث الثقلین، ص ۱۶۶) یعنی اولیاء اللہ کو لوحِ محفوظ کے نقوش کی، دیکھنے اور مطالعہ سے اطلاع ہو جاتی ہے اور بعض اولیاء سے یہ بات تواتر کے ساتھ منقول ہے۔

اب دیکھئے قرآن تو یہ کہے کہ "یہ کتاب مکنون" (پوشیدہ) ہے۔ اب اگر یہ سب اولیاء اللہ کی نظر کے سامنے مان لی جائے، تو پوشیدہ کیسے ہوتی، شاہ عبدالعزیز کی عبارت سے البتہ یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ نقل کا تواتر صرف "اولیاء اللہ" سے ہے کسی عالمِ دین سے نہیں۔ اور ان اولیاء اللہ کے سلف صالحین، وہی صالحین ہیں جن سے محدثین کسی حدیث کو قبول کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ کیونکہ جھوٹ فوراً بلا تحقیق ان کے منہ سے نکل جاتا ہے،

اب ہم شیخ عبدالقادر جیلانی کے چند واقعات پیش کرتے ہیں۔ ضیاء اللہ قادری 'سیرت غوث الثقلین' کے صفحہ ۱۹۷ 'پر رقمطراز ہیں کہ:

لوحِ محفوظ میں تبدیلی کیسے ہوتی ہے؟

"ملفوظ الغیاثیہ میں ہے کہ غوثِ اعظم کے زمانہ میں ایک مقرب کی ولایت سلب کر لی گئی، سب چھوٹے بڑے اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے، تو اس نے تین سو ساٹھ اولیاء اللہ سے دعا کی درخواست کی۔ ان سب اولیاء نے اللہ کی بارگاہ میں سفارش کی، لیکن ان سب نے اس کا نام لوحِ محفوظ پر اشقیاء کی فہرست میں لکھا دیکھا اور اسے کہا کہ "اب تم کامیاب نہیں ہو گے۔" اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ بالآخر وہ غوثِ اعظم کے پاس آیا، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ "اگرچہ تم مردود ہو چکے ہو، تاہم میں تمہیں مقبول بنا سکتا ہوں۔" آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو ندا آئی "کیا تم کو علم نہیں کہ اس کے لئے میرے ۳۶۰ اولیا سفارش کر چکے ہیں اور میں نے ان کی سفارش قبول نہیں فرمائی، کیونکہ یہ لوحِ محفوظ پر شقی اور بدبخت لکھا جا چکا ہے۔" غوثِ پاک نے عرض کیا: "اے ربِ کریم! تو مردود کو مقبول اور مقبول کو مردود بنانے پر قادر ہے۔ اگر تیری منشا یہی ہے کہ یہ مردود ہی رہے، تو تو نے اس کو مقبول بنانے کے لئے مجھ سے دعا کیوں کرائی؟" تو ندا آئی: "اے عبدالقادر! اسے میں نے تیرے سپرد کر دیا، جو چاہو بنا دو۔ اور تمہارا مقبول میرا مقبول ہے اور تمہارا مردود میرا مردود ہے۔ بیشک میں نے تم کو معزول کرنے اور مقرر کرنے کے اختیارات عطا فرما دیئے ہیں۔" بعد ازیں آپ نے

اُس کو منہ دُھونے کا ارشاد فرمایا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کا نام اشقیاء کی فہرست سے مٹا کر اصفیاء کی فہرست میں لکھ دیا۔" (تفریح الخاطر، ص ۲۱)

اس اقتباس میں درج ذیل اُمور قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ دیکھا آپ نے سید عبدالقادر جیلانیؒ نے کتنی زبردست دلیل سے اللہ کو قائل کر لیا اور وہ دلیل یہ تھی کہ اگر تم نے اس مسلوبُ الولایت کو مقبول نہیں بنانا تھا، تو پھر مجھ سے دُعا کیوں کرائی تھی؟ کاش یہ دلیل دوسرے ۲۶۰ اولیاء کو بھی سُوجھ جاتی، تو اس مسلوبُ الولایت کو اتنا زیادہ پریشان اور رُوسیاہ نہ ہونا پڑتا۔

۲۔ اگر عزل و نصب کے جملہ حقوق و اختیارات اللہ تعالیٰ نے پیرانِ پیر کو تفویض کر رکھے ہیں، تو مالکُ الملک اللہ تعالیٰ ہوا یا شیخ عبدالقادرؒ؟ اور پھر پہلے سے لوحِ محفوظ لکھ رکھنا بھی کچھ سُودمند معلوم نہیں ہوتا۔

۳۔ اس مسلوبُ الولایت ولی کی رُوسیاہی چہرہ دھونے سے ہی اُتر گئی۔ شاید دریں اثنا اُس نے نہ کوئی نماز پڑھی نہ ہی وضو کیا تھا۔ ورنہ یہ رُوسیاہی پہلے ہی دُھل چکی ہوتی۔

آخر اللہ تعالیٰ نے ہار مان لی۔

ضیاء اللہ قادری سیرت غوث الثقلین کے صفحہ ۱۹۸ پر فرماتے ہیں کہ:

"منتخب جواہر القلائد میں ہے کہ ایک دن ایک عورت غوث پاک کے پاس آئی اور عرض کی دُعا فرمائیں اللہ کریم مجھے اولاد عطا فرمائے۔ آپ نے لوحِ محفوظ کا مشاہدہ فرمایا، وہاں اس عورت کی اولاد نہیں لکھی ہوئی تھی، تاہم آپ نے اللہ سے دو بیٹوں کی التجا کی۔ تو ندا آئی کہ "لوحِ محفوظ میں تو ایک بھی بیٹا نہیں لکھا ہوا اور آپ دو بیٹوں کا سوال کرتے ہیں؟" آپ نے تین بیٹوں کے لئے عرض کیا، تو یہی جواب ملا۔ آپ نے چار بیٹوں کا سوال کیا، پھر وہی جواب ملا۔ پھر پانچ کا سوال کیا، تو وہی جواب ملا۔ پھر چھ کا سوال کیا، تو وہی جواب ملا۔ آپ نے سات بیٹوں کا سوال کیا، تو ندا آئی: "اے غوث اتنا ہی کافی ہے۔" اور یہ بشارت بھی ملی کہ "اللہ تعالیٰ اس عورت کو سات لڑکے عطا فرمائے گا۔" (تفریح الخاطر، ص ۴۲، مطبوعہ مصر)

اس اقتباس سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ہی سید عبدالقادر جیلانیؒ کے سوالوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ تاہم یہ وضاحت نہیں کی کہ اللہ نے لوحِ محفوظ میں بھی ترمیم کی تھی یا وہ ویسے کی ویسے ہی رہی۔ غالباً کر ہی لی ہو گی۔

لوحِ محفوظ میں تبدیلی کی نئی شکل

ضیاء اللہ قادری سیرت غوث الثقلین کے صفحہ ۲۰۹ پر رقمطراز ہیں کہ :

"السعُود حریمی بیان کرتے ہیں کہ ایک تاجر ابوالمظفر نے شیخ حماد کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میں سات سو دینار کا مال لے کر ملک شام کی طرف تجارت کے لئے جانا چاہتا ہوں۔ شیخ حماد نے فرمایا : " اگر تم اس سال سفر کرو گے، تو تم قتل کیئے جاؤ گے اور تمہارا مال لُوٹ لیا جائے گا۔" ابوالمظفر مغموم حالت میں باہر نکلا، تو سیدنا غوثِ اعظم سے ملاقات ہو گئی۔ اُس نے شیخ حماد کا ارشاد سنایا، تو آپ نے فرمایا : " اگر تم سفر کرنا چاہتے ہو تو جاؤ، تم سفر سے صحیح و تندرست واپس آؤ گے اور میں اس کا ضامن ہوں۔ " یہ بشارت سن کر وہ سفر پر شام کو چلا گیا اور اپنا مال ہزار دینار میں فروخت کیا، پھر وہ حلب گیا اور وہاں اُس نے اپنے دینار ایک مقام پر رکھ دیئے اور وہاں ہی دیناروں کو بھول گیا اور حلب میں اپنی قیام گاہ پر آ گیا۔ نیند کا غلبہ تھا، آتے ہی سو گیا، خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ عرب بدوؤں نے اُس کا قافلہ لُوٹ لیا ہے اور قافلے کے کافی آدمیوں کو قتل بھی کر دیا ہے اور وہ خود بھی قتل ہو گیا ہے۔ گھبرا کر بیدار ہوا، تو اسے اپنے دینار یاد آئے، اس مقام پر پہنچا، تو دینار اسے ویسے ہی پڑے ہوئے مل گئے اور وہ واپس بغداد آ گیا اور آ کر یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پہلے شیخ حماد کو ملوں یا شیخ عبدالقادر کو کہ حسن اتفاق سے شیخ حماد سے ملاقات ہو گئی، تو شیخ حماد نے فرمایا : "پہلے غوث پاک کی حاضری دو۔ وہ محبوبِ سبحانی ہیں، انہوں نے ستر مرتبہ تمہارے حق میں دُعا مانگی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ کریم نے اس بیداری کا واقعہ خواب میں تبدیل کر دیا"۔ چنانچہ ابوالمظفر شیخ عبدالقادر کی خدمت میں آیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ : " جو کچھ تمہیں شیخ حماد نے سلطان بازار میں کہا۔ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے تیرے لئے اللہ کریم سے ستر مرتبہ دُعا کی تھی کہ تیرے قتل کے واقعہ کو خواب میں بدل دے اور تمہارے مال کے ضائع ہونے کو تھوڑی دیر کے لئے نسیان سے بدل دے۔ " (قلائد الجواہر ص ۶۵، تحفہ قادریہ، ص ۴۱، ۴۲)

یہ قصہ بھی بہت خوب ہے، مگر اس میں دو باتیں ضرور کھٹکتی ہیں۔ ایک یہ کہ جب پہلی بار ابوالمظفر شیخ حماد کا جواب سن کر باہر نکلا، تو اسی وقت اس کی شیخ عبدالقادر سے ملاقات ہو گئی۔ جنہوں نے اسی وقت جان و مال کی ضمانت دے دی، تو اُن کو ستر مرتبہ دُعا کا موقع ہی کب ملا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو اس بات کا یقین ہو کہ میں ستر مرتبہ دعا بعد میں کر لوں گا اور اللہ تعالٰے کو اس تبدیلی کے لئے منوا کے چھوڑوں گا۔ لہٰذا ابو المظفر کو ضمانت دے دی ہو۔

اور دوسری یہ بات کہ جب وہ خواب میں قتل ہوا، تو اگر اس وقت اس کے ہزار دینار اس کے پاس ہی ہوتے، تو بھی اُن کے ضائع ہونے کا چنداں خطرہ نہ تھا۔ قصہ گھڑنے والے نے خواہ مخواہ ابوالمظفر سے حلب کے ایک مقام پر پیسے رکھوائے، جو وہ بیداری کے بعد لینے گیا تھا اور مفت میں حلب کا چکر ڈلوا دیا۔

البتہ اس لحاظ سے ہم اس قصہ نزاکش کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس نے شیخ حماد اور شیخ عبدالقادر دونوں کی لاج رکھ لی۔ رہی لوحِ محفوظ کی تحریر کی بات تو یہ اللہ کا کام ہے، جیسے چاہے بعد میں ترمیم کرتا ہے۔

اس عقیدہ کی مزید توثیق

شیخ عبدالقادر جیلانی کا بیان ہے کہ "مجھے اپنے ربِ جلیل کی عزت و عظمت کی قسم! میرے سامنے نیک بخت اور بد بخت لوگ پیش کئے جاتے ہیں۔ میری نظر لوحِ محفوظ پر ہوتی ہے۔ میں اللہ کے علوم اور مشاہدات کے سمندروں میں تیرنے والا ہوں۔" (سیرت غوث، ص ۱۳۶، بحوالہ بہجۃ الاسرار، ص ۲۲۔ قلائد الجواہر، ص ۲۶۔ تفریح الخاطر ص ۴۴)

اور صوفیاء کے شیخ اکبر ابنِ عربی نے تو اپنی کتاب فصوص الحکم پوری کی پوری لوحِ محفوظ کو دیکھ کر نقل فرمائی تھی۔ آپ فرماتے ہیں:

"میں نے اسے لوحِ محفوظ سے نقل کیا۔ بعد میں ۶۲۷ھ کے محرم میں رسول اللہ ﷺ کو دمشق کے شہر محروسہ میں دیکھا۔ آپ کے ہاتھ میں کتاب تھی۔ آپ نے فرمایا: "یہ کتاب فصوص الحکم ہے۔ اس کو محفوظ کرو اور لوگوں کے سامنے پیش کرو، تاکہ انہیں فائدہ حاصل ہو۔ چنانچہ میں نے آپ کے حکم کے مطابق اسے لوگوں میں پھیلانے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اس میں کمی بیشی کرنا میرے لئے ممکن نہ رہا۔" (فصوص، ص ۴۷، ۴۸)

اس تین سطر کے اقتباس میں ابنِ عربی کے فصوص الحکم کے متعلق دو بیان ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے یہ کتاب لوحِ محفوظ سے نقل کی دوسرے یہ کہ کچھ ہی عرصہ بعد یہی کتاب محروسہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ نے خود ان کو لکھی لکھائی دی تھی۔ دونوں بیان ایک دوسرے سے بڑھیا ہیں۔ ان میں سے جونسا چاہیں قبول فرمالیجئے۔ یا چاہیں، تو دونوں ہی قبول فرمائیے۔

پھر تو یہ دستور ہی چل نکلا کہ جس شخص کے جی میں آئے کہہ دے کہ میں نے اپنی کتاب لوحِ محفوظ سے نقل کی ہے۔ چنانچہ فرغانی صاحب نے بھی مرشد کامل کی تصنیف کے متعلق بھی ایسا ہی دعوائے کر دیا جس کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔

۱۳۔ عبادات میں غلو اور بدعات

بدعت کی اقسام

بدعات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ عبادات و نوافل جن کا ثبوت کتاب و سنت میں موجود ہے، اس پر کچھ اضافہ کر لیا جائے گا۔ مثلاً:

رسول اکرم ﷺ رات کو عبادت بھی کرتے تھے اور سوتے بھی تھے۔ اب اگر ایک شخص خالص نیکی کے جذبہ سے تہیہ کر لے کہ میں ساری رات قیام کر کے اللہ کی عبادت میں مشغول رہوں گا، تو یہ غلو فی العبادت اور ایک طرح سے بدعت ہے۔ اسی طرح نمازِ تہجد رسول اکرم ﷺ پر فرض تھی، دوسروں پر نہیں۔ اب اگر کوئی شخص اپنے آپ پر قیام اللیل کو فرض قرار دیتا ہے، تو اس کی بھی یہی صورت ہوگی اور اگر کوئی شخص پانچ فرض نمازوں کے بجائے چھ نمازیں اپنے آپ پر فرض کر لیتا ہے، تو یہ بھی بدعت ہے۔

اسی طرح روزہ کی مثال ہے۔ حضور اکرم ﷺ بعض دفعہ خود تو متواتر روزے رکھتے چلے جاتے تھے۔ افطاری نہیں فرماتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے دوسروں کو اس سے منع فرما دیا۔ نیز آپ ﷺ نے امت کو ہمیشہ روزہ رکھنے سے منع فرما دیا۔ اب اگر کوئی شخص روزانہ روزے رکھتا چلا جائے، تو یہ عبادت بھی مقبول نہیں بلکہ مذموم ہوگی، جیسا کہ ہم اس سے بیشتر کئی احادیثِ صحیحہ سے ثابت کر چکے ہیں۔

صدقہ و خیرات کی بھی مثال اسی طرح ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے پاس جو کچھ ہوتا دے دلا کر فارغ ہو جاتے لیکن اُمت کو یہ اُصول بتایا کہ اَلصَّدَقَةُ عَنْ ظَهْرِ غِنًى (بخاری) یعنی صدقہ وہ ہے جس کے بعد انسان خود محتاج نہ ہو جائے، تو اگر کوئی مسلمان آپ ﷺ کے اس فرمان کا لحاظ نہیں کرتا، تو یہ فعل مسنون نہیں، بلکہ بدعت ہوگا۔

یہی حال حج کا ہے۔ حج اس شخص پر فرض کیا گیا ہے جس کے پاس راستہ کی سواری کا اور اپنے کھانے پینے کا خرچ بھی ہو اور گھر والوں کے پاس بھی خرچ چھوڑ جائے۔ اب اگر کوئی شخص حج پیدل چل کر دور دراز کا سفر طے کرنے کی نیت کرتا ہے۔ یا راستے میں لوگوں سے مانگ کر کھاتا ہے یا لوگوں سے رقم فراہم کر کے حج کرنے جاتا ہے یا سواری پاس موجود ہو تو از راہِ تبرک اس پر سوار نہیں ہوتا، تو یہ سب کام نیکی کے کام نہیں، بلکہ خلافِ شرع ہیں اور بدعت ہیں۔

یہ تو عبادات میں اضافہ کی بات تھی۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اضافہ تو نہیں کرتا۔ البتہ اس کے طریقِ کار میں تبدیلی پیدا کر لیتا ہے اور بزعمِ خود یہ سمجھتا ہے کہ یہ طریقہ مسنون طریق سے بہتر اور افضل ہے اس کی مثال درج ذیل واقعہ سے واضح ہوتی ہے :۔

"حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ کی جامع مسجد میں داخل ہوئے، تو دیکھا کہ لوگ مختلف حلقوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر حلقہ کے درمیان کنکریوں کا ڈھیر ہے اور ہر حلقہ میں ایک آدمی کھڑا ہے، جو ان سے کہتا ہے کہ سو بار "سبحان اللہ" کہو۔ لوگ سبحان اللہ کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ سو بار "الحمد للہ" کہو۔ لوگ الحمد للہ کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ سو بار "اللہ اکبر" کہو۔ تو لوگ اللہ اکبر کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کو اس حالت میں دیکھ کر کہا: "اللہ کی قسم! کیا تم ایسے دین پر ہو، جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہدایت والا ہے یا تم گمراہی کے دروازے کھول رہے ہو۔" (دارمی ص ۶۸)

اب دیکھئے سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر کا وظیفہ کرنا مسنون ہے۔ لیکن اپنے طور پر، اس کی جو شکل ان لوگوں نے اختیار کی وہ دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں تھی۔ لہٰذا حضرت عبداللہ بن مسعود صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے گمراہی قرار دیا۔ کیونکہ ذکر اذکار کا یہ طریق مسنون نہیں بدعیہ تھا۔

بدعت کی دوسری قسم یہ ہے کہ اس کا اصل بھی آثار و سنت میں موجود نہ ہو اور وہ دین کا کام اور ثواب سمجھ کر رائج کی جائے۔ اور ایسی بدعات بے شمار ہیں۔ مثلاً عید کی نماز سے پہلے اذان دینا۔ اذان سے پہلے درود کہہ کر اذان کا شروع کرنا، یہ تیجا، ساتواں کے ختم شریف وغیرہ۔ صوفیاء میں ترکِ دنیا اور نفس کی ریاضتیں اور چلہ کشی، حبسِ دم وغیرہ سب اسی ذیل آتے ہیں۔

ہر طرح کی بدعت گمراہی ہے

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بدعت جب بھی شروع کی جاتی ہے، تو نیک ارادوں، نیک تمناؤں، خدا کی خوشنودی اور ثواب کی نیت سے شروع کی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود سراسر گمراہی ہے، جیسا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ

اور جو بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کی تقسیم کر کے بدعتِ حسنہ کو صحیح سمجھا جاتا ہے۔ وہ بھی اس حدیث کی رُو سے سراسر گمراہی ہی ہوتی ہے۔

بدعتِ حسنہ کے جواز میں جو لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جماعت تراویح شروع کرائی اور پھر

دیکھ کر فرمایا کہ "نِعْمَ الْبِدْعَۃُ ھٰذِہٖ" تو اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مقام پر بدعت کا لفظ شرعی اصطلاح کے طور پر نہیں، بلکہ لغوی مفہوم کے طور پر استعمال فرمایا تھا۔ نمازِ تراویح کی جماعت رسول اللہ ﷺ نے خود بھی کئی بار کرائی۔ یہاں اس سے مراد صرف نیا پن (NOVELTY) (قاموس الجدید العصری) ہے۔ یعنی جماعت کا التزام جو آپ نے فرمایا۔ جب لوگ پہلے سے اکیلے اکیلے مختلف ٹولیوں کی صورت میں باجماعت ادا کر رہے تھے۔

بدعت کا دوسرا پہلو

کسی سنت میں کمی کرنا عصیان ہے۔ جیسے کوئی شخص صلوٰۃ موقتہ میں فرضوں کے علاوہ کبھی سنتیں نہ پڑھے، تو یہ عصیان ہے اور یہ قابلِ معافی ہے مگر سنت میں اضافہ کرنا یا نئی بات شامل کرنا غلو فی العبادات اور بدعت ہے جو کفر اور شرک کی حدوں کو چھوتا ہے، لہٰذا یہ ناقابلِ معافی جرم ہے۔ الا یہ کہ توبہ کر لی جائے۔ کیونکہ اس شخص نے رسول اللہ ﷺ کے قائم کردہ طریق کو ناکافی اور شریعت کو نامکمل سمجھ کر اس میں اضافہ کیا ہے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ بندے کا شرک کے سوا تمام گناہوں میں مبتلا ہو جانا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ کسی بدعت میں مبتلا ہو۔ لیکن جب ہم ان صوفیاء کے اعمال و کردار پر نظر ڈالتے ہیں، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عبادات و افعال میں سے بیشتر بدعات ہی کا مجموعہ ہیں۔ اب ہم ان کی کتابوں سے مستند واقعات پیش کریں گے جو اس دعویٰ کا واضح ثبوت ہیں:

اویسؒ قرنی کی عبادت

"کیمیائے سعادت، تفسیر حسینی، تذکرۃ اولیاء، مجالس المؤمنین اور روضۃ الصالحین مذکور ہے کہ جناب خواجہ اویس قرنی بعض رات کو آپ فرماتے: "ھٰذِہٖ لَیْلَۃُ الرُّکُوْعِ" ساری رات رکوع کی حالت میں رہتے صبح ہوتی، تو رکوع سے سجدہ میں جاتے۔ بعض رات کو آپ فرماتے "ھٰذِہٖ لَیْلَۃُ السُّجُوْدِ" (یہ شب سجدہ کی شب ہے) اور ایک ہی سجدے میں صبح ہو جاتی۔ کسی نے عرض کیا یا اویس! یہ آپ کو کس طرح اطاعت کی طاقت ہے کہ ایک رکوع یا ایک سجدے میں رات بسر کر دیتے ہیں؟ آپ نے آہ بھرتے ہوئے فرمایا: "کاش! ازل سے ابد تک ایک ہی رات ہوتی کہ ایک رکوع یا ایک سجدے میں رات تمام کر دیتا۔"

"ایک اور روایت ہے کہ حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ میں کبھی بھی اچھی طرح ایک بار بھی سبحان ربی الاعلیٰ کہنے نہیں پاتا کہ سورج طلوع ہو جاتا ہے۔ اور تین بار تسبیح کہنا تو سنت ہے، بس تو سنت بھی پوری کرنے نہیں

پاتا۔ پھر فرمایا: "میں یہ سب کچھ اس لئے چاہتا ہوں کہ فرشتوں کی طرح عبادت کروں۔" (الاولیس، ص ۳۷)

یہ ہے اتباع سنت کا نمونہ، جو مندرجہ بالا پانچ کتابوں میں مذکور ہے۔

عبداللہ خفیفؒ کی عبادت

"رات دن عبادت میں مصروف رہتے۔ کہتے ہیں کہ ایک ایک رکعت میں ہزار بار قل شریف پڑھتے تھے۔ غذا بہت کم ہوتی تھی۔ روزہ صرف سات دانہ منقہ سے افطار فرماتے اور بس۔ اسی وجہ سے عبداللہ خفیف مشہور ہوئے۔" (مقربان حق۔ خلاصہ تذکرہ اولیاء، ص ۱۵۹)

یہ آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ ایک ہزار قل شریف پڑھنے میں کتنا وقت صرف ہو سکتا ہے اور وہ ہر رکعت میں اتنی بار جو پڑھتے تھے، تو فرض نمازوں کا کیا حشر ہوتا ہوگا۔

امام جعفر صادقؒ کا صدقہ

"امام صاحب کا ایک دوست حج پر روانہ ہوا اور رخصت ہوتے وقت اس نے دس ہزار درہم آپ کو بطور امانت دیئے اور کہا کہ اس سے میرے لئے میری واپسی تک مکان خرید رکھیں۔ آپ نے اس کے جانے کے بعد وہ سارا روپیہ اللہ کی راہ میں تقسیم کر دیا۔ جب وہ واپس آیا تو آپ نے فرمایا: "تمہارے لئے میں نے جنت میں مکان خرید لیا ہے۔ جس کی ایک دیوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کی دیوار سے ملتی ہے، دوسری دیوار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکان سے، تیسری حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور چوتھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے گھر سے ملتی ہے اور

لہ **دوسرا پہلو:** اب تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ اگر اس گروہ میں افراط اور تفریط کی انتہا پائی جاتی ہے۔ عبدالکریم جیلی مصنف انسان کامل لکھتے ہیں کہ ابلیس اپنی ذریت کو انسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے جب بھیجتا ہے، تو ہر گروہ کو الگ الگ کام کے لئے تاکید کرتا ہے۔ اس ضمن میں شیطانوں کا ایک گروہ "اہل علم کو تعلیم دیتے ہیں کہ وہ مناجات و عبادات کی پستی میں قائم رہیں۔" مصنف کی یہ بات اس کے مترجم کو بھی ناگوار محسوس ہوئی، تو اس نے ساتھ ہی یہ صراحت کر دی کہ:

"مناجات اور عبادات سعادت میں داخل ہیں، لیکن عارفین موحدین، جو توحید وجودی پر فریفتہ ہیں۔ اس کو حجابات میں داخل کرتے ہیں۔ اسی لئے شیطانی ضلالت میں مصنف علیہ الرحمۃ نے اسے داخل کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔" (انسان کامل، ص ۲۹۱)

ہم حیران ہیں کہ جب مترجم نے مصنف کے اس فعل کو غلط اور توحید وجودی پر فریفتگی پر محمول کیا ہے تو اس مصنف کو عارفین موحدین کے زمرہ میں شامل کرنے کے کیا معنی ہیں اور انہیں علیہ الرحمۃ کے الفاظ سے یاد کرنے کے کیا معنی ہیں؟ کیا اس طرح وہ زمرہ عارفین موحدین کی توہین تو نہیں کر رہے؟ کیا ایسے لوگوں کو عارف موحد کہنا درست ہے؟

میں نے اس کی دستاویز بھی تیار کر لی ہے، جو تمہارے حوالہ کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر ایک کاغذ لائے، جو اس کے حوالے کر دیا۔ اس شخص نے یہ کاغذ اپنے پاس رکھا اور وفات سے پہلے وصیت کی کہ یہ دستاویز میرے کفن میں رکھی جائے۔ اس کے لواحقین نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے دن لوگوں نے وہ کاغذ اس کی قبر پر پڑا پایا۔ اس کی پشت پر لکھا تھا کہ "جعفر بن محمد کی تحریر کو منظور کر لیا گیا ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۴۹)

اس روایت کے راوی نے کئی غلط باتیں امام جعفرؒ کی طرف منسوب کر دیں۔ مثلاً:

۱۔ امانت کی رقم یا تو مالک کو واپس دینا ضروری ہے۔ یا اسے مالک کی مرضی کے تحت خرچ کرنا، اس کے علاوہ دوسرے کسی مصرف میں خواہ اس سے ہزار گنا بہتر ہو، یہ وہ رقم خرچ نہیں کی جا سکتی۔ لیکن امام صاحب نے کسی کی رقم کو اپنی طرف سے صدقہ کر کے شریعت کی خلاف ورزی کی۔

۲۔ پھر جو جنت میں مکان لے کر دیا اس کا کوئی بیرونی دروازہ ہے ہی نہیں، جو سڑک یا گلی کی طرف کھلتا ہو۔ جس سے وہ خود یا اس کے اقارب داخل ہو سکیں۔

۳۔ اس بیچارے کو اس دنیا میں رہائش کے لئے مکان کی ضرورت تھی۔ رقم جنت کے مکان پر لگ گئی، تو بیچارا مرنے تک کرایہ کے مکان میں گزارا کرتا رہا ہوگا۔

۴۔ جنت میں رسول اللہ ﷺ کا مقام وسیلہ ہے۔ جس میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں اور یہی دعا ہر مسلمان اذان کے بعد رسول اللہ ﷺ کے حق میں مانگتا ہے۔ پھر آپؐ کے مکان کی دیوار کے ساتھ اس شخص کی یا دوسروں کی دیواریں کیسے ہو سکتی ہیں۔

۵۔ دنیا میں تو اسے مکان نہ مل سکا اور جو جنت کے مکان کی دستاویز کی توثیق ہوئی، تو وہ بھی مرنے کے بعد اور بغیر دستخطوں کے۔ جو اسے نہیں بلکہ دوسروں کو ملی۔ وہ بھی سوچتا تو ہوگا کہ امام موصوف پر ایسا اعتماد کیوں کیا؟

ابوالحسن خرقانی (م ۴۲۵) کا صدقہ اور قرض بذمہ میت

"فرمایا: دنیا سے قرضدار جانا اور قیامت کے دن قرض خواہوں کا دامن گیر ہونا پسند ہے۔ مگر سائل کی حاجت کو رد کر دینا گوارا نہیں۔"

(صوفیائے نقشبند، ص ۱۳۰)

ایک دفعہ کسی صحابی نے آکر رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ "شہید کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں؟" تو آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں!" وہ سائل مڑ کر چلا، تو آپ نے اسے واپس بلایا اور فرمایا کہ "ابھی ابھی جبریل

آیا، تو اُس نے فرمایا ہے "اِلاَّ الدَّیْنَ" [1] یعنی شہید کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں مگر قرضہ معاف نہیں ہوتا۔ آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ جس میت کے سر پر قرض ہو جب تک کوئی شخص اس قرضہ کی ادائگی کی ضمانت نہ دے دیتا۔ آپ اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھاتے تھے اور صحابہ سے فرماتے تھے کہ جاؤ تم خود ہی اس کا جنازہ پڑھ لو۔ بایں ہمہ ابوالحسنؒ خرقانی کو یہ سب کچھ گوارا ہے۔ مگر یہ گوارا نہیں کہ سائل خالی ہاتھ واپس جائے۔ جس کے لیے شریعت نے مکلف نہیں کیا۔

معروفؒ کرخی کا تبسم

"وفات کے وقت شیخ سری سقطیؒ حاضرِ خدمت تھے کہا مجھے نصیحت و وصیت فرماتے۔ فرمایا: "میں مرُوں، تو میرا کُرتہ صدقے میں دے دینا تاکہ دنیا سے برہنہ جاؤں، کیونکہ بطن مادر سے برہنہ ہی پیدا ہوا تھا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۲۹)

دیکھا آپ نے، اِسے کہتے ہیں اتباعِ سنت۔ کیا میت کو کپڑوں میں کفنانا سنت نہیں؟

ابوالحسین کے اُستاد کی غیرتِ فقر

"امام ابوبکر اسحاق کلاباذی لکھتے ہیں:
"شیخ ابوالحسین دراج نے سرمہ دانی کی تلاش میں اپنے استاد کے برتن کو ٹٹولا، تو اس میں چاندی کا ایک ٹکڑا پایا۔ فرماتے ہیں، اس پر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ جب استاد آئے، تو میں نے عرض کیا، آپ کے برتن میں مجھے چاندی کا ایک ٹکڑا ملا ہے۔ انہوں نے فرمایا: تم نے دیکھ لیا ہے؛ اُسے وہیں رکھ دو۔ پھر کہا اسے تم لے لو۔ اس پر میں نے کہا: آپ کو اپنے معبود کی قسم! اس ٹکڑے کا کیا قصہ ہے؟ فرمایا: "اللہ نے اس کے سوا کوئی اور سونے یا چاندی کا ٹکڑا نہیں دیا۔ تو میں نے چاہا میں وصیت کروں کہ اِسے میرے کفن کے ساتھ باندھ دیا جائے، تاکہ اسے اللہ کو واپس کر دوں۔" یہ رہی ان کی غیرتِ فقر۔" (روحِ تصوف، ص ۱۷۰، بحوالہ التعرف ترجمہ پیر محمد حسن صاحب)

اب دیکھئے کیا 'عطائے تو بلقائے تو' کی اس سے زیادہ واضح کوئی اور مثال مل سکتی ہے؟ اور کیا یہ استاد صاحب اس طرح اللہ تعالیٰ کے سب انعامات کا حساب چکا سکتے ہیں؟ اگر اتنی ہی غیرتِ فقر ترقی کر گئی تھی، تو جب اللہ نے یہ ٹکڑا دیا تھا، اس وقت لیا ہی کیوں تھا؟ کیا یہی خدا کے انعامات کے شکریہ کے انداز ہیں۔ ؎

خداوندا تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں   کہ درویشی بھی عیاری و سلطانی بھی عیاری

---

[1] مسلم۔ کتاب الامارۃ باب اغفر اللّٰہم لھا (۔۔۔)

اب اس فقر کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیے:

پیرانِ پیر (م ۵۶۱ھ) کا قیمتی لباس اور اس کی وجہ جواز

"بغداد کے مشہور بزاز ابوالفضل راوی ہیں کہ غوث پاک کا خادم میرے پاس آیا اور کہا کہ مجھے ایسا قیمتی اور عمدہ کپڑا درکار ہے جس کی قیمت فی گز ایک اشرفی ہو۔ نہ قیمت اس سے کم ہو نہ زیادہ۔" میں نے پوچھا: "اتنا قیمتی کپڑا کس کے واسطے درکار ہے۔ خادم نے حضورؒ کا نام لیا۔ میرے دِل میں خیال آیا کہ جب ایسا قیمتی لباس فقرا پہنیں گے، تو خلیفہ وقت کیا پہنے گا؟ انہوں نے تو بادشاہ کے لئے تو کوئی کپڑا ہی باقی نہ چھوڑا۔ بس اس خیال کا آنا تھا کہ میرے پاؤں میں غیب سے ایک ایسی کیل چبھی کہ قریب المرگ ہو گیا۔ ہر چند نکالنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ آخر آنحضرت کے پاس لائے۔ آپ نے فرمایا: "اے ابوالفضل! تو نے اپنے دل میں ہم پر کیوں اعتراض کیا؟ خدا کی قسم! میں نے اس کپڑے کو نہیں پہنا جب تک مجھے یہ نہ کہا گیا کہ ایک قمیص ایسے کپڑے کا پہن، جس کی قیمت فی گز ایک اشرفی ہو۔" (اخبار الاخیار فارسی، ص ۲۱، تفریح الخاطر، ص ۲۳۔ قلائد الجواہر، ص ۴۵۔ نزہتہ الخاطر الفاتر، ص ۴۷، تحفہ قادریہ، ص ۵۱۔ بحوالہ سیرت غوث، ص ۱۴۶)

دیکھا قیمتی لباس کے جواز کے لئے کیا خوب صورت افسانہ تراشا گیا ہے۔ ادھر ابوالفضل کے دل میں خیال آیا، اُدھر غیب سے ایک ایسی کیل چبھی کہ نکالنے سے نکلتی ہی نہ تھی اور جان لیوا ثابت ہوئی۔ پھر اس کا علاج بھی کسی حکیم، ڈاکٹر کے بجائے صرف پیرانِ پیر کے پاس تھا۔ شاید ابوالفضل کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میری اصل مرض یہ کیل چبھنا نہیں، بلکہ پیرانِ پیر کے متعلق دل میں یہ خیال آنا تھا اور اس جرم میں مجھے غیب سے سزا ملی ہے۔ پھر اس لاعلاج مریض کو جب آپ کے پاس لایا گیا، تو آپ نے اس کے اصل مرض یا جرم ہی کا علاج فرمایا اور کیل تو امید ہے خود بخود ہی نکل گئی ہو گی اور زخم بھی اسی دم مندمل ہو گیا ہو گا۔ تاہم اس بات کا تذکرہ ان پانچ سات تذکرہ نگاروں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا۔

اب اسی طرح کا ایک دوسرا قصہ ملاحظہ فرمائیے:

شیخ ابوالسعودؒ کی قیمتی پگڑی

"شیخ ابوالسعود (م ۵۷۹ھ) پیرانِ پیر کے بزرگ ترین خلفاء سے تھے۔ مکلف طعام کھاتے اور لباس فاخرہ پہنتے۔ ایک دفعہ دو سو دینار قیمت کی دستار پہن رکھی تھی۔ ایک درویش کے دِل میں خیال آیا کہ یہ تو فضول خرچی اور قرآن کے حکم کے خلاف ہے اس سے تو دو سو درویشوں کا لباس تیار ہو سکتا ہے۔ شیخ کو

نورِ باطن سے یہ بات معلوم ہو گئی۔ آپ نے درویش کو کہا یہ پگڑی بازار میں لے جا کر بیچ ڈال اور درویشوں کے لئے طعام مہیا کر۔ اس درویش نے پگڑی بیچ کر مکلّف دسترخوان آراستہ کیا مگر شیخ کو دیکھا تو وہی پگڑی سر پر تھی۔ بڑا حیران ہوا۔ شیخ نے فرمایا: "حیران نہ ہو اور اس شخص سے اس کی کیفیت پوچھ" چنانچہ اس شخص نے کہا "میں پچھلے سال کشتی میں سوار تھا کہ طوفان نے آگھیرا۔ میں نے منت مانی، اگر بچ گیا، تو ایک قیمتی دستار شیخ کی نذر گزرانوں گا۔ چھ ماہ سے مجھے کوئی قیمتی دستار مل نہیں رہی تھی۔ آج ایک دکان پر دیکھی، تو خرید کر ہدیہ شیخ کیا۔ شیخ نے کہا: "سنا! میں نے یہ پگڑی خود نہیں باندھی، بلکہ کسی اور نے بندھوائی ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۷۶)

سچ فرمایئے کہ الف لیلہ کی داستانیں اچھی ہیں یا اولیاء اللہ کی کرامات کے یہ قصے؛ بہر حال لباس فاخرانہ کا جواز تو مل گیا کہ وہ ندائے غیب یا حکم الٰہی کی بنا پر پہنا کرتے ہیں۔ البتہ فقر یہ حضرات اپنی طرف سے اختیار فرماتے ہیں۔

کم خوری کا معیار

"بزرگوں کا قول ہے کہ سالک کی بھوک اختیاری ہے، کیونکہ اگر وہ سیر ہو کر کھائے گا تو اس کا نفس زور پکڑے گا اور پھر سالک اس کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ نفس کو اتنا ضعیف اور ناتواں کرنا چاہیئے کہ اگر اسے بال میں جکڑ دیں، تو اسے نہ توڑ سکے یہ بات بھوک کے سوا حاصل نہیں ہو سکتی۔" (مرشدِ کامل، ص ۹۵)

یہی وہ ریاضت ہے جس کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ مسلسل روزہ رکھنے سے منع فرمایا اور فرمایا "حضرت داؤد علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے اور دشمن کے مقابلے میں جنگ سے بھاگتے نہ تھے۔" اور فرمایا "وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ"۔

ترکِ دنیا کا معیار

"نقل ہے کہ بایزید بسطامی کو ۷۰ دفعہ خدا کا تقرب حاصل ہوا۔ آپ نے ہر دفعہ کہا میں ابھی پورا کلمہ گو اور مسلمان نہیں ہوا کئی سالوں تک آپ نے ٹوٹی ہوئی لاٹھی اور پرانا جبہ رکھا آخر چالیس رات دن ریاضت کرتے رہنے کے بعد آپ نے خدا کی بارگاہ میں عرض کی کہ الٰہی! اگر تو مجھے اپنے فضل و کرم سے باریابی کا شرف عطا فرمائے، تو تیرا کیا نقصان ہے؟" ہاتف نے آواز دی۔ "بایزید! تو اس ٹوٹی ہوئی لاٹھی اور پرانے جبے سے ہماری بارگاہ میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔" آپ نے اسی وقت دونوں کو زمین پر پھینک دیا اور آپ کا مقصد حاصل ہو گیا۔" (مرشد کامل، ص ۹۶)

اس واقعہ کی ابتداء میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ بایزید کو ۲، دفعہ خدا کا تقرب حاصل ہوا۔ پھر اور کون سے شرفِ باریابی کی التجا فرما رہے تھے۔ کیا خدا کے تقرب حاصل ہونے اور خدا کا شرفِ باریابی میں کچھ فرق ہے؟ یہی ایک نکتہ باقی ہے کہ آپ کو کھٹکا لگا رہتا تھا کہ یہ جبہ اور لاٹھی مسلمان ہونے کی شان کے منافی ہے جس کی تائید ہاتفِ غیبی نے کر دی۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ چیزیں رسولِ خدا ﷺ بھی استعمال فرماتے تھے، تو ایسی ندائے غیبی کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

بایزید بسطامیؒ کا نماز دہرانا

"حضرت بایزید بسطامیؒ نے کسی امام کے پیچھے نماز پڑھی بعد از فراغت امام نے پوچھا: "یا حضرت! آپ مانگتے بھی کسی سے کچھ نہیں اور کرتے بھی کچھ نہیں، تو گزر بسر کیسے ہوتی ہے؟" آپ نے فرمایا: "ٹھہرو! میں نماز کا اعادہ کر لوں، کیونکہ جو اپنے رازق کو نہیں پہچانتا اس کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔" (درجِ تصوف، ص ۱۶۳، بحوالہ تاریخ مشائخ نقشبندیہ، ص ۶۲)

دیکھا آپ نے اس سوال پر بسطامیؒ نے کتنی گرمی کھائی اور کیسا مسکت جواب دیا۔ امید ہے اس امام نے زندگی بھر پھر کبھی ایسا سوال نہ کیا ہو گا۔ رہا نماز کا مسئلہ، ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کی پہلی نماز جو امام کے پیچھے پڑھی تھی، ہو گئی تھی۔ اگر پھر بھی آپ نے غصہ میں اعادہ فرما لیا ہو تو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔

عبدالقادر جیلانیؒ کا وضو

"ابوالفتح ہروی بیان کرتے ہیں کہ میں غوثِ اعظم کی خدمت میں چالیس سال تک رہا اور اس مدت میں میں نے آپ کو ہمیشہ عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔" (بہجۃ الاسرار، ص ۵۹۔ قلائد الجواہر، ص ۶۷۔ اخبار الاخیار، ص ۱۰۔ جامع کرامات، ج ۲، ص ۲۰۱۔ نفحات الانس، ص ۔ طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۱۲۸۔ محفل نامہ گیارھویں شریف، ۲۴۹۔ بحوالہ سیرت غوث، ص ۸۴)

اب دیکھئے ہروی صاحب کے اس بیان کو ۸ تذکرہ نگاروں نے نقل فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت نہایت ہی معتبر ہے، مگر یہی ضیاء اللہ قادری صاحب اپنی کتاب "سیرت غوث" کے صفحہ ۲۴ پر فرماتے ہیں کہ "آپ کی اولاد کثرت تعداد میں تھی۔ اس اولاد میں سے صرف دس لڑکوں کے نام لکھے ہیں۔ اور یہ ان لڑکوں کے نام ہیں جو زیادہ مشہور رہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی کل اولاد بیس چالیس سے کم کیا ہو گی۔ اب سوال یہ ہے کہ ان چالیس سال میں، جن میں آپ نے عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی

کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔ یا کسی بیوی کے پاس نہ گئے تھے؟ کیا اتنی کثیر تعداد میں اولاد والا شخص مسلسل چالیس سال تک اس فطری عمل سے رُک سکتا ہے۔ اسی ایک بات سے ان تذکرہ نگاروں کی روایتوں کی صحت کا بھرم کھل جاتا ہے۔ پھر قادری صاحب بھی بلا سوچے سمجھے حوالہ جات کا انبار لگائے چلے جاتے ہیں، مگر یہ نہیں سوچتے کہ اس کا امکان بھی ہے یا نہیں؟

پیرانِ پیرؒ کے نوافل

"آپ ہر روز ایک ہزار رکعت نفل ادا فرماتے تھے۔"

(تفریح الخاطر، ص ۲۶، بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۸۵)

اب دیکھئے فطری حوائج، کھانا، پینا، سونا سب آپ کے ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ پانچ فرض نمازیں جن پر تقریباً دو گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ پھر آپ کے مجالس وعظ بھی منعقد کیا کرتے اور درس دیا کرتے تھے۔ پھر آپ کثیر الاولاد ہونے کی وجہ سے آپ کے خانگی مسائل بھی بہت تھے۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ اگر فل سپیڈ پر حنفیوں والی نماز بھی ادا کی جائے، تو بھی اوسطاً ایک منٹ فی رکعت کے حساب سے ایک ہزار رکعت پر ۱۶ گھنٹے ۴۰ منٹ صرف ہوتے ہیں اور دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں باقی صرف ۷ گھنٹے اور ۲۰ منٹ بچتے ہیں، ان میں مندرجہ بالا حوائج پورے ہو سکتے ہیں؟

شیخ محمد میر کی عبادت و ریاضت

"ان کی ریاضت کا یہ حال تھا کہ رات کبھی نہ سوتے اور حبسِ دم کی یہ حالت تھی کہ ایک دم میں تمام رات گزر جاتی اور ایک ہفتہ کے بعد روزہ افطار ہوتا تھا اور کبھی بحالتِ جذب و استغراق ایک ایک ماہ تک طعام کھانے کی نوبت نہ پہنچتی تھی۔" (حدیقۃ الاولیاء، ص ۴۹)

مندرجہ بالا اقتباس میں ہم نے چار باتیں نشان زد کر دی ہیں جو سُنّتِ نبوی کے خلاف ہیں۔ پھر یہ شریعت کی اتباع ہوئی یا جوگیانہ طریقِ ریاضت؟

شیخ شاہ محمد مشہور بہ مُلّا شاہ قادری اور اتباعِ سُنّت

"اپنے گھر میں کبھی کھانا نہ پکاتے اور نہ رات کو چراغ جلاتے۔ سوائے ایک بوری کے کبھی فرش کے محتاج نہ ہوتے۔ ذکر ان کا ہمیشہ حبس دم کے ساتھ ہوتا۔ تمام عمر میں کبھی آنکھیں اُن کی نیند سے آشنا نہ ہوئیں اور نہ نکاح کیا۔ اور ہمیشہ یہ ان کی عادت میں داخل تھا کہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ تمام عمر میں ہم کو غسلِ جنابت اور احتلام کی حاجت نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ دونوں غسل

نکاح اور نیند سے متعلق ہیں اور ہم نے نہ تو نکاح کیا ہے اور نہ سوئے ہیں..... ان کا دیوان فارسی ان کی عمدہ تصانیف سے ہے اور ہر ایک شعر میں مضامین "وحدتِ وجودی" مترشح ہیں۔" (حدیقۃ الاولیاء ص ۵۷)

غرض ان کے ایسے واقعات کہاں تک پیش کئے جائیں۔ کوئی بزرگ روزانہ صرف ایک چنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ کوئی ایسے ہیں کہ روزہ کی افطاری کے لئے تھوڑی روٹی ان کو دی جاتی۔ جب ایک ماہ بعد گئے، تو ان کے حجرہ میں پوری تیس روٹیاں اسی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ وغیر ذالک۔ کیا ایسے افعال و عبادات کا سنت سے کوئی تعلق ہے؟

۱۴۔ اکلِ حلال میں غلو کی حد تک احتیاط

اکلِ حلال کی اہمیت

اسلام میں اکلِ حلال کو بہت اہمیت حاصل ہے حرام کھانے والے کی نہ نماز قبول ہوتی ہے، نہ صدقہ اور نہ دعا۔ پھر مسلمانوں کو اس بات کی بھی تنبیہ کی گئی ہے کہ مشتبہ مال سے بھی پرہیز کیا جائے، کیونکہ جو انسان مشتبہ مال کو مباح سمجھنے لگے گا، تو پھر کسی وقت حرام مال کو مباح سمجھنے کے لئے گنجائشیں نکالنے لگے گا۔ لیکن اس احتیاط کی بھی ایک حد مقرر ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو بلاتحقیق و تجسس یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مال حرام ہے یا مشتبہ؛ اور اس کی مثالیں دورِ صحابہ، تابعین و تبع تابعین میں بکثرت ملتی ہیں۔

احتیاط کی حدود

کسی مال کے متعلق تحقیق و تجسس سے معلوم کرنا کہ آیا یہ حلال ہے یا نہیں؛ ہم اس کے مکلف نہیں کہ ہم اس کی تحقیق و تجسس بھی کرتے پھریں۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب السوال باسماء اللہ، میں درج ذیل حدیث مذکور ہے:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ هُنَا اَقْوَامًا حَدِيْثًا عَهْدُهُمْ بِشِرْكٍ يَأْتُوْنَا بِلُحْمَانٍ لَا نَدْرِيْ	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ لوگوں نے حضورِ اکرم ﷺ سے کہا: "یا رسول اللہ ﷺ! یہاں چند ایسے آدمی ہیں (جو نو مسلم ہیں) ابھی اُن کا شرک کا زمانہ تازہ

يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللهِ عَلَيْهَا اَمْ لَا؟ قَالَ: "اُذْكُرُوْا اَنْتُمْ اِسْمَ اللهِ وَكُلُوْا۔" (بخاری، کتاب التوحید)

گزرا ہے۔ وہ ہمارے پاس کٹا ہوا گوشت (بیچنے کو) لاتے ہیں۔ ہم کو معلوم نہیں کہ انہوں نے اللہ کا نام لیا یا نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا "خود اللہ کا نام لے کر اسے کھا لیا کرو۔"

حضورِ اکرم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ ان سے تحقیق کر لیا کرو۔ اشتباہ کے بجائے اباحت کے پہلو کو ملحوظ رکھا۔ مزید تسلی کے لئے خود اللہ کا نام لینے کا حکم دیا۔

اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے ایک دو واقعات بھی ملاحظہ فرمائیے:

ا۔ ایک دفعہ سفر میں آپ ایک تالاب کے قریب اُترے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ: "یہاں درندے تو پانی نہیں پیتے" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو روک دیا کہ: "نہ بتانا" اس سے دو اُصول ثابت ہوئے۔ ایک یہ کہ اصل اشیاء اباحت ہے۔ دوسرے یہ کہ ظاہر حالت اگر صحیح ہے، تو تفحص اور جستجو پر ہم مکلف نہیں ہیں۔ (الفاروق، شبلی، ص ۳۵، مطبوعہ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور)

۲۔ ایک دفعہ رمضان میں بدلی کی وجہ سے آفتاب کے چھپ جانے کا دھوکہ ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روزہ کھول دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آفتاب نکل آیا۔ لوگ متردد ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اَلْخَطْبُ يَسِيْرٌ وَقَدِ اجْتَهَدْنَا (موطا امام محمد، ص ۱۸۴، بحوالہ ایضاً)

یعنی معاملہ چنداں اہم نہیں۔ ہم اپنی طرف سے کوشش کر چکے تھے۔

گویا مشتبہ مال سے بچنے کا یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ کسی چیز میں کرید کر کے اس کا پورا تا پتہ لے کر اس سے اطمینان کر لیا جائے۔ بلکہ اس کا یہ معنیٰ ہے کہ ایک معین حرام چیز سے ملتی جلتی چیز سے بھی پرہیز کیا جائے۔ اگرچہ اس کے احکام واضح نہ ہوں۔ مثلاً سُود حرام ہے، تو اس سے ملتی جلتی چیز مثلاً کمرشل انٹرسٹ بھی حرام سمجھا جائے گا۔ یا اگر سود اور قمار دونوں حرام ہیں، تو بیمہ بھی حرام قرار دیا جائے گا۔ کیونکہ اس میں ان دونوں چیزوں کا عنصر موجود ہے۔ یا اگر عورتوں کو موسیقی کی تعلیم دلانا حرام ہے، تو مردوں کے لیے بھی موسیقی یا سماع جائز نہیں قرار پا سکتا، وغیرہ۔

حِلت و حُرمت کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ایک شخص کی حرام کی کمائی اگر جائز طریقے سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے، تو دوسرے آدمی کے لئے حلال ہو گی۔ فقہی زبان میں اسے یوں بیان کیا جاتا ہے کہ "ہاتھ کی تبدیلی سے احکام بدل جاتے ہیں۔" اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک آدمی سُودی کاروبار کرتا ہے

اب کوئی دوسرا آدمی اس کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کر کے اس کی قیمت اس سے وصول کرتا ہے، تو دوسرے آدمی کو خواہ یہ بات معلوم ہو کہ یہ شخص سودی کاروبار کرتا ہے، تب بھی وہ رقم اس دوسرے آدمی کے لئے حلال متصور ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ دین کے اصول لوگوں کو مشکلات میں ڈالنے کے لئے نہیں ہیں۔

اب ان احکامات و ارشادات کی روشنی میں ہم صوفیاء کے چند واقعات درج کریں گے اور دیکھیں گے کہ اگر یہ واقعات صحیح ہیں، تو انہیں اس مشکل میں پڑنے کا کوئی جواز ہے بھی یا نہیں؛ اور اگر نہیں، تو کیا وہ اس ذیل میں نہیں آتے کہ:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۔ اے نبی ﷺ! تم اپنے پر وہ چیزیں کیوں حرام کرتے ہو، جو اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں۔ (۶۶/۱)

صوفیاء کی احتیاط

حضرت سفیان ثوریؒ

حضرت سفیان ثوریؒ کے متعلق تذکرہ نگار رقمطراز ہیں کہ:

"جب کوئی آپ کی دعوت کرتا، تو رد نہ کرتے، کیونکہ حدیث میں ہے، 'جو دعوت دے اسے قبول کرو'، لیکن روٹی اپنے گھر سے لے جاتے اور وہی کھاتے۔ صاحب خانہ کی دریافت پر فرماتے، 'مجھے اپنی روٹی کا حال معلوم ہے، مگر مجھے معلوم نہیں کہ حلال مال سے ہے یا حرام سے۔ مجھے اپنی روٹی کا علم ہے کہ حلال سے ہے۔ تیرے بلانے سے میں آگیا، لیکن روٹی اپنی کھاؤں گا۔'"

(مقربانِ حق، ص ۶۵)

غور فرمائیے دعوت قبول کرنے اور عمل بالحدیث کا یہی مطلب ہے۔ پھر جب محض شبہ کی بنا پر صاحبِ خانہ یا میزبان کو یہ جواب ملے، تو اس کی کس قدر دل شکنی ہوتی ہوگی۔ جب صوفیاء کا یہ مقولہ بھی بہت مشہور ہے:

دل بدست آور کہ حج اکبر است

حضور اکرم ﷺ کا تو یہ اسوہ تھا کہ ایک دفعہ کسی دعوت پر سارے کا سارا سالن ختم کر دیا کہ اس میں نمک زیادہ تھا اور آپ کو یہ خیال آیا کہ کہیں سالن کی اس بدمزگی پر میزبان کی دل شکنی نہ ہو۔ لیکن حضرت سفیان ثوری کا یہ عمل دلبشرطِ صحت، میزبان کو کس قدر بددل کر دیتا ہوگا۔

حارث محاسبی

"نقل ہے کہ ایک روز آپ حضرت جنیدؒ کے پاس آئے۔ آپ بھوکے تھے۔ حضرت جنیدؒ نے کہا، "ایک شادی کے گھر سے کھانا آیا ہوا ہے، چاہیں تو لا دوں۔" پھر کھانا لائے۔ آپ نے لقمہ منہ میں ڈالا، لیکن حلق سے نہ اترا۔ آخر اگل دیا۔ یہاں تک لکھا ہے کہ اگر مشتبہ کھانے میں ہاتھ ڈالتے، تو انگلیاں ٹیڑھی ہو جاتیں۔" (مقربانِ حق، ص ۱۸۲)

اب دیکھئے رسول اکرم ﷺ نے یہودیہ عورت کی (زہر آلود) بکری کا گوشت کھایا اور آپکے صحابہؓ نے بھی۔ پھر آپ کو زہر کا احساس بھی اس وقت ہوا جب لقمہ منہ میں ڈال لیا۔ آپ ﷺ کی مرض الموت میں اس زہر کو بھی دخل تھا۔ لیکن محاسبیؒ کی مشتبہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانے سے انگلیاں ہی ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ (۲) اس مشتبہ کھانے کا حضرت جنید جیسے بلند پایہ ولی اللہ کو تو علم تک نہ ہو سکا لیکن حارث محاسبی کے گلے سے اترتا ہی نہیں فیاللعجب!

احمد بن حربؒ

"نقل ہے کہ ایک بار آپ کی والدہ شریفہ نے ایک مرغ ذبح کیا اور کہا: "یہ مرغ میرے گھر کا پالا ہوا ہے۔ اس میں کچھ شک و شبہ نہیں۔ اسے کھاؤ۔" آپ نے کہا: "یہ وہی مرغ تو ہے، جو ایک روز ہمسائے کے کوٹھے پر چلا گیا اور وہاں سے دانے کھا آیا تھا۔ یہ میرے لئے حلال نہیں۔" (ایضاً، ص ۲۱۴)

غور فرمائیے! اگر حلال و حرام کا یہی معیار قائم کیا جائے، تو دنیا میں کوئی چیز حلال ثابت کی جا سکتی ہے؟ اس معیار کے مطابق تو آپ نے جو کچھ زندگی بھر کھایا تھا، اس میں بھی شبہ کے بیسیوں پہلو نکل آتے ہیں۔

بلا تبصرہ

"نقل ہے کہ آپ کا ایک بیٹا زندمشرب تھا۔ بزرگوں نے اس کی شکایت کی، فرمایا: "اصل یہ ہے کہ ایک روز پڑوسی کے گھر سے کھانا آیا تھا، میں نے کھا لیا۔ اسی رات خلوت کا اتفاق ہوا جس سے یہ لڑکا پیدا ہوا۔ وہ کھانا پڑوسی کو بادشاہ کے گھر سے ملا تھا۔ یہ اسی کا اثر ہے۔ آپ دعا فرمائیے۔ اللہ میری خطا معاف فرمائے۔" (ایضاً، ص ۲۱۴)

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ ایسے 'محتاط' صوفیاء پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یا اتنا صوفی و پرہیزگار بنا پھرے کہ عام مسلمانوں کا کھانا طعام ہی ترک کر دے کہ مبادا اس کے اندر حرام و مشتبہ مال چلا جائے اور بعض علم سے کورے اور جاہل صوفیاء و زہاد پر تو اس بیہودہ ورع و پرہیزگاری کا جنون اس قدر سوار ہوا کہ اسلامی شہروں کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز تک کو حرام و مشتبہ سمجھ کر ٹال دیتے اور نہ کھاتے مگر عیسائی

شہروں سے آئی ہوئی چیزوں کو حلال و طیب جان کر ڈکار جاتے۔ تو دیکھئے ان جاہل صوفیوں کو جہل مفرط اور غالیانہ زہد نے ہی اہلِ اسلام سے بدظن کر دیا اور عیسائیوں کے حق میں حسن ظنی اور خوش فہمی کا بیج بویا۔ (نعوذ باللہ)" (ذکرِ الٰہی، ص ۳۰۔ ترجمہ، وابل الصیّب از ابنِ قیم)

۱۵۔ پہیلیوں کی زبان اور اسرار و رموز

قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے عوام الناس کی ہدایت کے لئے بھیجا تھا۔ لہٰذا یہ ٹھیٹھ اور واضح عربی میں نازل کیا گیا۔ یہ کوئی پہیلیوں، معموں اور رموز و نکات کی کتاب نہیں اور تبلیغ کے لئے یہی سب سے بڑی خوبی ہونی چاہیے کہ وہ آسان اور عام فہم زبان میں ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے مطالب کو مختلف انداز اور مثالوں سے سمجھایا، تاکہ کوئی اُلجھن نہ رہے۔ رسول اکرم ﷺ کا بھی یہی طریقِ تبلیغ تھا، لیکن یہ صوفیاء عام فہم انداز سے ہٹ کر رموز و نکات کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ا۔ واقعات

حسن بصری کا واعظ

"نقل ہے کہ حضرت حسن بصری جب وعظ کے لئے منبر پر کھڑے ہوتے، تو دیکھتے آیا رابعہ (بصریہ) موجود ہیں یا نہیں؛ اگر موجود ہوتیں، تو واعظ کہتے ورنہ منبر سے اُتر آتے۔ جب تک رابعہ مجلس میں نہ آتیں آپ وعظ نہ کہتے۔ ایک بار لوگوں نے کہا: "کیا وجہ ہے کہ جب تک ایک ضعیفہ نہ آئے آپ وعظ نہیں کہتے حالانکہ لوگ بکثرت موجود ہوتے ہیں۔" فرمایا: "ہاتھیوں کی غذا چیونٹیوں کے آگے نہیں رکھی جا سکتی۔" سبحان اللہ"

(معتربانِ حق، ص ۴۶)

اب سوال یہ ہے کہ آپ تبلیغ لاتعداد چیونٹیوں کے لئے فرماتے تھے یا صرف ایک ہاتھی کے لئے؛ اگر ہاتھی کے لئے آپ وعظ کی غذا مہیا کرتے تھے، تو چیونٹیوں کو تکلیف دینے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ ہاتھی کو وہ غذا علیحدہ ہی دینا چاہیے جو چیونٹیوں کے کام کی نہیں۔ پھر یہ سوال چیونٹی اور ہاتھی کا نہیں بلکہ چیونٹے اور ہتھنی کا ہے۔ اگر

رابعہ بصری، حسن بصری سے پردہ نہیں کرتی تھیں تو یہ ویسے خلاف شرع ہے اور اگر کرتی تھیں، تو پھر حسن بصری کو یہ کیونکر معلوم ہوتا تھا کہ وہ اب تک تشریف لائی ہیں یا نہیں؟

اور اس سے بھی بڑا سوال یہ ہے کہ آیا حسن بصریؒ اور رابعہ بصری کی ملاقات بھی ثابت ہے یا نہیں۔ حضرت حسن بصری کا سن وفات بالاتفاق '۱۱۰ھ' ہے اور رابعہ بصری کا سن پیدائش بقول بعضے '۹۹ھ' اور بقول بعضے '۹۵ھ' ہے۔ رابعہ بصری کو بچپن ہی میں کسی نے پکڑ کر فروخت کر دیا تھا۔ ان کی پاک طینت نے خریدار کے دل میں رحم ڈالا اور اس نے رابعہ بصریہ کو رہا کر دیا۔ (دائرۃ المعارف، ج ۱۰، ص ۹۲) ان حالات میں یہ واقعہ ہی سرے سے تراشا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں رابعہ بصریہ کے بوڑھا ہونے کا ذکر ہے اور یہ سراسر محال ہے۔

رابعہ بصریہ اور گورے کالے کا فلسفہ

"نقل ہے کہ ایک بار آپ نے کسی کو چار سو درہم دیئے تاکہ کمبل لا دے۔ اس نے پوچھا: "کالا کمبل لاؤں یا سفید؟" آپ نے سنا اور درہم واپس لے کر دجلہ میں ڈال دیئے، فرمایا" اسباب دنیا سراسر فساد ہے، کمبل ابھی خریدا نہیں کہ کالے اور سفید کا تفرقہ شروع ہو گیا۔" اللہ اللہ!" (مقربان حق، ص ۴۸)

دیکھا آپ نے، جو حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ "سفید کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔" تو یہ مسئلہ کس خوبی سے حل کیا جا رہا ہے۔ آپ نے چار سو درہم تو دریا برد کر دیئے تاہم یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل فرما دیا۔

احمد خضرویہ کی مہمان نوازی

"نقل ہے کہ حضرت احمد خضرویہ کے پاس ایک درویش بطور مہمان آئے۔ ان کے ساتھ ستر اور درویش تھے۔ آپ نے ان کی خاطر ستر شمعیں روشن کیں۔ اُنہوں نے کہا یہ کیا اسراف ہے، آپ نے فرمایا: "میں نے آپ کی عزت رضائے الٰہی کے لیئے کی۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ مہمان فرستادہ خدا ہوتا ہے اس کی عزت بڑھ کر کرنی چاہیئے۔ آپ اُٹھیئے اور جس شمع کو میں نے خدا کے لئے روشن نہ کیا ہو اُسے بجھا دیجئے۔ انہوں نے شمعوں کو بجھانا اور اُن پر خاک ڈالنا شروع کیا مگر نہ بجھا سکے۔ صبح ہوئی تو بہت متعجب تھے۔ آپ نے اُن سے کہا آئیے! نہیں ایک اور عجیب چیز دکھائیں۔ درویش یہ سُن کر ساتھ ہو لیا۔ آپ اس کو لے کر باہر تشریف لائے۔ جب ایک کلیسا کے پاس پہنچے، تو دروازہ پر ایک راہب کو بیٹھے پایا۔ اُس نے آپ کو دیکھا اور کہا: "اندر تشریف لائیے۔" پھر دستر خوان بچھا کر عمدہ کھانے رکھے اور کہا "تناول فرمائیے۔"

آپ نے فرمایا: "دوست، دشمن کے ساتھ نہیں کھایا کرتے۔" اس نے کہا: "تو مجھے بھی دوست بنا لیجئے۔ میں آپ سے محبت رکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا اور اس کے گھر کے ستر آدمی اسی وقت مسلمان ہو گئے۔ آپ نے اس درویش سے فرمایا: "میں نے خدا کے لئے ستر شمعیں روشن کی تھیں۔ خدا نے مجھے یہ شرف بخشا کہ اس نے میرے ہاتھ ستر گمراہوں کے دلوں کو نورِ ایمان سے روشن کر دیا۔" (تفریحِ حق، ص...)

اس واقعہ سے مندرجہ ذیل نکات حل ہوتے ہیں:

۱۔ حضور اکرم ﷺ کے ارشاد 'مہمان کی تکریم' سے مراد اس کے لئے الگ شمع جلانا ہے۔ خدا کی رضا اور کی خوشنودی کا یہی طریقہ ہے۔

۲۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ایسی شمع کسی کے بجھائے بجھ نہیں سکتی، خواہ اُن پر مٹی بھی ڈالی جائے۔

۳۔ ایسی شمعیں جلانے سے مزید اسرارِ غیبی کھلتے ہیں اور یہ شمعیں کسی کافر کے ظلمت کدہ کو جا کر منور کرتی ہیں۔

۴۔ مہمانوں اور شمعوں کے ساتھ پُر تکلف کھانوں کا تعلق بھی ہوتا تو ہے، لیکن وہ کسی اور جگہ ہوتا ہے۔

۵۔ راہب تو تارکِ دنیا ہوتے ہیں۔ پھر یہ راہب بیٹھا بھی کلیسا کے دروازے پر تھا اس کے گھر کے ستر آدمی کہاں سے آ گئے؟ اگر اس کے گھر ستر آدمی واقعۃً تھے اور وہ ان سے معاشرتی تعلقات بھی رکھتا تھا، تو وہ یقیناً راہب نہیں تھا۔

۶۔ امید ہے کہ اس راہب کے مسلمان ہونے کے بعد آپ نے اور آپ کے ساتھی درویش نے اس کا پکا ہوا کھانا تو کھا ہی لیا ہوگا۔

اب دیکھئے بالکل ایسا ہی واقعہ شبلی اور ابوحفص کے درمیان بھی پیش آیا تھا۔ وہاں بھی چالیس مہمانوں کے لئے چالیس شمعیں تو جلیں جو بجھ نہ سکیں اور پر تکلف کھانوں کا تعلق بھی تھا مگر اِن شمعوں کے کسی ظلمت کدۂ دل کو منور کرنے کا وہاں ذکر نہیں۔ (تفریحِ حق، ص ۱۵۲) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد خضرویہ شبلی سے بہت بلند درجہ کے ولی تھے۔

سری سقطیؒ (م ۲۵۰ھ) کا خواب اور حضرت یعقوب علیہ السلام

"ایک روز آپ نے خواب میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو دیکھا، کہا: "اے جدِ پیغمبراں! دنیا میں گرفتارِ عشقِ یوسف ہو کر یہ کیا شور و فغاں پیدا کر دیا۔ عشقِ یوسف کے ساتھ عشقِ حق کس طرح جمع ہو سکتا ہے؟" غیب سے ندا آئی "سری!

خاموش رہ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے جمالِ جہاں آرا، کو دیکھ۔" جونہی جمالِ یوسفؑ کو دیکھا، غش کھا کر گر پڑے۔ تیسرے روز ہوش میں آئے۔ پھر ندائے غیبی آئی: "سری! یہ اس شخص کی سزا ہے جو عاشقانِ خدا کو ملامت کرتا ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۳۲)

اس روایت کو بار بار پڑھئے اور بتلائیے کہ:

۱ حضرت یعقوب علیہ السلام عاشقِ یوسف تھے یا عاشقِ حق؛ دونوں باتیں تو بہر حال جمع نہیں ہو سکتیں جو سریؒ سقطی کا اصل اعتراض تھا۔

۲ دو بار ندائے غیبی آئی۔ پہلی ندائے غیبی کے ساتھ سری سقطی کو حضرت یوسف علیہ السلام کے جمال جہاں آرا کا دیدار بھی کرا دیا گیا۔ پھر بھی سری سقطی کو تین دن بے ہوش کر کے اور زبردستی سزا دے کر چپ کرایا گیا حالانکہ سری صاحب کا اعتراض پھر بھی جوں کا توں قائم رہا۔

شبلی کا زہد

"شبلی سے زہد کے متعلق سوال کیا گیا، تو فرمایا: "درحقیقت زہد کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ یا تو انسان اس چیز سے زہد اختیار کرے گا جو اس کی ملکیت ہی نہیں یا اس چیز سے زہد اختیار کرے گا، جو اس کے لئے ہے۔ لہٰذا انسان یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اس نے زہد کیا۔ حالانکہ وہ چیز (یعنی دنیا) اس کے ساتھ اور اسی کے پاس ہر وقت موجود رہتی ہے لہٰذا یہ نفسِ انسانی کی ڈینگ، سخاوت اور غمخواری کے سوا کچھ نہیں ہے۔" (التعرف، ص ۱۴۳)

فرمائیے! کچھ سمجھے آپ کہ زہد کیا ہے؟ اگر زہد نام کی کوئی چیز دنیا میں موجود نہیں، تو قرونِ اولیٰ کے صالحین جنہیں زہاد کہا جاتا تھا، وہ کیا تھے؟

غرض ان صوفیاء نے معاملات اور اخلاقیات میں کچھ اس طرح سے افراط و تفریط یا غلو سے کام لیا کہ ؎

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

والی بات بن جاتی ہے۔

ب۔ اخلاقِ حسنہ کی تعریفیں

اب ہم صوفیا کی مشہور اور مستند کتاب "التعرف" سے اخلاقیات سے متعلق کچھ اقوال پیش کریں گے۔ جن کی صورت بعینہٖ وہی ہے، جو ہم نے بیان کی ہے:

صبر: کسی ایک صوفی نے کہا ہے: "اس نے صبر میں صبر کے ساتھ مقابلہ کیا یہاں تک کہ صبر پکار

اٹھا۔ فریاد۔ اور صابر نے پکار کر کہا اے صبر! صبر کرو۔" (تعرف، ص ۱۴۴)

شکر : ایک بڑے صوفی کا قول ہے: "انعام کنندہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے شکر کو بھول جانا شکر ہے۔" (تعرف، ص ۱۵۴)

تقویٰ : سہل تستری فرماتے ہیں: "اللہ کی طرف مائل ہونے کی مقدار کے مطابق احوال کا مشاہدہ کرنا تقویٰ ہے۔" (تعرف ۱۵۱)

۲ : سہل تستری فرماتے ہیں: "تقوے سے مراد اوروں سے بیزاری ہے اور یہی اخلاص ہے۔" (تعرف، ص ۱۵۱)

توکل : سری سقطی فرماتے ہیں: "توکل یہ ہے کہ تو اپنی معصیت سے رکنے کی قدرت اور نیک کام کرنے کی طاقت سے علیحدگی اختیار کرے۔" (تعرف، ص ۱۵۵)

۲ : بقول کسی بڑے صوفی کے اس کا مفہوم یہ ہے: "توکل کی حقیقت ترکِ توکل ہے اور یہ اس طرح ہے کہ اللہ ان کے لیئے ایسا ہو جیسا اس وقت تھا، جب وہ موجود نہ تھے۔" (تعرف، ص ۱۵۶)

اخلاص : ابویعقوب سوسی فرماتے ہیں: "خالص عمل وہ ہے جس کا فرشتے تک کو پتہ نہ ہو کہ لکھ سکے اور نہ شیطان کو خبر ہو کہ اسے خراب کر سکے اور نہ نفس کو پتہ ہو کہ اس پر فخر کر سکے۔" (تعرف ۱۵۲)

رضا : سفیان ثوری نے رابعہ کی موجودگی میں کہا: "خدایا! تو مجھ سے راضی ہو جا۔" اس پر رابعہ نے اسے کہا: "کیا تجھے اس خدا سے رضامندی طلب کرتے ہوئے شرم نہیں آتی، جس سے تو راضی نہیں ہے۔" (تعرف ۱۵۷)

یقین : نوری فرماتے ہیں: "یقین مشاہدہ کا نام ہے۔" اور سہل فرماتے ہیں: "یقین پردے کے کھل جانے کا نام ہے۔" (تعرف ۱۵۹)

ذکر : جنید فرماتے ہیں: "جس نے اللہ کے مشاہدہ کے بغیر اللہ کہا وہ مفتری ہے۔ ایک اور کہتا ہے: "دل کا کام مشاہدہ کرنا ہے اور زبان کا کام اس مشاہدہ کو بیان کرنا ہے۔ لہٰذا جس نے مشاہدہ کے بغیر بیان کیا وہ جھوٹا ہے۔" (تعرف ۱۶۲)

قرب : کسی نے کہا ہے: "قرب یہ ہے کہ تو اس کے ان افعال کا مشاہدہ کرے، جو تمہارے ساتھ پیش آرہے ہیں۔" (تعرف، ص ۱۶۷)

تصوف اور کسبِ حلال : "میں نے ابوالحسین محمد بن احمد فارسی کو کہتے سنا ہے کہ "تصوف کے دس ارکان ہیں۔ پہلا رکن تجریدِ توحید ہے۔ پھر سماع کا سمجھنا، حسنِ معاشرت، ایثار الایثار، ترکِ اختیار، سرعتِ وجد، دلوں کی باتوں کا ظاہر کرنا، روزی نہ کمانا اور نہ ذخیرہ کرنا۔ (تعرف ۱۴۵)

ج- ایمان اور ارکانِ اسلام کے اسرار و رموز

اب اسرار و رموز کی تیسری قسم ملاحظہ فرمائیے۔ مشہور متصوف عبدالکریم جیلی صاحب ارکانِ اسلام کے رموز اور باطنی معنے سمجھاتے ہیں :

اسرارِ کلمۂ شہادت : جاننا چاہیئے کہ کلمۂ شہادت بھی دو امروں پر مبنی ہے۔ ایک 'سلب' اور وہ 'لا' ہے۔ دوسرے 'ایجاب' اور وہ 'الا' ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ اور لفظ 'الٰہ' سے مراد یہ بُت ہیں جن کی وہ عبادت کرتے ہیں۔ اور یہ بہ سبب ان کے اس سِرِّ وجود کے جو ان کی ذوات میں ہے۔ اُن کی موافقت ہے پس وہ بوجود خود سچے معبود ہیں.... اس لئے کہ اللہ تعالےٰ عین اس کا ہے اور وہ اللہ جس طور بھی ظاہر ہوا الوہیت کا مستحق ہے۔ پھر اس نے اپنے قول الا اللہ میں ان سب کو ایک بنا دیا ہے۔ یعنی یہ معبود سوائے ایک اللہ کے کچھ نہیں ہیں۔ یا یوں کہو کہ یہ معبود غیر اللہ نہیں ہیں۔ پس نہ عبادت کرو تم مگر بطورِ اطلاق ایک اللہ کی۔ نہ کسی جہت کی قید لگا کر اس لئے کہ ذاتِ حق ہی تمام جہتیں ہیں اور سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔" (انسان کامل، ص ۴۲۵)

اسرارِ طہارت اور نماز : نماز سے مراد حق تعالیٰ کی واحدیت ہے اور اس کی اقامت سے تمام اسماء و صفات سے متصف ہو کر ناموسِ وحدیت کی اقامت کی طرف اشارہ ہے اور طہارت سے مراد نقائص کونیہ سے پاک ہونا ہے اور اس میں پانی کی شرط، اس بات کی طرف اشارہ کہ نقائص کونیہ زائل نہیں ہوتے۔ مگر آثارِ صفاتِ الٰہیہ کے ظہور سے کہ وجود کی زندگی میں اور پانی میں بھی زندگی کا راز رکھا گیا ہے اور ضرورت پر تیمم کا طہارت کے قائم مقام ہونا مخالفات، مجاہدات، ریاضات کے ذریعہ نفس کو پاک کرنے کی طرف اشارہ ہے۔" (ص ۴۳۶) پھر اسی طرح مصنف صاحب نے نماز کے تمام ارکان و افعال مثلاً تکبیر تحریمہ، سورۂ فاتحہ کی قرأت، رکوع، قومہ، سجدہ، جلسہ، التحیات وغیرہ سب کو اسرار و رموز کی زبان میں

بیان فرمایا ہے۔

اسرارِ زکوٰۃ : اور زکوٰۃ یہ ہے کہ بعد تزکیہ کے حق کو خلق پر ترجیح دے یعنی وجود میں شہودِ حق کو شہودِ خلق پر ترجیح دے .... باقی رہا نقدی کا اس میں چالیسواں حصہ ہونا۔ سو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وجود کے چالیس مرتبہ ہیں اور مطلوب مرتبہ الہیہ ہے اور وہ مرتبہ علیا ہے اور چالیس میں سے ایک ہے۔" (انسانِ کامل، ص ۴۳۷)

اسرارِ صوم : روزہ بشری خواہشات (یعنی کھانا، پینا، سونا، جنسی اور معاشرتی تعلقات) کے رواں کرنے سے نفس کو روکنے کا نام ہے۔ تاکہ وہ صفاتِ حمدیہ الہیہ سے متصف ہو۔ علی قدرِ امتناعِ نفس، آثارِ حق نفس میں ظاہر ہوتے ہیں اور روزوں کا ایک ماہ کامل تک ہونا اس بات کی ضرورت کی طرف اشارہ ہے کہ زندگی بھر تک نفس کو خواہشاتِ نفسانی سے روک رکھنا چاہیئے۔ یہ خیال نہ کرے کہ میں اب واصل بحق ہو گیا ہوں۔ مقتضیاتِ بشری کے چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔" (انسانِ کامل ۴۳۷)

رموزِ حج : حج سے اشارہ طلبِ الٰہی میں مدام کمربستہ رہنے کی طرف ہے اور احرام سے اشارہ شہودِ مخلوق کا ترک کر دینا ہے اور سلے ہوئے کپڑے کے ترک کرنے سے اشارہ ریاستِ بشریہ کے ترک کرنے کی طرف ہے اور ناخن کٹوانے کے ترک سے اشارہ ان فعلوں میں، جو اس سے صادر ہوں، خدا کے فعل کا مشاہدہ کرنا ہے۔" ..... پھر نماز کی طرح حج کے بھی تمام ارکان و افعال مثلاً خوشبو کا ترک کرنا، نکاح کا ترک کرنا، شرمہ کو ترک کرنا کے اشارے بتلاتے ہیں۔ بعد میں مرادیں بتلانا شروع کر دیا ہے۔ مثلاً میقاتِ قلب سے مراد ہے مکہ مرتبہ الہیہ سے مراد ہے۔ پھر کعبہ، حجرِ اسود، طواف، طواف کے بعد نوافل، سعی، سر منڈانا وغیرہ سب کی یا مرادیں بتلا دی ہیں یا اشارے بیان فرما دیتے ہیں۔" (ص ۴۳۸، ۴۳۹)

رموزِ ایمانی : ایمان عالمِ غیب سے کشف کا پہلا مرتبہ ہے اور وہ سواری ہے، جو سوار کو مقاماتِ علیہ تک پہنچاتی ہے اور مشاہدہ مندرہ کی سیر کراتی ہے اور وہ اس چیز کے ساتھ قلب کی موافقت سے مراد ہے جس کا ادراک عقل سے بعید ہے۔ جو چیز عقل سے معلوم کی جاتی ہے اس کے ساتھ دل کی موافقت کا نام ایمان نہیں ہے، بلکہ وہ علمِ نظری ہے جو شہود دلائل سے حاصل کیا جاتا ہے پس وہ ایمان میں داخل نہیں ہے۔" (انسانِ کامل ص ۴۴۰)

باب (۶)

آستانے اور مزارات

توحید کیا ہے؟

وحی الٰہی ہمیں یہ بتلاتی ہے کہ اس کائنات کا خالق، مالک، رازق صرف ایک اللہ ہے۔ وہی اکیلا اس نظام کو چلا رہا ہے۔ اور اسے اس نظام کائنات کو چلانے میں کسی دوسرے کی احتیاج نہیں اور نہ ہی یہ ممکن ہے اور کائنات کی ہر چیز اس کے تابع فرمان ہے۔ البتہ انسان اور جن کو کسی حد تک اختیار دیا گیا ہے، کہ وہ چاہے تو خدا کی ہدایت کو تسلیم کر کے دنیوی اور اخروی کامیابی حاصل کرے اور چاہے تو نافرمان بنے۔ اس آسمانی ہدایت کو بدل وجان تسلیم کر لینے کا نام ہی اسلام ہے جس کا آغاز ایک اقرار " لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ " سے ہوتا ہے۔ یعنی " تمام کائنات میں اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔"

شرک فی العبادات

عبادت، بندگی اور غلامی کو کہتے ہیں۔ تو جس طرح ایک غلام ہر حالت میں اپنے آقا کے لطف و کرم کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کو چاہئے کہ ہر حال میں اسی کے لطف و کرم کا محتاج رہے۔ اس کے احکام کی برضا و رغبت تعمیل کرے۔ تکلیف ہو تو صرف اسے پکارے اور کوئی ضرورت ہو تو صرف اس کے سامنے پیش کرے، اسی سے دُعا کرے، اسی سے مدد طلب کرے، اسی سے فریاد کرے، اسی سے ڈرے اور اسی سے امید رکھے اور یہ بھروسہ بھی رکھے کہ وہ آقا و مالک ہر دُعا، التجا اور فریاد کو ہر وقت سنتا اور اس کی تکلیف کو دور کرنے یا ضرورت پوری کرنے پر قادر ہے الغرض وہ اختیاری امور جن میں انسان سے اطاعت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں :

انابت (رجوع)، اطاعت، محبت، خضوع، توکل، دُعا، استعانت، خوف، امید، قربانی، نذر و نیاز اور اس کے گھر (کعبۃ اللہ) کا طواف شعائر اللہ کی تعظیم اور اس کے لطف و کرم پر مکمل اعتماد۔

اب اگر ان مندرجہ بالا امور میں سے کوئی کام یا ساری باتیں اللہ کے سوا کسی دوسرے شخص میں یا مقام معین میں تسلیم کرے یا اس کی طرف رجوع کرے گا تو اسی چیز کا نام شرک ہے۔ گویا اس نے خدا کی خدائی یا تصرف و

اختیار میں کسی دوسرے کو بھی شریک سمجھ لیا ہے ۔ اور یہ گناہ ناقابلِ معافی ہے خواہ وہ کسی مسلمان سے سرزد ہو یا کافر سے۔

دینِ طریقت کے اثرات

اب دینِ طریقت کے نظریات پر غور فرمایئے :

جس انسان کے بدن میں خدا حلول کر گیا، وہ تو خدا ہی بن گیا۔ اور اس کو ماننے والے اس انسان کے پجاری یا عبادت گزار ۔ اب جتنے انسانوں کے وجود میں خدا حلول کر چکا ہے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ سب خدا ہی ہیں۔

اسی طرح کسی مذہب سے تعلق رکھنے والا کوئی انسان خدا کی ذات میں مدغم یا فنافی اللہ ہو جاتا ہے تو وہ بھی ؎ مردانِ خدا ، خدا نباشند لیکن ز خدا جُدا نباشند

ترجمہ : خدا کے بندے خدا تو نہیں ہوتے ، لیکن خدا سے الگ بھی نہیں ہوتے ،

کے مصداق ان کے فنافی اللہ ہونے کے باوجود ان کے مادی جسم خداؤں کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ اور ان کے معتقدین ۔ ان کے پجاری اور عبادت گزار۔

اور وحدت الوجود کے نظریہ نے ہر چیز کو اللہ کا حصّہ قرار دے دیا۔ آپ بھی خُدا ہیں اور میں بھی خدا ، اب عبادت تم میری کرو گے یا میں تمہاری کروں ؛ لیکن انسان کے اندر ایک داعیہ ہے ، جو اسے مصیبت کے وقت کسی نہ کسی کو پکارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ پھر ان لوگوں نے جس سے کوئی بھلائی دیکھی ۔ دوسری چیزوں کو چھوڑ کر بس اسی کو پکارا اور اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ گویا وہ انسان جس کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنا کر یہ کہا تھا کہ صرف میرے سامنے جھکنا ، باقی تمام کائنات کے تم سردار ہو۔ اس انسان نے خود کو اتنا ذلیل کر دیا کہ ہر چیز کو خدا سمجھ لیا اور ہر چیز کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ یہ ہے ہمارے راہبوں اور پیروں کی تعلیم جس نے انسان کو قسم قسم کے شرک میں مبتلا کر کے اتنا ذلیل کر دیا۔

اسی وحدت الوجود کے نظریہ سے مظاہر پرستی کا آغاز ہوا۔ کسی قوم نے سورج کی پرستش کی ، کسی نے آگ کی ، کسی نے فرشتوں کی ، کسی نے درختوں ، پتھروں اور حیوانوں کی اور کسی نے پیروں فقیروں کی یا ان کے آستانوں کی ، کسی نے ان کے مجسموں کی ، تو کسی نے اُن کی قبروں کی پرستش شروع کر دی۔ گویا جن باتوں سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو منع فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو ماننے کے باوجود سب شرکیہ افعال دوسری چیزوں کے حضور بجا لاتے رہے۔

بُت پرستی اور قبر پرستی کی ابتداء

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قبر پرستی اور بُت پرستی کا وجود حضرت نوح علیہ السلام سے بھی بہت

پہلے اس دنیا میں پایا جاتا تھا۔ جب حضرت نوح نے اس قوم سے کہا کہ شرک اور بت پرستی سے باز آؤ، تو کہنے لگے:

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا (۲۳:۷۱)

اور کہنے لگے کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو کبھی ترک نہ کرنا۔

اس کی تفسیر میں امام بخاری حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں (علاوہ ازیں یہ روایت احمد، مسلم، نسائی میں بھی مذکور ہے)

اِنَّ هٰؤُلَآءِ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ فِيْ قَوْمِ نُوْحٍ فَلَمَّا مَاتُوْا عَكَفُوْا عَلٰى قُبُوْرِهِمْ ثُمَّ صَوَّرُوْا تَمَاثِيْلَهُمْ فَعَبَدُوْهُمْ، ثُمَّ صَارَتْ هٰذِهِ الْاَوْثَانُ فِيْ قَبَائِلِ الْعَرَبِ (صحیح بخاری وکتب تفسیر)

یہ سب (ود، سواع، یغوث، یعوق، نسر) قوم نوح کے اولیاء اللہ تھے۔ جب وہ مر گئے، تو لوگ ان کی قبروں پر اعتکاف کرنے لگے۔ پھر ان کے مجسمے بنائے اور ان کی عبادت کرنے لگے۔ پھر یہی بت عرب کے قبائل میں پھیل گئے۔

اس حدیث سے دو باتیں واضح ہوئیں۔

۱۔ شرک کا تعلق "اولیاء اللہ" قسم کے لوگوں سے ہوتا ہے۔

۲۔ بت پرستی کا پہلا زینہ قبروں پر اعتکاف بیٹھنا ہے۔ خواہ یہ وقتی طور پر ہو یا چلہ کشی کی صورت میں۔

اور یہی دونوں چیزیں "یعنی پیر پرستی اور قبر پرستی" آج بھی مسلمانوں میں عموماً اور دین طریقت کے پیروکاروں یا وجودیوں میں بالخصوص رائج ہیں۔ لہٰذا ہم ان پر ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔

یہ آستانے اور درگاہیں

غیر مشروط اطاعت ہی خدائی کا دعویٰ ہے

پیر پرستی سے مراد اپنے پیر کی بلا دلیل شرعی یعنی غیر مشروط اطاعت ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹:۳۱)

ان (اہل کتاب) نے اپنے عالموں اور پیروں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا۔

تو عدی بن حاتم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا، کہ یہ رب بنانا کیا ہے؟ ہم ان کی پرستش تو

نہیں کرتے تھے آپ نے فرمایا : "کیا تم لوگ اُن کی باتیں بلا دلیل تسلیم نہیں کر لیتے تھے؟" عدی بن حاتم نے کہا : "ہاں ! یہ تو کرتے تھے۔" تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا : "رب بنانے سے یہی مراد ہے۔" (ترمذی ابواب التفسیر، سورۃ توبہ)

ہم پچھلے صفحات میں کئی اقتباسات سے یہ واضح کر آتے ہیں کہ یہ لوگ کس طرح اپنے نووارد مریدوں کو صرف غیر مشروط اطاعت کی شرط پر بیعت کرتے ہیں۔ بلکہ ان سے اپنا کلمہ بھی پڑھواتے ہیں اور اس طرح انہیں "اپنی پرستش" کی تاکید کرتے ہیں۔ وہ مریدوں کو اس بات کی بھی تلقین کرتے ہیں کہ ہر مرید اپنے پیر کو ہر وقت ذہن میں رکھے۔ حتیٰ کہ مرید اس ریاضت میں اتنا پختہ ہو جاتے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں سے بھی مرید، پیر کو یاد کرے یا پکارے تو اُسے پیر کی شکل سامنے نظر آنے لگے اور صورتِ حال یہ ہو کہ ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار   جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

اس کیفیت کو ان لوگوں کی اصطلاح میں تصورِ شیخ اور اس کی پختہ حالت کو فنافی الشیخ کہا جاتا ہے۔

مشہور اور صحیح حدیث جبریل کا آخری حصہ یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا کہ "احسان کیا ہے؟" تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا : احسان یہ ہے کہ تو خدا کی ایسے عبادت کرے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کم از کم اتنا تو سمجھے کہ خدا تجھے دیکھ رہا ہے۔"

اب دیکھیے یہ لوگ کس طرح خدا سے بھی زیادہ اپنی پرستش کی تاکید کرتے ہیں۔ اب درج ذیل اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے، جو تصورِ شیخ، نداء لغیر اللہ، توسل اور استمداد جیسے سب مسائل حل کر دیتا ہے۔ اس کے راوی جناب اعلیٰ حضرت رضا خان بریلوی ہیں :

نداء لغیر اللہ، توسل اور استمداد

"غالباً حدیقہ ندیہ میں ہے کہ "ایک مرتبہ حضرت سیدی جنید بغدادیؒ دجلہ پر تشریف لائے اور یا اللہ کہتے ہوئے اس پر زمین کی طرح چلنا شروع کر دیا۔ بعد میں ایک شخص آیا، اسے بھی پار جانے کی ضرورت تھی۔ کوئی کشتی اس وقت موجود نہ تھی۔ جب اس نے حضرت کو جاتے دیکھا، عرض کیا میں کس طرح آؤں؟ فرمایا یا جنید ! یا جنید ! کہتا چلا آ۔ اس نے بھی کہا اور دریا پر زمین کی طرح چلنے لگا۔ جب بیچ دریا میں پہنچا شیطان لعین نے دل میں وسوسہ ڈالا کہ حضرت خود تو یا اللہ کہیں اور مجھ سے یا جنید کہلواتے ہیں۔ میں بھی یا اللہ کیوں نہ کہوں۔ اس نے یا اللہ کہا اور ساتھ ہی غوطہ کھایا۔ پکارا حضرت ! میں چلا۔ فرمایا "وہی کہہ یا جنید یا جنید!" جب کہا دریا

سے پار ہوا۔ عرض کی حضرت یہ کیا بات تھی۔ آپ اللہ کہیں، تو پار ہوں اور میں کہوں تو غوطہ کھاؤں۔ فرمایا۔ "اے نادان! ابھی تو جنید تک تو پہنچا نہیں، اللہ تک رسائی کی ہوس ہے، اللہ اکبر۔" (ملفوظات مجدد مائۃ حاضرہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی ص ۱۱۷)

دیکھا آپ نے پیر کو وسیلہ پکڑنے کی کتنی زبردست دلیل ہے، جو امام اہل سنت، موجودہ صدی کے مجدد اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں "غالباً حدیقہ ندیہ" کے حوالہ سے پیش فرما رہے ہیں۔ اور واقعی بھی ایسا لاجواب گھڑا ہے کہ اس بیچارے کو تسلیم کرنا پڑا کہ میرا اللہ کو پکارنا واقعی شیطانی وسوسہ تھا۔ وہ بیچارہ تو یہ خیال کر بیٹھا ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا تھا:

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (۲/۱۸۶) — اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو) میں (تمہارے) پاس ہوں۔

اس کی بس تلاوت ہی کافی ہے عملی دنیا میں یہ باتیں کام نہیں آتیں۔

سجدہ تعظیمی اور نظام الدین اولیاءؒ

اب پیر صاحب کی خدائی میں بس ایک سجدہ کرنے کی کسر رہ جاتی ہے، تو اس سے متعلق درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی بارگاہ میں پھر کچھ دیر اس بارے میں گفتگو رہی کہ مرید حضرت مخدوم کی خدمت میں آتے ہیں۔ آپ کے سامنے زمین پر سر رکھتے ہیں۔ حضرت خواجہ نے، اللہ کا آپ کا ذکر بھلائی سے کرے۔ فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کو اس سے منع کروں۔ لیکن چونکہ میں نے اپنے شیخ (شیخ الاسلام فرید الدین) کے سامنے اسی طرح کیا ہے۔ اس لئے میں منع نہیں کرتا۔ اس پر بندے نے عرض کیا کہ وہ لوگ جو حضرت مخدوم کی ذات سے وابستہ ہیں۔ وہ آپ کے ارادتمند ہیں اور آپ سے انہوں نے بیعت کی ہے، تو ان کی یہ ارادت و بیعت عبارت ہے پیر کے ساتھ عشق و محبت سے۔ پس جہاں عشق و محبت ہوگی زمین پر سر رکھنا ایک سہل سا کام ہے۔ حضرت خواجہ نے، اللہ آپ کا ذکر بھلائی سے کرے، میری اس بات کی مدافعت میں فرمایا کہ ایک دفعہ ایک راستے میں شیخ ابو سعید ابوالخیر ایک گھوڑے پر سوار جا رہے تھے۔ سامنے سے ایک مرید آگیا۔ وہ مرید پیدل تھا۔ اس نے شیخ ابو سعید ابوالخیر کے زانو کو بوسہ دیا۔ شیخ نے فرمایا کہ اس سے نیچے بوسہ دو۔" اس نے شیخ کے پاؤں کو بوسہ دیا۔ شیخ نے کہا، "اور نیچے۔" مرید نے گھوڑے کے زانو کو بوسہ دیا۔ شیخ نے فرمایا، "اور نیچے۔" مرید نے گھوڑے کے سُم کو بوسہ دیا۔ شیخ نے کہا "اور نیچے۔" مرید نے زمین کو بوسہ دیا

اس وقت شیخ نے کہا: "کہ میں نے جو نہیں نیچے اور نیچے بوسہ دینے کو کہا، تو اس سے میرا مقصد یہ نہ تھا کہ تم زمین کو بوسہ دو۔ میرا اس سے یہ مقصد تھا کہ تم جتنا نیچے جاؤ گے تمہارا درجہ بلند ہوگا۔" (فوائد الفواد۔ ملفوظات خواجہ نظام الدین اولیاء، مرتبہ خواجہ حسن دہلوی، ترجمہ محمد سرور صاحب۔ علماء اکیڈمی اوقاف پنجاب لاہور مطبوعہ ۱۹۷۳ء، ص ۴۳۰)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ نظام الدین اولیاء اکیلے ہی اولیاء (بہت سے ولی) تھے۔

۲۔ خود کو سجدہ کروانے کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ ان کے پیر بھی سجدہ کرواتے تھے۔

۳۔ اس واضح شرک کی اصل وجہ عشق و محبت ہے، جو دینِ طریقت کی بنیاد ہے۔

۴۔ یہ سجدہ تو اپنی بزرگی اور خدائی کے لیے کرواتے ہیں لیکن تاثر یہ دیتے ہیں کہ تواضع سے درجے بلند ہوتے ہیں ؎

خداوندا تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں ۔۔۔ کہ درویشی بھی عیاری و سلطانی بھی عیاری

بھلا اگر تواضع کا سبق ہی دینا تھا تو اس کا خود کو سجدہ کروانے کے بغیر کوئی اور طریقہ نہیں تھا۔ کیا رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح تواضع کا سبق دیا تھا؟ پھر یہ بھی خیال رہے کہ کتاب فوائد الفواد کو روحِ تصوف کے مصنف خورشید احمد گیلانی نے ان چودہ امہات کتب تصوف میں شمار کیا ہے، جو صحیح روحِ تصوف پیش کرتی ہیں اور سنت کے مطابق ہیں۔

سجدہ تعظیمی کی حرمت

ایک دفعہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو سجدہ کرنا چاہا، تو آپ نے فرمایا:

مَا هٰذَا يَا مُعَاذُ؟ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ رَأَيْتُهُمْ فِي الشَّامِ يَسْجُدُوْنَ لِأَسَاقِفَتِهِمْ فَقَالَ يَا مُعَاذُ! إِنَّهُ لَا يَصْلُحُ السُّجُوْدُ إِلَّا لِلّٰهِ وَلَوْ كُنْتُ اٰمِرًا أَحَدًا لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا مِنْ عِظَمِ حَقِّهِ عَلَيْهَا[1]

معاذ یہ کیا؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ میں نے شام میں دیکھا ہے کہ وہ اپنے پادریوں کو سجدہ کرتے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "اے معاذ! سجدہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے درست نہیں۔ اگر میں کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے کیونکہ خاوند کا عورت پر بڑا حق ہے۔"

کچھ لوگ سجدہ کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں۔ سجدہ تحریمی اور سجدہ تعظیمی۔ اور سجدہ تعظیمی کو غیر اللہ کے لئے جائز قرار دیتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں۔ اللہ نے خود فرشتوں سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کروایا۔ اسی طرح حضرت

---

[1] مشکوٰۃ، باب عشرۃ النساء، الفصل الثالث، بحوالہ مسند احمد بروایت حضرت معاذ بن جبل

یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین اور بھائیوں نے سجدہ کیا تھا۔

مندرجہ بالا حدیث میں ان لوگوں کی دونوں باتوں کے جواب آ گئے ہیں۔ حدیث کے خط کشیدہ الفاظ "من تعظیم حقہ علیھا" سجدۂ تعظیمی پر ہی دلالت کرتے ہیں نہ کہ تحریمی پر۔ لہٰذا یہ تحریمی و تعظیمی کی تقسیم ہی غلط ہے۔ نیز حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بھی تعظیم کے طور پر آپ کو سجدہ کرنا چاہا تھا نہ کہ سجدۂ تعبدی۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پیشتر کی شریعتیں آپ کے بعد منسوخ ہو گئیں۔ اگر پہلے یہ سجدہ جائز تھا بھی، تو آپ کے اس ارشاد کے مطابق قطعی طور پر حرام ہو چکا ہے۔

ولایت یا خدائی؟

اس مبحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ "اولیاء اللہ" جو اپنے مریدوں سے عبدیت کے پورے حقوق (غیر مشروط اطاعت، استمداد و استغاثہ اور سجدہ) وصول کرتے ہیں۔ تو کیا یہ خود معبود کے حقوق پورے بھی کرتے ہیں؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے حقوق کی تعیین ضروری ہے اور وہ یہ ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ وہ غیب کی بھی سب باتیں جانتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے بندوں کا ہر حال میں نگہبان ہے۔

۲۔ جب اسے پکارا جائے، تو وہ پکارنے والوں کی دعا سنتا، اسے قبول فرماتا، دادرسی کرتا، مشکل سے نجات دیتا، بیماری سے شفا بخشتا اور بندوں کی تمام حاجات پوری کرتا ہے۔

۳۔ اس نے اپنے بندوں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اگر وہ اس کے احکام مانیں گے، تو انہیں دوزخ کے عذاب سے بچائے گا اور جنت میں داخل کرے گا۔ بشرطیکہ اس نے شرک نہ کیا ہو۔

اب ان حقوق کے ثبوت ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ علم غیب خاصۂ خدا ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضور اکرم کو مخاطب کر کے فرمایا:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭوَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ٻ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ (۷/۱۸۸)	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دو کہ میں تو اپنے بھی فائدے اور نقصان کا کچھ اختیار نہیں رکھتا مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب کی خبریں جانتا ہوتا، تو بہت سے فائدے جمع کر لیتا اور مجھ کو کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ :

۱۔ علم غیب جاننے کے دو فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کسی آنے والی تکلیف سے بچ جائے اور دوسرے یہ کہ آئندہ کے مفید پہلوؤں کو اپنا کر اپنے لئے بہت سی بھلائیاں اکٹھی کر لے، خواہ وہ کسی قسم کی ہوں۔ انہی دو باتوں یعنی دفع ضر اور جلب منفعت کا نام علم تصوف یا دین طریقت کی زبان میں "تصرف" ہے کہ اولیاء اللہ اپنے اور دوسروں کے حالات سے باخبر بھی ہوتے ہیں۔ پھر ان کی مشکل کشائی بھی کر سکتے ہیں اور ان کو "فیض" بھی پہنچا سکتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے افضل الانبیاء کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے کہ میں تو اپنے نفع و نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتا۔ دوسروں کی رفع حاجات اور مشکل کشائی کیونکر کر سکتا ہوں۔"

۲۔ آیت میں اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰهُ کے الفاظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حسب مشیت و ضرورت انبیاء کو تھوڑا بہت علم غیب عطا بھی فرماتا ہے۔ چنانچہ درج ذیل آیت میں بھی اس بات کی وضاحت موجود ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ	وہی غیب کا جاننے والا ہے اور کسی پر اپنے غیب کو
اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ	ظاہر نہیں کرتا۔ ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے، تو اس کو
فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ	غیب کی خبریں بتلا دیتا ہے اور اس کے آگے اور پیچھے
خَلْفِهٖ رَصَدًا (۷۲/۲۶)	نگہبان مقرر کر دیتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ :

۱۔ علم غیب جاننا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔

۲۔ وہ غیب کی خبریں صرف کسی رسول کو ہی دیتا ہے، جسے وہ پسند کرے کیونکہ یہ دنیا کی رہنمائی کے لیے لابدی امر ہے۔

۳۔ پھر اس بات کا بھی اہتمام فرماتا ہے کہ ان خبروں میں ادھر اُدھر سے کہیں باطل کی آمیزش نہ ہو جائے۔

پھر کچھ آیات ایسی ہیں، جن سے غیر اللہ کے علم غیب کی بکسر نفی ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً :

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ	اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ جن کو اس کے
اِلَّا هُوَ (۶/۵۹)	سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔

اور ایسی اور بھی بہت سی آیات ہیں، جنہیں ہم بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔

اب احادیث کی طرف آئیے۔ احادیث سے بھی رسول اکرم ﷺ کا کلی علم غیب جاننا ثابت نہیں

ہوتا جیسا کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کو علمِ غیب بتدریج حاصل ہوتا رہا۔ تا آنکہ آپ کی رحلت کے وقت آپ کو مَا کَانَ وَ مَا یَکُوْنُ (یعنی ازل سے لے کر ابد تک) تمام حالات کا علم تھا اور یہ علم اللہ کے علمِ غیب سے کم نہ تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی ہے اور رسول اکرم ﷺ کا علم عطائی، خدا کی طرف سے عطا کیا ہوا تھا۔

رسول اکرم ﷺ کا علمِ غیب کلّی ثابت کرنے کی ضرورت

بیشتر اس کے کہ ہم اس دعوے کا جائزہ لیں یہ بتانا ضروری خیال کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو رسول اکرم ﷺ کا علمِ غیب کلّی ثابت کرنے کی ضرورت صرف اس لئے پیش آئی ہے کہ اولیاء اللہ کے علمِ غیب کلّی کے لئے راستہ صاف ہو جائے، چونکہ یہ حضرات خود کو متبع رسول ﷺ گردانتے ہیں اور زبانی یہی کچھ کہتے ہیں کہ ہماری بزرگی محض اللہ کے احسان اور رسول ﷺ کی محبت اور اتباع کے سبب سے ہے۔ تو جب تک رسول اللہ ﷺ کا علمِ غیب کلّی ثابت نہ کر لیا جائے یہ اپنے غیب کے دعوے کیسے کر سکتے ہیں؟

اب دیکھئے احادیثِ صحیحہ کی رُو سے ہم چند واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جن سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کو آخری دور تک بھی علمِ غیب (کلّی) نہ تھا، مثلاً:

۱۔ واقعہ تحریم ——— آپ نے بعض امہات المؤمنین کے کہنے پر شہد کو اپنے آپ پر حرام کر لیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر باز پرس بھی ہوئی۔ اگر آپ کو اس باز پرس کا علم ہوتا، تو آپ ایسا کیوں کرتے۔ (قرآن کریم، سورہ تحریم، بخاری، کتاب الحیل)

۲۔ واقعہ افک ——— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سلسلے میں آپ ایک ماہ تک بہت پریشان رہے آپ دوسرے لوگوں سے حضرت عائشہ کے کردار سے متعلق استفسار کرتے رہے۔ (قرآن کریم، سورۃ نور، بخاری و دیگر کتب احادیث)

۳۔ زہریلی بکری ——— جنگِ خیبر کے بعد آپ کو یہودیوں نے زہریلا بکری کا گوشت بطور ہدیہ پیش کیا، جو آپ نے کھا لیا۔ لقمہ اندر چلا گیا، تب آپ کو محسوس ہوا۔ (بخاری و مسلم)

۴۔ مقدمات کے فیصلے ——— حضور اکرم ﷺ کا فرمان: "تم میرے پاس جھگڑتے ہوئے آتے ہو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی اپنی دلیل دوسرے فریق کی نسبت اچھی طرح بیان کرتا ہے اور میں جو سنتا ہوں اس پر فیصلہ کر دیتا ہوں۔ پھر اگر میں کسی کو اس کے مسلمان بھائی کا حق (غلطی سے) دلا دوں، تو وہ ہرگز نہ لے۔ میں اس کو دوزخ کا ایک ٹکڑا دلا رہا ہوں۔" (بخاری، کتاب الحیل)

۵۔ حضور اکرم ﷺ کا قیامت کے روز اپنے اُمتیوں کو پانی پلانا اور فرشتوں کا کچھ اُمتیوں کو حوضِ کوثر سے پرے ہٹانا، تو حضور اکرم ﷺ کے استفسار پر فرشتوں کا یہ جواب دینا کہ :

لَا تَدْرِیْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَکَ — آپ نہیں جانتے ان لوگوں نے آپ کے بعد کیا کچھ بدعات جاری کیں۔ (بخاری و مسلم)

غرض ایسے واقعات بے شمار ہیں اب ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے فیصلہ پر اس موضوع کو ختم کرتے ہیں

۶۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا : "جو کوئی تجھ سے یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج میں اپنے پروردگار کو دیکھا وہ جھوٹا ہے اور جو کوئی یہ کہے کہ آپ غیب جانتے تھے وہ بھی جھوٹا ہے۔" (بخاری، کتاب التوحید، باب فلا یظہر علی غیبہ احدًا)

ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنا علمِ غیب چاہا اتنا ہی رسول اللہ ﷺ کو عطا کیا، جو کہ خلقت کی ہدایت کے لئے ضروری تھا اور جو نہ چاہا نہ دیا۔ کُلی علمِ غیب ایک ایسا دعویٰ ہے، جو نہ قرآن سے ثابت ہو سکتا ہے نہ احادیث سے اور نہ ہی تاریخ سے۔

۲۔ اولیاء اللہ کے علمِ غیب کی وسعت اور دعویٰ تصرف

لیکن کتاب و سنت کے ان واضح ارشادات کے علی الرغم عبد الوہاب شعرانی کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے شیخ خواص کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ "ہمارے نزدیک مردِ کامل اس وقت تک نہیں ہوتا، جب تک کہ وہ اپنے مرید کی حرکات کو روزِ میثاق سے لے کر اس کے جنت یا دوزخ میں داخل ہونے تک نہ جان لے۔" (کبریتِ احمر برحاشیہ الیواقیت والجواہر، بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۱۶۵)

۲۔ اور حضرت عزیزاں نے فرمایا کہ : "اولیاء اللہ کی نظر میں تمام زمین دسترخوان کی مانند ہے اور ہم کہتے ہیں کہ ناخن کی مثل ہے۔ ان اولیاء اللہ کی نظر سے کوئی چیز غائب نہیں ہے۔" (نفحات الانس فارسی للجامی، بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۱۶۶)

۳۔ اور عبد الکریم جیلی صاحب اس سے بھی چند قدم آگے ہیں۔ وہ انبیاء کے معجزات کو نہایت کمتر سمجھتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں کہ :

"منطق الطیر میں ان دونوں پیغمبروں (حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام) کی خصوصیت صرف یہی ہے کہ یہ باتیں بکثرت ان سے ظہور میں آئیں اور اس کا انہوں نے ادعا فرمایا۔ ورنہ جمیع افراد و اقطاب کو

مملکتِ وجودیہ میں تصرف حاصل ہے اور ہر ایک ان میں سے وہ باتیں جانتا ہے، جو رات اور دن میں کھٹکتی (آواز پیدا کرتی) ہیں۔ پرندوں کی بولیاں تو درکنار ہیں۔ چنانچہ شبلی فرماتے ہیں کہ اگر ایک سیاہ چیونٹی اندھیری رات میں سخت پتھر پر چل رہی ہو اور میں اس کی آواز نہیں سنتا، تو میں خیال کرتا ہوں کہ میں فریب میں آگیا اور ایک اور بزرگ نے فرمایا ہے کہ نہ میں یہ بات کہتا ہوں، جو شبلی نے کہی اور نہ اس کو سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ وہ (چیونٹی) حرکت کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہے مگر میری قوت کے ساتھ۔ اور میں ہی اس کا محرک ہوں۔ پھر میں کس طرح کہوں کہ اس کو نہیں جانتا۔" (انسان کامل، ص ۲۴۴)

شاہ عبدالرحیم کا علمِ غیب

انفاس العارفین میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنے والدِ محترم شاہ عبدالرحیم صاحب کے متعلق فرمارہے ہیں:

"سننے میں آیا ہے کہ آپ کا ایک خادم کسی بری عادت میں مبتلا تھا۔ آپ نے اُسے کئی بار اشاروں، کنایوں سے تنبیہ فرمائی، مگر وہ پھر بھی نہ چونکا اور نہ ہی اپنی عادتِ بد سے باز آیا۔ بالآخر حضرت شیخ نے اسے تنہائی میں بلا کر کہا "تجھے کئی بار اشاروں کنایوں سے سمجھایا مگر تو نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ شاید تو سمجھتا ہے کہ ہم تیرے کرتوتوں سے بے خبر ہیں۔ قسم بخدا! اگر زمین کے نچلے طبق میں رہنے والی کسی چیونٹی کے دل میں بھی سو خیالات آئیں تو ان میں ننانوے خیالات کو میں جانتا ہوں۔ اور حق سبحانہ وتعالیٰ اس کے سو کے سو خیالات سے باخبر ہے۔" یہ سن کر خادم نے اپنی برائی سے توبہ کرلی۔" (انفاس العارفین (ارشد)، ص ۱۰۸، مصنفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ترجمہ سید محمد فاروق القادری ایم اے، مطبوعہ المعارف لاہور)

اگر شاہ ولی اللہ صاحب جیسے محدث اور فقیہہ بھی اپنی روایت "سننے میں آیا ہے" سے شروع کریں، تو دوسروں کو ایسی روایات بیان کرنے کا اور بھی زیادہ حق پہنچتا ہے۔ پھر آپ نے عبد اور معبود کے علم میں ننانوے اور سو کی نسبت بیان فرمائی ہے، معلوم ہوتا ہے کچھ آپ نے کسرِ نفسی سے کام لیا ہے یا ذرا جھجک گئے ہیں۔

اب وہ واقعہ سامنے لائیے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مجمع البحرین پر حضرت خضر علیہ السلام سے ملے تو ایک چڑیا آئی اور اس سمندر سے چونچ میں پانی کا ایک قطرہ لے گئی، تو حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسےٰ علیہ السلام سے کہا، "میرے اور تمہارے دونوں کے علم کی خدا تعالیٰ کے علم سے وہی نسبت ہے، جو اس پانی کے قطرہ کی جو چڑیا لے گئی، اس سمندر سے ہے۔ حالانکہ ان دونوں بزرگوں کو اللہ کی طرف سے علم یقینی حاصل ہوتا تھا اور شاہ عبدالرحیم کا علم کشفی اور ظنی ہے۔

میاں جی نور محمد (م ۱۲۵۹ھ) کے شاگرد کا علم غیب

کچھ لوگ میاں جی کے پاس آ کر توجہ کے طالب ہوئے آپ بچوں کو پڑھا رہے تھے۔ آپ بچوں کو یہ کہہ کر کہ "پڑھتے رہو" انہیں حجرہ میں لے گئے اور توجہ ڈالنا شروع کی، جو بچہ عمر میں بڑا تھا اس نے حجرہ کے دروازہ کی دراڑ سے یہ منظر دیکھا، تو واپس آ کر لڑکوں میں اس کی نقالی شروع کر دی اور دو زانو بن بیٹھا اور بچے آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔ جب میاں جی کو معلوم ہوا، تو آپ نے اس بڑے لڑکے کو بلا کر اسے آنکھیں بند کرنے کو کہا۔ وہ بہت جلد تاب نہ لا کر چلا گیا۔ جب جوان ہوا تو اس نے بتلایا کہ جب میں میاں جی کے سامنے بیٹھا، تو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے دل پر چنگاری رکھ دی ہے۔ جو فوراً اٹھا لی گئی، مگر اب تک حال یہ ہے کہ اندھیری رات میں، سردی کے موسم میں، مکان کے اندر، لحاف میں منہ رکھنے کے باوجود باہر جو نیم کا درخت ہے اس کے پتوں کی حرکت تک معلوم ہوتی ہے۔" (تاریخ مشائخ چشت، ص ۲۳۹)

علی ہجویریؒ کا علم غیب اور اختیار و تصرف

درج ذیل واقعہ حضرت علی ہجویریؒ سے تعلق رکھتا ہے:

"ایک دفعہ میں نے دمشق کے درویشوں کے ساتھ ابن المعلا کی زیارت کے لئے جانے کا قصد کیا۔ یہ رملہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ راستہ میں ہم نے آپس میں باتیں کیں کہ کچھ سوچ لو تاکہ وہ حضرت ہمارے باطن سے مطلع کریں اور ہماری مشکل حل ہو۔ میں نے دل میں سوچا کہ مناجات ابن حسین کے اشعار ان سے سنوں۔ دوسرے نے سوچا مجھے طحال کا مرض ہے، یہ اچھا ہو جائے تیسرے نے کہا مجھے حلوہ صابونی ان سے لینا ہے۔ جب ہم ان کی خدمت میں پہنچے، تو انہوں نے ایک جزو کاغذ جس میں اشعار مناجات ابن حسین لکھے تھے میرے آگے رکھ دیئے اور دوسرے کے طحال پر ہاتھ پھیرا وہ جاتی رہی۔ تیسرے کو کہا حلوہ صابونی سپاہیوں کی غذا ہے۔ اور تو اولیاء کا لباس رکھتا ہے اور اولیاء کے لباس والے کو سپاہیوں کی غذا کا مطالبہ درست نہیں، دونوں میں سے ایک بات اختیار کر۔" (کلام المرغوب ترجمہ کشف المحجوب مصنفہ حضرت علی ہجویریؒ، ص ۵۴۴)

اس روایت سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام کا مزاج ہی ایسا بن گیا ہے کہ ان کو صرف باطن کی اطلاع سے ہی بزرگی کا یقین آتا ہے۔ دوسرے پیر صاحبان بھی اسی معیار کو پسندیدہ قرار دے کر ان کے مطالبہ کو پورا کرنے کے عادی بن گئے ہیں۔ بہر حال یہ بزرگ امتحان میں پوری طرح کامیاب ہیں اور ان کے علم غیب اور ساتھ ہی تصرف فی الامور میں داد دینے کے بغیر چارہ نہیں۔

عثمان ہارونی کا تصرف اور طی الارض

" اس پیر مرد نے اپنا احوال (خواجہ عثمان ہارونی سے) کہنا شروع کیا کہ آج تیس برس کا عرصہ ہوا کہ میرا لڑکا مجھ سے جدا ہے اور کہیں چلا گیا ہے۔ اس کے مرنے جینے کی کچھ خبر تک معلوم نہیں۔ اس کی دردِ جدائی سے میرا بُرا حال ہے۔ اور اب میں آپ کی خدمت میں آیا ہوں اور اس کے آنے اور صحت و سلامتی کے لئے فاتحہ و اخلاص کی درخواست کرتا ہوں۔ جب خواجہ عثمان ہارونی نے یہ بات سنی، تو مراقبے میں سر جھکایا۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اس پیر مرد کے گُم شدہ لڑکے کے آنے کے لئے فاتحہ و اخلاص پڑھو۔ جب آپ اور سب درویشوں نے فاتحہ و اخلاص ختم کی تو پیر مرد سے کہا: "جاؤ! اور ایک لحظے کے بعد اپنے لڑکے کو ملاقات کے واسطے ہمارے پاس لے آؤ۔"

" جونہی پیر مرد نے زبان مبارک سے یہ سنا فوراً رُو برو خواجہ کے سر جھکا کے واپس گیا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ کسی نے پیر مرد کا ہاتھ پکڑ کے کہا: "مبارک ہو، تمہارا لڑکا آ گیا۔ خوشی خوشی گھر میں آیا اور لڑکے سے ملاقات کی۔ اس پیر مرد کی آنکھیں ضعیف ہو گئی تھیں، لڑکے کو دیکھتے ہی روشن ہو گئیں، لے لٹے پاؤں لڑکے کو لے کر خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور لڑکے کو پابوس کرایا۔"

" خواجہ علیہ الرحمۃ نے اس لڑکے کو آگے بلا کے پوچھا: "میاں تم کہاں تھے؟" اس نے کہا: "سمندر میں کشتی پر تھا۔ صاحب کشتی نے پکڑ کر زنجیر سے جکڑ رکھا تھا، آج میں اسی جگہ بیٹھا تھا، ایک درویش، آپ کی شبیہ، گویا آپ ہی تھے، آئے اور میرے پاؤں کی زنجیر توڑ کر گردن زور سے پکڑی اور اپنے آگے مجھ کو کھڑا کیا۔ اور فرمایا: "اپنا پاؤں، میرے پاؤں پر رکھ لے اور آنکھیں بند کر۔" جیسا درویش نے حکم کیا، میں نے وہی کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کہا: "کہ آنکھیں کھول"۔ میں نے جو آنکھیں کھولیں، تو اپنے آپ کو اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے پایا۔" (دلیل العارفین ملفوظات خواجہ معین الدین چشتی، مرتبہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، ترجمہ، غلام احمد بریاں، ص ۴۲۔۴۳)

دیکھئے ان خواجہ صاحب کے مقابلہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کیسے بے بس نظر آتے ہیں اور خواجہ صاحب ہیں کہ بیٹھے بٹھائے ایک لمحہ میں کیا کچھ کر دکھایا۔ اس واقعہ میں کئی پیغمبروں کے معجزات پنہاں ہیں اور یہ سب محض سورۃ فاتحہ و اخلاص کی برکت اور حضرت خواجہ کی بزرگی کے طفیل ہوا۔ جس پیغمبر پر سورۃ فاتحہ اور اخلاص اتری اور جن بزرگوں کو اس پیغمبر نے ان سورتوں کی تعلیم دی وہ تو سب ان سورتوں کے اس قسم کے فوائد سے ناآشنا ہی رہے جو ان اولیاء اللہ نے ڈھونڈ نکالے ہیں کہ ادھر مراقبہ میں پڑے اور آن کی آن میں لڑکے کو سمندر سے اور زنجیریں توڑ کر گھر چھوڑ آئے ہیں۔

پیرانِ پیر کی حاجت روائی اور مشکل کشائی

اب شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمایئے، جس سے آپ کی دستگیری، حاجت روائی اور مشکل کشائی بھی ثابت ہوتی ہے اور توسّل و استمداد کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

"حضرت شیخ نے فرمایا کہ منصور حلاج کے زمانہ میں کوئی ان کی دستگیری کرنے والا اور جس لغزش میں وہ مبتلا ہوئے، کوئی بچانے والا نہیں تھا۔ اگر میں اُن کے زمانہ میں ہوتا تو ان کی دستگیری کرتا اور نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ قیامت تک میں اپنے مُریدوں کی دستگیری کرتا رہوں گا اگرچہ وہ سواری سے گرے اور فرمایا کہ ہر طویلہ میں ایک ناقابلِ مقابلہ سانڈ اور ایک ناقابلِ مسابقت گھوڑا رہتا ہے اور فرمایا کہ ہر ایک لشکر پر میرا تسلط رہتا ہے، جس میں کوئی اختلاف نہیں کرتا اور ہر منصب میں ایسا خلیفہ ہے جسے ہٹایا نہیں جا سکتا۔"

"فرمایا کہ جب بھی اللہ سے کوئی چیز مانگو، میرے وسیلہ سے مانگو۔ تاکہ مراد پوری ہو اور فرمایا کہ جو کسی مصیبت میں میرے وسیلہ سے امداد چاہے، تو اس کی مصیبت دُور ہو اور جو کسی سختی میں میرا نام لے کر پکارے اُسے کشادگی حاصل ہو، جو میرے وسیلہ سے اپنی مرادیں پیش کرے، تو پوری ہوں۔"

صلوٰۃِ غوثیہ کے فائدے

"آپ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت نماز پڑھے، ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد گیارہ مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھے اور سلام کے بعد سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے اور میرا نام لے کر اللہ تعالےٰ سے دعا مانگے تو اللہ تعالےٰ اپنے فضل و کرم سے اس کی حاجت برلائے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ گیارہ قدم عراق کی جانب چل کر میرا نام لے کر دعا مانگے، لیکن یہ روایت ثابت نہیں ہے۔"

(اخبار الاخیار، مصنفہ عبد الحق محدث دہلوی، مترجم اردو) مولانا سبحان محمود، ص ۱۴۹، ۱۵۰)

غور فرمایئے! کہ اس پورے بیان میں صرف آخری روایت ثابت نہیں، باقی سب کچھ بلا شک و شبہ تحقیق شدہ ہے اور یہ بات ہے بھی قرینِ قیاس کہ جہاں ہزاروں میل کا فاصلہ ہو وہاں صرف ۱۱ قدم جانب عراق (بغداد جو شیخ جیلانی کا مولد و مدفن ہے) چلنے یا نہ چلنے سے کیا فرق پڑتا ہے؛ پھر عراق کی جانب تلاش کرنے کی تکلیف سے بھی اس روایت کی بے ثبوتی نے آزاد کر دیا۔

اب دیکھئے! اس نماز کو ضیاء اللہ قادری نے سیرت غوث الثقلین میں صفحہ ۲۴۲ پر "صلوٰۃ غوثیہ" کے عنوان کے تحت تحریر فرمایا ہے۔ پھر اس 'صلوٰۃ غوثیہ' کے راوی یہ اکیلے عبد الحق "محدث" صاحب ہی نہیں۔ مندرجہ ذیل

تذکرہ نگار بھی ہیں :

۱۔ بہجۃ الاسرار، ص ۱۰۲ ابو الحسن نور الدین شنطوفی ۲۔ قلائد الجواہر، ص ۳۶ ، علامہ محمد بن یحیٰ حلبی

۳۔ نزہتہ الخاطر الفاتر، ص ۹، علامہ ملا علی قاری ۴۔ تفریح الخاطر، ص ۵۶ ، علامہ عبد القادر الاربلی

۵۔ تحفہ قادریہ، ص ۴۰،۴۸، ابو المعالی محمد سلمی قادری۔

اور امام اہلِ سنت احمد رضا خان نے تو اس نماز کے جواز میں ایک نہایت ہی مدلل رسالہ "اَنْہَارُ الْاَنْوَارِ مِنْ یَمِّ صَلوٰةِ الْاَسْرَارِ" بھی تحریر فرمایا۔ گویا آپ نے اسرار کے سمندر میں سے نور کی نہریں جاری کر کے نماز کے جواز کے ثبوت دلائل مہیا فرما دئے ہیں۔

اور صاحب ریاض السالکین نے اس نماز کا دوسرا نام "صلوٰۃ الاسرار دوگانہ ضرب الاقدام" بتلایا ہے اور اس کی تفصیل یوں بیان فرمائی ہے۔

۱۔ شب یکشنبہ کو غسل کر کے خوشبو لگا کر صاف کپڑے پہن کر پاک جگہ پر بیٹھے اور نیت صلوٰۃ الاسرار ہدیہ دربار پیرانِ پیر کرے۔

۲۔ سلام کے بعد ۱۱ بار اغثنی یارسول اللہ پھر ۱۱ بار الٰہی بحرمۃ غوث الثقلین اقض حاجتی پڑھے۔

۳۔ نماز سے فراغت کے بعد ۱۱ قدم جانب عراق چل کر کھڑا ہو جائے اور ۱۱ مرتبہ غوث پاک کی روح پر سلام بھیج کر اپنا دلی مطلب عرض کرے۔ (ریاض السالکین، ص ۳۱۴)

اب سوچئے نہیں بلکہ رو دیجئے کہ جہاں شرک و بدعات کا یہ عالم ہو، وہاں ایاک نعبد و ایاک نستعین کی کچھ حیثیت رہ جاتی ہے اور اس سے عجیب تر یہ معاملہ کہ یہ سب کچھ پیرانِ پیر کے نام منسوب کیا جاتا ہے۔

عبد القدوس گنگوہی کی کرامات

اب ایک علمی مجلہ ماہنامہ "دار العلوم" دیوبند کے ایک مضمون سے اقتباس ملاحظہ فرمائیے :

(عنوان: ہندو جوگی سے مقابلہ)

"جس وقت آپ (قطبِ عالم عبد القدوس گنگوہی) تکمیلِ علوم باطنی کے بعد گنگوہ تشریف لائے ہیں اس وقت یہاں ایک باکمال جوگی رہتا تھا جس کی کٹی نہایت وسیع اور پُر فضا تھی۔ آپ کو یہ جگہ بہت پسند

آئی اور قیام کی خواہش پیدا ہوئی۔ اندر جا کر چیلوں سے پوچھا کہ بتلائیے آپکے گرو جی کہاں ہیں؟ بولے وہ تو کٹی کے اندر گئے ہیں۔ ایک سال گزر چکا ہے۔ ہوا کے لئے صرف ایک روزن ہے، کیا مجال ہے، جو کوئی اس کے قریب جائے۔ آپ اس روزن کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ مراقبہ جو کیا تو معلوم ہوا کہ وہ حبس دم کئے ہوئے بیٹھا ہے اور اپنے کام میں مصروف ہے۔ آخر آپنے اس کی روح کو حرکت دی۔ ساتھ ہی وہ ہوشیار ہو گیا۔ پوچھا تو کون ہے؟ اور کس طرح اندر آگیا۔ فرمایا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اسی کی قدرت سے اس سوراخ کے ذریعہ اندر آگیا ہوں، مگر تو یہ تو بتا کہ کس حد تک ترقی کر چکا ہے؟ بولا کافی ترقی کر لی ہے، جو صورت چاہوں اختیار کر سکتا ہوں، دیکھو! ابھی پانی بنتا ہوں، چنانچہ وہ اسی وقت پانی ہو گیا۔ آپنے فوراً ہی اس پانی میں دھجی تر کرکے رکھ لی۔ اس کے ہوش میں آتے ہی فرمایا کہ اب میں پانی ہوتا ہوں، تو اس میں ایک کپڑا تر کرکے رکھ لینا۔ اس کے بعد کپڑے سونگھے گئے تو ایک میں بدبو تھی، تو دوسرے میں خوشبو۔ ایک کی وجہ سے دماغ پریشان ہوا جاتا تھا اور دوسرے کی خوشبو سے معطر۔ جوگی بولا کہ "میں تو اپنے فن دھن میں کامل تھا ہی، آپ بھی کامل نکلے، صرف خوشبو اور بدبو کا فرق رہا" فرمایا: "یہ کفر و اسلام کا فرق ہے۔" چنانچہ وہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور مرید ہو کر تکمیل کر لی۔ اس جوگی کو آپنے صاحب ولایت مقرر کرکے کہیں اور بھجوا دیا حضرت کا روضہ اسی جگہ ہے۔ وصال کے بعد بھی قلب بدستور ذکر و حرکت میں مصروف تھا" (ماہنامہ "دار العلوم" دیوبند، جنوری ۱۹۶۰ء، ص ۴۔ نگران اعلیٰ: قاری محمد طیب صاحب، مدیر: ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر)

اقتباسِ بالا سے مندرجہ ذیل باتیں مستنبط ہوتی ہیں:

۱۔ بزرگانِ کرام کسی غائب کی رُوح کو جھنجوڑ سکتے ہیں، باریک سے سوراخ سے گزر سکتے ہیں اور اپنی اشکال بدل سکتے ہیں۔ یہ سب کام تو غالباً جنوں یا فرشتوں کے ہو سکتے ہیں۔ کسی نبی سے کوئی معجزہ یا کسی صحابی سے ایسی کرامات ہمارے علم میں نہیں ہیں۔

۲۔ ایسی کرامات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ہندوؤں کے بزرگ بھی یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ عبد القدوس گنگوہی اور ہندو جوگی کا باطن یا فن ایک ہی تھا۔

۳۔ البتہ یہ فرق ضرور باقی رہتا ہے کہ مسلمان کے جسم سے (یا جو شکل بھی وہ بدلے) کلمہ طیبہ کی برکت سے خوشبو آتی ہے لیکن کافر کے بدن سے کلمہ کفر کی وجہ سے بدبو آتی ہے اور یہ فرق بزرگوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ سبحان اللہ! کلمہ پاک کی پاکیزگی کو کس مقام پر جا کر فٹ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جو کلمہ طیبہ

اور کلمہ خبیثہ یا اسلام اور کفر کی تمثیل پیش کر کلمہ طیبہ کے جو فوائد تبلاتے ہیں، کیا ان کی اس فائدہ سے کوئی نسبت ہے؟

۴۔ اور یہ فائدہ اتنا عظیم تھا کہ وہ کامل جوگی (بزرگ) فوراً مسلمان ہو گیا اور اس کے سب چیلے بھی۔ پھر آپ نے اسی وقت اس کو صاحب ولایت بھی مقرر کر دیا اور علامہ ابلی کے بیان کردہ اس دستور کی خلاف ورزی بھی کی کہ قیامت تک کے لئے قائم ولایت پیران پیر ہیں۔

۵۔ گنگوہی صاحب کا مقرر کردہ یہ نائب تو اسلامی تعلیمات خود بھی نہ جانتا تھا، دوسروں کو کیا سکھا سکتا تھا؟ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ علم و فن یہ حضرات سیکھتے ہیں اسے ہی انہوں نے اسلامی تعلیمات کا نام دے رکھا ہے۔ اور یہی کچھ ان اولیاء اللہ حضرات نے ہند میں اسلام پھیلایا تھا۔

۶۔ حرکتِ قلب کے بند ہو جانے کا نام ہی موت یا وصال (شریف) ہے۔ مگر آپ کے وصال کے بعد بھی آپ کا دل حرکت بھی کرتا رہا اور ذکر بھی کرتا رہا۔ پھر یہ وصال کی بات کیسی؟ صاف کہنا چاہئے کہ مرنے کے بعد بھی بدستور زندہ رہے یا فوت ہی نہیں ہوئے۔

پھر آپ کی یہ خوشبو اس قدر پختہ ہو گئی کہ آپ اپنے ایک مرید سے محض اس لئے بگڑ بیٹھے تھے کہ تمہیں ہماری خوشبو کیوں نہیں آئی۔ واقعہ یوں ہوا کہ آپ کے کسی مرید نے اپنے لڑکے کی دعوتِ ولیمہ میں امراء اور غرباء سب کو مدعو کیا۔ آپ بھیس بدل کر مجلسِ غرباء میں جا بیٹھے اور دیکھا کہ اُمراء اور غرباء سب کی ایک جیسی تواضع ہو رہی ہے آپ کا مرید وہاں موجود تھا، لیکن اپنے شیخ کو پہچان نہ سکا۔ پھر جب مجلس میں آیا۔ تو آپ کو ناراض دیکھ کر وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا: "ہم تمہاری دعوت میں گئے اور تم نے ہمیں پہچانا نہیں۔" اس نے کہا: "میں بھلا اس حالت میں آپ کو کیسے پہچان سکتا تھا؟" فرمایا: "اگرچہ ہم نے لباس تبدیل کیا ہوا تھا، مگر تمہیں ہمارے اندر سے خوشبو کیوں نہیں آئی؟ اور جب خوشبو نہیں آئی تو معلوم ہوا تم کو ہم سے محبت نہیں۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا ص ۲۰۱)

پیرانِ پیر اور جنس میں تبدیلی

بلا تبصرہ:

"شاہ ابو المعالی فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے بارگاہِ غوثیہ میں آکر لڑکے کے لیے التجا کی۔ آپ نے اس کے حق میں دُعا فرمائی اور وہ روزانہ آپ کی مجلس میں آنے لگا۔ اتفاق سے اس کے ہاں لڑکی پیدا ہو گئی، تو اس نے عرض کیا کہ "ہم نے تو لڑکے کے لئے کہا تھا اور یہ تو لڑکی ہے۔" آپ نے فرمایا: "اسے لپیٹ کر گھر لے جاؤ اور پردۂ غیب سے قدرت کا کرشمہ دیکھو۔" چنانچہ جب اس نے گھر لا کر کپڑا اٹھایا

تو لڑکی کے بجائے لڑکا پایا۔" (تفریح الخاطر، ص ۱۸۔ سفینۃ الاولیاء، ص ۱۷۔ تحفہ قادریہ، ص ۵۹۔ بحوالہ سیرت غوث، ص ۲۴۳)

اولیائے اللہ کا موت و حیات پر تصرف

تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ موت و حیات محض اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے اور یہ بات نصوصِ قرآنیہ سے ثابت ہے۔ کسی انسان کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ کب اور کہاں مرے گا، لیکن یہ "بزرگ حضرات" اس پابندی سے بھی آزاد ہیں۔ وہ جب چاہیں مر سکتے ہیں۔ اب مندرجہ ذیل واقعات ملاحظہ ہوں:

۱۔ عنوان ہے حضرت عبداللہ منازل:

"نقل ہے کہ ایک شخص نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا کہ .... (یہاں سے کچھ عبارت رہ گئی ہے)..... کہدے۔ کیونکہ اب اس کی عمر صرف ایک سال باقی ہے۔" اس نے آکر آپ سے کہہ دیا۔ آپ نے فرمایا: "یہ مدت تو بہت لمبی ہے۔ سال کا انتظار کون کرتا پھرے۔ نہ معلوم سال کب ختم ہو۔ یہ کہہ کر ہاتھ بجائے تکیہ سرہانے پر رکھا اور کہا: "لو میں چلا" پھر رحلت کی۔" (تقربانِ حق ص ۲۱)

۲۔ حضرت علی سہیل اصفہانی کی بات ہو رہی ہے:

"نقل ہے کہ ایک بار آپ نے اپنے دوستوں سے فرمایا "تم خیال کرتے ہو کہ میری موت تمہاری موت کی طرح ہوگی، یعنی بیمار پڑوں گا اور لوگ بیمار پرسی کو آئیں گے، نہیں! میری موت اس طرح ہوگی کہ وہ پکاریں گے اور میں حاضر ہو جاؤں گا۔" چنانچہ ایک دن آپ دوستوں کے ساتھ جا رہے تھے کہ اچانک ایک صاف جگہ لیٹ گئے اور کہا: "لبیک! لبیک!" پاس ہی حضرت ابوالحسن تھے۔ انہوں نے یہ حالت دیکھی، تو کلمہ شریف کی تلقین کی۔ آپ مسکرائے اور کہا: "مجھ کو تلقین کرتا ہے۔ اس کی عزت کی قسم! میرے اور اس کے درمیان صرف عزت کے پردہ کے سوا کوئی چیز حائل نہیں۔" (تقربانِ حق، ص ۲۱۶)

اب وہ منظر سامنے لائیے جن حالات میں حضور اکرم ﷺ کی وفات ہوئی تھی۔ آپ نے مسلمانوں کو کلمہ شریف پڑھنے کی تلقین بھی کی ہے اور اس وقت مسلمان کلمہ شریف اور قرآن پڑھ بھی رہے تھے۔ لیکن آپ کو ایسا "جلال" نہیں آیا۔

۳۔ شیخ فریدالدین عطار کا ذکر ہو رہا ہے:

"آپ ایک کارخانہ ادویہ کے مالک تھے۔ ایک دن کاروبار میں مصروف تھے کہ کسی فقیر نے آکر صدا لگائی کہ خدا کے نام پر کچھ دو۔ یہ مخاطب نہ ہوتے اس نے کتنی بار صدا لگائی۔ یہ اس قدر منہمک تھے کہ

جواب دینے کی فرصت نہ پائی۔ اس نے کہا کہ مشغولیت کا یہ عالم ہے، جان کیسے دو گے؟ انہوں نے جھنجلا کر کر کہا "جیسے تم دو گے"۔ اس نے کہا "بھلا میری طرح کیا دو گے؟" یہ کہہ کر کاسۂ گدائی سر کے نیچے رکھا۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہا اور روح پرواز کر گئی۔" (خلاصہ تصوفِ اسلام، از آقا بیدار بخت، ص ۴۷)

موت کے وقت میں تبدیلی

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے، تو کوئی اسے ایک لمحہ بھی آگے پیچھے نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ حضرات اس وقت کو آگے پیچھے کر سکتے ہیں اور کسی ایک کی جگہ دوسرے پر بھی موت وارد کر سکتے ہیں۔ مثلاً۔

(۱)۔ حضرت ابوالحسن خیر النساج کا ذکر چل رہا ہے:

"نقل ہے کہ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو نماز کا وقت بھی ہو گیا۔ ملک الموت حاضر ہوئے آپ نے سر اٹھا کر خوش آمدید کہا اور فرمایا: "اللہ آپ کو معاف کرے، ذرا ٹھہریئے! میں اور آپ دونوں خدا کے فرمانبردار بندے ہیں۔ آپ کو جو حکم ملا ہے ٹل نہیں سکتا، لیکن جو مجھے حکم ہے اس کا وقت فوت ہوا جاتا ہے۔ ذرا توقف کیجئے تاکہ نماز پڑھ لوں۔ پہلے میری طرف سے تعمیل ہو جائے، پھر آپ کر لیں۔" چنانچہ آپ نے وضو کیا، نماز پڑھی اور جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔" (مقربانِ حق، ص ۱۵۴)

سوال یہ ہے کہ:

۱۔ آپ نے جس نماز کے لیے ملک الموت کو انتظار کرایا اس کے آپ مکلف کب تھے؟

۲۔ آپ ملک الموت کو فرما رہے ہیں "اللہ آپ کو معاف کرے"۔ حالانکہ نہ وہ مکلف ہے۔ نہ اس سے گناہ سرزد ہوتا ہے، تو پھر معافی کیسی؟

(۲) "نقل ہے کہ محی الدین ابن عربی کو بادشاہِ وقت نے کہا: "میری لڑکی بیمار ہے آپ آ کر عیادت کریں تو شاید آپ کی برکت سے شفا ہو۔" آپ نے جا کر کہا کہ "عزرائیل تو روح قبض کرنے آگیا ہے"۔ بادشاہ آپ کے قدموں پر گر پڑا اور کہا: "اس کا علاج آپ کے ہاتھ میں ہے"۔ ابن عربی نے عزرائیل سے کہا: "ٹھہر! ہم اپنی لڑکی تمہارے ساتھ روانہ کر دیتے ہیں"۔ پھر گھر آئے اور دروازے کی طرف منہ کر کے فرمایا: "عزرائیل یہ لڑکی حاضر ہے۔ لڑکی اسی وقت زمین پر گر پڑی اور مر گئی اور بادشاہ کی لڑکی اچھی ہو گئی۔" (مرشدِ کامل، ترجمہ حدائق الاخبار، صادق فرغانی، ص ۲۳)

دیکھ لیجئے! خدائی کس کی چل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یا ابن عربی کی؟ پھر حضرت عزرائیل علیہ السلام کے ساتھ

بھی کیسی رازونیاز اور سمجھوتے کی باتیں ہو رہی ہیں۔

کلی تصرف کا ثبوت پیرانِ پیر کی زبان سے

شیخ عبدالقادر جیلانی 'فتوح الغیب' میں مقامِ ولایت میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض کتبِ انبیاء سابقین میں فرمایا: "اے اولادِ آدم! میں ہی وہ اللہ ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں جب میں کسی چیز کو کہہ دیتا ہوں "کُن" ہوجا، تو وہ ہو جاتی ہے۔ پس جب تم میری اطاعت اور فرمانبرداری کرو گے، تو میں تمہیں اسی مقام پر فائز کروں گا کہ تو بھی جب کسی چیز کو کہے گا "کُن" ہو جا تو وہ ہو جائے گی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم میں سے بے شمار انبیاء کرام، اولیاء کرام اور خواص کو اس صفت اور مرتبہ سے نوازا ہے۔"

(فتوح الغیب، مقالہ نمبر ۱۶ بر حاشیہ بہجۃ الاسرار، ص ۴۸ بحوالہ سیرت غوث، ص ۲۰۵)

اب دیکھئے اقتباس بالا میں پیران پیر نے "بعض کتب انبیاء سابقین" پر انحصار فرمایا۔ کتاب و سنت کو کافی نہ سمجھا۔ شاید اس لئے کہ کتاب و سنت سے ایسی بات کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ پھر آپ نے ان بعض کتب انبیاء سابقین کا حوالہ دینا بھی گوارا نہیں کیا۔ اسی سے آپ کے ارشاد کی نقاہت کا پتہ چل جاتا ہے اور اس طرح آپ نے اپنے سمیت اللہ تعالیٰ کے کئی شریکوں کا جواز پیدا کر دیا۔ خط کشیدہ الفاظ ایک دفعہ پھر ملاحظہ فرمائیے اور بتلائیے کہ اللہ تعالیٰ نے سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے، وہ بھی چند مخصوص باتوں میں، کسی نبی کو بھی یہ قدرت عطا فرمائی تھی؟ یہ بے شمار انبیاء، اولیاء اور خواص کہاں سے آ گئے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے علی الاطلاق یہ قدرت عطا فرما دی۔

پھر شیخ عبدالحق محدث دہلوی اسی فتوح الغیب کے اس کلام کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"ان حضرات (انبیاء، اولیا، خواص) میں سے ایک غوث پاک کی ذات بھی ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے آپ کو کائنات میں تصرف اور اقتدار حاصل ہے۔ درحقیقت ہر حال و مقام میں جو ان مقالات میں مذکور ہیں۔ وہ اپنے حال شریف کا کنایۃً اظہار ہے۔" (شرح فتوح الغیب، ص ۱۰۸، بحوالہ سیرت غوث، ص ۲۰۶)

اب دیکھئے محدث صاحب کا پہلا جملہ اپنے الفاظ و معانی میں بالکل صاف اور واضح ہے اور ہر شخص اس کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔ اگرچہ یہ بات کتاب و سنت کی رُو سے صریح شرک ہے، لیکن محدث صاحب کا دامن ادھر بھی الجھا ہوا ہے۔ لہٰذا آپ کو "اپنے حال شریف کے کنایۃً اظہار" کہنے کی ضرورت پیش آ گئی کہ اس طرح وہ شیخ جیلانی صاحب کی تنزیہہ بھی کر سکیں اور اپنے دل کو کسی حد تک مطمئن بھی۔

علامہ آلوسی اپنی کتاب "غایۃ الامانی فی الرد علی النبہانی" میں تصرف فی الکائنات کے اس مشرکانہ عقیدہ کی ہمہ گیری کے متعلق نہایت درد سے یہ واقعہ درج فرماتے ہیں:

اس عقیدہ پر علامہ آلوسی کا اظہارِ افسوس

اہلِ اسلام کے موحدین کی ایک جماعت ایک مصری کے گھر جمع ہوئی۔ اس کے قریب ہی ایک آدمی تھا، جس کو علم کا دعویٰ تھا۔ اس کو اہلِ خانہ نے پیغام بھیجا اور اس سے حاضرین کی موجودگی میں سوال کیا کہ "کتنے لوگ کائنات میں تصرف کرتے ہیں؟" اس نے جواب دیا "جناب سات آدمی!" پھر پوچھا گیا، "کون کون؟" اس نے جواب دیا، "فلاں فلاں" اور مصر کے چار معبودوں (بدوی، رفاعی، دسوقی اور ابو العلاء) کے نام لئے۔ اہلِ خانہ نے موجود موحدین سے کہا "میں نے آپکے سامنے اس سے اس لئے پوچھا ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ شرک کہاں تک اپنی جڑیں پھیلا چکا ہے۔"

۲۔ توجہ، بیعت اور شفاعت

توجہ کے کرشمے

حکیم الامت اشرف علی تھانوی، جنید بغدادیؒ کی عظمت میں یوں رطب اللسان ہیں۔

"۲۲۸۔ فرمایا حضرت جنید بغدادی بیٹھے تھے۔ ایک کتا سامنے سے گزرا۔ آپ کی نگاہ[1] اس پر پڑ گئی۔ اس قدر صاحبِ کمال ہو گیا کہ شہر کے کتے اس کے پیچھے دوڑے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ سب کتوں نے اس کے گرد حلقہ باندھ کر مراقبہ کیا۔" (امداد المشتاق، مؤلفہ حکیم الامت اشرف علی تھانوی، ص ۱۰۲)

لیجئے اب کتے بھی صاحبِ کمال و صاحبِ حال ہونے لگے۔ یہ مخلوق تو غیر مکلف ہے۔ اس بیچارے کو خواہ مخواہ ہی صاحبِ حال بنا دیا اور لطف یہ کہ یہ نگاہ اتفاقاً پڑ گئی۔ اگر باقاعدہ توجہ فرماتے، تو نہ معلوم وہ کتا کتنے بلند مقام پر فائز ہوتا۔ اگر اتفاقاً نگاہ پڑ جانے کا اتنا ہی اثر ہے، تو پھر تو اس دَور کے انسان، جن پر آپ کی

---

[1] یہی اشرف علی صاحب تھانوی بزرگوں کی توجہ کے متعلق ایک دوسرے مقام پر یوں رقمطراز ہیں:

"یہ نفس و خیال کی ایک قوت ہے۔ جو خیال و توجہ میں یکسوئی کی مشق سے مقبول کیا، مردود سے مردود شخص بھی حاصل کر سکتا ہے پرانے زمانے میں سحر یا جادوگری اور آج کل کے مسمریزم اور عمل تنویم (ہپناٹزم) کا بڑا مدار یہی ہے۔ اسی نفس یا باطن کی قوت سے کسی پر اثر ڈالنے کا نام صوفیوں کی اصطلاح میں توجہ، تصرف یا ہمت ہے ...... لیکن یہ قوت کوئی دینی کمال نہیں۔ نہ مقبول و مردود ہونے کی علامت ہے۔ ہر فاسق و فاجر بھی اپنے اندر مشق سے یہ قوت پیدا کر سکتا ہے۔" (تجدید تصوف و سلوک ص ۹۲)

نظر پڑی سب کے سب اولیاء اللہ ہو گئے ہوں گے ؟

نظرِ کرم کی فیوض و برکات

پھر یہ توجہ بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو کسی کو فیض پہنچاتی ہے یا اُسے ولی یا صاحبِ کرامت بنا دیتی ہے اور اسے نظرِ کرم کہتے ہیں۔ جنید بغدادی کی کتے پر "نظرِ کرم" ہی پڑی تھی۔ اب اس نظرِ کرم کے مختلف برکات و فیوض ملاحظہ فرمائیے !

۱۔ ایک بزرگ ابو ہبیرہ بصری (م ۲۸۷ھ) ہیں۔ "آپ کا جو شخص منظورِ نظر ہو جاتا۔ ایک توجہ سے فوراً اس پر علوم منکشف ہو جاتے تھے۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۴۷)

۲۔ پیرانِ پیر (م ۵۶۱ھ) نے جب شہاب الدین سہروردی پر ایک نگاہ ڈالی، تو علم کلام کی جملہ پڑھی ہوئی کتب ان کو یکسر محو ہو گئیں تھیں۔

۳۔ اس طرح عبد القدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) نے مولانا جلال الدین (جو انہیں ناچا پیر کہا کرتے تھے) کے جملہ علوم کو ایک توجہ سے زائل کر دیا تھا۔ (حوالہ ایضاً، ص ۲۱۱)

۴۔ حضرت احمد جام نے ایک کُند ذہن طالب پر نظر ڈالی، تو اتنے بلند پایہ مضامین منکشف ہوئے، جو عام انسانی سطح سے بہت بلند تھے۔ (مرشدِ کامل، ص ۲۴)

۵۔ میاں اسمٰعیل لاہوری المعروف میاں کلاں نے صبح کی نماز کے بعد سلام پھرتے وقت جب نگاہ کرم ڈالی تو دائیں طرف کے مقتدی سب کے سب حافظِ قرآن بن گئے تھے اور بائیں طرف کے ناظرہ پڑھنے والے۔ (حدیقۃ الاولیا صفحہ ۱۷۶)

۶۔ ابو احمد ابدال چشتی (م ۳۵۵ھ) جس شخص پر نظر ڈالتے تھے، صاحبِ کرامت ہو جاتا تھا۔ (تاریخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۴)

۷۔ میاں جی نور محمد (۱۲۷۴) نے جب اپنے ایک شاگرد پر توجہ ڈالی، تو اس کے اثر سے وہ سردیوں کے موسم میں، کمرہ میں، لحاف کے اندر صحن میں نیم کے درخت کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ تک سن لیتا تھا۔ (حوالہ ایضاً، ص ۲۳۹)

نگاہِ جلالیت کی تباہ کاریاں

پھر یہی توجہ جب کسی کو نقصان پہنچانے یا جان سے ختم کر دینے کے لئے استعمال کی جاتی ہے، تو اسے "نگاہِ جلالیت" کہتے ہیں۔ ان اولیاء اللہ کی دنیا میں اس قسم کی توجہ کی بھی بے شمار مثالیں ہیں۔ چند ایک درج ذیل ہیں :

۱۔ ابو یوسف ہمدانی (م ۵۳۵ھ) نے دو فقہاء کو یہ کہہ کر "تم خاموش رہو، زندہ نہ رہو" مار دیا تھا

ان کا قصور یہ تھا وہ فقہاء آپ کو بدعتی کہتے تھے۔ (صوفیائے نقشبند، ص ۱۲۹)

۲۔ جنید بغدادی (م ۲۹۷ھ) نے اپنے ایک مرید کو ایک ہی نگاہ میں مار دیا تھا۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے آپ کی مرضی کے خلاف آپ کی تقریر میں نعرہ لگایا تھا۔ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۲۷)

۳۔ علاء الدین صابر کلیری (خلیفہ فرید الدین گنج شکر) نے تو مسجد کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر سب نمازیوں کو ہلاک کر ڈالا۔ قصور اُن کا یہ تھا کہ اُنہوں نے آپ کو امام کے مصلّی سے اٹھا دیا تھا۔ (حدیقۃ الاولیاء، ص ۷)

پھر آپ کی یہ جلالیت اتنی ہمہ گیر تھی اور جلال اتنا غالب تھا کہ وصال کے بعد بھی مزار پر ایک شعلہ چمکتا تھا جس کی وجہ سے کسی شخص کی مجال مزار پر جانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت شاہ عبدالقدوس مزار پر حاضر ہوئے، تو حضرت کی درخواست پر وہ چمک موقوف ہوئی۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا۔ ص ۱۸۲)

غرض اس طرح کے واقعات بھی لا تعداد ہیں، جن میں سے چند ایک کی تفصیل ہم " اولیاء اللہ کی گستاخی کا انجام " کے تحت پیش کر چکے ہیں اور پیران پیر تو جانوروں کو بھی اس نگاہِ جلالیت سے معاف نہیں فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ایک چیل کو مار دیا۔ دوسری دفعہ ایک چوہے کو، تیسری دفعہ ایک چڑیا کو۔ واقعات کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ اب خدائی کا ایک کارنامہ باقی رہ جاتا ہے، وہ ہے اخروی نجات۔ اس بارے میں اولیاء اللہ، خدا سے بہت زیادہ فیاض ثابت ہوئے ہیں۔

بیعت ہی اُخروی نجات کی ضمانت ہے

" پھر شیخ الاسلام (خواجہ فرید الدین) نے فرمایا کہ (ان کے دادا پیر) شیخ معین الدین حسن سجزی (چشتی اجمیری) قدس سرہٗ العزیز کی یہ رسم تھی کہ جو کوئی ہمسایہ میں سے اس دنیا سے نقل (انتقال) کرتا اس کے جنازے کے ساتھ جانے اور خلق کے لوٹ جانے کے بعد اس کی قبر پر بیٹھتے اور جو درود کہ ایسے وقت میں پڑھنے آئے ہیں پڑھتے۔ پھر وہاں سے آتے۔ چنانچہ اجمیر میں آپ کے ہمسایوں میں سے ایک نے انتقال کیا۔ دستور کے مطابق آپ جنازہ کے ساتھ گئے، جب اسے دفن کر چکے، خلق لوٹ آئی اور خواجہ وہاں ٹھہر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد آپ اُٹھے۔ شیخ الاسلام قطب الدین فرماتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا کہ دمبدم آپ کا رنگ متغیر ہوا، پھر اسی وقت برقرار ہو گیا۔ جب آپ وہاں سے کھڑے ہوئے، تو فرمایا " الحمد للہ بیعت بڑی اچھی چیز ہے۔"

شیخ الاسلام قطب الدین اوشی نے آپ سے سوال کیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ " جب لوگ اس کو دفن کر کے چلے گئے، تو میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ عذاب کے فرشتے آئے اور چاہا کہ اس کو عذاب کریں۔ اسی

وقت شیخ عثمان ہارونی (آپ کے پیر صاحب، م ۶۰۳ھ) قدس سرہ العزیز حاضر ہوئے اور کہا کہ یہ شخص میرے مریدوں میں سے ہے۔ جب خواجہ عثمان نے یہ کہا، تو فرشتوں کو فرمان ہوا کہ کہو "یہ تمہارے برخلاف تھا" خواجہ نے فرمایا "بیشک، اگرچہ برخلاف تھا مگر چونکہ اس نے اپنے آپ کو اس فقیر کے پلّے باندھا تھا، تو میں نہیں چاہتا کہ اس پر عذاب کیا جائے۔" فرمان ہوا "اے فرشتو! شیخ کے مرید سے ہاتھ اٹھاؤ، میں نے اس کو بخش دیا" پھر شیخ الاسلام آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمانے لگے کہ اپنے آپ کو کسی کے پلّے باندھنا بہت ہی اچھی چیز ہے"

(راحۃ القلوب، ملفوظات خواجہ فریدالدین گنج شکر، مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی، مترجم غلام احمد بریاں، مطبع مجتبائی دہلی ص ۱۴)

کسی فقیر کے پلّے باندھنے کے فوائد

اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں مستفاد ہوتی ہیں:

۱۔ ان بزرگوں کے کمالات کے مظاہرہ کے لئے قبر ایک ضروری چیز ہے اور کشفِ قبور کے لئے درود بھی مخصوص قسم کے ہوتے ہیں۔

۲۔ ان کے تصرف کا دائرہ دنیا کے علاوہ برزخ اور قیامت تک وسیع ہوتا ہے۔

۳۔ ان کی غیب دانی خدا کی طرح ہے اور فوراً مرید کی مصیبت کے مقام پر پہنچ جانا فرشتوں کی مانند ہوتا ہے۔

۴۔ خدا نے جزا و سزا کا جو اٹل قانون مقرر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ وہ ان بزرگوں کی خواہش پر ہی غیر مؤثر ہو کر رہ جاتا ہے اور خدا اپنا فیصلہ بدل دیتا ہے۔

۵۔ ان بزرگوں میں اور خدا میں فرشتوں کی وساطت سے ہر وقت سوال جواب ہو سکتے ہیں۔ شریعت میں تو انبیاء ہی اس مرتبہ کے اہل ہوتے ہیں مگر صوفیوں کے دین میں پیر بھی کسی حیثیت سے کم نہیں ہوتے۔

۶۔ انبیاء تو قیامت کے دن شفاعت کریں گے، لیکن یہ حضرات دنیا میں ہی شفاعت کا کام شروع کر دیتے ہیں۔

ملاحظہ فرمایئے کس خوب صورت انداز میں خدا کے بجائے اپنی خدائی تسلیم کرائی جا رہی ہے۔ بیعت کی آڑ میں کیا کچھ ذہن نشین کرایا جا رہا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ، رسولِ اکرم ﷺ سے یوں فرما رہے ہیں۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ	اے پیغمبر! اس کام میں تمہارا کچھ اختیار نہیں۔ یا خدا ان کے حال پر مہربانی کرے یا انہیں عذاب دے کہ یہ ظالم لوگ ہیں۔ (۳/۱۲۸)

شفاعت اولیاء اللہ

ہمارے یہ بزرگ شفاعت کے بھی بڑے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں جبکہ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کا حق اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے مخصوص رکھا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر کسی کو بھی شفاعت کرنے کی مجال نہیں۔ احادیث سے البتہ یہ ثابت

ہے کہ روزِ محشر حضور اکرم ﷺ شفاعت فرمائیں گے۔ اُن کے بعد دُوسرے نبی اور نیکوکار لوگ بھی شفاعت کریں گے۔ بشرطیکہ وہ اپنے محاسبہ میں کامیاب ہو چکے ہوں اور سوا ان لوگوں کے جنہیں دنیا میں ہی جنت کی بشارت مل گئی۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کا اپنا حشر کیسا ہوگا۔ پھر دوسروں کی ذمہ داری اپنے سر اٹھانا کہاں تک درست ہے؟

اب مندرجہ ذیل واقعات ملاحظہ فرمایئے۔

ابوالحسن خرقانی قیامت کے دن نجات دہندہ

فرمایا: "جو یہاں آتا ہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ یہ جان لے کہ قیامت کے روز میں اس وقت تک کھڑا رہوں گا جب تک کہ یہاں آنے والے کو نجات نہ دلا لوں گا۔ اگر کوئی ایسا یقین نہیں رکھتا، تو اسے کہدو کہ یہاں مت آئے اور مجھے مت ملے۔" (مقربانِ حق، ص ۱۴۰)

اور صُوفیائے نقشبند صفحہ ۱۱۶ پر یہ روایت درج کرنے کے بعد یہ الفاظ زیادہ بھی ہیں کہ "ایسا شخص مجھے سلام بھی نہ کہے۔"

پیرانِ پیر سے توسل کے فائدے

۱۔ سیرۃ غوث الثقلین کے صفحہ ۲۴۴ پر مذکور ہے "غوث پاک کا ارشاد ہے: "جو مسلمان میرے مدرسہ کے کسی دروازہ سے بھی گزرے گا۔ قیامت کے اس کو عذاب میں تخفیف ہوگی۔" (طبقات الکبریٰ، ص ۱۲۷، ج ۱۔ بہجۃ الاسرار، ص ۱۰۱۔ قلائد الجواہر، ص ۱۵)

۲۔ ایک روز بغداد کا ایک آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا "میرے والد کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا، وہ مجھے کہتا تھا کہ میں عذابِ قبر میں مبتلا ہوں، تم شیخ عبدالقادر کو میرے لئے دُعا کرنے کو کہو۔ آپ نے فرمایا، "تمہارا والد میرے مدرسہ کے دروازے سے کبھی گزرا تھا؟" اس نے کہا: "جی ہاں!" آپ سُن کر خاموش ہوگئے۔ دوسرے دن وہ آدمی پھر آیا اور کہنے لگا "آج میں نے پھر والد کو خواب میں دیکھا وہ بہت خوش و خرم ہے اور سبز لباس زیب تن کئے ہے۔ عذاب اس سے دُور کر دیا گیا ہے اور مجھے کہا کہ تم ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہا کرو۔ آپ نے یہ سُن کر ارشاد فرمایا کہ "بیشک میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ جو مسلمان میرے مدرسہ کے دروازہ سے گزرے گا، میں اس کے عذاب میں تخفیف کروں گا۔" (بہجۃ الاسرار، ص ۱۰۱۔ قلائد الجواہر، ص ۱۵۔ سفینۃ الاولیاء، ص ۷۰۔ تحفہ قادریہ، ص ۴۴)

اب دیکھئے! مسلمانوں کی اولین درس گاہ مسجد نبویؐ ہے جس کے معلم حضور اکرم ﷺ خود تھے لیکن اس

مسجد کی فضیلت کے متعلق ہمیں کوئی روایت ایسی نہیں ملتی کہ اس کے دروازہ سے گزرنے پر عذاب میں تخفیف کا وعدہ کیا گیا ہو۔ لیکن پیران پیر سے اللہ نے بھی وعدہ فرما رہا ہے، پھر مسجد نبوی افضل ہوئی یا شیخ عبدالقادر کا مدرسہ نظامیہ!

۳۔ "غوث پاک کے زمانہ میں ایک شخص بہت ہی گنہگار تھا، لیکن اسے غوث پاک سے محبت ضرور تھی۔ اس کے مرنے کے بعد جب منکر نکیر نے اس سے سوالات کئے، تو اس نے ہر سوال کا جواب "عبدالقادر" کہتے ہوئے دیا۔ منکر نکیر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا کہ "یہ بندہ اگرچہ فاسق ہے مگر عبدالقادر سے اسے محبت ہے۔ میں نے اسے بخش دیا اور عبدالقادر سے محبت اور حسن اعتقاد کے عوض اس کی قبر کو وسیع کر دیا۔" (تفریح الخاطر، ص ۲۳، بحوالہ سیرت غوث، ص ۲۱۴)

۴۔ بغداد شریف کے محلہ باب الازج کے قبرستان میں ایک قبر سے مُردہ کے چیخنے کی آواز سنائی دینے کے متعلق لوگوں نے غوث پاک کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا: "کیا اس قبر والے نے مجھ سے خرقہ پہنا ہے؟" لوگوں نے کہا "ہمیں علم نہیں۔" پھر آپ نے پوچھا: "کیا اس نے کبھی میری مجلس میں حاضری دی؟" لوگوں نے کہا "ہمیں اس کا بھی علم نہیں۔" پھر آپ نے پوچھا: "کبھی اس نے میرے پیچھے نماز پڑھی تھی؟" لوگوں نے کہا: "ہمیں اس کا بھی علم نہیں۔" پھر آپ نے فرمایا: "بھولا ہوا شخص خسارہ میں ہی رہتا ہے۔" پھر آپ نے مراقبہ کیا اور سر اٹھا کر فرمایا: "فرشتوں نے مجھے کہا ہے کہ" اس شخص نے آپ کی زیارت کی ہے اور آپ سے حسن ظن اور محبت رکھتا تھا۔ لہٰذا اس سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم کر دیا ہے۔" اس کے بعد اس قبر سے کبھی آواز سنائی نہ دی۔" (قلائد الجواہر، ص ۲۵، بحوالہ سیرت غوث، ص ۲۱۴)

دیکھا آپ نے پیران پیر کی شفاعت کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ جب اہل دنیا سے کوئی گواہی دستیاب نہ ہوئی تو فرشتوں نے آکر گواہی بھی دے دی اور مغفرت کی بشارت بھی سنا دی۔

۵۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ: "مشائخ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے غوث پاک سے پوچھا: کہ "ایک شخص نے آپ کی بیعت تو نہیں کی مگر آپ کا ارادتمند ہے، تو کیا وہ شخص آپ کے مریدین میں شمار ہوگا اور اُن کی فضیلتوں میں شریک ہوگا یا نہیں؟" آپ نے ارشاد فرمایا کہ "جس نے اپنے آپ کو میری طرف منسوب کیا۔ وہ میرے ارادتمندوں میں شامل ہو گیا۔ اگرچہ یہ طریقہ مکروہ ہے تاہم ایسا شخص میرے اصحاب اور مریدین میں سے ہے اور میرے پروردگار نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ" وہ میرے تمام اصحاب اہل مذہب، میرے طریقہ پر چلنے والوں اور میرے محبوں کو بہشت میں جگہ دے گا۔" (اخبار الاخیار فارسی، ص ۲۵)

قلائد الجواہر، ص ۱۵۔ بہجۃ الاسرار، ص ۱۰۱۔ تحفہ قادریہ، ص ۴۸ بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۱۳۲)

۶۔ غوثِ اعظم نے فرمایا: "جو کوئی مصیبت میں مجھ سے فریاد کرے، میں اس کی مصیبت کو دُور کر ڈالوں گا۔ اور جو کوئی میرے توسّل سے حاجت مانگے گا اللہ اس کی حاجت پوری کرے گا۔" (قلائد الجواہر، اخبار الاخیار وغیرہ بحوالہ سیرت غوث، ص ۱۶۷)

۷۔ غوث الثقلین فرماتے ہیں کہ "قیامت تک میرے دوستوں، محبّوں اور مریدوں میں سے جو کوئی ٹھوکر کھائے گا، میں اس کا ہاتھ پکڑ لوں گا۔" (قلائد الجواہر، ص ۱۷، بحوالہ ایضاً)

۸۔ "فرمایا: حق تعالیٰ نے میرے ہاتھ میں ایک کاغذ دیا۔ میں نے اپنی حدِ نظر تک دیکھا اس میں میرے اصحاب اور مریدوں کے نام لکھے ہوئے تھے جو قیامت تک اپنی نسبتوں کو میری طرف منسوب کر کے اصلاح چاہیں گے۔ حکم ہوا "میں نے ان سب کو تیری وجہ سے بخش دیا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۶۴)

دیکھا آپ نے، ادھر اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھ میں اتنا لمبا چوڑا کاغذ تھماتا ہے اور ابھی اسے ملاحظہ فرما ہی رہے ہوتے ہیں ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی مغفرت کا اعلان عام ہو جاتا ہے۔ اسے ہی کہتے ہیں جھٹ منگنی پٹ بیاہ۔

۹۔ غوثِ اعظم نے فرمایا "مجھے اللہ کی عزت و جلالت کی قسم! کہ میرا ہاتھ اپنے مریدوں میں اس طرح ہے جس طرح آسمان (کا سایہ) ہے۔ اگر میرے مرید عالی مرتبہ نہ ہوں تو کچھ مضائقہ نہیں، میں تو اللہ کی بارگاہ میں عالی مرتبہ ہوں ۔

مُرِیْدِیْ ھِمْ وَطِبْ وَاشْطَحْ وَغَنِّیْ وَافْعَلْ مَا تَشَاءُ فَالْاِسْمُ عَالِیْ

اے میرے مرید خوش ہو اور بیباک ہاتھ سے جو چاہے کر گزر۔ میرا نام جو بڑا ہے تیرے پاس ہے

مُرِیْدِیْ لَا تَخَفْ اَللّٰہُ رَبِّیْ عَطَانِیْ رِفْعَۃً نِلْتُ الْمَنَالِیْ

اے میرے مرید تو مت ڈر۔ اللہ کریم میرا رب ہے۔ اس نے مجھے رفعت و بلندی عنایت فرمائی ہے اور میں اپنی امیدوں کو پہنچا ہوں

نَظَرْتُ اِلٰی بِلَادِ اللّٰہِ جَمْعًا کَخَرْدَلَۃٍ عَلٰی حُکْمِ التِّصَالِ

خدا کے تمام شہر اور ملک میری نگاہ میں رائی کے دانہ کی طرح ہیں اور میرے حکم انصال میں ہیں۔

وَوَلَّانِیْ عَلَی الْاَقْطَابِ جَمْعًا فَحُکْمِیْ نَافِذٌ فِیْ کُلِّ حَالِ

اللہ تعالیٰ نے مجھے جملہ اقطاب کا مختار بنایا ہے۔ پس میرا حکم ہر حال میں نافذ ہے۔

وَمَا مِنْھَا شُھُوْرٌ اَوْ دُھُوْرٌ تَمُرُّ وَتَنْقَضِیْ اِلَّا اَتَالِیْ

اور کوئی مہینہ اور سال ایسا نہیں ہے جو اپنے ظہور سے پہلے میرے پاس نہ آئے۔ (سیرت غوث، ص ۳۴)

۱۰۔ نیز آپ نے فرمایا کہ "ہم میں کا ایک انڈہ ہزار میں اور چوزہ کی قیمت تو لگائی نہیں جا سکتی۔ نیز فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک لکھا ہوا دفتر دیا۔ جس میں قیامت تک آنے والے میرے احباب اور مریدوں کے نام درج تھے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان سب کو تیری وجہ سے میں نے بخش دیا" (خزینۃ الاصفیا، ص ۱۶۴)

۱۱۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے داروغہ جہنم سے، جن کا نام مالک ہے، دریافت کیا کہ "میرے مریدوں میں سے تمہارے پاس کوئی ہے؟" جواب دیا "عزتِ پروردگار کی قسم! کوئی بھی نہیں۔" "دیکھو! میرا دستِ حمایت میرے مریدوں پر ایسا ہے، جیسے آسمان زمین کے اوپر۔ اگر میرا مرید اچھا نہیں، تو کیا ہوا میں تو اچھا ہوں۔ جلالِ پروردگار کی قسم! جب تک میرے تمام مرید بہشت میں نہیں چلے جائیں گے، میں بارگاہِ خداوندی میں نہیں جاؤں گا۔ اگر مشرق میں میرے ایک مرید کا پردۂ عفت گر رہا ہو اور میں مغرب میں ہوں تو یقیناً میں اس کی پردہ پوشی[1] کروں گا۔"

(اخبار الاخیار، مصنفہ عبدالحق محدث دہلوی، از ترجمہ مولانا سبحان محمود صاحب، ص ۴۹)

ان اقتباسات سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ حضور اکرم ﷺ نے تو اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے یہ فرمایا تھا کہ "آخرت میں تمہارے کام نہ آسکوں گا۔"[2] لیکن آپ کا سب مریدوں کی بخشش کے لئے اعلانِ عام ہے۔ تو اس روایت کے مطابق آپ عالی مرتبہ ہوئے یا حضور اکرم ﷺ؟

۲۔ آپ چونکہ اپنے بدکار مریدوں کی بخشش کا بھی ذمہ لے رہے ہیں، اس لئے کہ آپ خود تو اچھے ہیں، تو اس طرح تو اللہ تعالیٰ کا قانون غیر مؤثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر خدائی آپ کی ہوئی یا اللہ کی، مالکِ یوم الدین کون ہوا!

۳۔ خدا کے وعدہ مغفرت پر آپ کو اطمینان نہ ہوا، تو آپ نے باقاعدہ جہنم کے داروغہ مالک سے ملاقات کر کے تصدیق و توثیق کر لی بعدازاں مریدوں کو یہ مژدۂ جانفزا سنایا۔

۴۔ آپ کا مریدوں پر تصرف اتنا ہمہ گیر اور محیط ہے جیسے آسمان زمین کو محیط ہے اور غیب دانی کا یہ عالم کہ

---

[1] ان واقعات کی صحت کی ذمہ داری تذکرہ نگاروں پر ہے

[2] حضور اکرم ﷺ نے تو اپنی پیاری بیٹی سیدۃ النساء سے فرمایا تھا کہ
یا فاطمۃ انقذی نفسک من النار — فاطمہ! اپنی جان کو آگ سے خود بچاؤ (بخاری کتاب التفسیر سورۃ شعراء)
اور پھر ایک دفعہ یوں بھی فرمایا تھا کہ "اے فاطمہ! مجھ سے جو مانگنا ہے اسی دنیا میں مانگ لے، قیامت کے دن میں تمہارے کام نہ آسکوں گا۔" (بخاری) اور ان حضرات کے یہ دعوے ساء ما یحکمون

مشرق میں کسی مرید کو کچھ تکلیف پہنچ رہی ہو اور آپ مغرب میں ہوں تو بھی دستگیری کرنے کے لئے جائے واردات پر فوراً پہنچ جاتے ہیں۔

اب بتلائیے کہ اگر مریدوں کو آپ کے سلسلہ میں محض منسلک ہو جانے سے اتنے فوائد حاصل ہو جائیں تو شرعی تکلیفات یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے ادا کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ کیا یہ کافی نہیں کہ آپکے نام کی نذر گیارھویں دے دی جائے اور آپ کو بوقتِ ضرورت پکار لیا جائے تاکہ آپکے معتقدین کے زمرہ میں شامل ہو کر آخرت میں نجات حاصل کی جا سکے۔؟

یہ مزارات اور خانقاہیں

قبر پرستی اور بُت پرستی میں قدرِ مشترک

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ قومِ نوح میں بُت پرستی سے پہلے قبروں پر اعتکاف اور مراقبہ کرنے کا رواج ہوا تھا۔ بعد میں انہی اولیاء اللہ کے مجسّمے بنا لیے گئے اور ان کی پُوجا شروع ہو گئی۔ ان دونوں قسم کی پرستشوں میں قدرِ مشترک یہ تھی کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جس طرح مرنے کے بعد قبر کے ساتھ صاحبِ قبر کی رُوح کا تعلق باقی رہتا ہے اور وہ رُوح پکارنے والے کی پکار سنتی اور اس کی حاجت روائی کرتی ہے بعینہٖ اسی طرح اس "ولی" کا اگر مجسمہ بنا لیا جائے تو اس سے بھی وہی فوائد حاصل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کی قبروں پر جانے کے بجائے انہوں نے شارٹ کٹ یہ سوچا کہ ان کے بُت بنا لئے جائیں جنہیں وہ جہاں چاہتے رکھ سکتے اور ان کی پُوجا پاٹ کر سکتے اور ان سے اپنی مرادیں پوری کرا سکتے تھے۔ اسی سہولت کی خاطر بُت تراشی کا فن ایجاد ہوا، جو ایک پیشہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ لوگ اپنے ان "بنے بنائے خداؤں" کو خرید لیتے اور جہاں چاہتے لے جاتے۔ چنانچہ عرب میں پہلا شخص جو بُت لایا وہ قصی بن کلاب تھا۔

قبروں سے متعلق بعینہٖ یہی تصور آج مسلمانوں میں بھی پایا جاتا ہے اور یہی تصور درحقیقت "ولایت یا اولیائی" کی رُوحِ رواں ہے۔ چونکہ اپنے بزرگوں سے عقیدت انسان کی فطرت میں رچی ہوئی ہے لہٰذا یہی شرک کا سب سے بڑا چور دروازہ ثابت ہوا ہے۔ یہاں چند ایک سوالات خود بخود ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ مثلاً،

1. کیا واقعی قبر کے ساتھ صاحبِ قبر کی رُوح کا تعلق ہوتا ہے، جو اس کی پکار سن کر اس کی حاجت روائی کرتی ہے؟
2. اور اگر کرتی ہے تو کیسے؟
3. کیا جو کچھ قبروں پر ہوتا ہے اس کے متعلق شریعت خاموش ہے یا کچھ واضح احکام موجود ہیں؟

ہم مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر ان تینوں باتوں پر تفصیل سے بات کریں گے۔

کیا فوت شدہ لوگ سن سکتے ہیں؟

اس سوال کو شرعی اصطلاح میں "سماع موتیٰ" کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم کے واضح ارشادات موجود ہیں۔ مثلاً:

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَّمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۱۶/۲۱-۲۰)	اور جن لوگوں کو یہ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز بھی نہیں بنا سکتے، بلکہ وہ خود پیدا کئے گئے ہیں۔ وہ لاشیں ہیں بے جان، ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ (۳۵/۲۲-۲۱)	اور نہ ہی زندے اور مُردے برابر ہو سکتے ہیں۔ خدا جس کو چاہتا ہے سُنا دیتا ہے اور تم ان کو جو قبروں میں (مدفون) ہیں سنا نہیں سکتے۔

اور تیسرے مقام پر فرمایا:

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ (۴۶/۶-۵)	اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے، جو ایسے کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہ دے سکے اور اُن کو اُن کے پکارنے کی خبر بھی نہ ہو اور جب لوگ (قیامت کو) اکٹھے کئے جائیں گے، تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی پرستش سے انکار کر دیں گے۔

یہ اور اسی طرح قرآن کریم میں اور بھی کئی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مُردے سُن نہیں سکتے، لیکن سماع موتیٰ کے قائلین ہر آیت کی کوئی نہ کوئی ایسی تاویل و توجیہہ پیش کر دیتے ہیں جن سے کم از کم فوت شدہ بزرگان کرام کے سننے کا استثنا ہو سکے۔ لہٰذا ان آیات کا ہم ذرا تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

یہ تو واضح ہے کہ عبادت یا تو بتوں کی ہوتی رہی ہے یا سورج چاند، ہوا، پانی، درخت وغیرہ یا فوت شدہ بزرگوں کی یا جنوں اور فرشتوں کی۔ اب دیکھئے آیت نمبر ۱ میں جنوں اور فرشتوں پر اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ کا اطلاق نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ دونوں غیر مرئی مخلوق ہیں اور ان کے مرنے جینے کو ہم معلوم نہیں کر سکتے اور بتوں

یا دیگر مظاہر پر بعث بعد الموت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ کے الفاظ بھی اِن کو خارج از بحث قرار دے رہے ہیں۔ لہٰذا لامحالہ اس آیت سے صرف فوت شدہ بزرگ ہی مُراد لئے جا سکتے ہیں۔ اس توجیہہ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مشرکین مکہ تو بُت پرست تھے وہ قبر پرست تو نہیں تھے۔ یہ اعتراض بھی غلط ہے کیونکہ یہود و نصاریٰ کی قبر پرستی تو احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔ پھر احادیث و آثار سے یہ بھی ثابت ہے کہ جن بتوں کی پرستش ہوتی تھی تو وہ اُنہی بزرگان کرام کے مجسمے تھے، جن کی پہلے قبریں پوجی جاتی تھیں۔ جیسے ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں۔

آیت نمبر ۲ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں اموات سے مراد، مُردہ ضمیر کافر ہیں اور من فی القبور سے مراد گمراہی میں پڑے لوگ۔ گو یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے، لیکن کوئی قرینہ ایسا نہیں کہ اس سے مراد فوت شدہ بزرگ نہ لئے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے اصل معانی وہی ہیں جو بظاہر الفاظ سے معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہاں اموات سے مراد کفار بھی لئے جا سکتے ہیں۔ تاہم یہی وہ آیت ہے جس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سماع موتیٰ کے انکار پر استدلال فرمایا تھا۔

مزید غور فرمائیے آیت نمبر ۳ میں عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ کے الفاظ جنوں اور فرشتوں کو معبودانِ باطل کے زُمرہ سے خارج کر دیتے ہیں، کیونکہ ان کو موت و زیست کا ہمیں علم نہیں اور بحالت زیست وہ دُعائیں سکتے ہیں اور کَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً کے الفاظ بتوں اور مظاہر کو اس زُمرہ سے نکال دیتے ہیں۔ کیونکہ ان بے جان اشیاء کی نہ دنیا میں دوستی کا کچھ فائدہ نہ آخرت میں دشمنی کا کچھ نقصان بلکہ ان میں اکثر چیزوں کا تو اس وقت تک وجود تک بھی نہ ہوگا۔ باقی صرف فوت شدہ بزرگ رہ جاتے ہیں، جو اس آیت کا مصداق بن سکتے ہیں۔

احادیث اور سماع موتیٰ

اب احادیث کی طرف آئیے۔ سماع موتیٰ کے حق میں سب سے بڑی دلیل بدر کا واقعہ پیش کیا جاتا ہے، جو بخاری میں بالتفصیل کتاب المغازی میں مذکور ہے۔ چوبیس کافروں کی لاشیں ایک کنوئیں میں پھینک دی گئی تھیں۔ ان سب کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مخاطب کر کے اور نام بمعہ والد (لے فلاں ابن فلاں) لے لے کر پکارا اور کہا کہ "ہم سے تو اللہ نے وعدہ کیا تھا، وہ پورا کر دیا۔ کیا تم سے اللہ کا وعدہ پورا ہوا؟" تو اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا "یا رسول اللہ! یہ تو مُردے ہیں۔" تو آپ نے فرمایا: "کہ تم ان سے زیادہ نہیں سن رہے۔"

اب حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اسے ایک استثنائی صورت (یعنی اللہ کا اسماع ہے) قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

خدا نے اس خاص وقت میں ان کو زندہ کر دیا تھا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یوں فرماتی ہیں کہ وہ جس حالت میں بھی تھے، خُدا نے ان کو معلوم کرا دیا تھا اور پھر یہ آیت پڑھی ان الله یسمع من یشاء و ما انت بمسمع من فی القبور۔

تاہم بعض صحابہ مثلاً حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور کچھ مفسرین کا اس بارے میں اختلاف تھا مگر وہ بھی مُردوں کے سننے کی حد تک۔ سُن کر جواب دینے یا جوابی کارروائی کرنے کا کوئی بھی قائل نہ تھا (ملاحظہ ہو تیسیر الباری، حاشیہ متعلقہ حدیث مندرجہ) سماع سے متعلق اختلاف کی اصل وجہ در اصل چند دوسری احادیث تھیں، مثلاً :

۱۔ جب ہم قبرستان جاتے ہیں، تو ہمیں السلام علیکم یا اهل القبور .... الخ پڑھنے کا حکم ہے۔ پھر اگر مُردے سنتے ہی نہیں، تو اس طرزِ تخاطب کے کیا معنی؟

۲۔ احادیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ مُردہ کو جب دفن کر کے واپس آتے ہیں تو وہ واپس لوٹنے والوں کی جوتیوں کی چاپ سنتا ہے۔

حدیث نمبر ا کی مندرجہ آیات سے تطبیق یوں ہوتی ہے کہ یہ سلام، سلام دُعا ہے۔ سلام تحیہ نہیں۔ سلام تحیہ وہ ہوتا ہے جن کا جواب دینا فرض ہوتا ہے۔

بموجب ارشاد باری تعالیٰ :

وَإِذَا حُيِّيتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا (۴/۸۵)

اور جب تم کو کوئی دعا دے تو جواب میں اس سے بہتر دُعا دو یا انہی لفظوں سے دُعا دو۔

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم ایک دوسرے سے ملو تو ایک السلام علیکم کہے اور دوسرا اسے وعلیکم السلام سے جواب دے۔ اور یہ جواب دینا فرض ہے۔

دوسری قسم سلام دعا ہے۔ اس کا جواب دینا تو درکنار سننا بھی مخاطب کے لئے ضروری نہیں ہوتا۔ جیسے ہم کسی کو خط لکھتے ہیں تو ابتداء اسے مخاطب کر کے السلام علیکم لکھتے ہیں۔ پھر کبھی اس کا جواب آ جاتا ہے کبھی نہیں بھی آتا۔ اس کی دوسری مثال وہ سلام ہے جو ہم نماز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے آپ پر اور تمام نیک بندوں پر پڑھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے نیک بندوں میں سے کوئی بھی نہ یہ سلام سنتا تھا نہ اس سلام کا جواب دیتا تھا۔ کیونکہ سُن لینے کے بعد اس کا جواب دینا فرض ہو جاتا ہے۔ گویا یہاں بھی یا ایھا النبی میں "یا"

کا لفظ "ندا" کے طور پر نہیں۔ بلکہ نماز کے اذکار جو آنحضرت ﷺ سے ماثور ہیں۔ وہ اسی طرح اور اسی ترتیب سے بطورِ حکایت پڑھے جاتے ہیں۔ بالکل یہی صورت "السلام علیکم یا اھل القبور....." کی بھی ہے۔

حدیث نمبر ۲ میں جو مُردے کا جانے والوں کی جوتیوں کی چاپ سننے کا ذکر ہے۔ تو یہ محض اسے حسرت دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ سنا دیتے ہیں جس طرح قلیبِ بدر کے کافروں کو اللہ تعالیٰ نے سنا دیا تھا۔ اس حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ وہ ان قبر پر آنے والوں کی بھی چاپ سنتا ہے یا ان کی دوسری باتیں بھی سنتا ہے۔ صرف رخصت کر کے جانے والوں کی جوتیوں کی چاپ کا ذکر ہے کہ لو جن عزیزوں کے لئے تم نے اپنی زندگی کا بیشتر اور عزیز ترین حصہ صرف کر دیا اور حلال و حرام تک بھی تمیز نہ رکھی وہ سب چھوڑ کر واپس جا رہے ہیں۔ منکر نکیر کا سوال و جواب ایک استثنائی اور اضطراری امر ہے۔ لہٰذا اس اضطرار سے علی الاطلاق سماع موتیٰ کا امکان درست نہیں کہ یہ بھی استثنائی صورت ہے۔

مندرجہ آیت نمبر ۳ کے ضمن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں سماع موتیٰ سے متعلق جو حاشیہ لکھا ہے۔ وہ اس مسئلہ سے متعلق بیشتر اشکال کو دور کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کو یہاں درج کرنا مناسب رہے گا۔ (سورہ احقاف ۴۶، آیت نمبر ۵، ۶ کا حاشیہ از تفہیم القرآن، جلد ۴)

"یعنی ان تک ان پکارنے والوں کی آواز سرے سے پہنچتی ہی نہیں۔ نہ وہ خود اپنے کانوں سے اس کو سنتے ہیں نہ کسی ذریعہ سے ان تک یہ اطلاع پہنچتی ہے کہ دنیا میں انہیں کوئی پکار رہا ہے۔ اس ارشادِ الٰہی کو تفصیلاً یوں سمجھئے کہ دنیا بھر کے مشرکین خدا کے سوا جن ہستیوں سے دعائیں مانگتے رہے ہیں وہ تین اقسام پر منقسم ہیں: ایک بے روح اور بے عقل مخلوقات، دوسرے وہ بزرگ جو گزر چکے۔ تیسرے وہ گمراہ انسان جو خود بھی بگڑے ہوئے تھے اور دوسروں کو بھی بگاڑ کر دُنیا سے رخصت ہوئے۔ پہلی قسم کے معبودوں کا تو اپنے عابدوں کی دُعاؤں سے بے خبر رہنا ظاہر ہے ہی۔ رہے دوسری قسم کے معبود، جو اللہ کے مقرب انسان تھے، تو اُن کے بے خبر رہنے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کے ہاں اس عالم میں ہیں جہاں انسانی آوازیں براہِ راست ان تک نہیں پہنچتیں دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے بھی ان تک یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ جن لوگوں کو یہ بزرگ ساری عمر اللہ سے دُعا مانگنا سکھاتے رہے تھے وہ اب الٹی آپ (اس بزرگ) سے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ اس لئے کہ اس اطلاع سے بڑھ کر ان کو صدمہ پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور اللہ اپنے ان نیک بندوں کی ارواح کو اذیت دینا ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اس کے بعد تیسری قسم کے معبودوں پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے بے خبر رہنے کی بھی دو

ہی وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ملزموں کی حیثیت سے اللہ کے ہاں حوالات میں بند ہیں۔ جہاں دنیا کی کوئی آواز نہیں پہنچتی۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے بھی انہیں یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ تمہارا مشن دنیا میں خوب کامیاب ہو رہا ہے اور لوگ تمہارے پیچھے تمہیں معبود بنائے بیٹھے ہیں۔ اس لئے کہ یہ خبریں ان کیلئے مسرت کی موجب ہوں گی اور خدا ظالموں کو ہرگز خوش کرنا نہیں چاہتا۔"

"اس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو دنیا والوں کے سلام اور اُن کی دعائے رحمت (جیسے قبر پر یا نماز میں) پہنچا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں ان کے لئے فرحت کی موجب ہیں اور اسی طرح وہ مجرموں کو دنیا والوں کی لعنت اور پھٹکار اور زجر و توبیخ سے مطلع فرما دیتا ہے۔ جیسے جنگِ بدر میں مارے جانے والے کفار کو ایک حدیث کے مطابق نبی کریم ﷺ کی توبیخ سنوا دی گئی۔ کیونکہ ان کے لئے یہ اذیت کی موجب ہے۔ لیکن کوئی ایسی بات جو صالحین کے لئے رنج کی موجب یا مجرمین کے لئے فرحت کی موجب ہو وہ ان تک نہیں پہنچائی جاتی۔ اس تشریح سے سماعِ موتیٰ کے مسئلے کی حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔"

مُردوں کی برزخی زندگی

دراصل سماعِ موتیٰ کی بحث سے پہلے ایک اور بحث بھی پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مُردے سُن تو تب ہی سکتے ہیں۔ جب وہ زندہ ہوں۔ تو سوال یہ ہے کہ آیا مُردے زندہ بھی ہیں یا نہیں اور اگر زندہ ہیں تو کس طرح کی زندگی ہے؟ تو اس کے متعلق قرآن و حدیث میں واضح ارشادات موجود ہیں کہ رُوح کو چاروں مراحلِ موت و زیست میں فنا نہیں۔ وہ جب سے پیدا ہوئی ہے۔ زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر وہ زندہ ہیں تو کہاں رہتی ہیں، تو اس کا واضح جواب یہ ہے کہ کافروں کی رُوحیں "سجّین" اور مومنوں کی "علیّین" میں۔ یہ مقام کہاں واقع ہیں؟ یہ جاننے کے نہ ہم مکلف ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ یہ برزخی زندگی کا معاملہ ہے۔ البتہ شہیدوں کی رُوحوں کے بارے میں تخصیص ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (۲/۱۵۴)

اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم سمجھ نہیں سکتے۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے انہیں مُردہ مت سمجھو وہ

---

[1] مزید تفصیلات کے لیے میری تصنیف روح، عذابِ قبر اور سماعِ موتیٰ ملاحظہ فرمائیے۔

بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ (۳/۱۶۹) زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق پا رہے ہیں۔

گویا شہداء کی زندگی عام لوگوں سے مختلف اور بہتر تو ہے لیکن سمجھ ہم وہ بھی نہیں سکتے۔ اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"جو شخص بہشت میں جاتا ہے وہ پھر دنیا میں آنا پسند نہیں کرتا۔ گو اس کو ساری زمین کی دولت ملے البتہ شہید دنیا میں آنے کی اور دس بار اللہ کی راہ میں قتل ہونے کی آرزو کرتا ہے کیونکہ وہ شہادت کی عزت وہاں دیکھتا ہے۔" (بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب تمنی المجاہد ان یرجع الی الدنیا)

ان ارشادات سے واضح ہو گیا کہ کوئی نیک آدمی جو بہشت میں جاتا ہے۔ اس کی روح دنیا میں واپس نہیں آسکتی کیونکہ یہ اللہ کے دستور کے خلاف ہے۔ اب ہم دیکھیں گے کہ اللہ کی سنت یا دستور کیا ہے؟ اور شہداء کی تکریم کی وجہ کیا ہے؟

انسان کی روح کا سفر کچھ اس طرح ہے کہ وہ بطنِ مادر میں داخل ہونے سے مدتوں پہلے پیدا ہو چکی تھی پھر اپنے وقت پر جنین میں داخل ہوتی ہے۔ پھر بچہ پیدا ہوتا ہے، پھر جوان ہوتا ہے۔ پھر بوڑھا ہوتا ہے پھر مر جاتا ہے۔ مرنے کے بعد روح عالم برزخ میں چلی جاتی ہے۔ قیامت تک وہاں رہے گی۔ پھر سفر آخرت ہے۔ نیک روحیں جنت میں چلی جائیں گی اور بد روحیں جہنم میں۔ یا اللہ تعالیٰ اہل جہنمیوں میں سے بھی بعض کو بعد میں جنت میں داخل کر دیں گے بس یہاں پہنچ کر یہ سفر ختم ہو جاتا ہے۔

اب اس سفر کی ترتیب بدل نہیں سکتی۔ لیکن اس میں شارٹ کٹ ہو سکتا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ بچہ جوان یا بوڑھا ہونے سے پیشتر ہی مر جائے، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی بوڑھا بچہ بن جائے۔ شہداء کی تکریم اور تحسین یہ ہے کہ انہیں مرنے کے بعد برزخ میں نہیں رکھا جاتا بلکہ براہِ راست انہیں جنت میں بھیج دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں جنت کے باغوں میں چہچہاتی پھرتی ہیں۔

کیا روح کا اس دنیا میں واپس آنا ممکن ہے؟

اب یہ تو ظاہر ہے کہ برزخ یا بہشت میں رہنے والی روحیں اس دنیا کے لوگوں کی پکار یا دعا یا بات سن نہیں سکتیں۔ اللہ تعالیٰ پہنچا دے تو الگ بات ہے۔ بدکار لوگوں کی روحیں ویسے ہی مقید ہیں۔ انہیں یہاں آنے کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے اور نیک لوگوں کی روحیں کسی قیمت پر اس دنیا میں آنے کا نام نہ لیں گی۔ البتہ شہیدوں

کی رُوحیں آنے کی آرزو کریں گی۔ وہ بھی اِس لئے نہیں کہ اپنے اہل و عیال یا متعلقین کی صورتِ حال سے مطلع کریں اور ان کی حاجت روائی یا مشکل کشائی یا بشارات سنائیں بلکہ اس لئے کہ بار بار شہید ہو کر ان کا درجہ او زیادہ بلند ہو جو ان کو پہلی مرتبہ شہید ہونے پر ملا۔

پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ بدکاروں اور عام مسلمانوں کی رُوحیں تو عالمِ برزخ (سجین اور علیین) میں ہوئیں اور شہیدوں، نبیوں اور صدیقوں وغیرہ کی جنت میں۔ جو دنیا سے بہت دُور اور سفر کی آخری منزل ہے۔ پھر بھلا وہ رُوحیں اس دنیا میں کیوں آئیں گی؟

ان تصریحات سے صاف واضح ہوگیا کہ قبر میں یا اُس کے آس پاس یا اِس دنیا میں کسی فوت شدہ انسان کی رُوح نہیں ہوتی۔ لہٰذا سماعِ موتیٰ کی بحث ہی سرے سے ختم ہو جاتی ہے۔ رہا درود و سلام کا مسئلہ تو اس کی وضاحت پہلے بیان ہو چکی ہے۔ اور اسی تصریح کی تائید احادیث بھی کرتی ہیں۔

اولیاء اللہ مرتے نہیں

لیکن ہمارے صوفیاء بضد ہیں کہ ولی زندہ ہوتے ہیں اور اُنہوں نے ایک حدیث یا مقولہ بھی بنایا ہوا ہے کہ اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا یَمُوْتُوْنَ یعنی ولی مرتے نہیں۔ ان پر بس اک لمحہ کے لئے موت آتی ہے۔ پھر زندہ ہو جاتے ہیں[1]۔ اب سوال یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا جسدِ مبارک آپ کی وفات سے ۳۲ گھنٹے بعد دفن کیا گیا۔ تو کیا اس وقت وہ زندہ تھے؟ اور اگر زندہ تھے تو وہ صحابہ کی باتیں سنتے تھے؟ اور اگر سن سکتے تھے، تو پھر بولتے کیوں نہ تھے۔ نیز یہ کہ اگر زندہ تھے تو انہیں دفن کیوں کیا گیا؟ اگر ان صوفیاء کے عقیدہ کو صحیح سمجھ لیا جائے، تو ایسے لاتعداد سوال اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جن کا کوئی جواب نہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ پیری فقیری کے کاروبار کا سب سے بڑا چور دروازہ یہی سماعِ موتیٰ کا مسئلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مُردوں کے سننے کی پُرزور تردید کی اور اس کی تمام امکانی شکلوں کا دروازہ بند کر دیا۔ حدیث میں اگر مُردوں کے سننے کے متعلق کچھ اشارات ملتے ہیں، تو بعینہٖ ان کے بولنے کے متعلق بھی ملتے ہیں۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ کسی نیک آدمی کی میت یہ کہتی ہے کہ قَدِّمُوْنِیْ

---

[1] حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اپنے مُرشد میاں جی نور محمد (م ۱۲۵۹ھ) کی وفات کے وقت ان کے پاس موجود تھے۔ آپ فرماتے ہیں:

"مرض الموت میں جب آپ نے یہ کلمات کہے کہ پیام سفرِ آخرت آگیا ہے، تو میں پالکی کی پٹی پکڑ کر رونے لگا۔ حضرت نے تسلی دی اور فرمایا کہ "فقیر مرتا نہیں بلکہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں انتقال کرتا ہے۔ فقیر کی قبر سے وہی فائدہ ہوگا جو ظاہری زندگی میں ہوتا تھا۔" (تاریخ مشائخ چشت۔ مولانا زکریا، ص ۲۴۴)

قَدِّمُوْنِیْ " مجھے جلدی لے چلو، جلدی لے چلو (یعنی جلدی جا کر قبر میں دفن کرو) اسی طرح بدکار آدمی کی میت کہتی ہے کہ " ہائے مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" اب بتائیے کیا آپ نے کسی میت کی یہ آواز سنی ہے؟

بات یہ ہے کہ ہم مُردوں کے بولنے یا سننے کو سمجھ نہیں سکتے کیونکہ وہ برزخی زندگی کا بولنا اور سننا ہے، تو جس طرح ہم برزخی زندگی میں مُردہ کی پکار اس دنیا میں سُن نہیں سکتے۔ اسی طرح مُردہ روحیں جو برزخی زندگی میں ہیں، ہماری پکار سُن نہیں سکتیں۔ اس کی تھوڑی بہت وضاحت خواب سے ہو سکتی ہے۔ سوتا آدمی جاگتے کی آواز نہیں سن سکتا۔ حالانکہ وہ زندہ ہوتا ہے اور خواب میں سونے والا آدمی جو کچھ باتیں دوسروں سے کرتا ہے۔ پاس بیٹھا جاگتا آدمی سن نہیں سکتا۔ بعینہٖ یہی مثال فوت شدہ آدمیوں کے بولنے اور سننے کی ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ بزرگ حضرات اپنے کشف کے ذریعہ ان رُوحوں سے ملاقات کرتے اور ان سے سوال و جواب کر سکتے ہیں، اپنی سنا سکتے ہیں، ان کی سُن سکتے ہیں۔ لیکن یہ سماع موتیٰ کا مسئلہ تو عوام سے متعلق ہے جو قبروں پر جا کر نذریں نیازیں چڑھاتے ہیں۔ پھر جس طرح صوفیاً اور علمائے شریعت میں سماع موتیٰ کا مسئلہ زیر بحث رہا ہے، کبھی آپ نے یہ بھی سنا ہے کہ مُردوں کے بولنے کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہو؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے اگر وہ زندہ ہیں تو انہیں بولنا بھی چاہیئے۔ آپ اس مسئلہ پر جتنا غور کریں گے یہی حقیقت سامنے آئے گی کہ اس مسئلہ کی تہہ میں " دنیوی مال اور عزۃ و جاہ کی طلب " ہی کارفرما ہیں - اور انہی دو باتوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

" دو بھوکے بھیڑیئے اگر بکریوں کے ریوڑ میں جا پڑیں تو وہ اتنا نقصان نہیں کرتے جتنا انسان کے دین کو مال اور شرف کی طلب خراب کرتے ہیں۔" (ترمذی) ان تصریحات کے باوجود ہمارے صوفیاء نے صاحب قبر کی روح کو قبر میں موجود ہونے اور بیرونی معاملات سے پورا علم رکھنے کو اپنے ایمان کا جزو بنا دیا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل واقعہ سے ظاہر ہے:

" نقل ہے کہ ایک بار آپ (شبلیؒ) حضرت جنید کے مزار پر انوار پر کھڑے تھے۔ کسی نے ایک مسئلہ پوچھا: آپ نے جواب نہ دیا۔ اس نے عرض کیا " آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟" فرمایا: " صاحب قبر سے حیا آتی ہے۔ ان کے سامنے جواب کیسے دوں؟" پھر یہ شعر پڑھا:

انی لاستحییت فی التراب بیننا کما کنت استحییت وھو یرانی

بلاشبہ میں ان کے قبر میں ہونے کے باوجود ایسے ہی حیا کرتا ہوں جیسے کہ میں زندگی میں کرتا تھا اور وہ مجھے دیکھ رہے ہوتے تھے۔

صاحب قبر کی حاجت برآری

قرآن و حدیث سے یہ واضح ہے کہ صاحب قبر کی رُوح نہ اس دنیا میں واپس آتی ہے۔ نہ وہ کسی پکارنے والے کی پکار سنتی ہے، نہ اسے کچھ خبر ہوتی ہے اور اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ کب اس کے جسم کو اٹھا کھڑا کیا جائے گا. لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ قبروں پر مراقبہ کرنے والوں کو بسا اوقات صاحب قبر کی روح ملتی ہے۔ اس سے سوال و جواب ہوتے ہیں اور مکاشفات کا دارومدار ہی اسی بات پر ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اہل قبر سے مرادیں مانگنے والوں کی بعض اوقات مرادیں بھی پوری ہو جاتی ہیں، تو آخر یہ کیا معمہ ہے؟

پھر یہ معما صرف اتنا ہی نہیں کہ قبر سے حاجت برآری ہوتی ہے بلکہ بتوں سے بھی ہو جاتی ہے بت بھی بسا اوقات اپنے پجاریوں کے سوالوں کے جواب دے کر انہیں مطمئن کرتے ہیں. جیسا کہ ہم پہلے باب میں "بتوں کی کرامات" کے تحت دو واقعات درج کر آئے ہیں. پھر بات اتنی ہی نہیں. ایسی مرادیں درختوں، پتھروں، سورج، چاند، ستاروں، آگ وغیرہ کی پرستش کرنے سے بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ ورنہ انسانوں کی اتنی کثیر تعداد انہیں کبھی نہ پوجتی۔ پھر یہ بات اس سے بھی آگے چلتی ہے۔ آپ بغیر مُردہ کے ایک قبر تعمیر کر کے اس پر باقاعدہ غلاف وغیرہ چڑھا کر یا ایسے ہی کوئی لکڑی یا مرا ہوا جانور دفن کر کے اس پر قبر تعمیر کر دیں اور مجاور بن کر بیٹھ جائیں تو مرادیں وہاں سے بھی پوری ہونا شروع ہو جائیں گی۔ اور بعض دفعہ آپ کو آپ کی دعا و پکار کا جواب بھی مل جائے گا۔

ایک بزرگ سات قبریں اور جاروائیاں

سیرت خواجہ اویس قرنی کا تذکرہ نگار لکھتا ہے کہ خواجہ اویس کہاں فوت ہوئے اور کہاں دفن ہوئے واس میں اختلاف ہے۔ سات مقامات کا نام لیا جاتا ہے اور سات جگہ ہی آپ کا مزار ہے اور یہ ساتوں مرجع خاص و عام ہیں۔" (الاویس، ص ۸۶-۸۵، اویسیہ پبلشرز لاہور)

اب اس گھر کی شہادت کے بعد بھی کچھ شبہ رہ جاتا ہے کہ مراقبہ کی صُورت میں صاحب قبر کی رُوح سے سوال و جواب نہیں ہوتے بلکہ وہ کوئی اور ہی چیز ہوتی ہے، جو آستانوں، قبروں، بتوں، درختوں اور پتھروں

سے جواب دیتی اور بزعم خود ان کی بعض مرادیں پوری کرتی ہے۔ شعرانی کا قول ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے ہر ولی کی قبر پر ایک فرشتہ مقرر کر دیا ہے، جو اس ولی سے مانگی گئی حاجتیں پوری کرتا ہے۔" (غایۃ الامانی، ص ۱۴۱)

لیکن یہ حاجت برآری کا مسئلہ اگر صرف قبروں تک محدود ہوتا تو شاید یہ بات بلاسند بھی تسلیم کر لی جاتی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ حاجت برآری کا مسئلہ تمام مذکورہ اشیاء میں یکساں پایا جاتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ انسان چلہ کشی، ریاضتوں اور بعض دوسرے فنون کے ذریعہ غیر مرئی مخلوق کو دیکھنے اور اس سے استفادہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس غیر مرئی مخلوق یا عالم ارواح میں بھی کئی طرح کی مخلوق پائی جاتی ہے۔ ان میں فرشتے بھی پائے جاتے ہیں، جنات بھی، شیطان کے لشکر بھی اور بقول ان لوگوں کے فوت شدہ انسانوں کی روحیں بھی۔ انسانوں کی فوت شدہ روحوں کے متعلق وضاحت ہو چکی کہ وہ دنیا میں نہیں آسکتیں۔ فرشتے پہلے ہی مامور من اللہ ہوتے ہیں، جیسے چاند سورج وغیرہ ہیں۔ ان کی عبادت بھی انہی چیزوں کی طرح اختیاری نہیں بلکہ اضطراری ہے۔ باقی جن اور شیطان ہی رہ جاتے ہیں۔ جن بھی گو انسان کی طرح شرعاً مکلف ہیں۔ مگر ان میں سے بھی انسانوں کی طرح بیشتر طبقہ گمراہ ہی رہا ہے۔ اور یہ شیطان اور جن ہر طرح کی شکل اور ہر ایک کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ البتہ وہ حضور اکرم ﷺ کی شکل نہیں دھار سکتے، تاہم یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ کسی اور بزرگ کی شکل دھار کر مراقبہ کرنے والے سے یہ کہہ دیں کہ میں ہی حضور اکرم ﷺ ہوں۔ ابلیس کو خدا نے وسوسہ کا تصرف بھی دیا ہے اور اس نے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا تھا کہ "اے خدا! میں تیرے اکثر بندوں کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔" وہ انسانوں سے زیادہ عیار اور ہوشیار ہے۔ ہم پچھلے صفحات میں عنوان "دیدار الٰہی اور شیطانی فریب" کے تحت ایک واقعہ نقل کر آئے ہیں، جو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا اپنا نقل کردہ ہے کہ شیطان نے انہیں بھی گمراہ کرنے کی کوشش کی، مگر وہ اللہ کی مہربانی سے بچ گئے۔ اس وقت شیطان نے کہا کہ میں تمہارے جیسے ستر زاہدوں کو گمراہ کر چکا ہوں، اسی ایک واقعہ سے شیطان کی کارستانیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

پیرانِ پیر اور شیطانی فریب

محولہ بالا واقعہ کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم اسے دوبارہ یہاں نقل کر رہے ہیں:

"ایک مرتبہ ایک بڑی عظیم الشان روشنی ظاہر ہوئی جس سے آسمان کے کنارے بھر گئے۔ اس سے ایک صورت ظاہر ہوئی۔ اس نے مجھ سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "اے عبدالقادر! میں تمہارا رب ہوں، میں نے تمہارے لئے سب محرمات حلال کر دیئے۔" میں نے کہا: "دور ہو مردود۔" یہ کہتے ہی وہ روشنی ظلمت

سے بدل گئی اور وہ صورت دھواں بن گئی اور ایک آواز آئی کہ "عبدالقادر! تم کو تمہارے علم و تفقہ نے بچا لیا ورنہ اسی طرح میں ستر صوفیوں کو گمراہ کر چکا ہوں۔" میں نے کہا: "محض اللہ کی مہربانی سے۔"

کسی نے عرض کیا کہ حضرت! آپ کیسے سمجھے کہ یہ شیطان ہے؟" فرمایا: "اس کے کہنے سے کہ میں نے حرام چیزوں کو تمہارے لئے حلال کر دیا۔" (الطبقات الکبریٰ للشعرانی، ج ۱، ص ۱۳۰، وطبقات الحنابلہ ابن رجب بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت، ج ۱، ص ۱۸۷، مصنفہ ابوالحسن علی ندوی)

اس واقعہ سے درج ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ شیطان بھی اپنے ظہور سے پہلے تجلی ڈال سکتا ہے۔ اکثر صوفیاء اس تجلی کو تجلی الٰہی یا مشاہدۂ حق سمجھ لیتے ہیں۔

۲۔ شیطان نمودار ہو کر رب ہونے کا بھی دعویٰ کر سکتا ہے، تو اُسے کسی دوسری ہستی کے متعلق دعویٰ کرنا اس سے بہت آسان ہے۔ وہ حضور اکرم ﷺ کی شکل اختیار تو نہیں کر سکتا، لیکن اور کی شکل بن کر یہ جھوٹ بول سکتا ہے کہ میں ہی محمد ﷺ ہوں یا آپ کی شکل میں جلوہ گری کرتا ہے، تو دیکھنے والا اس وجہ سے فریب میں آجاتا ہے کہ اُس نے آپ کو زندگی میں نہیں دیکھا۔ اس دھوکہ سے صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی محفوظ رہ سکتے تھے۔ اور صاحب قبر کی شکل اختیار کرنا تو اس کے لئے بہت ہی آسان ہے۔

۳۔ اس طرح شیطان سے جو سوال و جواب ہوتے ہیں۔ یہی باتیں مکاشفات کی اصل بنیاد ہے۔

۴۔ اکثر صوفیاء دانستہ دروغ گوئی نہ کرنے کے باوجود گمراہ ہوتے ہیں۔

۵۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اولیاء اللہ کی تاریخ میں عبدالقادر جیلانیؒ کے پائے کے کل کتنے ولی . . . . ہو گزرے ہیں۔ جن میں سے ستر (۷۰) کو تو شیطان نے گمراہ کر دیا۔ باقی اولیاء الرحمٰن کتنے رہ گئے ہوں گے؟

انہی اُمور کے متعلق قرآن کریم کی درج ذیل آیت روشنی ڈالتی ہے:

اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِھِمْ — بے شک شیاطین اپنے ولیوں کے دلوں میں بات ڈالتے ہیں۔ (۶/۱۲۱)

اور جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ "خدا کی راہ میں بہت سے راہزن (شیطان) ہوتے ہیں جو طرح طرح کے جال پھیلاتے ہیں مثلاً: نور کا جال، لطف و کرم کا جال، کبر کا جال، مکر و فریب کا جال اور سب سے بڑھ کر استدراج کا جال جس میں شیطان فریب خوردہ کو ولی، نبی اور مسیح تک بنا دیتا ہے، لیکن مردِ حق وہ ہے جو نورِ حق اور نورِ

شیطان میں تفریق کرے اور اس وقت شیطان کے فریب میں آنے سے محفوظ رہے شیطان لعین نے ایسے ہی انوار واستدراج سے سینکڑوں عابدوں کو برباد کر دیا ہے۔" (مقربان حق، ص ۱۲۸)

اب اس شیطانی فریب کی مزید چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

۲۔ جنید بغدادی کا مرید اور بہشت کی سیر

شیخ جنیدؒ کے مریدوں میں سے ایک نے اہل دنیا سے کنارہ کش ہو کر ویرانے میں ایک عبادت خانہ بنا کر رہنا شروع کیا۔ ہر رات ایک اونٹ لایا جاتا اور اس پر بٹھا کر اسے بہشت کی سیر کرائی جاتی اس چیز نے اس کے دماغ میں رعونت پیدا کر دی۔ رفتہ رفتہ شیخ جنیدؒ کو خبر پہنچی، تو آپ وہاں تشریف لے گئے اور سب احوال پوچھے۔ شیخ نے کہا کہ آج رات تو جب بہشت میں پہنچے، تو تین بار لاحول پڑھنا۔ رات کو جب حسب معمول اسے انہی مقامات کی سیر کرائی گئی تو اس نے برائے امتحان لاحول پڑھا۔ شیاطین، جو اس کام کے مؤکل تھے، فرار ہو گئے اور وہ تنہا رہ گیا اور اپنے آپ کو ایسی گندگی کے ڈھیر پر پایا جس کی عفونت سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ آس پاس مردار جانوروں کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ اپنی غلطی پر آگاہ ہو کر بعد پشیمان ہوا۔ توبہ کی اور دوبارہ شیخ کی خدمت میں رہنے لگا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۳۱)

۳۔ مردہ زندہ کرنے والا جنات کا عامل

"نقل ہے کہ ایک شخص نے عملیات کے ذریعے ایک جن کو مسخر کر رکھا تھا۔ اسے پرانی قبر کے نیچے چھپا کر اس سے جو چاہتا کہلواتا۔ اس چیز نے اسے عوام میں صاحب کرامت مشہور کر رکھا تھا اور اکثر جہلاء اس کے دام فریب میں گرفتار تھے۔ ایک روز عبداللہ شاہ بلوچ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: "یا تو مجھے کوئی کرامت دکھایئے یا پھر میں دکھاتا ہوں۔ تب آپ کو میرا مرید ہونا پڑے گا۔ میں مُردوں کو زندہ کر سکتا ہوں" چنانچہ وہ انہیں میانی کے قبرستان میں لے جا کر کہنے لگا۔ "بتلایئے کون سا مُردہ زندہ کروں۔" آپ نے قبر کا نشان دیا۔ اس نے قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر کہا "یٰسین" اندر سے آواز آئی "والقرآن الحکیم" کہنے لگا: "دیکھئے مُردہ زندہ ہو گیا۔" آپ نے قبر پر پاؤں دبا کر فرمایا کہ "جو شخص قبر کے اندر چھپا ہے باہر آجائے۔" اسی وقت ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکا قبر سے باہر آگیا۔ آپ نے پوچھا: "تو کون ہے؟" کہنے لگا میں جن ہوں اور کئی سالوں سے اس شخص کی قید میں ہوں۔" آپ نے فرمایا: "میں تمہیں اللہ کے حکم سے آزاد اور اس شخص کے عمل تسخیر کو باطل کرتا ہوں۔" جن اسی وقت غائب ہو گیا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۳۲۰)

۴۔ ابوالقاسم قشیری اور سماع کا جواز

اب ہم ایک مثال کے ذریعے آپ کو بتلائیں گے کہ شیطان کس طرح لوگوں کو حضور اکرم ﷺ کی شکل بتلا کر صوفیاء کو گمراہ کر سکتا ہے۔

"دنیائے تصوف میں ابو القاسم قشیری اور ابوسعید ابوالخیر دونوں مانی ہوئی بزرگ شخصیتیں ہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ سماع کو صرف علماء ہی ناجائز قرار نہیں دیتے، بلکہ بہت سے صوفیاء نے بھی اسے ناجائز قرار دیا ہے اب واقعہ یہ ہے کہ استاد ابوالقاسم قشیری سماع کو ناجائز اور حرام سمجھتے تھے اور شیخ ابوسعید ابوالخیر اسے جائز سمجھتے اور محفل سماع منعقد کرتے تھے۔ ایک دن ابوسعید ابوالخیر نے محفل سماع رچائی ہوئی تھی، استاد ابوالقاسم وہاں سے گزرے تو دل میں کہا کہ یہ لوگ جو یوں برہنہ سر برہنہ پا، مارے مارے پھرتے ہیں، شریعت میں ان کا "ثقہ" ہونا مستند نہیں اور ان کی گواہی کا اعتبار نہیں۔ شیخ ابوسعید نے اسی وقت ایک شخص کو دوڑایا کہ استاد (ابوالقاسم) سے ذرا پوچھو کہ ہم کب بہ حیثیت گواہ حاضر ہوئے تھے، جو ہماری گواہی کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کا سوال پیدا ہوا؟ (گویا جو خیال ابوالقاسم کے دل میں آیا تھا وہ فوراً شیخ ابوسعید کو معلوم ہو گیا اور اس کی جوابی کارروائی بھی کر دی۔)

خیر ان دونوں بزرگوں کی آپس میں نوک جھوک ہوتی رہی ایک دن استاد ابوالقاسم نے حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ کہیں جا رہے ہیں۔ پوچھا کہاں کا قصد ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "مجلس ابوسعید کا، کہ جو شخص وہاں حاضر نہ ہوگا وہ بدنصیب یا مردود ہے۔" استاد ابوالقاسم گھبرا کر بیدار اور ابوالخیر کے پاس گئے۔ ایک دفعہ پھر دل میں بدگمانی پیدا ہوئی کہ ابوسعید مجھ سے نہ تو علم میں زیادہ ہے نہ مرتبہ روحانی میں، پھر یہ کیا قصہ ہے؟ ابوسعید پر استاد ابوالقاسم کے اس خیال کا کشف ہو گیا اور دل کی بات ابوالقاسم کو بتلا دی۔ اب ابوالقاسم کا دل صاف ہو گیا۔ دونوں بغل گیر ہوئے۔ ابوالقاسم اپنے خیالات سے تائب ہوئے اور بر سر منبر فرمایا کہ جو شخص ابوسعید کی مجلس میں حاضر نہ ہو وہ مہجور یا مطرود ہے۔" (اقتباس از تصوف اسلام، ص ۶۶)

اقتباس بالا سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر جو محفل سماع رچاتے تھے وہ مرتبہ روحانی کے لحاظ سے ابوالقاسم سے بلند تھے۔

۲۔ ابوالقاسم جو سماع کو ناجائز سمجھتے تھے انہیں خود حضور اکرم ﷺ نے خواب میں متنبہ فرمایا کہ ابوسعید کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ ہم اس کی مجلس میں خود جاتے ہیں اور جو نہ جائے وہ بدنصیب یا مردود ہے۔

۳۔ حضور اکرم ﷺ کے اس انتباہ پر ابوالقاسم صرف سماع کے قائل ہی نہیں ہوئے، بلکہ باقاعدہ ابوسعید

کی فضیلت کا اعلان فرمایا۔

اب دیکھئے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں تو گانا بجانا حرام فرمایا تھا مگر خواب میں آ کر اہلِ سماع کو افضل قرار دے رہے ہیں، تو اس کا واضح مطلب یہ ہوا یا تو یہ افسانہ سرے ہی سے غلط ہے یا جو ہستی خواب میں ملی وہ رسول اللہ کی ہستی نہ تھی کوئی اور تھی۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی زندگی میں کوئی اور تعلیم دیں اور خواب میں کچھ اور۔

۵۔ فریبِ شیطانی کی بعض دوسری شکلیں

بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ صاحب قبر بزرگ تو عذاب شدید میں ماخوذ ہوتا ہے، لیکن چونکہ یہاں اس عالم آب و گل میں بحیثیت ولی اور قطب مشہور ہوتا ہے لہٰذا لوگ اس کا عالیشان مزار بھی بنا دیتے ہیں۔ پھر اس کی مجاورت، نذر دنیاز، چڑھاوے وغیرہ سب کچھ اس قبر پر ہوتا ہے اور لطف کی بات یہ کہ حاجتیں اس کی قبر سے بھی پوری ہو رہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی ایک دو واقعات مولانا اللہ یار خان صاحب نے اپنی کتاب "دلائل السلوک" میں درج کیے ہیں جو یہ ہیں:

"ایک مزار پر جانے کا اتفاق ہوا۔ روضہ بنا ہوا ہے، قبر پر چادریں چڑھی ہوئی ہیں، بوسے دیئے جا رہے ہیں مگر صاحب قبر زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ کتے کی طرح اُٹھ اُٹھ کر حملے کرتا ہے..... ایک اور ایسے 'غوث' کے مزار پر ہر ہفتہ میلہ لگتا ہے۔ حالانکہ صاحب قبر کافر سادھو ہے۔ کسی نے غلطی سے دفن کر دیا۔ رفتہ رفتہ غوث بن گیا اور روضہ کھڑا کر دیا گیا۔ اس کو ایسا دردناک اور بھیانک قسم کا عذاب ہو رہا ہے کہ اس سے کوئی بات معلوم نہیں کی جا سکتی۔" (دلائل السلوک ص ۱۳۴)

اور ہمارا خیال یہ ہے کہ صاحب مزار حضرات کی کثیر تعداد ایسے ہی بزرگوں اور غوثوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ لیکن جاہل انسانوں پر شیطان کا فریب کچھ اس طرح مسلط ہوتا ہے کہ زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی پہنچے ہوئے بزرگ سمجھ کر لوگ ان کی قبروں پر مشرکانہ افعال بجا لاتے رہتے ہیں اور لطف یہ کہ حاجتیں ان کی بھی پوری ہوتی ہیں جن کا تعلق زیادہ تر عقائد سے ہوتا ہے۔ حقائق سے نہیں۔

حاجت روائی کیسے ہوتی ہے؟

اب رہا حاجت روائی کا مسئلہ، تو ایسے بتوں، تھانوں، اور قبروں سے حاجت روائی کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ لیکن وہ بھی مشیتِ الٰہی کے تحت ہی ہوتی ہیں اور وہ ان قبروں پر دعا و استغاثہ کے بغیر بھی پوری ہو جاتیں شیطان کو یہ اختیار

ضرور دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالے، انہیں جھوٹے وعدے دے (جن پر اس کی قدرت نہیں) اور انہیں گمراہ کرے، لیکن اُسے تصرف فی الامور میں قطعاً کوئی اختیار نہیں ہے۔ چنانچہ وہ قیامت کے دن صاف طور پر کہہ دے گا کہ:

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۱۴/۲۲)

اور جب (حساب کتاب کا) کام فیصل ہو چکے گا، تو شیطان کہے گا (جو) وعدہ خدا نے تم سے کیا تھا وہ تو سچا تھا اور (جو) وعدہ میں نے تم سے کیا تھا وہ جھوٹا تھا اور میرا تم پر کسی طرح کا زور نہیں تھا۔ ہاں میں نے تم کو (گمراہی اور باطل کی طرف) بلایا، تو تم نے (جلدی سے بے دلیل) میرا کہنا مان لیا، تو (آج) مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔

مندرجہ بالا آیت کا ترجمہ مولانا فتح محمد جالندھری کا ہے۔ ہم نے اپنی طرف سے بریکٹوں وغیرہ میں کوئی لفظ شامل نہیں کیا۔ اس آیت میں لفظ سلطٰن کا معنی غلبہ، قوت، زور، اختیار، تصرف اور دلیل سب کچھ لیا جا سکتا ہے۔ اس آیت سے واضح ہے کہ شیطان کا تصرف فی الامور میں کوئی حصہ نہیں۔ وہ اپنی شکل حسب احوال تبدیل کر کے سامنے آسکتا ہے۔ پکارنے والے کو یا مصیبت زدہ اس کے پیر کی شکل میں دکھائی دے سکتا ہے اسے تسلیاں اور جھوٹے وعدے کر سکتا ہے۔ حسین وعدے دکھلا کر گمراہ کرسکتا ہے، دل میں وسوسے ڈال سکتا ہے اور وہ یہ سب کام اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنی تمام ذریت سمیت اور اس کے تعاون سے کرتا ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کو گمراہ کر سکے۔ اور وہ گمراہی کے یہ سب کام ہر انسان کے علم اور مرتبہ کے مطابق اور اسی مناسبت سے عیاری سے سرانجام دیتا ہے۔ اس نے خدا سے یہ بھی کہا:

وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۙ وَّلَاُضِلَّنَّھُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّھُمْ وَلَاٰمُرَنَّھُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّھُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (۴/۱۱۹)

شیطان (خدا سے) کہنے لگا: میں تیرے بندوں سے (غیر خدا کی نذر دلوا کر مال کا) ایک مقررہ حصہ لے لیا کروں گا اور ان کو گمراہ کرتا اور امیدیں دلاتا رہوں گا اور سکھاتا رہوں گا کہ جانوروں کے کان چیرتے رہیں اور یہ بھی کہتا رہوں گا کہ وہ خدا کی بنی ہوئی صورتوں کو بدلتے رہیں۔

اس آیت میں کچھ ایسے افعال کا ذکر ہے جو بتوں یا صاحب قبر کے نام پر کئے جاتے ہیں، تو شیطان کہہ رہا

ہے کہ لوگ ایسے افعال میری ہی ترغیب پر سرانجام دیتے ہیں۔ اور اس نے خدا سے یہ بھی کہا کہ :

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ	شیطان نے (خدا سے) کہا کہ مجھے تو تُو نے ملعون کیا ہے میں
صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ	بھی تیرے سیدھے رستے پر (ان کو گمراہ کرنے کے لئے)
مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ	بیٹھوں گا۔ پھر ان کے آگے سے اور پیچھے سے، دائیں سے
اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ	اور بائیں سے (غرض ہر طرف سے) آؤں گا اور تو ان میں سے
اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (۷/۱۶)	اکثر کو شکر گزار نہیں پائے گا۔

ان آیات میں اور تو سب کچھ ہے مگر شیطان کے تصرف فی الامور کا کہیں ذکر نہیں ملتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اگر خدا سے دُعا کی جائے، تو وہ اپنی مرضی سے بعض دفعہ تو قبول فرما لیتا ہے اور بعض دفعہ قبول نہیں کرتا (جس کے متعدد وجوہ ہیں جن کا یہاں موقع نہیں) لیکن قبروں اور آستانوں پر نذریں دینے اور دعا و ندا کرنے میں بسا اوقات حاجات جلدی پوری ہو جاتی ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان صرف اپنی صوت یا اپنی کلام سے ہی مطمئن نہیں کرتا بلکہ وہ اور اس کا لشکر اس کو پورا کرنے میں حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ یہاں آ کر اس شیطانی کاروبار میں کہانت اور جادو بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ کہانت اور جادوگری کے کام بھی انہیں شیاطین کے ذریعہ سرانجام پاتے ہیں۔ جن کے دلائل ہم پہلے دے چکے ہیں کہ یہ صریح کفر ہے، لیکن کہانت و جادو کے نتائج ضرور سامنے آتے ہیں۔ شیطانی کاروبار کی وسعت شیطان اور اس کے لشکر کی استعداد پر منحصر ہوتی ہے۔

شیطان بھی حقیقت میں جنوں کی جنس سے تھا۔ جو اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے عموماً فرشتوں میں رہا کرتا۔ کیونکہ دونوں غیر مرئی مخلوق تھے۔ خدا نے فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، تو اس کی اصلی جبلت عود کر آئی۔ سمجھا کہ میں حضرت آدم علیہ السلام سے برتر مخلوق ہوں اور اس کی فضیلت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ تب سے جنات کی یہ جنس یعنی ابلیس اور اس کی پوری ذریت انسان کی گمراہی کے لئے ہر ہتھکنڈا استعمال کرنے پر تلی بیٹھی ہے۔ پھر خبیث قسم کے دوسرے جن بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ان "رجال الغیب" سے استفادہ کا کاروبار بھی قدیم سے رائج ہے۔ قرآن میں ہے :

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ	اور یہ کہ بعض بنی آدم بعض جنات کی پناہ پکڑا کرتے تھے اس
بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (۷۲/۶)	سے ان کی سرکشی بڑھ گئی تھی۔

اور آج بھی مسلمانوں میں رجال الغیب سے استمداد کے کئی وظیفے اور جنتر منتر رائج ہیں۔ جنہیں اکثر صوفی

قسم کے لوگ ہی سرانجام دیتے ہیں۔ یہ "شش قفل" مختلف اقسام کے وضعی درود اور "ہفت ہیکل" جو اکثر پنجسورہ شریفوں میں مذکور ہیں۔ اسی پرانے شرکیہ فعل کی تازہ شکل میں آج بھی موجود ہیں۔

اصل سوال یہ ہے کہ اگر قبروں سے حاجت برآری ثابت ہو بھی جائے، تو کیا یہ بات ان افعال کے صحیح اور جائز ہونے کی دلیل بن سکتی ہے؟ تو اس کا جواب سراسر نفی میں ہے۔ اور اس کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے جادو کے عمل کے اثرات قرآن کریم سے ثابت ہونے کے باوجود وہ اسے صریح کفر قرار دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ چوری اس لئے جائز ہے کہ اس سے فی الواقع مال مل جاتا ہے اور اس کی شہادتیں بھی پیش کر دے، تو اس سے چوری کا فعل جائز تو نہیں ہو جائے گا؟ ہمیں از روئے شرع صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا ان اعمال و افعال کا کچھ جواز بھی ہے یا نہیں؟ ان کے نتائج و اثرات کا ہونا یا نہ ہونا زیر بحث نہیں لایا جاسکتا۔

قبروں سے متعلق ارشاداتِ نبویؐ

نبیوں اور ولیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں پر اللہ کی لعنت

دینِ طریقت اور اس کے شرکیہ اعمال و افعال

ن قبر سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی ہر دلعزیزی کے اسباب ہم پہلے تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ چونکہ ان سب شرکیہ امور کی جڑ قبر ہے، لہٰذا اس جڑ کو ختم کرنے کے لئے شریعت نے بہت واضح احکام صادر فرمائے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَرَضِهِ لَمْ يَقُمْ مِنْهُ: لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِهِمْ مَسَاجِدَ قَالَتْ عَائِشَةُ: لَوْلَا ذٰلِكَ لَاُبْرِزَ قَبْرُهٗ اَخْشٰى اَنْ يُتَّخَذَ مَسْجِدًا

(بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبیؐ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیماری میں جس سے آپ اچھے نہ ہو سکے، فرمایا: "اللہ یہودیوں پر لعنت کرے جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیا۔" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: "اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ لوگ آپ کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیں گے، تو آپ کی قبر مرجع خاص و عام بنا دی جاتی۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھی۔ اس کی صورت یہ تھی کہ پیچھے قبر شریف اس

کے آگے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رہائش اور اس سے آگے بیرونی دروازہ تھا۔ قبر تک سوائے حضرت عائشہ یا رشتہ داروں کے علاوہ دوسرے لوگ جا ہی نہ سکتے تھے، کیونکہ قبر کے پیچھے پھر دیوار تھی، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرما رہی ہیں کہ اگر آپ کی قبر کے متعلق یہ خطرہ نہ ہوتا کہ مبادا اصحابہ اور معتقدین سجدہ کرنے لگیں تو بغرض زیارت پچھلی دیوار کھول دی جاتی! اور درج ذیل حدیث میں قبر پرست یہود کے علاوہ عیسائیوں کا بھی ذکر ہے۔

۲۔ اَنَّ عَائِشَۃَ وَعَبْدَ اللّٰہِ بْنَ عَبَّاسٍ قَالَا: لَمَّا نَزَلَ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طَفِقَ یَطْرَحُ خَمِیْصَۃً لَّہٗ عَلٰی وَجْھِہٖ فَاِذَا اغْتَمَّ کَشَفَ عَنْ وَجْھِہٖ وَھُوَ کَذٰلِکَ یَقُوْلُ: لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْیَھُوْدِ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَائِھِمْ مَسَاجِدَ یُحَذِّرُنَا مَا صَنَعُوْا" (بخاری بحوالہ ایضاً)	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ دونوں نے کہا: "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بیماری آن پڑی اور وفات کی علامات ظاہر ہوئیں، تو آپ اپنی چادر اپنے منہ پر اوڑھ لیتے اور کبھی جب بیزاری بڑھتی تو چادر کو اپنے چہرے سے ہٹا دیتے اور یوں کہنے لگتے: "یہود اور نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔" آپ ہم لوگوں کو اس برے کام سے ڈراتے تھے، جو انہوں نے کیا تھا۔"

۳۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ میں حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے اسی مضمون کی جو روایت ہے، اس کے الفاظ میں نبیوں کے ساتھ "ولیوں" کی قبروں کا بھی ذکر ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

اَلَا وَاِنَّ مَنْ کَانَ مِنْ قَبْلِکُمْ کَانُوْا یَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِیَائِھِمْ وَصَالِحِیْھِمْ مَسَاجِدَ اَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ اِنِّیْ اَنْھٰکُمْ عَنْ ذٰلِکَ۔	ترجمہ: سنو! تم سے پہلے لوگوں نے اپنے نبیوں اور بزرگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔ خبردار! تم قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا۔ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔

مزارات بنانا، اُن کی تزئین، چراغ جلانا اور مجاوری کرنا

اب صحیح مسلم، کتاب الجنائز کی درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ یُّقْعَدَ عَلَیْہِ وَ	حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو پختہ بنانے (پلستر کروانے)، اور اس پر (مجاور) بیٹھنے اور اس

اَنْ یُبْنٰی عَلَیْهِ — پر تعمیر کرنے سے منع فرمایا۔

۲۔ عَنْ اَبِیْ مَرْثَدِ الْغَنَوِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ، لَا تُصَلُّوْا اِلَی الْقُبُوْرِ وَلَا تَجْلِسُوْا عَلَیْهَا

ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا: "نہ تو قبروں کی طرف (منہ کرکے) نماز پڑھو اور نہ ہی ان پر بیٹھو" (مراقبہ یا اعتکاف کی شکل میں)

اور درج ذیل حدیث، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ سب میں موجود ہے:

۳۔ لَعَنَ اللّٰهُ تَعَالٰی زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِیْنَ عَلَیْهَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ۔

اللہ تعالیٰ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے اور اُن مردوں پر بھی جو ان کو سجدہ گاہ بنا لیتے ہیں اور ان پر چراغ روشن کرتے ہیں۔

جعلی یا مصنوعی مزارات

اب ایسی قبریں جن میں کوئی میت نہیں ہوتی، یا کوئی لکڑی، پتھر یا کسی مُردہ جانور کی ہڈیاں وغیرہ دفن کرکے مزارات بنا لئے جاتے ہیں اور وہاں بھی حاجت روائی اور مشکل کشائی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ملاحظہ فرمالیجئے۔ فرمایا:

مَنْ زَارَ قَبْرًا بِلَا مَقْبُوْرٍ كَاَنَّمَا عَبَدَ الصَّنَمَ (الحدیث، طبرانی، بیہقی)

جس شخص نے ایسی قبر کی زیارت کی جس میں میت نہیں۔ اس نے گویا کسی بُت کی پوجا کی۔

غور فرمائیے یہ تہدید صرف زیارت کی ہے۔ پھر جو شخص ایسی بلا مقبور قبروں پر دوسرے افعال بھی بجا لائے، تو آپ اس کی سزا کا خود اندازہ کر لیجئے۔

سابقہ مزارات کا انہدام

صحیح مسلم کتاب الجنائز میں ہے:

عَنْ اَبِی الْهَیَّاجِ الْاَسَدِیِّ قَالَ قَالَ لِیْ عَلِیٌّ: اَلَا اَبْعَثُكَ عَلٰی مَا بَعَثَنِیْ عَلَیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ لَا تَدَعَ تِمْثَالًا اِلَّا طَمَسْتَهٗ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا اِلَّا سَوَّیْتَهٗ۔

حضرت ابو الہیاج اسدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: "کیا میں تمہیں ایسے کام پر نہ بھیجوں جس پر مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا، اور وہ یہ ہے کہ تو کوئی مجسمہ نہ چھوڑ مگر اسے مٹا دے اور نہ کوئی ایسی قبر چھوڑ جو زمین سے بلند ہو مگر یہ کہ اُسے زمین کے برابر کر دے۔

احادیث سے صرف قبر کی اتنی بلندی کی اجازت ہے، جیسے اونٹ کی کوہان ہوتی ہے وہ بھی اس لئے کہ اتنی مٹی بچ جاتی ہے۔

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ قبر کو تو سجدہ گاہ نہ بنایا جائے۔ بلکہ قبر کے پاس مسجد بنالی جاتی ہے۔

قبر کے پاس مسجد بنالینا

صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ میں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ بعض ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو انہوں نے حبشہ میں "ماریہ" نامی ایک کنیسہ (یہودیوں کی عبادت گاہ) دیکھا ہے۔ جس میں مجسمے تھے، تو آپ نے فرمایا:

اِنَّ اُولٰٓئِكَ اِذَا كَانَ فِيْهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ	جب ان لوگوں میں سے کوئی صالح مرد مرجاتا، تو اس کی قبر
فَمَاتَ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهٖ مَسْجِدًا وَصَوَّرُوْا فِيْهِ	پر مسجد بنالیتے اور پھر اس میں اس کے مجسمے رکھ لیتے ایسے
تِلْكَ الصُّوَرَ اُولٰٓئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّ	لوگ اللہ عزوجل کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں۔
وَجَلَّ	(صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ)

اور اس مسئلہ کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ قبرستان میں نماز پڑھنا ہی ناجائز ہے۔ خواہ وہاں کسی ولی یا بزرگ کی قبر ہو یا نہ ہو۔

قبرستان میں نماز ناجائز ہے

عَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ	ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْاَرْضُ	تمام روئے زمین نماز کے قابل ہے۔ سوائے قبرستان
كُلُّهَا مَسْجِدٌ اِلَّا الْمَقْبَرَةَ وَالْحَمَّامَ (ترمذی)	اور حمام کے۔

اب ان احادیث کی روشنی میں خود فیصلہ کر لیجئے کہ آیا شریعت مطہرہ میں پختہ قبر، مزار یا روضہ بنانے، اس پر مجاور بیٹھنے، اس پر روشنی کرنے، اس پر جھاڑو دینے، غلاف چڑھانے، وہاں اعتکاف بیٹھنے، نماز پڑھنے یا ساتھ ہی مسجد بنانے کی کوئی گنجائش ہے۔ پھر جو اولیاء، دوسرے اولیاء اللہ کے مزارات پر معتکف ہوتے، مراقبے کرتے یا چلہ کشی کرتے ہیں وہ متبع سنت کہلا سکتے ہیں؟

اب مزارات کی ضرورت اور مجاورت کی اہمیت سے متعلق صوفیاء کی ایک مایہ ناز ہستی علی ہجویریؒ کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

صوفیاء اور قبروں کی مجاورت

حضرت علی ہجویری فرماتے ہیں:

"اور مجھے بھی (یعنی حضرت علی بن عثمان جلابی کو) ایک دفعہ ایک ایسا واقعہ گزرا۔ میں نے اس امید پر بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہ واقعہ حل ہو، مگر حل نہ ہوا اور ایک دفعہ اس سے قبل بھی ایسا واقعہ پیش آیا تھا تو میں مزار حضرت شیخ بایزید کا اس وقت تک مجاور بنا رہا جب تک وہ حل نہ ہوا۔ آخر حل ہو گیا۔" (کلام المرغوب، ص ۱۷۱، اردو ترجمہ کشف المحجوب، مصنفہ علی ہجویری عرف داتا گنج بخش)

یہ واقعہ جہاں مزارات کی بزرگی کی روشن دلیل ہے، وہاں اس سے حلِ مشکلات کے لئے اس کی مجاوری کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ معین الدین چشتی اجمیری نے انہی علی ہجویریؒ کی قبر کا چلہ کاٹا تھا اور مجاورت اختیار فرمائی تھی اور جاتی دفعہ یہ شعر کہہ گئے۔

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنما

اور یہ شعر آج تک ان کے مزار کی زینت اور اجمیری صاحب کی یادگار ہے۔ غرض صوفیاء میں یہ مزارات اور اُن کے فیوض کا سلسلہ ایک لامدّی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

قبر النبیؐ سے متعلق موضوع احادیث

شریعت نے قبروں کے ذریعے پیدا ہونے والے ایک ایک چور دروازے کو بند کر دیا تھا۔ ان حضرات نے ایک ایک کر کے ان کو پھر سے کھول دیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے خود اپنے متعلق فرمایا تھا کہ:

لَا تَتَّخِذُوا قَبْرِیْ عِیْدًا وَصَلُّوْا عَلَیَّ حَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَاِنَّ صَلٰوتَکُمْ یُبَلِّغُنِیْ	میری قبر کو عید (عرس یا میلہ) نہ بنانا اور جہاں کہیں تم ہو وہیں سے درود پڑھ لیا کرو۔ بلاشبہ تمہارا درود مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔

اس ارشاد کی رُو سے آپ نے مسلمانوں کو اپنی قبر پر حاضری دینے کو پسند نہیں فرمایا۔ رہی درود پڑھنے کی فضیلت اور ضرورت، تو اس کے متعلق بھی آپ نے وضاحت فرما دی کہ تمہارا درود، جہاں بھی تم ہو، مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس غرض کے لئے میری قبر پر آنے کی ضرورت نہیں۔ پھر آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی فرمائی کہ:

اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُّعْبَدُ	اے اللہ! میری قبر کو آستانہ نہ بنا دینا کہ لوگ آکر پوجا کرنے لگیں۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود یار لوگوں نے آپ کی قبر کی زیارت، فضیلت اور اہمیت کی بھی حدیثیں گھڑ لیں: مثلاً یہ حدیث:

(۱) مَنْ زَارَنِيْ بَعْدَ مَمَاتِيْ فَكَأَنَّمَا زَارَنِيْ فِيْ حَيَاتِيْ — جس نے میرے مرنے کے بعد میری زیارت کی۔ گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔

یہ حدیث مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر موضوع ہے:

۱۔ حدیث کی معتبر کتابوں میں اس کا کوئی نشان نہیں۔ ابن قدامہ نے اپنی کتاب الصارم المنکی علی نحر ابن سبکی میں آپ کی قبر کی زیارت کے متعلق سب حدیثوں کو پرکھ کر ان کا واہی ہونا ثابت کیا ہے (مشکوٰۃ، باب حرم المدینہ، الفصل الثالث، حاشیہ بر روایت مذکورہ)

۲۔ فقہائے امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ بعد کے لوگ کبھی صحابہ کرام ؓ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ صرف قبر کی زیارت سے یہ درجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

۳۔ اگر اس بات میں صداقت ہوتی، تو حضور اکرم ﷺ کی قبر بند نہ رکھی جاتی۔ ۵۱ھ تک حضرت عائشہ زندہ رہیں۔ اس وقت تک کوئی غیر محرم وہاں داخل ہی نہ ہوسکتا تھا۔ اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو زیارت کا اہتمام ضروری تھا۔

اب زیارتِ قبر سے متعلق چند دوسری موضوع احادیث بھی ملاحظہ فرمائیے:

(۲) من حج ولم يزرني فقد جفاني — جس نے حج کیا اور میری قبر کی زیارت نہ کی، تو اس نے مجھ پر جفا کی۔

(۳) من زار قبري وجبت له شفاعتي — جس نے میری قبر کی زیارت کی، اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی۔

(۴) من زار قبري (او قال) من زارني كنت له شفيعا او شهيدا — جس نے میری قبر کی (یا راوی نے کہا) میری زیارت کی میں اس کا شفیع یا شہید ہوں گا۔

ایسی سب روایات جو آپ کی قبر کی زیارت کی فضیلت بتلاتی ہیں، تیسرے اور چوتھے درجہ کی کتابوں میں درج ہیں اور مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر مجروح یا موضوع ہیں اور یہی وہ موضوعات ہیں جن پر صوفیاء کے عقائد متعلقہ قبور، کشف قبور اور مراقبات وغیرہ کی بنیاد استوار ہوتی ہے۔

قبروں سے متعلق صوفیاء کا ذہنی انتشار

پھر بہت سے حضرات ایسے بھی ہیں جو ماشاء اللہ علم شریعت کے ماہر ہیں۔ مگر ان کا دامن طریقت میں اُلجھا ہوا ہے۔ جب یہ حضرات شریعت کی بات کرتے ہیں، تو تمام تر دلائل اس کی حقانیت میں صرف کر دیتے ہیں، لیکن جب طریقت کی طرف آتے ہیں جو پہلی سب باتیں اور دلائل بھول جاتے ہیں اور یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ دونوں قسم کی تصانیف فردِ واحد کی نہیں ہو سکتیں اور ایسے علما کی تعداد بہت زیادہ ہے ہم اس انتشار کی دو مثالوں سے وضاحت کریں گے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی خدماتِ اسلامی سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ آپ نے ایک کتاب "البلاغ المبین (فارسی)، میں پیر پرستی اور قبر پرستی کا نہایت مدلل اور تحقیقی انداز سے رد کیا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۳۰ پر صحیح بخاری کے حوالے سے یہ واقعہ نقل فرماتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو قبر کے پاس نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا: "اَلْقَبْرَ اَلْقَبْرَ" وہ گویا حضرت انس رضی اللہ عنہ کو ڈرا رہے تھے کہ اس کام سے بچو۔ جیسے کسی کو شیر شیر یا سانپ سانپ کہہ کر ڈرایا جاتا ہے کہ محتاط ہو جائے۔

شاہ ولی اللہ اور کشف قبور

اب انہی شاہ صاحب کا درج ذیل بیان بھی ملاحظہ فرمایئے:

"ذکر کشف قبور۔ جان کہ ذکر کشفِ قبور کے واسطے اوّل جب مقبرہ میں آئے دوگانہ ان بزرگ کی روح کے واسطے پڑھے اگر سورۃ فاتحہ یاد ہو پہلی رکعت میں پڑھے اور دوسری میں سورۃ اخلاص اور نہیں تو ہر رکعت میں پانچ پانچ بار اخلاص پڑھے اور پھر قبلہ کی پیٹھ کر کے بیٹھے اور ایک بار آیت الکرسی اور بعض سورتیں جو زیارت کے وقت پڑھتے ہیں، جیسے سورۃ ملک اور اس کے سوا۔ بعدہٗ قل ہے بعد فاتحہ کے گیارہ بار سورۃ اخلاص پڑھے اور ختم کرے اور تکبیر کرے۔ بعدہٗ سات دفعہ طواف کرے اور اس میں تکبیر پڑھے اور پھر پاؤں کی طرف رخسار رکھے اور نزدیک میت کے منہ کے بیٹھے اور کہے یارب اکیس دفعہ۔ بعدہٗ دل طرف آسمان کے کہے "یا روح" اور دل میں ضرب کرے "یا روح الروح"۔ جب تک کے انشراح پائے یہ ذکر کرے۔ انشاء اللہ کشفِ قبور و کشفِ ارواح حاصل ہو گا۔" (انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ مصنفہ شاہ ولی اللہ صاحب، ص ۱۱۳، ۱۱۴)

شاہ صاحب کے مندرجہ بالا بیان سے درج ذیل چیزوں کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

۱. مقبروں اور مزاروں کا جواز۔

۲. نذر لغیر اللہ کا جواز۔ کیونکہ دو رکعت نماز محض ایصالِ ثواب کے لئے نہیں پڑھی جا رہی۔ بلکہ اس کے پیچھے ایک مقصد بھی ہے اور یہی چیز "نذر" کہلاتی ہے۔

۳. قبروں کے گرد طواف کا جواز۔ ۴. صاحب قبر کے پاؤں کی طرف رخسار رکھنے کا جواز۔

۵. غیر اللہ کو پکارنے کا جواز، اور

۶. قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنے کی حکمت و آداب تو شاہ صاحب خود ہی بہتر سمجھتے ہیں۔

اب اگر اتنی باتیں شاہ صاحب جیسے بزرگ اور عالم دین سے ثابت ہو جائیں، تو اگر عام لوگ اس میں قبروں پر چراغ جلانے، جھاڑو دینے اور ان صاحب قبور سے مرادیں مانگنے کا اضافہ کرلیں تو ان بے چاروں کا کیا قصور ہے؟

اسی طرح ایک اور بزرگ ابن حجر مکی (م ۹۷۲ھ) میں ان کے متضاد بیانات بھی ملاحظہ فرمائیے:

ابن حجر مکی کا ذہنی انتشار

نبہانی نے جن لوگوں سے استفادہ کیا، ان میں سے ایک ابن حجر مکی ہے۔ ابن حجر اپنی کتاب "الزواجر" میں کہتے ہیں: "شرک کا سب سے بڑا سبب قبروں کے پاس نماز پڑھنا اور ان کو مساجد بنا لینا ہے۔ جتنے منکرات مزاروں اور قبروں پر ہوتے ہیں ان کو ہٹانا اور مٹانا واجب ہے۔ قبروں پر تعمیر شدہ قبوں اور مزاروں کو جلد از جلد گرا دینا چاہیئے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے روکا اور قبروں کو گرانے کا حکم دیا۔ لہٰذا قبروں پر دیئے، قندیلیں اور قمقمے سب ختم کر دیئے جائیں۔ ایسی جگہوں کے لئے کوئی چیز وقف کرنا اور نذر و نیاز ماننا اور اس کو پورا کرنا صحیح نہیں ہے۔ قبروں پر دیئے جلانا، ان کو بت بنانا، ان کا طواف کرنا اور ان کی طرف نماز پڑھنا۔ سب کبیرہ گناہ ہیں۔

مگر الجواہر المنظم میں خود ہی ان سب باتوں کی تردید کر دی اور "تحفہ" اور "الزواجر" میں جن کاموں کو کبیرہ گناہ اور اسباب شرک بنایا تھا ان کو جائز کر دیا۔ یہاں تک کہ قبروں کو سجدہ کرنا۔ اہلِ حال کے لئے جائز قرار دیا اور اتنا غلو کیا کہ غالیوں کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیں۔ (غایۃ الامانی فی الرد علی النبہانی، مصنفہ علامہ آلوسی)

یہ دو مثالیں ہم محض بطورِ نمونہ پیش کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو علمائے دین بھی اس طریقت کے میدان میں گھسے ہیں۔ آپ ان کی مختلف تصنیفات کا مطالعہ کریں گے تو ایسی ہی صورتِ حال سامنے آئے گی۔

باب (۷)

کچھ ولایت کی تعلیم اور اولیاء اللہ کے بارے میں

ا۔ تعبیرات ولایت

ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ دورِ نبوی، صحابہ یا تابعین میں لفظ ولی (جمع اولیاء) ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ جن معنوں میں تیسری صدی کے صوفیاء نے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ قرآن نے یہ لفظ حمایتی اور دوست کے معنوں میں استعمال کیا تھا اور جو شخص دینِ اسلام کو قبول کر لیتا، اسے اللہ کا ولی کہہ کر پکارا جاتا، لیکن تیسری صدی میں صوفیہ نے یہ لفظ جن معنوں میں لیا وہ کچھ اس طرح ہے:

ولایت کا نیا مفہوم "ولایت سے مراد محبت و تصرفِ قرب ہے۔ پس جو شخص محبتِ الٰہیہ میں مستغرق ہو کر تصرف میں کاملیت اختیار کر کے قرب حاصل کر لیتا ہے، وہ والیٔ ولایت ہو کر ولی کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پیشوائے کامل چاہے تو ایک نگاہ سے طالب کو منزلِ مقصود پر پہنچا دیتا ہے۔" (ریاض السالکین، ص ۲۷۵)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ ولایت کے مفہوم میں تصرفِ امور کا اضافہ مابعد کے دور کی پیداوار ہے۔

۲۔ فی الحقیقت اس قسم کی ولایت کی منزلِ مقصود یہی تصرفِ امور ہے۔

۳۔ اور یہ منزلِ مقصود کسی "مرشدِ کامل" کے بغیر ہاتھ نہیں آسکتی۔

اب دیکھئے کتاب و سنت کی رُو سے تصرف فی الامور کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ارشادِ باری ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ — یاد رکھو! اگر پیدائش اللہ کی ہے، تو حکم بھی اسی کا چلے گا۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ — (اے پیغمبر ﷺ) آپ ان لوگوں سے کہدیجئے کہ امر پورے کا پورا اللہ کے لئے ہے۔ (۳/۱۵۴)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہ کسی کا کچھ سنوار سکتا ہے اور بگاڑ سکتا ہے اب اگر کسی دوسرے شخص یا چیز سے ایسا تصرف ظاہر ہو تو وہ کتاب و سنت کے خلاف ہی کوئی بات ہو سکتی ہے۔ جیسے جادوگر اپنے جنتر منتر کے ذریعے لوگوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور ہم پہلے باب میں بحوالہ شاہ ولی اللہ صاحب یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ جادو، کہانت، رمل، مسمریزم وغیرہ کئی علوم و فنون ایسے ہیں جن سے مخاطب کے دل کا حال اور اس کی کیفیت (اشراف) اور آئندہ کے غیب کے احوال (انکشاف) معلوم ہو جاتے ہیں۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے نام نہاد صوفیا نے یہ تصرف فی الامور کی منزل مقصود کو اپنانے کے لئے کیا طریق اختیار کیا ہے۔ صاحب ریاض السالکین سورۃ فاتحہ کے خواص کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ:

ولایت کی تعلیم

"دعوت سورۂ فاتحہ[1] حضرت محمد ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تعلیم فرمائی۔ انہوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو انہوں نے امام زین العابدین کو، انہوں نے امام باقر کو، انہوں نے امام جعفر کو، انہوں نے امام موسیٰ کاظم کو اس کے عمل کی اجازت دی۔ حضرت بایزید فرماتے ہیں کہ میں نے انیس برس دعوت چہل اسماء اور قرشیہ اور شیخ میں صرف کئے ہیں فائدہ کما حقہ، نہ دیکھا۔ اتفاقاً امام جن و انس حضرت موسیٰ کاظم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض حال بیان کیا۔ آپ نے کمال لطف سے فرمایا: "یا طیفور! (بایزید کا اصل نام) ابھی منزل مقصود دور ہے۔" (ریاض السالکین، ص ۳۳۳)

اس اقتباس سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

---

[1] ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ جب عثمان ہارونی نے آنکھیں بند کر کے دریا کو پار کیا تھا، تو پانچ مرتبہ سورۂ فاتحہ ہی پڑھی تھی اور جب ایک ہندو بچہ کو بادشاہ نے ظلم کے تختہ دار پر کھینچا تھا، تو آپ نے سورۂ فاتحہ کے عمل ہی سے اسے زندہ کر دکھایا تھا۔ پھر ایک دفعہ ایک لڑکے کو جو کسی جزیرے میں قید تھا، آزاد کرکے سورۂ فاتحہ کے ہی عمل سے گھر لے آئے تھے۔ دوسرے اولیاء اللہ بھی سورۂ فاتحہ کے اس عمل سے بکثرت فائدہ اٹھاتے اور کرامات دکھلاتے ہیں۔

۱۔ سورۂ فاتحہ کے خواص اور اس کی دعوت کا طریقہ بھی دین کا حصہ ہیں۔

۲۔ یہ دین کا حصہ حضورِ اکرم ﷺ نے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تبلایا یا اس کی اجازت دی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی صرف اُن صاحبزادوں کو تبلایا، جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے۔ اپنے دوسرے بیٹوں کو بھی نہیں تبلایا۔

۳۔ یہ دین کا حصہ دعوت چہل اسماء، قرشیہ اور تسبیح پر مشتمل ہے۔

۴۔ اس دعوت چہل اسماء، قرشیہ اور تسبیح سے ہی منزلِ مقصود حاصل ہوتی ہے۔

۵۔ بایزیدؒ (گروہ صوفیہ انہیں سلطان العارفین کے لقب سے پکارتے ہیں) نے انیس برس اس دعوت پر صرف کئے مگر کما حقہٗ فائدہ نہیں ہوا، کیونکہ انہوں نے کسی "مرشد کامل سے اجازت" نہیں لی تھی۔ لہٰذا منزلِ مقصود کے لئے یہ اجازت انتہائی لازمی شرط ہے۔

۶۔ امام موسیٰ کاظم انسانوں کے علاوہ جنوں (و رجال الغیب) کے بھی امام تھے۔

چہل اسماء اور منزل مقصود

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس چہل اسماء، قرشیہ اور تسبیح کی دعوت ہے کیا چیز؟ اور منزلِ مقصود کیا ہے؟ تو ان سوالوں کا جواب اگلی عبارت میں ملاحظہ فرمایئے، بایزید فرماتے ہیں کہ:

"میں نے عاجزی سے اپنا سر امام (موسیٰ کاظم) کے آگے رکھ دیا اور عرض کیا کہ یا امام مجھے تعلیم فرمایئے کہ راہِ ہدایت میسر ہو اور قوت دعوت کی حاصل ہو اور بھید مکاشفات اور مراقبات کھل جائیں۔ امام نے فرمایا کہ واللہ اگر ہزار برس تک دعوت کرتا ہے گا کچھ حاصل نہ ہوگا جب تک ہماری اجازت سے سورۂ فاتحہ کی دعوت نہ کرے۔ میں نے پھر عرض کی کہ یا حضرت تعلیم فرمایئے۔ بعد مدت کے آپ نے خلوت کی اجازت دی۔ ۳۹ دن تک دعوت میں مشغول رہا۔ ۳۸ ویں روز چار مؤکل بہت سے کواکب کے ساتھ میرے پاس آئے اور السلام علیکم کی اور میں نے سلام کا جواب دیا، تو انہوں نے کہا کہ اے صاحب دعوت! ہم اس لئے حاضر ہوئے کہ تیری خدمت بجا لائیں، اپنا مدعا بیان کر۔ ہم سب فرمانبردار (اسماء چہل) کے ہیں، جس قدر اللہ تعالیٰ نے ملک ارواح میں تمام جن و انس کے پیدا کیے ہیں، ہمارے تحت و تصرف میں ہیں۔ ان میں سے ایک نے فرمایا: "میرا نام ارفائیل ہے اور جبرائیل بھی کہتے ہیں۔ چار ہزار گروہ فرشتوں کا میرے تحت و تصرف میں ہے اور تمام ارواح اس عمل کے پڑھنے والے کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ دوسرے مؤکل نے کہا: کہ

میرا نام میکائیل ہے۔ لاکھ ارواح جن وانس میرے فرمان میں ہیں۔ صاحب دعوت جس کام کا حکم دے فوراً بجالائیں۔ تیسرے مؤکل نے کہا کہ میرا نام سرفائیل ہے اور اسرافیل بھی کہتے ہیں۔ تمام جن وانس و شیاطین اور ارواح ارضی و سماوی اس اسم کے تابع ہیں اور سب میرے مطیع و فرمانبردار ہیں، جو فرمایا جائے فوراً بجالائیں۔ چوتھے مؤکل نے کہا کہ میرا نام شیخ ہے اور عزرائیل بھی کہتے ہیں۔ اللہ پاک نے مجھ کو سب بزرگیاں عنایت فرمائی ہیں۔ میرے بارہ ہزار تین سو ملک اور ساٹھ ہزار جن وانس تابع ہیں۔ جب صاحب دعوت مجھ کو طلب کرے حاضر ہوں۔ میں نے بخور آگ میں ڈال کر ان کو رخصت کیا۔ چالیس روز کے بعد امام زمان کے قدم بوس ہوا۔ امام نے میرے اوپر بہت سے لطف اٹھا کر مجھے رخصت کیا اور فرمایا جس کو لائق سمجھو اسے اجازت دینا۔" (ریاض السالکین، ص ۳۳۳، ۳۳۴)

یہ تھا وہ سورۃ فاتحہ کی دعوت کا "خاص الخاص" طریقہ جسے حضور اکرم ﷺ نے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تعلیم فرمایا تھا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بیٹوں کو بتلایا۔ پھر آئمہ شیعہ کے واسطے سے ہوتے ہوئے بایزید تک پہنچ گیا۔ پھر بایزید نے امام موسیٰ کاظم کا تہ دل سے شکریہ بھی ادا کیا، کیونکہ وہ انتیس سال سے کشف و مجاہدہ میں پڑے ہوئے تھے اور انہیں منزل مقصود ہاتھ نہ آئی تھی۔

مؤکلین کی قوت

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتوں کا مزید پتہ چلتا ہے:

۱۔ تصرف فی الامور، جو ولایت کا ایک قسم ہے، رجال الغیب سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ کتاب و سنت کی پیروی سے۔

۲۔ سب سے کمزور مؤکل ارفائیل یا جبریل (فرشتہ) ہے جس کے تحت صرف چار ہزار فرشتوں کا گروہ ہے۔ دوسرا مؤکل میکائیل پہلے مؤکل جبریل سے بہت زیادہ طاقتور ہے کیونکہ اس کے تحت ایک لاکھ یا ۲۵ گنا زیادہ جن وانس ہیں۔ تیسرا مؤکل سرفائیل یا اسرافیل دوسرے سے بھی بہت زیادہ طاقتور ہے کیونکہ اس کے تحت تمام ارضی و سماوی ارواح اور جن وانس ہیں۔ چوتھے مؤکل شیخ یا عزرائیل کی شان سب سے بالا ہے۔ اگرچہ اس کے تابع جن وانس تو صرف ساٹھ ہزار ہیں مگر اس کے پاس بارہ ہزار تین سو ملک بھی تو ہیں۔

۳۔ اگر "مرشد کامل" کی اجازت ہو تو ۴۰ دن کے چلے کے آخر تک سب حاضر ہو کر اپنے مسخر ہونے کی اطلاع دیتے ہیں اور اس طرح صاحب دعوت ہر طرح کے تصرف فی الامور پر قادر ہو جاتا ہے۔

۴۔ یہ موکل جب اپنی فرمانبرداری کا اعلان کرنے آتے ہیں، تو اس وقت تک رخصت نہیں ہوتے جب تک آگ پر بخور نہ ڈالا جائے۔

چلّہ کاٹنے کا طریقہ

اس کے بعد صاحب ریاض السالکین اس چلّہ بیٹھنے کا طریقہ بتلاتے ہوئے دعوت سورہ فاتحہ کو زکوٰۃ سورۃ فاتحہ میں بدل دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

"طریقہ زکوٰۃ سورۃ فاتحہ شریف یہ ہے کہ اوّل ترک حیوانات جلالی وجمالی کرے اور عروج ماہ میں دوشنبہ کے روز روزہ رکھے اور رات کو خلوت میں بیٹھ کر ہر شب میں ہزار ہزار مرتبہ چالیس یوم تک پڑھا کرے اور جب تک چلّہ تمام نہ ہو خلوت سے باہر نہ آئے مگر ضرورت پر مضائقہ نہیں اور بعدہ ہر صدی کے درود پڑھے۔ پھر جس کام کے لئے پڑھے وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ پھر ہمیشہ کے لئے اسی مقدار میں پڑھتا رہے نہایت مجرّب عمل ہے۔" (ریاض السالکین ص ۳۴۴)

دیکھ لیا آپ نے ہمارے یہ بزرگانِ دین، اولیائے کرام چلّے جو کاٹتے پھرتے ہیں، تو ان کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ پھر کوئی بزرگ تو اس کے لئے ویرانہ کا انتخاب کرتے ہیں یا جنگل کا۔ کچھ قبر کھود کر اس میں بیٹھ جاتے ہیں اوپر ڈھکنا رکھ دیتے ہیں۔ کوئی دریا کا کنارہ تلاش کر لیتے ہیں اور فرید الدین گنج شکرؒ نے تو یہ چلّہ کنوئیں میں بیٹھ کر کاٹا تھا (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۷۸) اور یہی تھی وہ منزلِ مقصود جس کے لئے بایزید انتیس سال تک محنت کرتے رہے۔ غور فرمائیے ان باتوں میں سے کوئی بات بھی شریعت سے مطابقت رکھتی ہے؟

ہمارے خیال میں یہ روایت کئی لحاظ سے غلط ہے۔ ہم نہ حضور اکرم ﷺ کو اور نہ ہی دوسرے اماموں کو اس قدر نچلی سطح پر لانا چاہتے ہیں اور بایزید کے متعلق بھی معتبر روایت تو یہی ہے کہ وہ کشف و کرامات کو قطعاً معیارِ ولایت نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم یہ بات بھی ثابت ہے کہ وہ خود تیس سال تک شام کے جنگلوں میں ریاضت و مشاہدہ میں مشغول رہے۔ (صوفیائے نقشبند، ص ۸۹) ہو سکتا ہے پہلے وہ اسی "منزلِ مقصود" کے لئے جنگلوں میں ریاضت و مشاہدہ کرتے رہے ہوں اور آخری عمر میں انہیں احساس ہو گیا ہو کہ یہ کشف و کرامات معیارِ ولایت نہیں ہوتے۔ اور بمصداق "من نہ کردم شما حذر بکنید" آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہو کہ:

"اگر کسی کو پانی پر چلتا یا ہوا میں اڑتا ہوا دیکھو..... یہ ولایت کے لئے ضروری نہیں" (صوفیائے نقشبند ص۱۰۱)

ولایت اور کشف و کرامات کا تعلق

کچھ بھی ہو عوام الناس کا ذہن بھی کچھ ایسا ہی بن گیا کہ وہ ولایت اور کشف و کرامات کو لازم و ملزوم سمجھنے لگے اور تیسری صدی کے بعد آنے والے بیشتر صوفیائے کرام بھی انہیں طور طریقوں، یعنی جنگلوں میں ریاضتوں، چاروں ترک چلوں، مزاروں اور قبروں پر چلے کشیوں کے ذریعہ کشف و کرامات کو حاصل کر کے اپنی ولایت کا ثبوت مہیا کرنے لگے۔ جو کوئی جتنا صاحب کرامات ہوتا اتنا بڑا ولی اور ابدال و قطب یا غوث سمجھا جانے لگا۔ پھر تحریر کی صورت میں ان صوفیائے کرام کے تذکروں نے بھی یہ ثبوت مہیا کر دیا کہ اصل ولایت محض نام ہے۔ کشف و کرامات کا اور توجہ کے ذریعہ تصرف فی الامور کا۔

۲۔ اولیاء اللہ کے باہمی مقابلے

۱۔ اولیاء ہند اور اولیائے افغانستان کا مقابلہ

صوفیائے نقشبند کے مصنف سید امین الدین احمد رقمطراز ہیں کہ:

"ایک روز ایک درویش، جو خاندانِ چشتیہ سے منسلک تھے۔ عجب نور (جو نقشبندی تھے) کے پاس آئے اور اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ اولیائے ہندوستان زبردست ہیں یا اولیائے افغانستان۔ بعد نمازِ عشاء اللہ نور (عجب نور کے بھائی اور نقشبندی) نے ایک پتھر لا کر رکھ دیا اور چشتی صاحب سے کہا کہ آپ اس پر توجہ کریں، فقیر بھی توجہ کرے گا۔ چشتی صاحب نے اسمائے الٰہی کی ضربات کا بہت زور لگایا لیکن اس پتھر پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد خلیفہ اللہ نور نے بسم اللہ شریف اور کلمہ تمجید پڑھ کر اسم ذات کی ضربات لگانا شروع کیں۔ بفضلِ الٰہی پتھر حرکت میں آ گیا۔ گاؤں کا سردار اس پتھر کو تبرکاً اپنے گھر لے گیا اور باقی گاؤں کے تمام لوگ حضرت خواجہ صاحب کے سلسلہ نقشبندی میں داخل ہو گئے" (صوفیائے نقشبند ص۲۸۹)

اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ عوام و خواص کا ذکر تو در کنار، ان "اولیاء اللہ" کا اپنا ذہن بھی یہی رہا ہے کہ کرامات و تصرف ہی کا دوسرا نام ولایت ہے۔

۲۔ اسمائے الٰہی سے ضربات لگانے اور کرامات دکھلانے کے لحاظ سے طریقہ نقشبندیہ، چشتیہ

سے زیادہ کارگر اور مفید ہے۔

۳۔ ان "اولیاء اللہ" کا عوام کو اپنے قریب کرنے، اپنے سلسلہ میں داخل کرنے یا اسلام کی طرف مائل کرنے کا یہی گُر تھا۔

۲۔ رجال الغیب کا مقابلہ

پہلا مقابلہ تو توجہ کے ذریعے کرامات دکھلانے کا تھا کہ اب اولیاء اللہ کے براہ راست تصرف کے مقابلہ کا واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ صاحب ریاض السالکین لکھتے ہیں کہ:

"جب شاہ ایران نے بغداد پر فوج کشی کی تو خلیفہ اس کے مقابلے کی تاب نہ لا کر آپ (پیران پیر) سے مدد کا طالب ہوا۔ آپ نے علی بن الہیتی سے فرمایا کہ تم عجم کے لشکر میں جاؤ۔ سب سے پیچھے ایک چادر کا خیمہ ملے گا۔ اس میں تین شخص ہوں گے ان سے کہدو کہ وہ واپس چلے جائیں۔ اگر وہ کہیں کہ ہم کسی کے حکم سے آئے ہیں، تو تم بھی یہی جواب دینا کہ میں بھی کسی کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ غرض شیخ علی بن الہیتی نے اس طرح جا کر خیمہ تلاش کیا۔ اس میں واقعی تین شخص تھے۔ ان کو کہا، تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ ہم کسی کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ اُن کے جواب میں آپ کے خادم نے بھی یہی کہا کہ میں بھی کسی اور ہی کے حکم سے آیا ہوں۔ یہ سُن کر وہ سب واپس چلے گئے ان کی واپسی کے ساتھ ہی عجمی فوج میں ایک گڑبڑسی مچ گئی اور وہ بھی بھاگ نکلے۔ آپ (یعنی پیران پیر) کی کرامات بے شمار ہیں۔" (ریاض السالکین ص ۱۳۱)

اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ پیران پیر کے زمانہ تک "اولیاء اللہ" کی کرامات و تصرفات کا عقیدہ اتنی ہمہ گیر صورت اختیار کر چکا تھا کہ شاہان وقت، خواہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے، مسلمان ہوں یا کافر، جنگ میں فتح و شکست تک کے معاملات میں ان اولیاء اللہ کے تصرفات پر انحصار کرتے تھے۔

۲۔ شاہ ایران نے تین مختلف اولیاء اللہ سے استمداد لی اور انہوں نے اپنا اپنا ایک نمائندہ بھیجا۔ یا ایک ہی ولی سے استمداد پر اس نے اپنے تین نمائندے بھیجے، یہ وضاحت تذکرہ نگار بھول گئے۔ جو کچھ بھی ہوا بہرحال یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ شاہ ایران کے ولی یا اولیاء کے نمائندے، پیران پیر کے نمائندے کے مقابلے میں دُم دبا کر بھاگ نکلے۔ یہ ہار دراصل شاہ ایران کی نہیں، بلکہ ان اولیاء اللہ اور ان کے رجال الغیب کی تھی۔

۳۔ جنگ میں فتح حاصل کرنے کے یہ طریقے نہ رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھے نہ خلفائے راشدین کو۔ ایسے طریقوں کی ایجاد بہت دیر بعد کی پیداوار ہے۔

۳۔ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) اور محمد غوث گوالیار کا مقابلہ

"محمد غوث گوالیاری، جو کتاب "جواہر خمسہ" کے مصنف ہیں، عامل تھے۔ انہوں نے عبدالقدوس گنگوہی کو لانے کے لئے ایک مرتبہ جنوں کو بھیجا۔ شیخ مسجد میں مشغول تھے۔ جن پہنچے، تو خود ہی سر اٹھا کر دیکھا اور پوچھا کون ؟ جنوں نے جواب دیا کہ "محمد غوث نے بھیجا ہے وہ زیارت کا مشتاق ہے۔ اجازت ہو تو ہم اس طرح لے چلیں کہ تکلیف نہ ہو۔" حضرت نے فرمایا: "میں حکم دیتا ہوں کہ محمد غوث کو لے آؤ۔" چنانچہ جنات واپس پہنچے اور محمد غوث کو لے کر چلے انہوں نے جنات سے دریافت کیا کہ" اس کی کیا وجہ ہے، تم تو میرے مطیع تھے، یہ سرکشی کیسی ؟" جنوں نے جواب دیا کہ "سب کے مقابلہ میں تو تمہارے مطیع ہیں، مگر شیخ (عبدالقدوس گنگوہی) کے مقابلے میں تمہاری اطاعت نہیں۔[1]" غرض اِن کو لے کر شیخ کی خدمت میں پہنچے، تو شیخ نے محمد غوث کو دیکھ کر فرمایا "تمہیں شرم نہیں آتی۔" اور بہت ڈانٹا۔ آخر وہ بیعت ہو کر صاحب نسبت ہو گئے۔ گوالیار میں ان کا مزار ہے۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۲۰۶)

اِس اقتباس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ محمد غوث اور عبدالقدوس گنگوہی دونوں جنات یا رجال الغیب کے عامل تھے۔ لیکن عبدالقدوس اس فن میں ماہر تھے، جنہوں نے محمد غوث اور اُن کے جنوں کو بھی مطیع کر لیا، لہٰذا عبدالقدوس بڑے ولی ہوئے اور محمد غوث چھوٹے ولی۔

۲۔ مروجہ ولایت اسی طرح کی تسخیر رجال الغیب اور شعبدہ بازیوں کا مقدس نام ہے اور اس کا شریعتِ محمدی کی اتباع سے کوئی تعلق نہیں۔ شریعت کی اتباع کا نام صرف جاہل مسلمانوں کو اس جال میں پھنسانے کے لئے لیا جاتا ہے۔

۴۔ مولانا درویش محمد اور حسین خوارزمی کا نسبت سلب کرنے کا مقابلہ

شیخ حسین خوارزمی اپنے وقت کے مقتدر تھے۔ جہاں کہیں جاتے وہاں کے مشائخ آپ کے تصرفات کے مقابلے میں ماند ہو جاتے تھے۔

---

[1] شاید کلا طاعۃ فی معصیۃ اللہ کا یہی مفہوم ہو۔

جب کوئی درویش آپ سے ملنے آتا تو آپ اس کی نسبت سلب کر لیتے ۔ ایک دفعہ شیخ مولانا درویش محمد کے شہر میں آئے تو وہاں کے مشائخ آپ کی ملاقات کے لئے گئے ۔ مولانا نے فرمایا کہ ہمیں شیخ کی ملاقات کو جانا چاہیئے اور ساتھ ہی شیخ حسین کی نسبت بھی سلب کر لی۔ اس نسبت کی سلبی سے شیخ بہت پریشان ہوتے اور اونٹ پر سوار ہو کر نسبت کی خوشبو کے پیچھے چل دیے۔ ادھر سے مولانا بھی شیخ کی طرف چل پڑے تھے ۔ شیخ، مولانا سے جتنا قریب ہوتے جاتے اسی قدر گم شدہ نسبت کی بو تیز ہوتی جاتی۔ جب راہ میں دونوں کی ملاقات ہوئی، تو وہ نسبت کی بو وہیں منقطع ہو گئی، تب جا کر شیخ کو معلوم ہوا کہ میری نسبت مولانا نے اپنے تصرف سے سلب کر لی ہے۔ شیخ نے بڑی انکساری سے کہا، مجھے علم نہ تھا کہ یہ اقلیم آپکے زیرِ حکومت ہے۔ اب میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ مولانا کو شیخ پر رحم آگیا اور سلب شدہ نسبت واپس دے دی۔ شیخ نے اسے غنیمت سمجھا اور اپنے وطن کو واپس ہوئے۔"

(صوفیائے نقشبند، ص ۱۸۵)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے:

۱۔ ہمارے اولیاء اللہ اپنی نمود و نمائش کے بڑے حریص واقع ہوئے ہیں اور فوراً مقابلہ پر بھی اتر آتے ہیں اور اپنے سے کم تر کے تصرفات چھین کر ان سے اپنی ولایت کا سکہ تسلیم کروا کے چھوڑتے ہیں۔

۲۔ نسبت کی سلبی غالباً تصرفات کی سلبی سے بڑی سزا ہے کیونکہ تصرفات میں بو نہیں ہوتی جبکہ نسبت میں خوشبو بھی ہوتی ہے۔ اگر نسبت سلب ہو جائے، تو اس کی خوشبو کے پیچھے چلنے سے یوں سراغ لگایا جا سکتا ہے جیسے چور کا اس کے پاؤں کے نشانات سے۔

۳۔ تصرف یا کرامات اور ولایت لازم و ملزوم ہیں۔ پھر جتنا زیادہ صاحب تصرف کوئی ولی ہوگا۔ اتنا ہی وسیع علاقہ اس کے زیرِ حکومت ہوگا، گویا تصرف حکومت (باطنی) بھی لازم و ملزوم ہوئے۔

۵۔ پیر شمس اور بہاؤالدین زکریا کی کرامتوں کا مقابلہ

فرقہ اسماعیلیہ (شیعہ امامیہ) کے ایک مبلغ پیر شمس الدین سبزواری تبریزی (م ۶۷۵ء) کا ذکر ہو رہا ہے:-

"حضرت پیر شمس کی شہرت بڑھنے سے بہاؤالدین زکریا نامی ایک درویش کو اپنی عزت کی نسبت ڈر پیدا ہوا۔ گلزار شمس کی روایت کے بموجب اس نے اپنے خاص مرید خان محمد سید حاکم شہید کو حکم دیا کہ پیر شمس ملتان آئیں گے تو ہمیں بھی ان کی اطاعت کرنی پڑے گی اس لیے تمام کشتیوں کو شہر میں لے لو تاکہ وہ شہر میں داخل نہ ہو سکیں۔ مرید نے اس حکم پر عمل کیا اور جب پیر شمس

نے کنارہ پر آکر دیکھا تو ایک بھی کشتی نظر نہ آئی۔ بے حد غصہ آیا۔ ایک کاغذ کی کشتی بنائی اس میں خود بیٹھ گئے اور کشتی کے ساتھیوں کو اپنی انگلی پکڑنے کے لیے کہا۔ سبھوں نے اس پر عمل کیا۔ کشتی اسی وقت ندی میں بہنے لگی۔ مگر چکر کھانے لگی۔ پیر شمس نے دریافت کیا کہ کسی کے پاس دنیوی مال و متاع ہے کیا؟ شاہزادہ محمد کو ان کی والدہ نے زادِ راہ کے لیے چند زیورات دیئے تھے اس کو انہوں نے پیر شمس کے سامنے رکھ دیا۔ آپ نے ان جواہرات کو دریا میں پھینکوا دیا۔ ویسے ہی کشتی ندی میں بہنے لگی اور جب بیچ میں پہنچی تو بہاؤالدین زکریا کی نظر اس پر پڑی اور اس نے بد دعا دی اس لیے کاغذ کی کشتی وہیں رک گئی۔ پیر شمس بہت حیران ہوئے آخر ان کی نظر بہاؤالدین زکریا پر پڑی جو کھڑکی میں بیٹھا تھا۔ انہیں معلوم ہوگیا کہ میری کشتی اس نے روکی ہے۔ پیر شمس نے اس کی طرف جونہی نظر اٹھائی تو بہاؤالدین کے سر پر دو سینگ پیدا ہو گئے۔ اور سر کھڑکی میں اٹک گیا۔ بہاؤالدین اس مصیبت سے گھبرا گیا اور اپنے دو بیٹوں کو معافی کے لیے پیر شمس کے پاس بھیجا۔ ان لڑکوں کی مسجد قدیم میں پیر شمس سے ملاقات ہوئی۔ لڑکوں نے والد کی طرف سے معافی مانگی پیر شمس نے اس کے حق میں دعا فرمائی۔ اس طرح بہاؤالدین کو اس مصیبت سے نجات ملی آج تک وہ دونوں سینگوں کی نشانی ان کے ذکور فرزندوں میں باقی ہے۔ اور وہ کھڑکی بھی موجود ہے۔ جس میں بہاؤالدین بیٹھا تھا۔ ملتان شہر کے سیاحت کرنے والوں کو یہ چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں"۔

اب دیکھیے درج بالا کرامت دراصل بہت سی کرامات کا یا خرقِ عادت امور کا مجموعہ ہے۔ مثلاً:-

۱۔ آج تک اتنا چوڑا کاغذ ایجاد نہیں ہوا جس کی اگر کشتی بنائی جائے تو آدمی اس میں بیٹھ سکے مگر پیر شمس کو ایسا کاغذ مل گیا تھا۔

۲۔ پھر وہ کاغذ اس قدر واٹر پروف تھا کہ پانی میں گلنا تک نہ تھا۔

۳۔ نیز وہ کاغذ اس قدر مضبوط اور توازن بدوش تھا کہ پیر شمس کے اس میں بیٹھنے اور ساتھیوں کے پیر شمس کی انگلی پکڑنے یعنی کئی آدمیوں کا بوجھ اٹھانے کے باوجود نہ تو ٹوٹا۔ اور نہ ہی ان کو لے ڈوبا۔

۴۔ اتنے پائیدار کاغذ کے ناؤ کے چکر کھانے کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ خواجہ خضر خواج جسے اولیاء اللہ کی دنیا میں پانیوں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے کا نذرانہ پیر شمس نے نہ دیا تھا۔ چنانچہ پیر شمس نے شاہزادہ محمد سے چند زیور لیے۔ لیکن جب پھینکے تو وہ زیور کے بجائے جواہرات بن گئے ان جواہرات کے ملنے پر خواجہ خضر خوش ہو گئے۔ اور کشتی کو آگے چلنے دیا۔

۵۔ پیر شمس کی نظر جلالت پڑنے پر بہاؤالدین ذکریا ملتانی کے سر پر دو سینگوں کا اسی وقت اگ آنا بھی بڑی عالی شان کرامت ہے معافی مانگنے پر یہ سینگ تو غائب ہو گئے۔ لیکن یہ کلنک کا ٹیکہ ان کی اولاد ذکور میں باقی رہ گیا کہ کیسے ہمارے جدامجد بہاؤالدین ذکریا ملتانی نے شکست کھائی تھی۔

۶۔ شیخ خرقانی اور شیخ ابو العباس کا آگ میں کودنے کا مقابلہ

اس مقابلہ کی تفصیل ہم آگے کرامات اور استدراج کے ذیلی عنوان "یا نار کونی برداً و سلاماً" کے تحت درج کر رہے ہیں، وہاں دیکھ لی جائے۔

کشف و کرامات کے حصول کا بہترین نسخہ

جب ولایت اور کشف و کرامات کے لازم و ملزوم ہونے کا عقیدہ ہمہ گیر شکل اختیار کر گیا، تو ضروری تھا کہ جوئندہ یابندہ کے مصداق کشف و کرامات یا ولایت کے حصول کے طریقے بھی دریافت کئے جاتے چنانچہ ان "اولیاء اللہ" نے ایسے سینکڑوں اوراد و اذکار اور وظائف بھی ایجاد کر لئے۔ نمونۃً ایک نسخہ حاضر خدمت ہے۔ صاحب ریاض السالکین "اسم اعظم" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"یہ وظیفہ مخدوم جہانیاں جلال الدین جہاں گشت کا ہے۔ اس اسم اعظم سے نو ہزار کشف و کرامات حاصل ہوتی ہیں۔ ترکیب اس کی یہ ہے کہ اول ترک حیوانات جلالی و جمالی کرے اور ہر وقت پاکیزہ باطہارت رہے۔ ایک کروڑ مرتبہ "اللہ الصمد اجب یا اسرافیل بامدد فاتیل" اول آخر درود شریف پڑھے اور ایک تعداد مقرر کر کے روزانہ اسی تعداد کے مطابق ایک ہی جانماز پر وظیفہ کرے۔ جب ۲۵ لاکھ پورا ہو چکے، تو اس کا ثواب تمام پیغمبروں کی روحوں کو پہنچائے۔ پھر ۲۵ لاکھ پورا کر کے اس کا ثواب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روح کو پہنچائے۔ پھر ۲۵ لاکھ پورا ہونے پر اس کا ثواب تمام شہیدوں اور غوث، قطب، ابدال اور تمام برگزیدہ بزرگوں کی ارواح کو پہنچائے۔ پھر ۲۵ لاکھ پورا ہونے پر اس کا ثواب تمام امت رسول اور جمیع مسلمانوں کی ارواح پاک کو پہنچائے۔ پس عمل پورا ہو گیا..... تین مرتبہ یا گیارہ مرتبہ اسم اعظم پڑھ کر جو چاہے فوراً حاضر ہو۔ تمام کائنات تسخیر میں ہو گی۔ تین ماہ گزرنے کے بعد بے شمار کشف و کرامات حاصل ہوں گے، لیکن حلال و حرام کی تمیز ہو۔ ناجائز، خلاف شرع کوئی بات سرزد نہ ہو..... یہ میرا آزمودہ ہے۔ نااہل کو اس کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ مجھے اس کی اجازت سید محمد عبد اللہ نے ۱۹۳۰ء میں دی تھی۔ ہر چیز ارضی و سماوی تابع فرمان ہو گی۔ یہ اسم اعظم ننگی تلوار ہے بغیر اجازت مرشد کامل ہرگز نہ پڑھے۔" (ریاض السالکین، ص ۳۵۴)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں :

۱۔ اس وظیفہ کے موجد جلال الدین مخدوم جہانیاں، اجازت دہندہ سید محمد عبداللہ اور راقم کتاب مذکورہ "مرشدین کامل" ہیں۔

۲۔ ان تینوں کے نزدیک اللہ الصمد کے ساتھ ساتھ "اَجِبْ یا اسرافیل یا مدد فائیل" بھی اسم اعظم کا حصہ ہے، جو صریح شرک ہے اور یہی رجال الغیب سے استمداد ہے۔ لیکن ان حضرات کے نزدیک یہ خلافِ شرع کیا عین شرع کے مطابق ہے۔

۳۔ اور ہمارا خیال یہ ہے کہ اس شرکیہ وظیفہ میں یہی حصہ "اَجِبْ یا اسرافیل یا مدد فائیل" ہی اصل الاصول ہے کیونکہ ہندو جوگی اور سادھوؤں سے بھی بے شمار کرامات ظاہر ہوتی ہیں اور وہ بھی اپنے جنتر و منتروں کے ذریعے رجال الغیب سے استفادہ کرتے ہیں اور "اللہ الصمد" کے قائل بھی نہیں ہوتے۔

۴۔ یہ حرام حلال کی تمیز اور طہارت وغیرہ کی پابندیاں بھی محض تقدس پیدا کرنے کے لئے لگائی گئی ہیں۔ کیونکہ دوسرے مذاہب کے مرشدان کرام ایسی پابندیاں روا نہیں رکھتے اور اس کے باوجود کشف و کرامات کے ماہر ہوتے ہیں۔

۳۔ اولیاءاللہ کی اقسام

تعلیم و تربیت یا کرامات کے صدور کے لحاظ سے اِن اولیاءاللہ کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں:

۱۔ مادرزاد ولی

مختلف تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب پہلے مادرزاد ولی سید الطائفہ، بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) تھے۔ آپ کی والدہ سے روایت ہے "جب کبھی میں شبہ کا لقمہ کھا لیتی تو اندر بے قراری شروع ہو جاتی تھی۔ اور تاوقتیکہ قے نہ کر دیتی آرام نہ آتا تھا۔" (صوفیائے نقشبند ص)

آپ کا سلسلہ طریقت امام جعفر صادق سے ملایا جاتا ہے۔ جنہیں آپ نے دیکھا بھی نہیں یعنی آپ امام موصوف کی وفات کے بعد پیدا ہوتے تھے۔ (حوالہ ایضاً)

۲۔ علو ممشاد دینوری (م ۲۹۸ھ) "اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ شیخ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ لڑکپن میں بھی کبھی دن میں ماں کا دودھ نہیں پیتے تھے۔ اسی وجہ سے مادرزاد ولی کہلاتے ہیں۔" (تاریخ مشائخ چشت ص ۱۴۹)

۳۔ خواجہ محمد یا ابو محمد (م ۴۱۱ھ) "آپ کا لقب ولی الدین یا ناصح الدین تھا، مادر زاد ولی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حمل کے زمانہ میں والدہ کے پیٹ سے ذکر اللہ کی آواز آتی تھی، پیدا ہوتے ہی سات مرتبہ کلمہ پڑھا۔ ایام رضاعت میں مشغول بذکر رہتے تھے۔" (تاریخ مشائخ چشت، از مولانا زکریا، ص ۱۵۵)

۴۔ شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ) "آپ کی والدہ بھی صاحب کشف کرامات تھیں۔ آپ فرماتی ہیں "رمضان بھر میں کبھی دودھ منہ میں نہیں لیا۔" ایک روز مطلع ابر آلود تھا۔ چاند نظر نہ آسکا۔ لوگوں نے آکر مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا۔ "آج دن بھر میرے لڑکے عبدالقادر نے دودھ نہیں پیا ہے۔" بعد میں معلوم ہوا کہ اس دن رمضان کی پہلی تاریخ تھی۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۵۹)

اگرچہ لوگوں کو اس کرامت سے کوئی فائدہ نہ ہوا، ان کا روزہ تو قضا ہو ہی گیا تھا تاہم آپ کی یہ کرامت مشہور ہو گئی۔ اس کرامت کے لحاظ سے مشائخ چشت سبقت لے گئے کہ ان کے علو مشاد دینوری ایک تو بہت پہلے کے ہیں (م ۲۹۸ھ) دوسرے وہ رمضان کے علاوہ بھی دن بھر میں ماں کا دودھ نہیں پیتے تھے۔ یعنی پیدائش سے ہی صائم الدھر تھے۔

۵۔ خواجہ امیر کلال (م ۷۷۲ھ) "ایام حمل میں اگر آپ کی والدہ محترمہ کوئی مشتبہ لقمہ کھا لیتیں تو پیٹ میں درد شروع ہو جاتا اور جب تک وہ نکل نہ جاتا، چین نہ آتا تھا۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۵۰)

۶۔ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) "آپ مادر زاد ولی تھے۔ بچپن ہی میں صاحب کرامات ہو گئے تھے۔" (تاریخ مشائخ چشت از مولانا زکریا، ص ۱۹۴)

۷۔ شاہ بلاول قادری لاہوری (م ۱۰۴۶ھ) "محبوب الواصلین میں مرقوم ہے کہ آپ مادر زاد ولی تھے۔ سات برس کا سن تھا کہ ان کا ایک ہم عمر لڑکا فوت ہو گیا۔ آپ یہ سن کر اس کے سرہانے گئے اور کہا "اے یار! بے وقت سونا اچھا نہیں ہے آؤ چل کر کھیلیں۔ لڑکے نے اسی وقت آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر ساتھ چلا گیا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۴۳)

۸۔ خواجہ خاوند المعروف حضرت ایشان (م ۱۰۵۲ھ) "آپ مادر زاد ولی اور قطب الارشاد بزرگ تھے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۲۶۱) تذکرہ نویس نے ثبوت کے لئے کوئی کرامت بیان نہیں فرمائی۔

۹۔ محمد نوشاہ گنج بخش (م ۱۰۶۳ھ) آپ مادر زاد ولی اللہ صاحب جذب (مجذوب) صحو و سکر

اور محبت عشق اور شوق و ذوق اور زہد و ریاضت تھے۔ ولایت کے بادشاہ اور صاحب خوارق و کرامات تھے۔ طریقہ نوشاہیہ قادریہ کے امام اور پیشوا تھے۔"..... آپ نو ماہ کی عمر میں جھولے میں تھے کہ ایک ہمسائی نے آکر آپ کو گود میں لینا چاہا۔ دیکھا تو ایک سیاہ سانپ حضرت نوشاہ عالی جاہ کے گرد لپٹا ہوا ہے۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹی اور چلائی۔ آپ کی والدہ بی بی جیونی چیخ سن کر دوڑی آئیں دیکھا تو کوئی سانپ نہیں تھا حیران ہوگئیں۔ اسی اثنا میں گوشہ سے آواز آئی کہ "یہ عورت ناپاک حالت میں چاہتی تھی کہ ہمارے جسم کو ہاتھ لگائے۔ اس لئے اس کام سے اس کو باز رکھا۔ حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔"

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۶۸)

یہ کرامت تو بہت خوب ہے مگر یہ سمجھ نہیں آسکی کہ یہ گوشہ سے آواز دینے والا کون تھا جو آپ کے جسم کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا تھا۔ نیز یہ کہ کونسی شریعت میں ناپاک عورت کا بچے کو ہاتھ لگانا منع ہے۔

۱۰۔ نور محمد تیراہی المشہور بابا جیو دم ۱۲۸۵ھ) یہ بھی مادر زاد ولی ہیں (صوفیائے نقشبند، ص ۲۸۶) ان کے مادر زاد ولی ہونے کی وجہ تذکرہ نگار نے بیان نہیں فرمائی۔ غالباً یہ وہی ولی ہیں جنہوں نے اولیائے ہندوستان اور اولیائے افغانستان کے درمیان مقابلہ رچایا تھا اور ایک پتھر پر بسم اللہ کی ضربات لگانے سے اس کو حرکت میں لانے میں کامیاب ہوگئے تھے اور اولیائے ہندوستان (نقشبند) کی لاج رکھ لی تھی۔

۱۱۔ میاں شیر محمد شرقپوری دم ۱۳۴۷ھ) "عام طور پر مشہور ہے اور دیکھنے والے معتبر اور مستند راوی بیان کرتے اور لکھتے ہیں کہ آپ کے پیدا ہوتے ہی جسم اطہر اور چہرہ نورانی سے ولی کامل ہونے کے آثار روزِ روشن کی طرح ظاہر تھے اور ہر شخص جو حضرت کو دیکھتا تھا، بے اختیار پکار اٹھتا تھا کہ یہ بچہ تو مادر زاد ولی ہے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۳۵۹)

مندرجہ بالا اقتباسات سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ اگرچہ بعض اولیائے کرام کشف و کرامات کو ولایت کے لئے لازم قرار نہیں دیتے، لیکن معلوم ہوتا ہے، کہ اس طبقہ میں ان کی یہ پکار صدا بصحرا ثابت ہوئی ہے۔ ابتداء سے لے کر آج تک عمومی ذہن یہی رہا ہے کہ ولایت اور کرامات لازم و ملزوم ہیں۔ جس میں کرامت نہیں وہ ولی کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ان مادر زاد ولیوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو احکام شریعت کا پاس رکھنا تو در کنار، شرعی کبائر میں مبتلا تھے۔

وہ نماز روزہ کی چنداں پرواہ نہ کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود تذکرہ نویسوں کے ہاں اسی طرح قابلِ احترام اور بلا ریب ولی ہیں۔ جس سے صوفیاء کے اس دعوے کی تردید ہو جاتی ہے کہ طریقت شریعت سے ہی ماخوذ ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

۳۔ ان مادر زاد ولیوں کی جو کرامات بیان کی گئی ہیں وہ کرامت کی شرائط پوری نہیں کرتیں۔ ان سے نہ کوئی اشد دینی ضرورت پوری ہوتی ہے نہ دنیوی۔ لہٰذا یہ کرامات نہیں، بلکہ استدراجات ہیں۔

۲۔ اِک نگاہِ کرم سے بننے والے ولی

پیرانِ پیر جناب شیخ عبدالقادر جیلانی کے دو واقعات پہلے درج کر آتے ہیں کہ کس طرح ان کی ایک نگاہِ کرم نے ایک چور کو اور دوسری دفعہ ایک کافر کو ابدال کے مقام پر پہنچا دیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس میدان میں کئی دوسرے ولی ان سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔ مثلاً مولانا محمد زکریا صاحب اپنی تصنیف "تاریخ مشائخ چشت" شیخ نظام الدین العمری تھانیسری (م ۱۰۳۴ھ) کے حالات میں لکھتے ہیں کہ:

۱۔ "جس شخص پر نظر ڈالتے تھے ایک ہی وہلہ میں صاحب شہود ہو جاتا تھا۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے ولی تراش نام رکھ دیا تھا۔" (تاریخ مشائخ چشت، ص ۲۱۵)

۲۔ یہی مولانا زکریا صاحب خواجہ ابو ہبیرہ بصری (م ۲۸۷ھ) کے متعلق لکھتے ہیں:

"آپ کا جو شخص منظورِ نظر ہو جاتا تھا۔ ایک توجہ سے فوراً اس پر علوم منکشف ہو جاتے تھے۔"

(تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۴۷)

اور یہ تو ظاہر ہے کہ یہ علوم لدنی یا باطنی ہی ہو سکتے ہیں جن کی ان اولیاء اللہ کو ضرورت ہوا کرتی ہے۔

۳۔ حضرت نور محمد بدایونی کی مرزا مظہر جان جاناں پر توجہ ڈالنے کا ذکر ہو رہا ہے۔

"مگر اس وقت بغیر درخواست کے (نور محمد صاحب نے) مرزا صاحب سے فرمایا کہ آنکھیں بند کر کے دل کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ اور ایک ہی توجہ میں لطائف خمسہ کا ذاکر بنا کر رخصت کیا۔ آپ کی توجہ کی تاثیر نے باطن کو اس قدر متاثر اور منور کر دیا کہ دوسرے روز جب (مرزا مظہر جانِ جاناں نے) حضرت سید صاحب کی خدمت میں حاضری کا قصد کیا اور حسبِ عادت آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو بعینہ حضرت سید کی معلوم ہوئی۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۲۱۷)

گویا سید صاحب کی ایک توجہ نے کئی مرحلے طے کروا دیئے۔ ایک تو تصوّرِ شیخ میں کامل بنا دیا۔ دوسرے لطائف خمسہ کا ذاکر بھی بنا دیا۔ یہ لطائف پانچ ہیں یا چھ ہیں یا سات ؟ اس بات میں بھی اِن حضرات نے اختلاف کیا ہے اور یہ لطائف کون کون سے ہیں۔ اس کی تفصیل باطنی علوم کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔ بہرحال سیّد صاحب نے اس توجہ میں مرزا مظہر کو پانچ لطائف کا ذاکر بنا ڈالا تھا۔

۴۔ خواجہ محمد فضیل صاحب قادری نوشاہی کے تذکرہ میں صاحب خزینۃ الاصفیاء فرما رہے ہیں:

"جس فاسق و فاجر پر حالتِ جذب و سکر میں (فضیل صاحب نوشاہی کی) نظر پڑ جاتی۔ عارفِ کامل ہو جاتا۔ کسی مُردہ پر نظر پڑتی تو زندہ ہو جاتا۔ نگاہِ غضب سے کسی کو دیکھتے تو اس کی جان تن سے نکل جاتی۔ غرض آپ کے احوال و مقامات عجیب و غریب تھے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۷۷)

یہ یاد رہے کہ یہ نوشاہی حضرات انتہا درجہ کے بے دین، تارکِ صوم و صلوٰۃ، بھنگ چرس اور سماع و وجد کے رسیا ہوتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک مجذوب کی یہ کرامات بیان ہو رہی ہیں۔ منجملہ یہ کہ وہ ایک ہی نظر میں فاسق و فاجر لوگوں کو بھی عارفِ کامل بنا ڈالتے تھے۔ اب جیسے یہ عارفِ کامل بنتے ہوں گے اس کا اندازہ خود فرما لیجئے۔

۵۔ اسی طرح کے ایک اور نوشاہی شاہ عبدالرحمٰن ہیں۔ مجذوب تھے۔ لوگ انہیں رحمان دیوانہ کہا کرتے تھے۔ ان کے فضائل و مناقب یہ ہیں کہ:

"گرمیوں کے موسم میں سورج کی دھوپ میں بیٹھتے اور سردیوں میں برہنہ تن رات کو جنگل میں جا کر بیٹھ جاتے اور کبھی سردیوں میں دریا میں کھڑے ہو کر ذکرِ حق میں مشغول ہوتے۔ آپ کی گرمیٔ ذکر سے دریا کا پانی گرم ہو جاتا۔ جس شخص پر نگاہِ شفقت ڈالتے وہ صاحب کشف و کرامات ہو جاتا۔" (خزینۃ الاولیاء، ص ۳۴۰)

۶۔ اس نظرِ کرم یا توجہ کا اثر اتنا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ عام انسان یا فاسق و فاجر تو درکنار کتوں پر پڑ جاتے تو انہیں بھی صاحب کشف و کرامت اور ولی بنا دیتی ہے۔ چنانچہ اشرف علی تھانوی صاحب جنید بغدادی کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"۲۲۸۔ فرمایا (یعنی اشرف علی صاحب کے پیر امداد اللہ مہاجر مکی نے) حضرت جنید بغدادی بیٹھے تھے۔ ایک کُتا سامنے سے گزرا۔ آپ کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اس قدر صاحب کمال ہو گیا کہ شہر کے کُتے اس کے پیچھے دوڑے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ سب کُتوں نے اس کے گرد حلقہ باندھ کر مراقبہ کیا۔" (امداد المشتاق از حکیم الامت اشرف علی تھانوی، ص [illegible])

یہ کتے بیچارے تو غیر مکلف مخلوق تھے۔ اس بیچارے کو خواہ مخواہ صاحب حال بنا دیا۔ پھر دوسرے یہ کہ اس کا مراقبہ بھی شروع ہو گیا اور اس طرح کتوں میں ولایت کی داغ بیل ڈال دی۔ پھر لطف یہ کہ یہ نگاہ بھی اتفاقاً پڑ گئی تھی۔ اگر آپ عمداً نگاہِ کرم فرماتے تو خدا معلوم اس کتے کو کتنا بلند مقام حاصل ہو جاتا۔ رہے وہ انسان جن پر آپ کی زندگی میں نظر پڑ گئی یا آپ نے ڈالی تھی، تو ان کے ولی ہونے میں کسی کو کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

۳۔ تربیّت یافتہ وَلی اَور طریقِ تربیّت

کہا جاتا ہے کہ تزکیہ نفس کا دوسرا نام تصوّف ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے تزکیہ نفس پر حضور اکرم بھی مامور تھے اور یہی کام صوفیا بھی کرتے ہیں۔ اب درج ذیل طریقہ ہائے تربیت ملاحظہ فرمائیے اور یہ فیصلہ خود فرما لیجئے کہ آیا رسولِ اکرم ﷺ اسی طرح سے اور اسی طرح کا تزکیہ نفس فرمایا کرتے تھے۔

۱۔ بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) کا طریقہ کار

آپ کا ایک مرید ۳۰ سال آپ کی خدمت میں رہا وہ رات کو نہ کبھی سوتا اور نہ ہی کبھی روزہ چھوڑتا تھا مگر باطنی علوم اس پر منکشف نہ ہوتے تھے۔ آخر تنگ آ کر حضرت شیخ سے اس بات کی شکایت کی تو بایزید نے فرمایا "تم تین سو سال بھی لگے رہو تو یہ علم حاصل نہ کر سکو گے۔" مرید نے پوچھا: "اس کا کوئی علاج ہے؟" فرمایا "علاج تو ہے، مگر تم کر نہ سکو گے۔" جب مرید نے اصرار کیا تو آپ نے علاج یہ بتلایا کہ "اپنی ڈاڑھی اور سر منڈا دو، گودڑی پہن لو، باداموں کا ایک کشکول ہاتھ میں لے کر اپنے گرد بچوں کو جمع کرو اور کہو جو بچہ مجھے ایک گھونسا مارے گا، اسے ایک بادام دوں گا۔ اسی طرح گلی گلی پھرو۔" مرید نے کہا: "سبحان اللہ کیا علاج ہے؟" بایزید نے کہا "تیرا سبحان اللہ کہنا بھی شرک ہے، کیونکہ تو یہ کلمہ اپنی پاکیزگی بیان کرنے کے لئے کہہ رہا ہے۔" مرید نے کہا مجھ سے یہ علاج نہیں ہو سکتا کوئی اور بات بتلائیے۔" بایزید نے کہا "اگر یہ علاج نہیں کر سکتا تو تیرا کوئی علاج نہیں۔" (احیاء العلوم، ص ۳۵۸، ج ۴، مصنفہ امام غزالی)

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد امام غزالی لکھتے ہیں کہ "جس شخص کا دل بیمار ہے وہ اپنے نفس کے تابع ہے اس کا وہی علاج ہے، جو بایزید نے تجویز کیا۔" (حوالہ ایضاً)

اب دیکھئے اس مرید بیچارے نے تین خلافِ شرع کام تو پہلے ہی کر لئے تھے۔ (۱) رات کبھی نہ سونا،

(۲) روزہ کبھی نہ چھوڑنا اور (۳) دینِ طریقت پر ایمان۔ اب بایزید صاحب نے ولایت کی تکمیل کے لئے یہ چار خلافِ سنت اور کام بتلا دیتے: (۱) داڑھی منڈوانا (۲) گودڑی پہننا (۳) در در کی گدائی اور (۴) بچوں سے گھونسے کھانا۔ پھر جب ایسے کاموں پر معذرت کرنے لگا، تو آپ نے اسے ولایت کے لئے نااہل اور لاعلاج مریض قرار دے دیا۔

پھر امام غزالی صاحب نے بھی ان تمام خلافِ سنت کاموں کے علی الرغم بایزید کے علاج کی ہی حمایت فرمائی اور اس 'دل کے بیمار' مرید پر ہی عتاب فرمایا:

۲۔ جنید بغدادی (م ۲۹۸ھ) کا طریقِ تربیت

"ایک روز شبلیؒ نے حضرت جنیدؒ سے کہا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے گوہر آشنائی (معرفت) عطا فرمایا ہے اسے یا تو بیچ دیجئے یا بخشش دیجئے۔" شیخ جنید نے فرمایا: "نہ فروخت کروں گا نہ بخشوں گا۔ فروخت کروں تو تیرے پاس ادا کرنے کے لئے کچھ نہیں۔ مفت دوں تو یہ موتی تیرے ہاتھ مفت میں آ جائے گا۔ مردانِ باہمت کی طرح اپنے آپ کو دریائے معرفت میں ڈال اور گوہر مقصود حاصل کر۔" شبلی نے پوچھا: "پھر کیا کروں؟" فرمایا: "ایک سال تک کبریت فروشی کر (دیا سلائی بیچ)" ایک سال گزرنے کے بعد شیخ شبلی، مرشد کی خدمت کی حاضر ہوئے فرمایا: "اب ایک سال تک بغداد کے کوچہ و بازار میں گدائی کر مگر اس طرح کہ کسی دوسرے کام میں مشغول نہ ہونا۔" شیخ شبلی فرمودۂ مرشد کے مطابق بغداد کے بازاروں میں گداگری کرتے رہے۔ مگر کسی شخص نے آپ کو ایک حبّہ بھی نہ دیا۔ سال گزرنے کے بعد خدمتِ شیخ میں حاضر ہوتے۔ "فرمایا: "کیوں شبلی! اپنی قدر و قیمت معلوم ہوئی؟ کوئی شخص تیری طرف متوجہ بھی نہ ہوا۔ اچھا اب نہاوند جا، جہاں تو حکومت کرتا رہا ہے۔ وہاں ایک سال دریوزہ گری کر۔" چنانچہ آپ وہاں پہنچے۔ کسی نے آپ کو روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہ دیا۔ سال گزار کر خدمتِ مرشد میں آئے۔ شیخ جنید نے فرمایا: "شبلی! ابھی ایک سال اور بغداد کے کوچہ بازار میں گدائی کر۔" چنانچہ حکم شیخ کے مطابق آپ بغداد کی گلیوں میں بھیک کا ٹھیکرا لئے بھک منگا بن کر بھیک مانگتے رہے۔ شام کو خانقاہ شیخ میں بھی حاضر ہوتے اور بھیک کے ٹکڑوں کو خدمتِ مرشد میں پیش کرتے اور شیخ انہیں درویشوں میں تقسیم کر دیتے۔ ایک سال گزرنے کے بعد حضرت جنید نے پوچھا: "کیوں شبلی! اب تیرے نفس کا حال تیرے نزدیک کیا ہے؟" عرض کیا پیر و مرشد! اپنے آپ کو خلقِ خدا کی کمترین مخلوق سمجھتا ہوں۔" فرمایا: "اب تیرا ایمان درست

ہوا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۴۵ - ۱۴۶)

دیکھا آپ نے سید الطائفہ جناب جنید بغدادی نے اپنے بعد میں ہونے والے خلیفہ ابوبکر شبلی کی تربیت کے لئے کیسا شاندار پروگرام تجویز کیا۔ پہلے سال تو خیر انہوں نے ماچسیں بیچیں۔ دوسرے اور تیسرے سال شبلی کو گداگری کے ذریعہ نہ کہیں سے حبہ ملا نہ ٹکڑا۔ یہ بھی دراصل سید الطائفہ کی کرامت ہی تھی کہ انہیں دو سال کچھ نہ ملا۔ ورنہ بھک منگے گداگر آج بھی موجود ہیں۔ ایسا ہونا ناممکن ہے کہ کسی کو دو سال تک کچھ نہ ملا ہو۔ اور چوتھے سال جو گداگری کے ٹکڑے آتے رہے وہ گویا سب کے سب حلال و پاکیزہ رزق کے تھے، جو آپ درویشوں میں بانٹتے رہے۔ خیر کچھ بھی ہو چار سال بعد آپ نے شبلی کے ایمان کو درست کر دیا جس کے بغیر معرفت کا موتی ہاتھ نہ آسکتا تھا۔

شیخ شبلی پر ولایت کے اثرات

اور اس طرح جو معرفت ابوبکر شبلی کو ملی اس کے متعلق صاحب خزینۃ الاصفیاء فرماتے ہیں: "روایت ہے شیخ شبلی کچھ عرصہ اپنے مقام سے غائب رہے۔ ہر چند تلاش کیا نہ پایا۔ ایک روز مخنثوں کے گروہ میں دیکھے گئے (شاید نماز بھی انہیں کے ساتھ پڑھتے رہے ہوں گے) لوگوں نے پوچھا "کیا بات ہے؟" فرمایا: "یہ گروہ دنیا میں نہ مرد ہے نہ عورت۔ میں بھی اسی حالت میں گرفتار ہوں۔ نہ مرد ہوں نہ عورت۔ پس ناچار میری جگہ انہی میں ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۴۷)

اب دیکھئے رسول اللہ بھی تزکیۂ نفس فرمایا کرتے تھے لیکن طریق کار جداگانہ ہونے کی وجوہ دو ہیں:

۱۔ شرعی اصطلاح میں تزکیۂ نفس سے مراد دلوں کو شرک اور کفر کی آلائشوں نیز اخلاقِ رزیلہ سے پاک کرنا ہے۔ جبکہ طریقت میں تزکیۂ نفس سے مراد معرفت کا موتی تلاش کرنا ہے جن سے کشف و کرامات کا صدور ہو۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ اس مقصد کے حصول کے لئے شرعی تعلیمات پر زور دینے اور نگرانی فرماتے تھے۔ چونکہ شریعت کی نظروں میں انسان تمام مخلوقات سے برتر ہے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کا طریق تربیت ایسا تھا جس سے کسی کی عزت یا وقار مجروح نہیں ہوتا تھا۔ لیکن یہ گروہ صوفیہ نفس کشی کے درپے ہوتے ہیں اور انسان کو تمام مخلوق سے کمتر درجہ پر لانا چاہتے ہیں۔ اور اسے انتہائی ذلیل بنا دینا ان کا طریق کار ہے

گداگر کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے تو فرمایا تھا کہ قیامت کے دن اٹھے گا تو اس کے چہرے پر گوشت نہ ہوگا۔ لیکن صوفیوں کے ہاں یہی گداگری کا طریقہ حصول ولایت کے لیے ضروری ہے یہ ہے ان لوگوں کی اتباع سنت کا نمونہ۔ اور پھر اس تربیت کا منطقی نتیجہ بھی یہی کچھ نکلنا چاہیے تھا کہ شبلی مخنث بن گئے۔ نہ مرد رہے نہ عورت۔

۳۔ شیخ نظام العمری (م ۱۰۳۴ھ) ولی تراش کا طریق تربیت

نظام الدین اپنے ایک مرید ابو سعید نعمانی کو طریقت سکھلا رہے ہیں:

"جب کئی دن گزر گئے تو شاہ ابو سعید نے عرض کیا کہ حضرت میں گنگوہ سے بلخ تک پیدل چل کر دعوتوں کے لئے نہیں آیا۔ فرمایا: "صاحبزادے پھر جو خاص مطلب ہو بیان فرمائیے۔" کہا: "میں وہ دولت لینے آیا ہوں جو آپ میرے گھر سے لائے ہیں۔" (نظام الدین، ابو سعید کے آباؤ اجداد کے مرید تھے۔ یہاں بھی دولت سے مراد وہی معرفت کا موتی ہے) بس یہ سنتے ہی شیخ کا رنگ بدل گیا اور فرمایا: "صاحبزادے! اگر دولت لینا چاہتے ہو تو پھر یہ شان و شوکت رخصت کرو اور آج سے حمام کی خدمت تمہارے سپرد ہے جا کر حمام جھونکو اور نقیب سے فرمایا کہ ان کو لنگر کی روٹی صبح و شام دے دیا کرو اور فرمایا جب تک ہم اجازت نہ دیں اس وقت تک ہمارے سامنے نہ آؤ۔" نہ ذکر بتلایا نہ شغل بس نماز روزہ کرتے اور حمام جھونکتے رہے۔ اسی حالت میں ایک عرصہ گزر گیا۔ اس کے بعد حضرت شیخ نے بھنگن سے فرمایا کہ "آج کوڑا کرکٹ ابو سعید کے سر پر ڈال دینا۔" بھنگن نے ایسا ہی کیا، تو شاہ ابو سعید نے غصہ سے فرمایا کہ "نہ ہوا گنگوہ ورنہ آج تجھے حقیقت معلوم ہو جاتی۔" بھنگن نے عرض کر دیا کہ آج ابو سعید نے یہ کہا تھا۔ فرمایا: "ارے ابھی تو خناس دماغ میں گھسا ہوا ہے۔ گنگوہ کی بو سے ریاست نہیں نکلی، ابھی اور حمام جھونکیں۔" چنانچہ اور عرصہ گزر گیا، پھر دوبارہ بھنگن کو حکم دیا۔ چنانچہ اس نے پھر ایسا ہی کیا۔ اس وقت شاہ ابو سعید نے زبان سے کچھ نہیں کہا مگر تیز نظروں سے گھور کر دیکھا۔ شیخ نے یہ حال سن کر فرمایا کہ "ابھی تو کسر باقی ہے۔" چنانچہ ایک عرصہ تک اور یہی خدمت جاری رہی۔ اس کے بعد پھر وہی حکم ہوا۔ بھنگن نے پھر ایسا ہی کیا کہ سارا کوڑا کرکٹ ابو سعید کے سر پر ڈال دیا۔ اس وقت شاہ ابو سعید کا حال بالکل بدل گیا تھا۔ کوڑا جو گر گیا تھا وہ اپنے اوپر ڈالنے لگے۔ بھنگن نے جا کر شیخ سے یہ حال عرض کیا، تو فرمایا: "الحمد للہ اول قدم تو طے ہوا۔ واقعی

یہ تکبر ہی راستہ میں حائل ہوتا ہے۔ یہ نکل جائے، تو پھر بہت جلد طریق طے ہو جاتا ہے۔" اس ریاضت کے بعد شاہ ابو سعید کو اتنی اجازت ملی کہ شیخ کی مجلس میں آجایا کریں۔ کچھ عرصہ بعد ذکر تعلیم کیا گیا۔ ذکر شروع کرنے کے بعد کچھ حالات و کیفیات طاری ہوئیں تو شیخ کو معلوم ہوا کہ ابو سعید میں عجب پیدا ہو گیا ہے تو سب ذکر و شغل چھڑا دیئے اور کتوں کی خدمت سپرد ہوئی۔ دو شکاری کتے تھے۔ ایک دن شاہ ابو سعید اُن کو جنگل لے گئے۔ راستہ میں کوئی شکار نظر آیا۔ جس کو دیکھ کر کتے اس کے پیچھے دوڑے۔ شیخ سعید کچھ راستہ تو اُن کے ساتھ چلے مگر تھک گئے۔ پھر اس خیال سے کہ کتے بے قابو نہ ہو جائیں اور شیخ ناراض نہ ہوں۔ زنجیر کو اپنی کمر سے باندھ لیا۔ اب حال یہ ہے کہ کتے بھاگے جا رہے ہیں اور یہ ساتھ ساتھ گھسٹتے جا رہے ہیں کہیں ڈھیلوں پر سر لگتا ہے کہیں کانٹوں سے بدن زخمی ہوتا ہے۔ اسی حالت میں ان پر غیبی فضل ہوا کہ ایک تجلی خاص ان کے اوپر ہوئی۔ جس کی لذت نے تمام تکلیف کو بھلا دیا۔ ادھر حضرت شیخ کو یہ حالت منکشف ہوئی اور انہوں سے خدام سے فرمایا کہ " اس وقت ابو سعید پر فضل ہو گیا اور ایک تجلی خاص سے حق تعالے نے اُن کو مشرف فرمایا۔ جاؤ جنگل سے انہیں اٹھا لاؤ۔" خدام تو ادھر دوڑے اور اُدھر سلطان نظام الدین پر شیخ المشائخ عبد القدوس کی رُوحانیت منکشف ہوئی اور فرمایا: "نظام الدین تم کو اس سے زیادہ مشقت لینے کا بھی حق تھا، مگر ہم نے تو تم سے اتنی مشقت نہیں لی تھی۔" یہ ایک محبت آمیز عتاب تھا جس سے سلطان نظام الدین کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ابو سعید آئے تو اسے سینے سے لگایا اور خاطر و مدارات ہونے لگی۔" ...... شاہ ابو سعید کو اس روز کی تجلی کا بہت اشتیاق تھا۔ روزانہ ذکر کر کے اس کے مشتاق رہتے جب کئی روز تک نہ ہوئی تو ایک دن حبسِ دم کر کے بیٹھ گئے اور پختہ ارادہ کر لیا کہ جب تک وہ تجلی نہ ہو گی سانس نہ چھوڑوں گا۔ چاہے مر جاؤں۔ کیونکہ ایسی زندگی سے مرنا ہی اچھا ہے۔ بالآخر وہ تجلی ہوئی اور اس کی مسرت میں سانس اس زور سے چھوٹا کہ پسلی پر ضرب پہنچی اور ٹوٹ گئی۔ اس وقت غیب سے ایک ہاتھ نمودار ہوا جس میں چمچہ کے اندر کوئی دوا تھی وہ ان کے منہ میں لگا دی گئی اور اس کے کھاتے ہی فوراً پسلی جڑ گئی اور اسی کے ساتھ یہ ارشاد بھی ہوا کہ "چوزہ کا شوربا چند روز تک دینا۔" شیخ نے فوراً چوزہ کا انتظام کر دیا اور کئی روز تک چوزے کھلاتے گئے۔ بالآخر شیخ نے تکمیل کے بعد اپنا نائب بنا کر گنگوہ واپس کیا۔" (تاریخ مشائخ چشت ص ۲۲۰)

اس طویل قصہ سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ طریقت کی تربیت کی جو منازل جنید بغدادی نے گداگری کے ذریعہ طے کرائیں۔ نظام الدین صاحب نے وہی منازل بھنگن کے کوڑا پھینکنے کے ذریعہ طے کرائیں اور یہ بھنگن اس کارِ طریقت کا ایک اہم رُکن تھی۔

۲۔ سنا تھا کہ بعض پیرزادے شکاری کتوں کا شوق فرماتے ہیں، اب معلوم ہوا کہ ان سے راہِ طریقت کی تربیت میں بھی مدد لی جا سکتی ہے۔

۳۔ جس چیز کو شیخ نظام الدین تکبر سے تعبیر فرما رہے ہیں، وہ تکبر نہیں بلکہ ذلت و تحقیر اور اہانت نفس کا احساس ہے جو ایک مومن کو کسی قیمت پر گوارا نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے تکبر کی تعریف یوں بیان فرمائی کہ: "تکبر یہ ہے کہ تو حق بات کی پرواہ نہ کرے اور دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھے۔" اب بتلائیے کہ یہ تعریف بھنگن کے کسی مسلمان پر غلاظت کا ڈھیر پھینکنے پر صادق آ سکتی ہے۔ عزتِ نفس کو تکبر کہنا تو وہی درست قرار دے سکتا ہے جو نفس کُشی کے درپے ہو اور معرفت کے موتی تلاش کر رہا ہو۔ جس کا شریعت نے قطعاً کوئی حکم نہیں دیا۔ نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے ایسا موتی اس طرح طرح کے بیہودہ طریقوں سے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

۴۔ ابو سعید پر جو تجلی ہوئی وہ چونکہ شریعت کے تابع نہ تھی لہٰذا وہ یقیناً استدراج تھا۔ جیسا کہ جنید بغدادی کا ایک مرید ہر رات کو بہشت کی سیر کیا کرتا تھا اور یہ شیطانی عمل تھا۔

۵۔ اِن مُرشد و مرید دونوں کے شیخ المشائخ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) وہی صاحب ہیں جنہوں نے پانی بننے میں ہندو جوگی سے مقابلہ رچایا تھا اور فرق یہ رہ گیا تھا کہ جوگی کے پانی سے بُو آئی تھی اور آپ کے پانی سے خوشبو۔

۶۔ ندائے غیب کی باتیں تو خیر صوفیاء کے تذکروں میں اکثر ملتی ہی رہتی ہیں البتہ ہاتھ کے برآمد ہونے اور اس ہاتھ میں چمچہ اور اس چمچہ میں پسلی ٹوٹنے کے علاج والا لطیفہ بھی خوب ہے اور اچھے مقام پر فٹ کیا گیا ہے۔

۴۔ ابُو سعید چشتی صابری گنگوہی (م ۱۰۴۰ھ) کا طریقِ تربیت

اب وہی ابُو سعید جنہوں نے اپنے مُرشد نظام الدین عمری سے اس طرح تربیت پا کر فیض حاصل کیا تھا، اِن کا طریقہ واردات بھی ملاحظہ فرمائیے:

"سواطع الانوار میں لکھا ہے کہ ایک شخص منکرِ حال آپ کے پاس آیا اور عرض کی۔" میں طالب خدا ہوں

مگر طاقتِ مجاہدہ وریاضت کی مجھ میں نہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ کی نظرِ فیض اثر سے مقصودِ دِل حاصل کروں۔"
حضرت کے ہاتھ میں اس وقت عصا تھا فرمایا کہ "ہاں ہم اس عصا کی تین ضرب سے طالب کو خدا تک پہنچا دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر ایک ضرب عصا کی اس کے سر پر لگائی۔ عالمِ ملکوت اس پر کھل گیا اور دوسری ضرب میں عالمِ جبروت، تیسری ضرب میں عالمِ شہود اس پر منکشف ہوگیا۔ تین دن تک بے ہوش رہا۔ جب ہوش میں آیا صدقِ دِل سے مُرید ہوگیا۔" (حدیقۃ الاولیاء، ص ۹۳)

یہ طریقِ کار تکلیف دہ ضرور ہے مگر اس لحاظ سے اچھا ہے کہ کم از کم ابوسعید صاحب نے خلافِ شرع کوئی تلقین نہیں فرمائی اور وہ مرید بڑا ہی سخت جان تھا کہ سر میں عصا کی تین ضربیں کھانے پر اس پر صرف عالمِ ملکوت، جبروت اور شہود ہی روشن ہوتے۔ اُس پر تو چودہ طبق روشن ہو جانے چاہئیں تھے۔ البتہ اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ جب اس پر تینوں عالم منکشف ہوگئے اور وہ خُدا تک بھی پہنچ چکا، تو پھر بعد میں مُرید ہونے کا کیا فائدہ تھا۔

۴۔ حضرت خضر علیہ السلام کی تعلیم سے بننے والے ولی

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام ان اولیاء اللہ کو کیا تعلیم دیا کرتے تھے، جو اُنہیں ولایت کے درجۂ عُلیا تک پہنچا دیتی تھی۔

عبدالخالق غجدوانی (م ۵۷۵ھ) کو خضر کی تعلیم

ایک دن حضرت خضر علیہ السلام سے آپ کی ملاقات ہوئی اور حضرت خضر نے فرمایا کہ "میں تم کو اپنی فرزندی میں لیتا ہوں اور تم کو ایک سبق پڑھاتا ہوں[1]۔ اگر تم اس کی پابندی

[1] معلوم ہوتا ہے کہ گروہِ صوفیاء میں سب سے پہلے بزرگ جنہیں حضرت خضر علیہ السلام سے شرفِ ملاقات نصیب ہوا وہ ابراہیم بن ادھم (م ۱۶۲ھ) ہیں۔ صوفیاء کے مخصوص اوراد و ظائف کا آغاز بھی غالباً اسی بزرگ سے ہوا ہے۔ صاحب سیر الاولیاء ص ۴۲ پر لکھتے ہیں کہ:
"منقول ہے کہ خواجہ ابراہیم ادھم نے ایک دفعہ ایک شخص کو صحرا میں دیکھا۔ اس نے آپ کو اسمِ اعظم کی تلقین کی جس کے پڑھنے کی برکت سے آپ نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ "اے ابراہیم! میرے برادر الیاس نے تمہیں اسمِ اعظم تعلیم کیا ہے یہ تمام برکتیں اسی کی ہیں۔" یہ بھی واضح رہے کہ جس طرح صوفیاء کے ہاں حضرت خضر علیہ السلام کو ایک زندہ جاوید ہستی تسلیم کر لیا گیا ہے

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور مواظبت کرو گے تو تم پر اسرارِ باطنی کھل جائیں گے۔" پھر حضرت خضر علیہ السلام نے آپ کو وقوفِ عددی کی تعلیم دی اور فرمایا: "حوض میں غوطہ لگاؤ اور دل سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہو۔" چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور اس کا ورد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ پر اسرار و رموز منکشف ہونے لگے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۳۴)

پھر اسی بیان کی تصدیق یعقوب چرخی (م ۸۵۱ھ) کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اس کے بعد آپ (یعنی یعقوب چرخی کے پیر خواجہ بہاؤ الدین نقشبند م ۷۹۱ھ) نے اپنے مشائخ کا سلسلہ بیان کیا اور خواجہ عبدالخالق غجدوانی تک بیان کیا اور پھر مجھ کو وقوفِ عددی کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ علم لدنی کا پہلا سبق ہے اور یہ حضرت خضر علیہ السلام نے خواجہ غجدوانی کو بتایا تھا۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۶۹)

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا علم لدنی کا یہ پہلا سبق جو وقوفِ عددی سے تعلق رکھتا ہے اسرار و رموز کے انکشاف میں اتنا اہم ہے کہ اس سلسلہ میں یہ سبق متوارث چلا آرہا ہے۔ یہ وقوفِ عددی ہے کیا بلا؟ اس کی تصریح تذکرہ نگار نے نہیں فرمائی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عمل کا کچھ نہ کچھ تعلق پانی کے حوض سے بھی ہے کیونکہ حضرت خضر کا پانی سے گہرا تعلق بتایا جاتا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام سے روایت

پھر جو اولیاء اللہ حضرت خضر علیہ السلام یا ان کے واسطہ سے "ولایت" میں تعلیم پاتے ہیں۔ ان سے روایت بھی بیان کرتے ہیں۔ مثلاً:

"حضرت خضر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جو کوئی اذان کے وقت اپنے ہاتھوں کے دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں کو آنکھوں پر پھیرے درد چشم سے امن پائے جب مؤذن کہے اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ"

(ریاض السالکین، ص ۲۲۰) (نیز دیکھئے کتاب ہذا ص ۲۳۴)

اگر آپ خود خضر بننا چاہتے ہیں تو اس کا نسخہ بھی حاضر خدمت ہے۔

خضر بننے کا طریقہ

"اگر مجموعہ اسمائے عظام کو اوقاتِ مذکورہ پر پچیس پچیس مرتبہ اور جمعہ کو پچھتر مرتبہ اسی وقت پڑھے اپنے وقت کا خضر ہوگا۔" (ریاض السالکین، ص ۲۴۰)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) اسی طرح حضرت الیاس کو بھی وہ زندہ جاوید تسلیم کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس طبقہ میں راہنمائی اور تعلیم کے لئے حضرت خضر علیہ السلام حضرت الیاس علیہ السلام سے بہت زیادہ مشہور و معروف ہیں۔ اس روایت میں حضرت خضر علیہ السلام کی زبانی حضرت الیاس علیہ السلام کی شخصیت اور تعلیمات سے بھی متعارف کرا دیا گیا ہے۔

ان اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کی تعلیم نقوش و عملیات سے رکھتی ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کسی مخصوص ہستی کا نام نہیں۔ بلکہ جو کوئی ان نقوش و عملیات کا ماہر ہو، وہی اپنے وقت کا خضر ہوتا ہے۔ اگر آپ اس طرح سے خضر بن جائیں تو نئے بننے والے ولیوں کی غائبانہ طور پر رہنمائی فرما سکتے ہیں اور غالباً یہ ولایت کا کوئی بلند درجہ ہے۔

۵۔ صرف صحبتِ بزرگان سے بننے والے ولی

صاحب "صوفیائے نقشبند" فرماتے ہیں کہ:

"آپ (خواجہ علی رام تینی م ۷۱۵ھ) اپنے مذہب حنفیہ کے پابند اور اپنے زمانہ کے قطب تھے جو شخص ایک روز آپ کی صحبت میں بیٹھ جاتا، حقیقت اور معرفتِ الٰہی تک پہنچ جاتا۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۴۸)

ہمارے خیال میں ولایت کے حصول کا یہ طریقہ سب سے آسان ہے۔ وقت بھی بہت کم لگتا ہے۔ ہر طرح کے جھمیلوں سے بھی چھٹی مل جاتی ہے اور کچھ تکلیف بھی نہیں ہوتی۔

خواجہ ابویوسف بن سمعان (م ۴۵۹ھ) "بعض مورخین نے لکھا ہے کہ جو شخص حضرت شیخ کی خدمت میں تین دن رہتا تھا، صاحبِ کرامت ہو جاتا تھا۔ گویا اس سلسلہ میں سلسلہ چشت سے نقشبند بازی لے گئے۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵)

۶۔ مجذوبین

صوفیاء ایسے اولیاؤں کے لئے جذب و سکر اور استغراق کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ظاہری حالت میں یہ لوگ بالکل دیوانوں طرح ہوتے ہیں۔ کیچڑ میں لیٹنا، گرمیوں میں دھوپ میں بیٹھے رہنا، برہنہ پھرنا، حواس باختہ ہونا یہ سب کچھ انہی لوگوں کی علامات ہیں۔ مجذوب کا مطلب یہ ہے کہ یا اللہ کیطرف سے اسے جذب ہو رہا ہے یا وہ خود اللہ کی ذات میں جذب ہو رہا ہے اور استغراق کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ سے لو لگاتے ہے۔ باقی دنیا جہان کی اسے کوئی خبر نہیں۔ صوفیاء کے نقطہ نظر سے ایسے حضرات بھی

مقبول ولی اور مستجاب الدعوات ہوتے ہیں۔ رہا تکالیفِ شرعیہ کا معاملہ، تو ان سے اس کا تصور بھی محال ہوتا ہے بلکہ بعض عیار صوفی تکالیفِ شرعیہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے بھی سُکر و استغراق کی مصنوعی کیفیت پیدا کر لیتے ہیں۔

ایسا ولی بننے کے بھی دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ کسی "مرشدِ کامل" کی نظرِ کیمیا اثر کے طفیل کوئی شخص مجذوب بن جائے جیسے:

عبدالرحمان قادری نوشاہی (م ۱۱۵۲ھ) المعروف رحمان پاک

ان کا وطن موضع بھڑی ضلع گوجرانوالہ ہے

ابھی صرف پانچ برس کے تھے کہ ادھر نوشہ گنج بخش کا گزر ہوا۔ نوشاہ صاحب کی ان پر ایسی نظرِ کیمیا اثر پڑی کہ بے خودی اور جذب و مستی اسی عمر میں پیدا ہو گئی اور اپنے گاؤں میں رحمان دیوانہ مشہور ہو گئے۔ والدین نے ایسا بچہ نوشاہ صاحب کو ہی دے دیا۔ جنہوں نے ان کی ظاہری و باطنی تربیت بحدِ کمال کی۔ رحمان صاحب کا مجاہدہ اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ تمام رات بہ حبسِ دم، ذکرِ خفی کرتے اور بعض اوقات معکوس لٹک کر رات بھر ذکر میں مشغول رہتے۔ خلوت اختیار کرتے تو قبر کھدوا کر اس میں بیٹھ جاتے اور چالیس چالیس روز اسی حالت میں گزار دیتے۔ ساتھ ہی ساتھ ذوقِ سماع و وجد بھی بے انداز تھا۔ حالتِ سماع و وجد میں مدہوشی کا یہ عالم تھا کہ کبھی آپ اپنے آپ کو بیلوں کے پیچھے باندھ کر زمین پر گھسٹتے جاتے۔ گرمیوں کے موسم میں سورج میں بیٹھتے۔ سردیوں میں برہنہ تن رات کو جنگل میں جا بیٹھتے اور کبھی دریا میں کھڑے ہو کر ذکرِ حق میں مشغول ہوتے تو آپ کی گرمیٔ ذکر سے دریا کا پانی گرم ہو جاتا۔ جس شخص پر نظر ڈالتے وہ صاحبِ کشف و کرامت ہو جاتا۔" (شریفۃ الاصفیاء، ص ۳۰۵)

یہ ہیں ہمارے اولیاء اللہ جو خواہ کس قدر مدہوش ہوں۔ وجد و سماع پر پھر بھی ہوش میں آجاتے اور مرمٹتے ہیں اور یہ دریا کے پانی کا ذکر سے گرم ہونے کا لطیفہ بھی خوب ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی جلد بے اثر ہو جاتی ہے۔ اسی لئے وہ پانی صرف آپ ہی کے لئے گرم ہوتا تھا۔ دوسروں کے لئے آپ کی گرمیٔ ذکر کے باوجود وہ ٹھنڈے کا ٹھنڈا ہی ہوتا تھا۔ اب اگر ایسے لوگ بھی ایک ہی نظر سے دوسروں کو صاحبِ کشف بنانے لگیں۔ تو یہ دنیا اب تک کشف و کرامات سے بھرپور ہو جاتی۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ یہ نوشاہی حضرات جس کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ اس کا ذکر ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔

دوسرا طریق یہ ہے کہ کسی ولی اللہ کا پس خوردہ کھا لیا جائے، تو اس قسم کی ولایت حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسے شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب اپنی تاریخ مشائخ چشت کے صفحہ ۱۶۲ پر خواجہ شریف زندنی (م ۶۱۲) کے متعلق فرما رہے ہیں کہ: "اہلِ تاریخ نے لکھا ہے کہ حضرت کا پس خوردہ جو شخص کھا لیتا تھا، مجذوب ہو جاتا تھا"

بتلائیے اسلام کو ایسے اولیاء اللہ کی کچھ ضرورت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی نظر کیمیا اثر نے کسی کو بھی مجذوب نہ بنایا۔ نہ ہی آپ کے پس خوردہ کھانے سے کوئی مجذوب بنا۔ پھر ان مجذوبوں کا کوئی بھی پہلو شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ہوتا ہے؟

۷ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک پہنچنے والے ولی

ایسے چند اولیاء اللہ کا ذکر ہم عشق و مستی کے بیان میں پہلے ذکر کر چکے ہیں ایسے اولیاء اللہ اپنا کام عشقِ مجازی سے شروع کرتے ہیں۔ پھر از خود عشقِ حقیقی کی منزل پر پہنچ کر ولی بن جاتے ہیں۔ پھر ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ولی تو پہلے سے ہوتے ہیں مگر عشق حقیقی کی منزل ادھوری سمجھ کر معاشقہ کے لئے کسی لونڈے کو پسند فرما لیتے ہیں۔ اس طرح یہ مسئلہ کہ پہلی منزل مجازی عشق ہے یا حقیقی؟ لاینحل ہی رہ جاتا ہے۔

۸ پاخانہ کھانے سے بننے والے ولی

"ایک باباجی میں یہ کمال تھا کہ جو بات منہ سے نکالتا وہی ہو جاتی۔ راجہ نے اُس سے پُوچھا کہ "مہاراج (یعنی میر صاحب) آپ کو یہ کمال کیونکر حاصل ہوا؟" اس نے جواب دیا کہ: "میں بارہ برس سے اپنا پاخانہ، پیشاب کھاتا پیتا ہوں اس کی بدولت میری زبان میں یہ تاثیر ہے کہ ایک فقیر کو بادشاہ یا راجہ کہدوں، تو فوراً ہو جائے۔" راجہ نے کہا: "پھر آپ کو کیا؟ بادشاہ بنا تو دوسرا، راجہ ہوا تو اور، تمہاری قسمت میں تو وہی پاخانہ پیشاب۔" (تذکرہ غوثیہ، ص ۳۴۹، بحوالہ رضاخانی مذہب ۱۳۲)

اب آپ ہی بتلائیے کہ پاخانہ پیشاب کو شریعت نے حرام قرار نہیں دیا؟ اور کیا حرام خور ولی بن سکتا ہے۔ لیکن ولایت کی دُنیا بڑی وسیع ہے۔ اس میں حرام خوری بھی بلندیٔ درجات کا سبب بن سکتی ہے۔

۹۔ اولیاء اللہ کی انوکھی قسم ــــ خدا کی بیوی

جناب احمد رضا خان بریلوی فرماتے ہیں:

"حضرت موسیٰ سہاگ مشہور بزرگ گزرے ہیں میں اُن کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں۔ زنانہ وضع رکھتے تھے۔ ایک بار شدید قحط پڑا۔ قاضی اکابر جمع ہو کر حضرت کے پاس دُعا کے لیے گئے۔ آپ انکار فرماتے رہے کہ میں کیا دُعا کے قابل ہوں۔ جب لوگوں کی التجاء وزاری حد سے گزری تو ایک پتھر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ کی چوڑیوں کی طرف لائے اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر فرمایا: "مینہ بھیجئے یا اپنا سہاگ واپس لیجئے۔" سہاگن بیوی کا یہ کہنا تھا کہ گھٹائیں پہاڑ کی طرح اُمڈیں اور جل تھل ہو گیا۔" (ملفوظات احمد رضا خان، ص ۹۴، ج ۲ بحوالہ رضا خانی مذہب، ص ۲۰)

پھر اس میاں بیوی کے تعلق کی مزید تشریح جناب احمد رضا خان یوں فرماتے ہیں کہ:

"حضرت موسیٰ سہاگ ایک دن نماز جمعہ کے وقت بازار میں جا رہے تھے۔ اِدھر سے قاضی شہر جامع مسجد کو جاتے تھے۔ انہیں دیکھ کر کہا یہ وضع مردوں کو حرام ہے۔ مردانہ لباس پہنیئے اور نماز کو چلیئے اس پر انکار و مقابلہ نہ کیا۔ چوڑیاں، زیور اور زنانہ لباس اتارا اور مسجد کو ساتھ ہو لئے۔ خطبہ سنا۔ جب جماعت قائم ہوئی اور امام نے تکبیر تحریمہ کہی اللہ اکبر سنتے ہی اُن کی حالت بدلی۔ فرمایا "اللہ اکبر! میرا خاوند حیٌّ لایموت ہے کہ کبھی نہ مرے گا اور یہ مجھے بیوہ کئے دیتے ہیں۔ اتنا کہنا تھا کہ سر سے پاؤں تک وہی سُرخ لباس تھا اور وہی چوڑیاں۔" (حوالہ ایضاً)

اس اقتباس کے آخری جملہ کو جناب احمد رضا خان نے نامکمل ہی چھوڑ دیا کہ آیا "وہی سرخ لباس اور وہی چوڑیاں" وہ تھیں جو موسیٰ سہاگ نے پہلے اتار کر اپنے پاس رکھ لی تھیں، وہی پہن لیں یا وہ الگ ہی رکھی رہیں۔ اور پردۂ غیب سے ایسا ہی سُرخ لباس اور چوڑیاں نمودار ہو کر موسے سہاگ کے زیب تن ہو گئی تھیں۔

یہ اللہ کی بیوی سُرخ لباس پہنتی اور زیور اور چوڑیاں پہنتی تھی اور نماز کے نزدیک تک نہ جاتی تھی۔ کیونکہ نماز ادا کرنے سے اس کا سہاگ چھن جاتا اور وہ بیوہ ہو جاتی تھی اور زبان سے علی الاعلان کہتی تھی کہ اللہ حیٌّ لا یموت میرا خاوند ہے جبکہ خاوند میاں یا اللہ تعالیٰ کو موسیٰ سہاگ کو بیوی بنانے سے شدید انکار ہے۔ وہ تو فرماتا ہے "وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ" (۶/۱۰۲) اس کی کوئی بیوی نہیں۔ اور ایسا خیال کرنا بھی صریح کفر اور شرک ہے۔ شاید اس دنیائے طریقت میں یہ سب کچھ جائز ہے۔ سبحانہ و تعالیٰ عما یصفون۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان مختلف طریقوں سے بننے والے اولیاء اللہ کی تکمیلِ ولایت کا معیار کیا ہے؟ تو اس سلسلہ میں اکابر صوفیاء میں بہت اختلاف واقع ہوا اور وہ کسی ایک معیار پر متفق نہیں ہو سکے لہٰذا اب ذیل میں مختلف اکابرین کا معیار پیش کرتے ہیں:

۴۔ تکمیلِ ولایت کا معیار

۱۔ امام باقر (م ۱۱۴ھ) کا معیار

"ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا: "مجھے بتلایئے مومن کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے؟" فرمایا: "مومن کا حق یہ ہے کہ اگر وہ اس کھجور کے درخت کو کہے کہ اِدھر آؤ، تو وہ درخت توقف نہ کرے۔" یہ بات سنتے ہی کھجور کا وہ درخت چل کر آپ کے پاس آ گیا، تو آپ نے کہا: "درخت! میں نے تو یہ بات بر سبیل تذکرہ کہی تھی. تم اپنی جگہ پر چلے جاؤ۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۴۰)

یہ روایت بھی بلا سند لہٰذا غلط ہے اور اس کے غلط ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے پوچھا، معاذ! کیا تو جانتا ہے کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے؟" حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: "اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ اُسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر حق یہ ہے کہ وہ ان کو عذاب نہ کرے اِلّا یہ کہ کسی نے اس کے ساتھ شرک کیا ہو۔" (متفق علیہ، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الایمان، الفصل الاول)

بات دراصل یہ ہے کہ ایسی روایات جن سے کرامات کا ثبوت مہیا ہو۔ بعد میں آنے والے صوفیوں نے گھڑ کر پہلے بزرگوں سے منسوب کر دیں جیسا کہ ابُونعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ) نے حلیۃ الاولیاء کی تصنیف کے دوران کیا۔ البتہ اتنی احتیاط ضرور کی گئی ہے کہ تکمیلِ ولایت کے بجائے "اللہ پر حق" کے الفاظ سے سوال کیا ہے۔ ورنہ بات ایک ہی ہے۔

اور وہ درخت بھی کچھ زیادہ ہی فرمانبردار تھا جو بر سبیلِ تذکرہ بات کرنے پر بھی دوڑا آیا اور امید ہے کہ وہ واپسی کے آرڈر پر واپس تو ضرور چلا ہی گیا ہوگا۔

۲۔ ابراہیم بن ادھم (م ۱۶۲ھ) کا معیار

آپ ایک مرتبہ جبلِ ابوقبیس پر تشریف فرما تھے۔ تذکرۃً فرمایا کہ بعض اللہ کے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ پہاڑ کو اگر کہیں چل تو وہ چلنے لگتا ہے۔ یہ فرماتے ہی پہاڑ کو جنبش ہونے لگی۔ آپ نے فرمایا، "ٹھہر جا میں تو قصہ بیان کر رہا تھا۔" وہ ٹھہر گیا۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۲۹)

یہ معیار بھی بہت حد تک امام باقر کے معیار سے ملتا جلتا ہے اور روایت بھی۔"

۳۔ شیخ علی خواص کا معیار

"عبدالوہاب شعرانی (م ۹۷۳ھ) فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے شیخ علی خواص کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ" ہمارے نزدیک مردِ کامل اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے مرید کی حرکاتِ غیبی کو روزِ میثاق سے لے کر اس کے جنت یا دوزخ میں داخل ہونے تک نہ جان لے۔" (کبریتِ احمر بحاشیہ الیواقیت والجواہر، بحوالہ سیرۃ غوث، ص ۱۶۵)

۴۔ شیخ شبلی (م ۳۳۴ھ) کا معیار

"شیخ شبلی فرماتے ہیں کہ" اگر ایک سیاہ چیونٹی، اندھیری رات میں سخت پتھر پر چل رہی ہو اور میں اس کی آواز نہیں سنتا، تو میں خیال کرتا ہوں کہ میں فریب میں آگیا۔"

" اور ایک اور بزرگ نے فرمایا ہے کہ" نہ میں یہ بات کہتا ہوں جو شبلی نے کہی اور نہ اس کو سمجھتا ہوں اس لئے کہ وہ (چیونٹی) حرکت کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہے مگر میری قدرت کے ساتھ۔ اور میں اس کا محرک ہوں۔ پھر میں کس طرح کہوں کہ میں اس کو نہیں جانتا۔" (انسانِ کامل، ص ۲۰۴)

اب دیکھئے کہ یہ "ایک اور بزرگ" تو شیخ شبلی کے بھی استاد نکلے۔ شیخ شبلی نے تو صرف علمِ غیبِ کُلی کا دعویٰ فرمایا تھا۔ اس بزرگ نے ساتھ ہی ساتھ اسی قدر تصرف کا دعویٰ بھی فرما دیا۔ شبلی کے نزدیک تکمیلِ ولایت کا معیار وہ تھا۔ اس "ایک اور بزرگ" کے نزدیک یہ ہے۔

۵۔ معین الدین اجمیری (م ۶۳۲ھ) کا معیار

"کسی نے آپ سے پوچھا: "مرید ثابت قدم کب ہوتا ہے؟" آپ نے فرمایا کہ "جب فرشتہ بیس سال تک کوئی برائی اس کے نامۂ اعمال میں نہ لکھے۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۷۰)

غور کیجئے! ثابت قدمی کا کتنا کڑا معیار آپ نے مقرر فرما دیا۔ جس پر پورا اترنا ناممکنات سے ہے جضور اکرم ﷺ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ   تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے۔ (۴۸/۲)

لیکن اجمیری صاحب کے ثابت قدم مریدوں کی شان یہ ہے پیر اجمیری صاحب کی اپنی شان تو بہرحال اس سے بھی بلند ہی ہونی چاہیئے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م ۶۳۴ھ) کا معیار

"آپ سے پوچھا گیا کہ حضرت کیونکر معلوم ہو کہ اب سلوک کا مرتبہ تمام ہو گیا اور یہ شیخ کمال کو پہنچ گیا، فرمایا: "اگر وہ کسی مُردہ پر دَم کر دے اور وہ مُردہ خدا کے حکم سے زندہ ہو جائے تو اس وقت سمجھ لو کہ وہ کمالیت کو پہنچ گیا۔" اتنے میں ایک ہندو عورت روتی ہوئی آئی اور قدموں میں سر رکھ دیا اور کہا کہ "میرا ایک ہی بچہ تھا جسے بادشاہ نے بیگناہ دار پر کھینچوا دیا۔" آپ اپنے اصحاب کے ساتھ عصا ہاتھ میں لئے وہاں پہنچے اور فرمایا: "الٰہی! اگر اسے بادشاہ نے بے گناہ دار پر کھینچا ہے تو اسے زندہ کر دے۔" آپ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ لڑکا زندہ ہو کر ساتھ چلنے لگا۔ یہ کرامت دیکھ کر کئی ہزار ہندو مسلمان ہو گئے پھر آپ نے اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا کہ "مرد کی کمالیت اس سے زیادہ نہیں ہے۔"

(ملفوظات خواجہ فریدالدین، ص ۱۱۰، ۱۱۱، مرتبہ بدر اسحٰق۔ ترجمہ غلام احمد بریاں)

تکمیلِ ولایت کا انوکھا معیار

"عارف کی پہچان ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ عورتوں کے اندام مخصوصہ کو ہر وقت نظر رکھتا ہو"۔ . . . یعقوب فرماتے ہیں کہ وہ مردِ کامل پر اس حمل کی حالت پر مطلع ہوتا ہے جو ابھی تک ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے (یعنی) کسی عورت کو حمل قرار نہیں پاتا، مگر وہ اسے جانتا ہے۔" (نجم الرحمان، ص ۱۰۴، ۱۰۶)

"لا تستقر نطفة فی فرج انثیٰ الا ینظر ذٰلک الرجل (الکامل) الیها (نجم الرحمان ص ۱۰۱، بحوالہ   کسی مادہ کی شرمگاہ میں کوئی نطفہ قرار نہیں پاتا مگر وہ کامل مرد اس کو دیکھتا ہے۔

رضاخانی مذہب، ص ۱۴۰)

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے سات مشہور و معروف اولیاء اللہ کا تکمیلِ ولایت سے متعلق قائم کردہ معیار بیان کر دیا ہے۔ اور یہ سب معیار کسی "بہت بڑی کرامت" سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب اگر کچھ بزرگ زبان سے یہ کہتے بھی جائیں کہ کرامت و ولایت لازم و ملزوم نہیں تو ان بیانات کے سامنے ان کے اس زبانی دعوے

کی کچھ حقیقت رہ جاتی ہے؟

۵۔ اولیاء اللہ اور کیمیا گری

اولیاء اللہ کے تذکرے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کیمیا گری کا فن بھی آتا تھا۔ ان میں سے بعض حضرات تو اسے بطورِ علم وفن جانتے تھے اور بعض بطورِ کرامت وقت آنے پر سونا بنا دیا کرتے تھے۔ چند اولیاء اللہ کے واقعات حاضرِ خدمت ہیں:

۱۔ شیخ نظام الدین عمری (م ۱۰۳۴ھ)

"آپ کو علوم اسرار و رموز کے علاوہ کیمیا وغیرہ کے علوم بھی حاصل تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ علوم ظاہری آپ نے پڑھا ہی نہیں تھا۔ بلا تحصیل ہی کمال حاصل تھا۔ آپ جس شخص پر نظر فرماتے ایک ہی دہلہ میں صاحبِ شہود ہو جاتا تھا اسی وجہ سے بہت لوگوں نے "ولی تراش" نام رکھ دیا تھا۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا۔ ص ۲۱۵)

۲۔ میاں تنھا قادری (م ۱۰۲۷ھ)

شہزادہ محمد دارا شکوہ اپنی کتاب سکینۃ الاولیاء میں رقمطراز ہیں کہ نباتات اور جمادات تک میاں تنھا قادری (م ۱۰۲۷ھ۔ یہ میاں میر لاہوری کے خاص الخاص مرید تھے) سے ہم سخن ہوتے تھے۔ ایک روز میاں تنھا جنگل میں جا رہے تھے کہ ایک درخت سے آواز آئی کہ "اگر قلعی کو چرخ دے کر اس پر میرے پتے ڈالے جائیں تو وہ چاندی ہو جائے گی۔ میاں تنھا نے یہ سن کر کوئی جواب نہ دیا۔ آگے بڑھے تو دوسرے درخت سے آواز آئی۔ "اگر تانبا کو چرخ دے کر میری تھوڑی سی لکڑی اس میں ڈالی جائے، تو وہ زرِ خالص بن جائے گا۔" میاں تنھا اس پر بھی متوجہ نہ ہوئے اور آگے بڑھ گئے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۳۱)

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو پہلے ہی یہ معلومات حاصل تھیں کہ اس پر متوجہ بھی نہ ہوئے یا پھر یہ کرامت آپ کی رفعتِ شان کے لحاظ سے حقیر اور کمتر تھی۔

۳۔ عبد اللہ بلوچ (م ۱۰۴۶ھ)

" "شیخ عبد اللہ بلوچ قادری (م ۱۲۱۲) کی خدمت میں ایک ہندو آیا۔ عرض کیا "میں علمِ کیمیا کا شائق ہوں۔ بڑی محنت اور روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ معلوم نہیں کہ آیا یہ بھی کوئی علم ہے یا نہیں۔ اگر آپ

اس معاملے میں میری رہنمائی فرمائیں، تو ممنون ہوں گا۔" آپ نے فرمایا: "بہتر، جاؤ کچھ تانبے کے پیسے، سم الفار اور گندھک لے آؤ۔" وہ ہندو اسی وقت بازار جا کر یہ چیزیں لے آیا۔ آپ نے فرمایا کہ: "جس مٹی کے پیالے میں ہم کھانا کھاتے ہیں وہ اٹھا لاؤ اور تانبے کے پیسے اس میں ڈال کر سم الفار اور گندھک بھی اس میں شامل کر دو۔ اوپر کوئلے بھر کر آگ دے دو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ کچھ دیر کے بعد فرمایا: "چمٹے سے اسے پکڑ کر ایک پیسہ باہر نکالو۔" میں نے ایک پیسہ نکال کر زمین پہ رکھ دیا۔ اس ہندو سے فرمایا "اسے کوٹو جب سیاہ پردہ دُور ہو گیا تو زرِ خالص نکل آیا۔ وہ ہندو اسی وقت حلقہ بگوش اسلام ہو کر آپ کا مُرید ہو گیا"

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۳۱۹)

ایسے تجربے تو سب مہوسی تمام عُمر کرتے ہی رہتے ہیں اور وہ ہندو بھی کرتا رہا ہو گا لیکن سونا نہ بن سکا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ کے کھانے کے مٹی کے پیالہ کی کرامت تھی۔ شاید مُرید ہونے کے بعد اس کے اپنے کھانا کھانے کے مٹی کے پیالہ میں بھی یہ کرامت پیدا ہو گئی ہو۔

۴۔ شاہ بلاول (م ۱۰۴۶ھ)

"صاحب محبوب الواصلین لکھتے ہیں کہ محلہ شیخ ابواسحٰق میں آپ (شاہ بلاول قادری لاہوری م ۱۰۴۶ھ) کے ایک ہمسایہ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا اور رسم کے مطابق نقال زرِ مبارک باد لینے آ گئے۔ وہ بڑا تنگ دست اور مفلس تھا۔ آپ اس کے حال سے واقف تھے۔ آپ ایک مٹی کا لوٹا لے کر حجرے سے باہر آتے اور اسے دیوار ہمسایہ پر مار کر توڑ ڈالا۔ تمام ٹکڑے زرِ خالص بن گئے۔ جنہیں نقال اٹھا کر لے گئے اور ہمسایہ کو ان سے خلاصی ہوئی"

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۴۵)

ہمارے خیال میں اگر آپ یہ لوٹا دیوار کی اندرونی جانب توڑتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اس بیچارے مفلس کا افلاس بھی ختم ہو جاتا اور وہ بھانڈوں کو بقدرِ ضرورت زرِ مبارک باد دے کر خود بطریقِ احسن رخصت کر سکتا۔

۵۔ میاں جی نور محمد (م ۱۲۵۹ھ)

ایک سادھو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رخصت ہوتے وقت کہنے لگا: "میری زنبیل میں تھوڑی سی اکسیر ہے یہ لے لے۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے پاس روپے پیسے کی کمی ہے۔" آپ نے انکار کر دیا۔ جب اس نے دو تین بار اصرار کیا، تو آپ نے ایک ڈھیلا اٹھا کر سامنے کی دیوار پر مارا اور اسے کہا کہ سامنے دیکھ۔

اس نے دیکھا تو ساری دیوار سونے کی ہو گئی تھی۔ یہ دیکھ کر کہنے لگا " تب تو میاں جی تجھے اِس کی ضرورت نہیں۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۲۳۰)

معلوم ہوتا ہے کہ سادھو کے جانے کے بعد وہ دیوار پھر اپنی اصلی حالت پر آگئی تھی اور اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی، جیسے قرآن میں آیا ہے:

وَسَحَرُوْا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ۔ — اور ان (فرعونی ساحروں نے) لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور وہ ڈر بھی گئے تھے۔

اگر وہ دیوار علیٰ حالہٖ قائم رہتی تو کیا اچھا تھا، سینکڑوں من سونا پورے ملک سے افلاس کو دُور کرنے میں بہت ممد ثابت ہوتا اور تاریخوں میں اس کا ذکر ہوتا۔

۷۔ توکل شاہ انبالوی (م ۱۳۱۵ھ) اور سونے چاندی کی نہریں

"مولوی محبوب روایت کرتے ہیں کہ میرے سامنے ایک فقیر آپ کی خدمت میں آیا اور کہا: مجھے سونا بنانا سکھلا دیجئے۔ آپ یہ سن کر جوش میں آگئے اور اسے اپنے حجرہ میں لے گئے اور بڑی دیر کے بعد حتیٰ کہ نماز ظہر کا وقت بھی آخر ہو گیا، باہر تشریف لائے۔ میں نے اس فقیر کو مسجد میں لے جا کر دریافت کیا کہ "تجھ پر کیا گزری؟" اس کی آنکھیں سُرخ تھیں اور محویت کا عالم طاری تھا۔ اس نے بتایا کہ "مجھ کو حجرہ میں لے جا کر جانماز کے نیچے میرا سر دے دیا۔ میں نے دیکھا کہ سونے، چاندی اور جواہرات کی نہریں جاری ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے کہا کیا حال ہے؟ پھر فرمایا: "آگے چل کر دیکھو کہ نہریں کہاں سے آرہی ہیں"۔ اور مجھے ایک دھکا اور دے دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک جگہ پر ایک نوری تختہ پر لفظ "اللہ" لکھا ہوا ہے اور اس کے ہر ایک حرف سے ایک نہر جاری ہے۔ فرمایا: "دیکھ لے اس سے کیمیا آتی ہے۔" اور پھر میرے قلب پر لفظ اللہ لکھ کر مجھ کو توجہ دی۔ اب میرے جسم کے جوڑ جوڑ سے اللہ اللہ جاری ہے۔" وہ ایسی حالت میں جنگل کو چلا گیا۔ کیمیا کی خواہش اُس کے دِل سے محو ہو گئی اور خدا کے نام میں محو ہو گیا۔"

(صوفیائے نقشبند، ص ۲۵۶)

۱۔ اب دیکھئے جنت میں ستھرے پانی، دودھ، شہد اور شرابِ خالص کی نہروں کا ذکر قرآن و حدیث میں بھی آیا ہے لیکن یہ سب سیال چیزیں ہیں۔ ان کی تو نہریں بہہ سکتی ہیں لیکن سونا، چاندی اور جواہرات ٹھوس چیزیں ہیں۔ اگر شاہ صاحب ان چیزوں کی کانیں دکھلا دیتے تو روایت ذرا معتبر ہو جاتی۔

۲۔ دھاتیں بھی شدت کی گرمی سے پگھل کر بہنے لگتی ہیں۔ لیکن اس حالت میں ان سب کا رنگ ایک ہی جیسا آگ کی مانند سُرخ ہو جاتا ہے اور یہ تمیز نہیں رہتی کہ یہ سونے کی نہر ہے اور یہ چاندی کی اور یہ جواہرات کی۔

۳ "اللہ" کے حرف چار ہیں، لیکن نہریں آپ نے صرف تین جاری کیں۔ ایک اور بھی کر دیتے تو کیا مضائقہ تھا۔

بہرحال نتیجتہً یہ حکایت اچھی ہے۔ اچھا ہوا کہ وہ فقیر بے چارہ ساری عمر کیمیا گری میں برباد کرنے کی بجائے خدا کے نام میں محو ہو گیا اور جنگلوں کی راہ لی۔

۷ محمد بن اسلم طوسی اور سونے کا تراشہ

"نقل ہے کہ آپ ان درویشوں کی خدمت، جو آپ کے پاس آتے تھے، قرض لے کر کرتے۔ ایک بار ایک یہودی جس کے آپ مقروض تھے، آیا اور اپنی رقم طلب کی۔ آپ نے فرمایا: "اس وقت اس تراشہ قلم کے سوا کچھ نہیں، اسے اُٹھا لے۔" اس نے جو ہاتھ لگایا، تو وہ خالص سونا تھا۔ اس نے اسی وقت کلمہ پڑھا اور کہا: یقیناً وہ دین برحق ہے جس میں اس شان کے بزرگ موجود ہیں، جن کے قلم کا تراشہ سونا ہو جاتے۔" (مقربانِ حق، ص ۱۸۴)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی درویشوں کی خدمت کے لئے اکثر یہودیوں سے قرض لیتے تھے۔ پھر ایک دن ایک یہودی نے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آکر شدید تقاضا کیا اور سخت سُست باتیں بھی کہیں، مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معذرت چاہی اور ادائیگی کا وعدہ کیا۔ آپ سے بھی "کرامت" صادر نہ ہو سکی۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ "بزرگ" ایسے باکرامت تھے تو انہیں یہودیوں سے قرض لینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ پہلے ہی تراشے کا سونا بنا لیتے۔ پھر ان صوفیاء کا ایک مخصوص مسئلہ اکلِ حلال میں کمال احتیاط کا بھی ہے تو کیا یہ بزرگ یہودیوں سے جو پیسہ لے کر درویشوں کو کھلاتے تھے، وہ اُن کے معیارِ حلت پر پُورا اُتر آتا تھا۔

۸ طلائی دیناروں کی بارش

منقول ہے کہ درویشوں کی ایک جماعت خواجہ عبدالواحد بن زید کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور بھوک کی وجہ سے بے قرار تھی، سب نے اتفاق کر کے آپ سے حلوا کی درخواست کی۔ پہلے تو آپ نے اس طرف توجہ نہ کی، لیکن جب اُن کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو آپ نے آسمان کی جانب منہ کر کے درخواست کی۔ فوراً طلائی دینار برسنے لگے۔ آپ نے درویشوں سے کہا کہ ان دیناروں میں سے صرف اتنا ہی لے لو جس سے حلوا بقدر کفاف تیار ہو سکے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، لیکن خواجہ نے اس حلوا میں سے کچھ نہیں کھایا۔ (سیر الاولیاء، ص ۳۸)

خواجہ صاحب نے آسمان سے گرے ہوئے طلائی دیناروں پر ضرورت سے زیادہ اٹھانے پر پابندی لگا دی۔ باقی دینار تو ضائع ہی ہو گئے ہوں گے۔ کیا اس سے بہتر یہ نہ تھا کہ طلائی دیناروں کے بجائے بقدرِ ضرورت حلوے کی ہی بارش ہو جاتی۔ جب کوئی خرقِ عادت واقعہ ہونا ہی ہے، تو حلوا اُترنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ پھر لُطف کی بات یہ ہے کہ آپ نے حلال و طیّب حلوا میں سے خود کچھ بھی نہیں کھایا۔

اور ابراہیم بن ادھم کا وہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی لوہے کی سوئی دریا میں گرائی تو ہزارہا مچھلیاں سونے کی ایسی سوئیاں لے کر آپ کے پاس حاضر ہو گئیں، لیکن خواجہ محمد چشتی (م ۴۱۱ھ) غالباً ابراہیم بن ادھم سے زیادہ باکرامت بزرگ تھے۔ کیونکہ ان کے لئے دجلہ کی مچھلیاں سونے کی سوئیوں کے بجائے طلائی دینار منہ میں لئے اُبل پڑی تھیں۔ (سیر الاولیاء، ص ۴۴)

۶۔ صوفیاء کا اشاعتِ اسلام کا طریقہ

انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہی رہا ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں اور اس کی تبلیغ و اشاعت کریں اور ہوتا یہ رہا ہے کہ جب کسی نبی نے اپنی قوم کو دعوت دی تو قوم نے انبیاء کو جھٹلا دیا۔ بعض قوموں نے انبیاء سے معجزات کا مطالبہ کیا، لیکن معجزات دیکھنے کے بعد انہوں نے معجزہ کو "جادو" قرار دے کر انبیاء کی دعوت کو مسترد کر دیا اور انبیاء کو جھٹلایا۔ ارشادِ باری ہے:

وَ اِنْ یَّرَوْا اٰیَةً یُّعْرِضُوْا وَ یَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۔ (۵۴/۲)

اور کافر جب بھی کوئی نشانی دیکھتے ہیں، تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے چلا آتا۔

انبیاء پر صرف وہ لوگ ایمان لاتے رہے جو اُن کی پاکیزہ زندگی اور اخلاق و کردار سے متاثر ہوئے۔ معجزات کے طالب کم ہی ایمان لائے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے سانپ بن کر ساحروں کی رسیوں کو کھا جانے پر صرف جادوگر ہی ایمان لائے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جادوگر بحیثیت فن دان یہ سمجھ گئے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ جادو کے فن سے کوئی ماوراء چیز ہے۔ قومِ فرعون سے ایک آدمی بھی یہ معجزہ دیکھ کر ایمان نہ لایا۔

لیکن ہمارے اولیاء اللہ کی دنیا ہی الگ ہے۔ ان کا طریق کار یہ ہے کہ یہ اسلام کی تعلیمات پیش نہیں

فرماتے۔ بلکہ طلب کیے بغیر کوئی نہ کوئی کرامت پیش کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کافر دھڑا دھڑ اسلام لانا شروع کر دیتے ہیں۔ اب ان کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور صلوٰۃِ خمسہ

"راحت القلوب میں لکھا ہے کہ ایک دن مدینہ کے بازار میں چند یہودی بیٹھے تھے۔ ایک مسلمان سائل اُن کے پاس آیا اور کہا: "میں بھوکا ہوں، کھانے کو کچھ دیجئے۔" انہوں نے ازراہِ تمسخر کہا: "علی شاہِ مرداں کے پاس جاؤ، جو چاہو گے پاؤ گے۔" ابھی سائل نے کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ دُور سے حضرت علی رضی اللہ عنہ آتے دکھائی دیئے۔ وہ سائل اُن کے پاس گیا، اپنی داستانِ غم بھی بیان کی اور یہودیوں کے طعنہ کا بھی ذکر کیا۔ اتفاق سے اُس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ نہ تھا۔ آپ نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور پانچ بار صلوٰۃ خمسہ پڑھی اور سائل کے ہاتھ پر دم کر دیا اور پنجہ بند کر دیا اور کہا: "جاؤ یہودیوں کو دکھلاؤ۔" وہ اسی طرح پنجہ بند کئے یہودیوں کے پاس گیا۔ جب کھولا تو اس میں سونے کے پانچ دینار تھے۔ حیران ہو کر دوڑے دوڑے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہو گئے اور مسلمان ہو کر ہدایت یافتہ ہو گئے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۶۷)

اب دیکھئے راحت القلوب کی اس روایت میں درج ذیل امور قابلِ غور ہیں:

۱۔ دورِ نبوی ــــــ میں ہی یہودیوں کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔

۲۔ دورِ عثمانی ــــــ میں مسلمانوں کے پاس اتنی دولت آگئی تھی کہ کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ ملتا تھا کسی مسلمان کے مفلوک الحال ہونے کی وجہ سے سائل ہونا ہی خارج از بحث تھا۔

۳۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پانچ بار صلوٰۃِ خمسہ پڑھی تو پانچ دینار نکلے اگر دس بار پڑھتے تو یقیناً دس دینار نکلتے۔

۴۔ یہ صلوٰۃِ خمسہ کیا بلا ہے؟ کب ایجاد ہوئی؟ اس کی صاحب راحت القلوب نے تصریح نہیں فرمائی بہرحال اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی دم جھاڑ اور جنتر منتر قسم کی کوئی چیز ہو گی، جو اس دورِ صحابہ سے بہت بعد کی پیداوار ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام جڑ دی گئی ہے۔

یہ بات بہرحال شک و شبہ سے بالا ہے کہ وہ سارے یہودی یہ کرامت دیکھ کر مسلمان ہو گئے تھے۔

اب اسی قسم کی چند کرامات جنہیں دیکھنے پر لوگ اسلام لاتے رہے۔ بلا تبصرہ حاضرِ خدمت ہیں:

۲۔خواجہ حذیفہ المرعشی (م ۲۰۲ھ) اور ندائے غیب

"آپ سے کسی نے پوچھا: آپ اتنا کیوں روتے ہیں؟" فرمایا مجھے فَفَرِیْقٌ فِی الْجَنَّۃِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ رلاتا ہے۔ نہ معلوم میں کون سے فریق سے ہوں۔" اس نے کہا: "اگر ایسی بات ہے تو آپ بیعت کیوں لیتے ہیں؟" آپ نے یہ سن کر ایک آہ کھینچی اور بیہوش ہوگئے۔ جب ہوش میں آئے تو غیب سے بشارتِ جنت کی ندا آئی، جو سب نے سنی۔ کہتے ہیں کہ اس آواز پر تین سو کافران کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئے۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۴۶)

۳۔خواجہ ابو احمد ابدال چشتی (م ۳۵۰)

"ایک مرتبہ دورانِ سفر آپ کا گزر ایک کافروں کی بستی پر ہوا۔ جہاں قرب و جوار میں بھی کوئی مسلمان نہ تھا۔ ان کافروں کی عادت تھی کہ جب کوئی مسلمان ادھر کو آجاتا تو اس کو نہایت مار پیٹ کر آگ میں جلا دیا کرتے۔ اسی طرح حضرت شیخ کے ساتھ بھی معاملہ کیا مگر رعب کی وجہ سے آگ میں ڈالنے کی جرأت نہ ہوئی۔ شیخ نے کہا کہ تم فکر نہ کرو۔ میں خود ہی آگ میں کود جاؤں گا۔ یہ کہہ کر حضرت شیخ اپنا مصلیٰ آگ پر ڈال کر خود چلے گئے۔ حضرت کا وہاں پہنچنا تھا کہ آگ دفعتہً ٹھنڈی ہوگئی۔ یہ قصہ دیکھ کر سب متحیر ہوگئے۔ دل و جان سے قربان ہوگئے اور سینکڑوں نے فوراً اسلام قبول کرلیا۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۴)

اب دیکھیے کہ:

۱۔ حضرت شیخ کا رعب بھی بڑا نرالا تھا کہ مار پٹائی کے وقت تو کچھ اثر نہ دکھایا مگر جلانے کے وقت سب کافر مرعوب ہوگئے۔

۲۔ پھر جب رعب کی وجہ سے کافروں کو آگ میں ڈالنے کی جرأت ہی نہ ہوسکی، تو پھر از خود آگ میں پڑنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔؟

۳۔ تاہم آپ نے آگ پر مصلے ڈالا اور خود مصلے پر ہی بیٹھ گئے ہوں گے ورنہ مصلیٰ کا کچھ مصرف نظر نہیں آتا، تو مصلے کی برکت کی وجہ سے نیچے سے آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ اور آپ مصلے سمیت زمین پر آگئے ہوں گے۔ یہ ایسی ترکیب ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذہن میں بھی نہ آئی تھی۔

۴۔ جو کچھ بھی ہوا بہرحال سینکڑوں کافر ضرور مسلمان ہوگئے تھے اور یہ ایسی سعادت ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی نصیب نہ ہوئی۔

۴۔خواجہ محمد بن احمد (م ۴۱۱ھ)

"مادر زاد ولی تھے۔ حمل کے زمانہ میں والدہ کے پیٹ سے ذکر اللہ کی آواز آتی تھی۔ پیدا ہوتے ہی سات مرتبہ کلمہ پڑھا۔ ایام رضاعت میں مشغول بذکر رہتے تھے اور پانچوں وقت (یعنی نمازوں کے وقت) آنکھیں آسمان کی طرف اٹھاکر ان گنت کلمہ پڑھتے۔ جو شخص آزمانے آتا وہ ہی مسلمان ہو جاتا۔" (ایضاً، ص ۱۵۵)

گویا جو لوگ آزمانے گئے تھے وہ سب کافر ہی ہوتے تھے اور یہ بات ہے بھی دل لگتی۔ بھلا جو لوگ پہلے ہی مسلمان ہوں اُن کو ایسی شنید پر کیسے شک ہو سکتا تھا؟

۵۔احمد خضرویہ کی کرامت

"احمد خضرویہ کے ہاں ایک درویش مہمان ہوئے۔ اس درویش کے ساتھ ستر اور بھی درویش تھے۔ آپ نے بطورِ مہمان نوازی ستر شمعیں روشن کیں اور وہ شمعیں ایسی تھیں کہ پھونک تو درکنار، اوپر خاک ڈالنے سے بھی نہ بجھتی تھیں آپ کی اس کرامت کا یہ اثر ہوا کہ دوسرے دن جب آپ اس مہمان درویش کے ساتھ ایک راہب کے پاس سے گزرے، تو وہ اپنے گھر کے ستر آدمیوں سمیت مسلمان ہو گیا۔ آپ نے اپنے ساتھی درویش سے فرمایا "میں نے خدا کے لئے ستر شمعیں روشن کی تھیں۔ خدا نے میرے ہاتھ ستر گمراہوں کے دلوں کو نورِ ایمان سے روشن کر دیا۔" (مقربانِ حق، ص ۱۸۰)

راہب تو تارک الدنیا ہوتے ہیں۔ وہ راہب بھی خوب تھا، جو اپنے گھر کے ستر آدمیوں کے ساتھ ہی رہتا تھا۔

۶۔سید مودود چشتی (م ۵۲۷ھ) کا جنازہ اُڑنا

"آپ کی وفات، ۹۰ سال کی عمر میں رجب ۵۲۷ھ میں ہوئی۔ آپ کی نمازِ جنازہ اوّل رجال الغیب نے پڑھی۔ پھر عام آدمیوں نے اور نماز کے بعد جنازہ خود بخود اڑنے لگا۔ خواجہ صاحب کی اس کرامت سے بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کیا۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۶۰)

اور سیر الاولیاء صفحہ ۴۹ پر یوں لکھا ہے کہ: "خواجہ کی یہ کرامت دیکھ کر اس دن ہزاروں کافر مسلمان ہو گئے۔"

۷۔خواجہ عثمان ہارونی (م ۶۰۳ھ) کا آگ میں داخل ہونا

"ایک دفعہ آپ کا آتش پرستوں پر گزر ہوا۔ انہیں نصیحت فرمائی کہ آگ ہرگز

پرستش کے قابل نہیں۔ یہ تو خود مخلوق ہے۔ اگر اس کی پرستش کرو گے تو بھی تم کو جلانے میں کمی نہیں کرے گی۔ پھر قیامت کے دن بھی جلائے گی اور اگر اللہ کی پرستش کرو گے تو آگ نہیں قیامت کے دن نہیں جلائے گی انہوں نے کہا: "اچھا تم جو اللہ کو پوجتے ہو۔ اس میں داخل ہو کر دکھلاؤ کہ وہ اثر کرتی ہے یا نہیں۔ آپ نے وضو کر کے دوگانہ ادا کیا۔ پھر سردار کے ایک کمسن بچے کو گود میں لے کر اس آگ میں چلے گئے اور دو گھنٹہ اس میں رہے۔ آگ نے اس بچہ پر کوئی اثر نہ کیا۔ اس پر وہ سب آتش پرست مع سردار کے مسلمان ہو گئے۔"

(تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۲۴)

۸۔ معین الدین چشتی (۵۳۷ - ۶۲۷) اور شیعی امیر

"ایک دفعہ دوران سفر آپ ہرات تشریف لے گئے۔ وہاں کا شیعی امیر سخت متعصب تھا۔ اور جو شخص حضرات ثلثہ کے نام پر نام رکھتا۔ اسے قتل کرا دیتا تھا۔ آپ اس کے خاص باغ میں لب حوض تشریف فرما ہوئے۔ اس نے جب آپ کو اس حالت میں دیکھا تو غضب ناک ہو کر تکلیف دہی کا ارادہ کیا۔ آپ نے ایک نگاہ اس پر ڈالی وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ حضرت نے تھوڑی دیر میں اس پر حوض کا پانی ڈالا جس[1] سے وہ ہوش میں آیا، لیکن اس حال میں کہ سخت معتقد تھا۔ اور مع اپنے اراکین حضرت سے بیعت ہو گیا اور خلافت ظاہری و باطنی سے آپ کا نائب امیر بنا۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا ص ۱۶۸)

۹۔ قضیب البان (م ۵۷۲ھ) کی تبدیلی اشکال

"آپ غوث الاعظم کے کامل ترین مریدوں سے تھے۔ مگر بے نماز تھے۔ کسی نے غوث الاعظم سے اس بات کی شکایت کی، تو فرمایا: "اُن کا سر ہمیشہ کعبہ کی دہلیز پر رہتا ہے۔" قاضی موصل کو ان سے سخت اختلاف تھا۔ ایک روز موصل کے کسی بازار سے گزرتے ہوئے قاضی سے دوچار ہو گئے۔ قاضی نے دل میں کہا۔ آج موقعہ ہے۔ گرفتار کر کے حاکم کے پیش کر دینا چاہیے۔ قاضی نے اچانک دُور سے دیکھا کہ گرد اُڑ رہی ہے۔ جب وہ گرد قریب ہوئی تو معلوم ہوا کہ کوئی مغرور قوی ہیکل پہلوان ہے اور قریب ہوا تو ایک اعرابی کی صُورت میں متشکل ہو گیا۔ پھر عالم و فقیہہ کی شکل میں ظاہر ہوا اور قریب آ کر کہنے لگا۔ کہو ان تین شکلوں میں سے کون سی شکل حاکم کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہو۔ قاضی اس تبدیلی ہیئت سے خوفزدہ ہو کر شیخ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۰۸)

اب دیکھئے کہ:

۱۔ قضیب البان بے نماز ہونے کے باوجود پیرانِ پیر کے کامل ترین مریدوں میں سے تھا۔
۲۔ غوث الاعظم نے ترکِ نماز کی شکایت پر اس بے نمازی کی طرفداری فرمائی۔ آخر مرید جو تھا۔
۳۔ ایسے بے نمازوں سے بھی ایسی عظیم الشان کرامات صادر ہوسکتی ہیں کہ پڑھے لکھے اور پابندِ شرع قاضی قسم کے لوگ بھی ان کے مُرید بن جاتے ہیں۔

۱۰۔ فرید الدین گنج شکر (م ۶۶۰ھ) چھ سال کی عمر میں کرامت

"حضرت نظام الدین فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ (فرید الدین) کی والدہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ ایک چور چوری کرنے آیا۔ جب اس کی نگاہ والدہ پر پڑی، فوراً اندھا ہوگیا۔ اس نے آواز دی: "اگرچہ میں چوری کی نیت سے آیا تھا اور نابینا ہوگیا ہوں، مگر اب عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی چوری نہ کروں گا۔" حضرت شیخ کی عمر اس وقت چھ سال کی تھی۔ حضرت نے دُعا کی۔ اللہ کے فضل سے اچھا ہوگیا۔ صبح جا کر بمعہ اہل و عیال مشرف بہ اسلام ہوا۔ عبداللہ نام تجویز ہوا۔ اور اخیر تک حضرت شیخ کی خدمت میں رہا۔ (تاریخ مشائخ چشت۔ مولانا زکریا ص۱۷۰)

غور فرمائیے چھ سال کے شیخ کے دستِ حق پرست پر یہ چور بمعہ اہل و عیال مشرف بہ اسلام ہو رہا ہے اور اس وقت سے بے کراہیں کا ہو رہتا ہے۔ اس نے اس چھ سالہ شیخ سے اسلام کا کیا سیکھا ہوگا؟

۱۱۔ خواجہ فرید الدین گنج شکر (م ۶۶۰ھ)

"آپ کے پاس ایک عورت رُوتی ہوئی آئی اور کہا کہ بادشاہ نے میرے بے گناہ بچہ کو تختہ دار پر کھنچوا دیا۔ آپ اپنا عصا ہاتھ میں لئے اپنے اصحاب سمیت اس کے ساتھ ہو لئے اور دار کشیدہ لڑکے کے پاس پہنچے۔ ہندو مسلمان کی ایک بھیڑ لگ گئی۔ خواجہ نے کہا: "الٰہی! اگر اسے بادشاہ نے بے گناہ دار پر کھینچا تو اسے زندہ کردے۔ آپ کہہ ہی رہے تھے کہ لڑکا زندہ ہوگیا اور ساتھ چلنے لگا۔ یہ کرامت دیکھ کر کئی ہزار ہندو مسلمان ہوگئے۔" (اسرار الاولیاء، ملفوظات خواجہ فرید الدین گنج شکر، ص ۱۱۰۔ ۱۱۱ مرتبہ خواجہ بدر اسحاق، ترجمہ غلام احمد بریاں۔ مطبع مجتبائی دہلی، س ۱۹۱۶ء)

۱۲۔ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) کا پانی بننا

"قطب عالم عبدالقدوس گنگوہی جب باطنی علوم سے فارغ ہو کر گنگوہ تشریف لائے، تو ایک ہندو جوگی سے سابقہ پیش آیا۔ آپ نے اس سے پوچھا: کتنی روحانی ترقی کر لی ہے؟" کہنے

لگا۔ بہت، جو صورت چاہوں بن سکتا ہوں۔ دیکھو ابھی پانی بنتا ہوں۔" چنانچہ وہ اسی وقت پانی بن گیا آپ نے کپڑے کی ایک دھجی اس سے تر کر کے رکھ لی۔ پھر اس جوگی کے ہوش میں آتے ہی فرمایا کہ اب میں پانی ہوتا ہوں، تو اس میں سے ایک کپڑا تر کر کے رکھ لینا۔ اس کے بعد یہ کپڑے سونگھے گئے، تو پہلے کپڑے میں بدبو کی وجہ سے دماغ پھٹا جاتا تھا اور دوسرے میں خوشبو کی وجہ سے دماغ معطر ہو رہا تھا۔ جوگی بولا "میں تو اپنے فن و ہنر میں کامل تھا۔ آپ بھی کامل نکلے۔ صرف خوشبو اور بدبو کا فرق رہا۔ فرمایا: "یہ کفر و اسلام کا فرق ہے۔ چنانچہ وہ اسی وقت آپ کا مرید ہو کر مسلمان ہو گیا۔ اس جوگی کو آپ نے صاحب ولایت مقرر کر کے کہیں اور بھجوا دیا۔ حضرت کا روضہ بھی اسی جگہ ہے۔" (ماہنامہ دار العلوم دیوبند جنوری ۱۹۶۰ء، ص ۴۔ بگران اعلیٰ قاری محمد طیب صاحب)

ذرا غور فرمائیے کہ یہ جوگی صاحب ولایت مقرر ہو کر جہاں گئے ہوں گے، تو وہ لوگوں کو وہی کچھ سکھلاتے ہوں گے جو کچھ انہیں آتا تھا۔ اسلامی تعلیمات سے جب وہ خود ہی بے بہرہ تھے تو دوسروں کو اسلام کیا سکھلاتے ہوں گے؟

۱۳۔ امیر کلال (م ۷۷۳ھ) کی کشتی کا فلسفہ

"امیر کلال بابا سماسی سے بیعت ہونے سے پہلے کشتی لڑا کرتے تھے۔ ایک بار کشتی لڑ رہے تھے کہ بابا سماسی کا ادھر سے گزر ہوا۔ لوگوں کے دل میں خیال آیا کہ کشتی لڑنا تو بدعت ہے۔ ایسے بزرگ اور سید زادے کو ان بدعتوں سے کیا واسطہ۔ اسی وقت ان لوگوں پر نیند اور غنودگی طاری ہو گئی۔ خواب دیکھا کہ قیامت برپا ہے اور لوگ کیچڑ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اتنے میں امیر کلال تشریف لاتے اور ان کو کیچڑ سے نکال دیا۔ جب وہ لوگ نیند سے بیدار ہوئے، تو حضرت امیر کلال نے ان کے کان پکڑ کر فرمایا کہ "ہم اس روز کے لئے زور آزمائی کرتے اور کشتی لڑتے ہیں۔ بزرگوں کی طرف سے بد عقیدہ نہ ہونا چاہتے۔" اس پر سب نے توبہ کی اور آپ کی تربیت سے مردانِ خدا بن گئے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۶۱)

غور فرمایا آپ نے کتنی لاجواب کرامت ہے۔ ابھی امیر کلال بیعت بھی نہیں ہوئے، نہ فقیری لائن میں داخل ہوئے، لیکن کرامت ظاہر ہو گئی جس کا آدھا حصہ خواب سے تعلق رکھتا ہے آدھا بیداری سے۔ ابھی امیر کلال کشتی ہی لڑا کرتے ہیں، خود ابھی بابا سماسی نے ان کی طرف توجہ بھی نہیں فرمائی، لیکن سب لوگ آپ کے دستِ حق پرست پر توبہ بھی کرتے اور مردانِ خدا بھی بن جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس روایت اور کرامت نے مل کر بدعت

کی کیسی جامع و مانع تعریف بیان فرمادی اور اُس کا فلسفہ بھی بیان کر دیا کہ پہلوان حضرات ہی قیامت کے دن سب سے زیادہ کار آمد ثابت ہوں گے۔

۱۴۔ پیر حسن کبیر الدین (م ۸۵۲ھ) کی دعوت

پیر حسن کبیر الدین شیعہ امامیہ اسماعیلیہ کے پیر اور مبلغ تھے۔ ان کے متعلق نور مبین میں بحوالہ کتاب گلزار شمس لکھا ہے کہ:

"آپ نے چالیس سال تک ایک پاؤں پر کھڑے رہ کر عبادت کی تھی اور اپنی کرامت سے گنگا ندی کا پانی اوچھ گاؤں میں منگوا کر اس میں ہندوؤں کو اشنان کرواتے تھے۔ جس کے باعث کثرت سے لوگ مذہب اسمٰعیلی میں داخل ہوتے تھے۔ نیز آپ نے ایک مردہ بلوچ کو زندہ کیا تھا۔ (نور مبین، مرتبہ اے جے چنارا، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن، برائے ہند بمبئی)

۸۔ اولیاء اللہ کا وعظ اور تاثیر کلام

اولیاء اللہ چونکہ معرفت کے خزینے ہوتے ہیں، لہٰذا ان کا کلام بھی حقائق معرفت سے لبریز ہوتا ہے ان کا وعظ ایسا نہیں ہوتا جیسے رسول اللہ ﷺ کا تھا کہ اس پر کافروں کی طرف سے آپ کو بے شمار اذیتیں پہنچائی گئی تھیں۔ نہ ہی ان کا وعظ عام علمائے امت کی طرح ہوتا ہے جو لوگوں کو خوفِ خدا کی تلقین کرنے اور احکام شرعیہ کی پابندی کے لئے دعوت دیتے ہیں۔ پھر کسی پر کچھ اثر ہو جاتا ہے کسی پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اولیاءُ اللہ کا وعظ اور تاثیر کوئی جداگانہ چیز ہی ہوتی ہے جس سے پہلے بیچارے سامعین بھی مرنا شروع ہو جاتے ہیں چند ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

جنید بغدادیؒ (م ۲۹۸ھ) کا پہلا وعظ

"شیخ جنید نے جب علوم ظاہر و باطن کی تکمیل کر لی تو شیخ سریؒ (ان کے مرشد، م ۲۵۰ھ) نے انہیں وعظ کی اجازت دی، لیکن شیخ جنید نے اپنے استاد کے پاس ادب کی وجہ سے وعظ نہ کہا۔ رات کو خواب میں رسول اللہ ﷺ نے کہا: "اے جنید! وعظ کیوں نہیں کہتا۔ اللہ نے تیری زبان میں بڑی تاثیر دی ہے"۔ صبح کو شیخ سری ملے تو کہا: "میں نے نہ کہا تھا کہ لوگوں سے کلام کر۔ پس اب رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق وعظ کر۔" چنانچہ جنیدؒ کی پہلی مجلس میں چالیس آدمی حاضر ہوئے۔ جن میں سے سترہ شیخ کی تاثیر کلام سے جان بحق ہو گئے اور بیس بے ہوش ہو گئے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۳۹)

---

[1] شیخ سری سقطی (م ۲۵۰)، آپ جنید بغدادی کے مرشد ہیں۔ بغداد میں سب سے پہلے آپ ہی نے بر سر منبر حقائق توحید (یعنی توحید وجودی کے اسرار و رموز بیان کئے۔ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۳۱)

معلوم ہوا آپ کو کہ تاثیرِ کلام کس چیز کو کہتے ہیں اور وعظ کس چیز کو؟ پہلے ہی وعظ میں چالیس میں سے سترہ تو فوراً مر گئے اور بیس بے ہوش ہو گئے، وہ گھر جا کر مر گئے ہوں گے یا دوسرا وعظ سن کر مر جائیں گے۔ یہ وعظ تھا یا کسی بس کا شدید ایکسیڈنٹ یا آسمانی صاعقہ اور جو بھی ٹھیک ٹھاک رہے وہ بڑے سخت جان یا شقی القلب ہوں گے

پیرانِ پیر (م ۵۶۱ ھ) کا وعظ

" ۵۲۱ ھ میں باشارہ[1] رسول اکرم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ منبر پر وعظ کہنا شروع کیا۔ آنجناب اکثر حالتِ وعظ میں فرمایا کرتے تھے کہ "اے اہلِ آسمان و زمین! آؤ اور میری بات سنو کہ میں نائب و وارثِ رسول ﷺ ہوں۔" آپ کی ہر مجلس میں ستر ہزار حاضرین کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ چار سو شخص آپ کے کلام کو لکھتے۔ تاثیرِ کلام کا یہ حال تھا کہ سامعین میں سے اکثر لذتِ ذوق و شوق و غلبۂ حال میں جان بحق ہو جاتے بعض پر بے خودی و وجد طاری ہو جاتا اور وہ کئی کئی دن تک ہوش میں نہ آتے۔ شیخ ابو سعید قبلوی فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کی مجلسِ وعظ میں بار بار رسول اللہ ﷺ، دیگر پیغمبروں نیز ملائکہ اور جنات کو صف بہ صف دیکھا ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۹۵)

---

[1] اس اشارہ کی تفصیل سیرۃ غوث الثقلین کے صفحہ ۰۰ پر یوں دی گئی ہے۔

"غوثِ اعظم حالتِ بیداری میں نمازِ ظہر سے پہلے رسول اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے تو آپ نے فرمایا: "اے میرے بیٹے! وعظ و نصیحت کیوں نہیں کرتے؟" پیرانِ پیر نے کہا: "ایک عجمی شخص ہوں فصحائے عرب کے سامنے کیسے تقریر کروں۔" آپ نے فرمایا: "اچھا منہ کھولو۔" پیرانِ پیر نے منہ کھولا تو آپ نے سات مرتبہ اپنا لعاب مبارک منہ میں تھوکا اور کہا: "اب وعظ و نصیحت کرو اور لوگوں کو نیکی کی دعوت دو۔"

پھر نمازِ ظہر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور کہا: "بیٹا منہ کھولو۔" پیرانِ پیر نے منہ کھولا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چھ بار منہ میں تھتکار کر فرمایا: "وعظ و نصیحت کرو۔" پیرانِ پیر نے پوچھا: "آپ نے سات بار کیوں نہیں تھتکارا؟" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ادباً مع رسولِ اللہ یعنی رسول اللہ کے پاس ادب کی خاطر۔

اس کے ساتھ ہی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاضر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: "اے بیٹا! یہ خلعت پہنو۔" پیرانِ پیر نے پوچھا: "یہ خلعت کیسی ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ تمہاری ولایت کی خلعت ہے جو قطب اولیاء سے مخصوص ہے۔

پیرانِ پیر کہتے ہیں کہ اس کے بعد ان (یعنی رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے فیض و برکات سے میں نے حقائق و معارف کو جان لیا حلقہ ارادت وسیع ہو گیا۔ (بہجۃ الاسرار، ص ۲۵-۲۶، قلائد الجواہر، ص ۱۳، سفینۃ الاولیاء، ص ۶۲، اخبار الاخیار فارسی ص ۱۸، تحفہ قادریہ، ص ۱۹)

دیکھا آپ نے کتنی معتبر روایت تھی جسے صاحب خزینۃ الاصفیاء نے صرف بہ اشارہ رسولِ اکرم ﷺ اور حضرت علی

بقیہ اگلے صفحہ پر

بات ہے بھی دل لگتی۔ بھلا جس مجلس میں رسول اللہ ﷺ اور دوسرے پیغمبر، ملائکہ اور جنات اور انسان سب آئیں، وہاں ستر ہزار کی تعداد معمولی بات ہے اور چار سو کھنے والوں میں بھی شاید ملائکہ اور جنات شامل ہوں۔ البتہ یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ ملائکہ تو غیر مکلف مخلوق ہیں ان کے لئے وعظ و نصیحت بے کار چیز ہے۔ وہ اس مجلس وعظ میں کیا لینے آتے تھے؟ ممکن ہے کہ "اہلِ آسمان و زمین" کا فرمان سن کر اور حکم عدولی کی تاب نہ لا کر حاضر ہو جاتے ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی زندگی بھر وعظ فرمایا لیکن کبھی ایک آدمی بھی جاں بحق نہ ہوا نہ کوئی وجد و حال سے بے ہوش ہوا۔ اب پیرانِ پیر کے وعظ کے متعلق تین ہی احتمالات ہو سکتے ہیں:

۱۔ آپ کا وعظ رسول اللہ سے بہت زیادہ پُر تاثیر ہوتا ہو۔

۲۔ آپ کا وعظ وہ کچھ نہ ہو، جو کچھ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے بلکہ کسی دوسری نوعیت کا جداگانہ موضوع رکھتا ہو۔

۳۔ تذکرہ نویسوں نے انتہائی مبالغہ آرائی اور بے احتیاطی سے کام لیا ہو۔

ہمارے خیال میں تیسری بات زیادہ قرینِ قیاس ہے، آپ جو چاہے سمجھ لیجئے۔

۹۔ برِ صغیر پاک و ہند میں اشاعتِ اسلام میں صوفیاء کا کردار

صوفیاء کی طرف سے بڑے شد و مد سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اشاعتِ اسلام کا سہرا صوفیائے کرام کے سر پر ہے۔ پھر وہ لوگ جو صوفیائے کرام سے کچھ زیادہ ہی حسنِ عقیدت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ:

"سچی بات تو یہ ہے کہ ہم اہلِ اسلام ان بے نوا فقیروں کے ممنونِ احسان ہیں۔ جن کے صدقے ان کے دل نورِ اسلام سے منور ہوتے۔ ورنہ کیا خبر آج ہم کسی مندر میں دیوی کے چرنوں میں آلتی پالتی مارے بیٹھے اس کی ڈنڈوت بجا لا رہے ہوتے۔" (درسِ تصوف، ص ۱۰۷)

جناب مناظر احسن گیلانی کے خیال کے مطابق تو سچی بات یہ ہے جو اقتباس بالا میں مندرج ہے اور ہمارے خیال میں صوفیاء، اور ان کے حسنِ عقیدت رکھنے والے حضرات جس طرح کئی دوسری باتوں میں مبالغہ اور غلو

کچھ کر گول مول کر دیا۔ یہ بات البتہ ہم سمجھنے سے قاصر ہی رہے کہ فیوض و برکات تو آپ رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حاصل کریں اور وعظ کا اثر بالکل ان کے متضاد ہو۔ یہ کیا معمہ ہے؟

سے کام لیتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اس معاملہ میں بھی مبالغہ اور بے احتیاطی سے کام لیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تاریخی حقائق صوفیاء کے اس دعویٰ کی پرزور تردید کرتے اور منہ چڑاتے نظر آتے ہیں۔

صوفیاء کی برِصغیر پاک و ہند میں آمد

برِصغیر پاک و ہند میں اسلام اس وقت آچکا تھا جب کہ ابھی نہ کسی صوفی کا اس دنیا میں وجود تھا نہ تصوف کا۔ گو دوسری صدی ہجری کے اواخر یا تیسری صدی کے اوائل میں چند ایک بزرگوں کو صوفی کہا جانے لگا تھا۔ تاہم ان کی ابتدا تیسری صدی ہجری میں شمار ہوتی ہے اور جو صوفیائے کرام برصغیر پاک و ہند میں تشریف لائے اور ان کی وساطت سے ہند میں اشاعتِ اسلام کا کام ہوا، ان میں سے دو ہستیاں ہی زیادہ مشہور ہیں جو پہلے پہل تشریف لائیں۔ پہلے حضرت علی ہجویری (۴۰۰ھ/۱۰۰۹ء - ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) ہیں۔ یہ ہندوستان میں ۴۶۲ھ/۱۰۶۹ء میں تشریف لائے اور دوسرے بزرگ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری (۵۳۷ھ/۱۱۴۲ء، ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء) ہیں۔ جن کی ہندوستان میں آمد کی تاریخ دس محرم ۵۶۱ھ بمطابق ۱۱۶۱ء بتلائی جاتی ہے، جو کہ سخت مشکوک ہے۔ تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق بھی یہ تاریخ ۵۷۰ھ اور ۵۸۰ھ کے درمیان ہونی چاہئے۔[1]

ان دو مشہور بزرگوں کے علاوہ دو اور بزرگوں کی آمد بھی تذکروں سے بھی پتہ چلتا ہے۔ ان میں ایک تو

---

[1] آپ کی تاریخِ پیدائش ۵۳۶ھ یا ۵۳۷ھ ہے۔ پندرہ سال کے تھے کہ والد نے اور پھر ایک سال بعد والدہ نے وفات پائی۔ آپ کو ایک باغ اور ایک چکی ورثہ میں ملی اور آپ نے باغبانی کو ذریعہ معاش بنایا۔ اسی اثناء میں ایک مجذوب ابراہیم قندوزی سے ملاقات ہوئی اور زندگی نے پلٹا کھایا۔ تمام اثاثہ بیچ کر رقم فقراء کو دے دی۔ پھر پہلے سمرقند اور بخارا گئے اور وہاں حفظِ قرآن، تفسیر، فقہ، حدیث اور دوسرے علومِ ظاہری میں مہارت حاصل کی۔ (انسائیکلو پیڈیا فیروزسنز ص ۱۲۴۲) ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ نے علومِ ظاہری سے فراغت حاصل کی تھی اس وقت آپ کی عمر کم از کم بیس سال تو ضرور ہوگی۔ اس کے بعد آپ خواجہ ہارونی کی بیعت ہوئے اور ایک ہی دن میں تکمیل ہوگئی اور ساتھ ہی ساتھ حضرت شیخ کی توجہ سے سب علوم حاصل ہوئے اور اس کے بعد امتثال امر کی وجہ سے بیس سال حضرت کی خدمت میں اور رہے (تاریخ مشائخ چشت مولانا زکریا، ص ۱۶۶) گویا جب آپ عثمان ہارونی سے فارغ ہو کر ہندوستان آئے، تو آپ کی عمر از کم چالیس سال کی ہوگی یا یہ ۵۷۰ھ کا واقعہ ہے۔ لیکن یہی مولانا زکریا آپ کی ہندوستان میں آمد محرم ۵۶۱ھ بتلاتے ہیں۔ یعنی ۲۴ سال کی عمر میں آپ اجمیر تشریف لائے اور یہ بات قطعاً غلط ہے کیونکہ آپ ہارونی صاحب سے فراغت کے بعد کئی دوسرے بزرگوں سے ملے اور فیض حاصل کرتے رہے۔ پھر علی ہجویری کے مزار پر چلہ بھی کاٹا۔ پھر پہلے دہلی گئے بعد میں اجمیر آئے، تو اس لحاظ سے آپ کی اجمیر آنے کی تاریخ ۵۸۰ھ کے لگ بھگ ہونی چاہئے۔

شیخ محمد اسماعیل بخاری ہیں جو ۳۹۵ھ ۱۰۰۵ء میں لاہور تشریف لائے۔ (روحِ تصوف، ص ۹۹ اور ۱۰۲) اور دوسرے بزرگ خواجہ ابو محمد بن ابو احمد جو محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، خلیق نظامی، ص ۱۴۲) اور محمود غزنوی نے ۱۰۰۱ء سے لے ۱۰۲۵ء تک ہندوستان پر سترہ حملے کئے تھے۔ آخری حملہ سومنات پر ۱۰۲۵ء میں کیا گیا۔

ان تمام تر تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی صوفی بزرگ، وہ مشہور و معروف ہو یا غیر معروف، سلطان محمود غزنوی سے پہلے برِ صغیر پاک و ہند میں وارد نہیں ہوا تھا۔ لیکن مسلمان ہمیں اس سے بہت پہلے یہاں نظر آتے ہیں۔ جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ اور یہ تفصیل ہم "تاریخ پاک و ہند" (مصنفہ پروفیسر عبداللہ ملک صدر شعبہ تاریخ اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور، ساتواں ایڈیشن ۱۹۸۰ء) سے پیش کر رہے ہیں۔ آپ کی یہ کتاب کالجوں میں بطورِ نصاب پڑھائی جاتی ہے۔

"اسلام مذہب کی حیثیت سے پہلے جنوبی ہند میں پہنچا۔ مسلمان تاجر اور مبلغین ساتویں صدی عیسوی میں (یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ۶۳۲ء میں ہوئی تھی۔ یعنی آپ کی وفات کے بعد جلد ہی مسلمان) مالابار اور جنوبی سواحل کے دیگر علاقوں میں آنے جانے لگے۔ مسلمان چونکہ بہترین اخلاق و کردار کے مالک اور کاروباری لین دین میں دیانتدار واقع ہوتے تھے، لہٰذا مالیبار کے راجاؤں، تاجروں اور عام لوگوں نے ان کے ساتھ رواداری کا سلوک روا رکھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے برِ صغیر پاک و ہند کے مغربی ساحلوں پر قطعاتِ اراضی حاصل کر کے مسجدیں تعمیر کیں۔ (یاد رہے کہ اس وقت خانقاہوں کی تعمیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا) اور اپنے دین کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ ہر مسلمان اپنے اخلاق اور عمل کے اعتبار سے دینِ اسلام کا مبلغ تھا۔ نتیجۃً عوام ان کے اعمال و اخلاق سے متاثر ہوتے چلے گئے۔ تجارت اور تبلیغ کا یہ سلسلہ ایک صدی تک جاری رہا یہاں تک کہ مالیبار میں اسلام کو خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا اور وہاں کا راجہ بھی مسلمان ہو گیا۔ جنوبی ہند میں فروغِ اسلام کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں جنوبی ہند مذہبی کشمکش کا شکار تھا۔ ہندو دھرم کے پیرو کار بدھ مت اور جین مت کے شدید مخالف اور ان کی بیخ کنی میں مصروف تھے۔ ان حالات میں جب مبلغینِ اسلام نے توحیدِ الٰہی اور ذات پات اور چھوت چھات کو لایعنی اور خلافِ انسانیت قرار دیا، تو عوام جو ہزاروں سال سے تفرقات اور امتیازات کا شکار ہو رہے تھے۔ بے اختیار اسلام کی طرف مائل ہونے لگے۔ چونکہ حکومت اور معاشرہ کی طرف سے تبدیلیٔ مذہب پر کوئی پابندی نہ تھی۔ لہٰذا ہزاروں غیر مسلم

مسلمان ہو گئے۔" (تاریخ پاک و ہند، ص ۳۹۰)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل امور واضح ہوتے ہیں :

۱۔ پہلی ہی صدی ہجری میں اسلام جنوبی ہند بالخصوص مالیبار اور مغربی سواحل میں پھیل گیا تھا۔ ان علاقوں کے ہزارہا غیر مسلم مسلمان ہو چکے تھے اور راجہ بھی مسلمان ہو گیا تھا۔

۲۔ اشاعتِ اسلام کی اصل وجوہات تین تھیں :

(۱) عقیدہ توحیدِ الٰہی کی سادگی۔ (۲)۔ ذات پات اور چھوت چھات کو خلافِ انسانیت قرار دینا اور (۳) مسلمانوں کے اعمال و اخلاق کی پاکیزگی اور شائستگی۔

گویا ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کا اصل سبب اولیاء اللہ یا صوفیاء کی مزعومہ کرامات نہیں بلکہ درجِ بالا وجوہات تھیں۔

اب اس پہلی صدی ہجری میں برصغیر پاک و ہند میں جن جن مقامات پر اشاعتِ اسلام ہوئی اس کی مزید تفصیل درج ذیل اقتباس میں ملاحظہ فرمائیے :

"برصغیر پاک و ہند میں عربوں کے تجارتی مراکز میں سراندیپ، مالدیپ، مالابار، کارومنڈل، گجرات اور سندھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جنوبی ہند اور ساحلی علاقوں میں بھی جابجا عرب تاجروں کی نوآبادیات موجود تھیں۔ جہاں عراق اور عرب کے تاجر موجود تھے۔ ظہورِ اسلام کے بعد عربوں کی سیاسی، مجلسی اور اقتصادی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ اب وہ تبلیغِ اسلام کے شوق سے سرشار، اخلاق و اطوار کے لحاظ سے بلند معیار کے حامل اور صداقت و دیانت کے پیکر تھے۔ ان میں سے اکثر نے برصغیر میں ہی رہائش اختیار کر لی۔ آہستہ آہستہ جنوبی ہند کے اکثر مقامات پر مسلمانوں کی نوآبادیات قائم ہو گئیں۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو مشرف بہ اسلام کرنا شروع کر دیا۔ مقامی راجاؤں سے مسلمان تاجروں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے اور انہیں تبلیغِ اسلام اور عبادت کی پوری آزادی حاصل تھی۔" (ایضاً، ص ۱۷، ۱۸)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ :

پہلی صدی ہجری میں اسلام صرف مالابار اور مغربی سواحل پر ہی نہیں پھیلا بلکہ جزائر سراندیپ، مالدیپ اور علاقہ ہائے کارمنڈل، گجرات اور سندھ میں اسلام کی اشاعت ہو چکی تھی۔ ان مقامات پر مسلمان عربوں کی نوآبادیات بھی قائم تھیں اور بہت سے عرب مسلمان مستقلاً یہاں قیام پذیر ہو کر اسلام کی تبلیغ اور اشاعت میں

منہمک ہوگئے تھے۔

برِصغیر میں اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں یہ کچھ تو نجی سطح پر ہوا۔ اب جو کچھ سرکاری سطح پر ہوا اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

۱۔ دورِ فاروقی ــــــ میں بحرین و عمان کے حاکم عثمان بن ابو العاص ثقفی نے ۶۳۶ء۔ ۶۳۷ء میں (وفاتِ نبوی ﷺ سے صرف چار سال بعد) ایک فوجی مہم تھانہ نزد بمبئی میں بھیجی۔ پھر اس مہم کی اطلاع حضرت عمر کو دی۔ آپ ناراض ہوئے اور لکھا کہ "تم نے میری اجازت کے بغیر سواحلِ ہند پر فوج بھیجی۔ اگر ہمارے آدمی وہاں مارے جاتے تو میں تمہارے قبیلہ کے اتنے ہی آدمی قتل کر ڈالتا۔" (ایضاً، ص ۱۸)

۲۔ عہدِ عثمانی ــــــ میں عراق کے حاکم عبداللہ بن عامر نے حکیم بن جبلہ کو برِصغیر کے سرحدی حالات کی تحقیق پر مامور کیا۔ واپسی پر انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی رپورٹ میں بتلایا کہ "وہاں پانی کمیاب ہے۔ پھل نکمے ہیں ڈاکو بہت دلیر ہیں اگر قلیل التعداد فوج بھیجی گئی تو ہلاک ہو جائے گی اور اگر زیادہ لشکر بھیجا گیا، تو بھوکوں مر جائے گا۔" اس رپورٹ کی بناء پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فوج بھیجنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ (ایضاً، ص ۱۹)

۳۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں مشہور سپہ سالار مہلب بن ابی صفرہ نے برِصغیر کی سرحد پر حملہ کیا اور لاہور تک بڑھ آیا۔ انہی ایام میں خلیفہ اسلام نے ایک اور سپہ سالار عبداللہ بن سوار عبدی کو سواحل برِصغیر کے سرکش لوگوں کی گوشمالی کے لئے چار ہزار کی عسکری جمعیت کے ساتھ بھیجا۔ اس نے قیقان کے باشندوں کو سخت شکست دی اور مالِ غنیمت لے کر واپس چلا گیا۔ اس نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں قیقانی گھوڑے پیش کئے، لیکن کچھ مدت بعد عبداللہ بن سوار قیقان واپس آگیا، جہاں ترکوں نے یورش کر کے اسے قتل کر دیا۔" (ایضاً، ص ۱۹)

۴۔ بعد ازاں ۱۲، ۷۱۱ء یعنی ۹۳ھ میں ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے برِصغیر میں اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں بڑا مؤثر کردار ادا کیا یعنی محمد بن قاسمؒ نے اس سال سندھ کے سارے علاقہ کو فتح کر لیا۔ اس حملہ کے اسباب اور محرکات ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ہم تو یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس مہم میں محمد بن قاسمؒ نے دیبل، نیرون، سیوستان، سیسم، راوڑ، برہمن آباد، اوور، باتیہ (موجودہ بہاولپور کے قریب جوار میں واقع تھا)، اور ملتان کو فتح کر لیا اور قنوج کی تسخیر کا ارادہ کر رہا تھا کہ اسے واپس بلا لیا گیا۔

محمد بن قاسمؒ کے جانے کے بعد فتوحات کا سلسلہ اچانک رک گیا۔ بہر حال عرب سندھ و ملتان پر دو سو سال

سے زیادہ عرصہ تک (یعنی دسویں صدی عیسوی تک) قابض رہے۔ چوتھی صدی ہجری تک خلیفۃ المسلمین والیانِ سندھ کا تقرر کرتا رہا۔ اس کے بعد سندھ میں عربوں کی دو نیم آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں۔ اِن میں سے ایک ملتان اور دوسری منصورہ تھی۔ (ایضاً، ص ۳۵)

محمد بن قاسم کی ان فتوحات نے اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں کیا کردار ادا کیا، وہ پروفیسر عبدالقادر و شجاع الدین کی زبان سے سنئے:

"فتح سندھ کے بعد بے شمار علماء، مبلغین، تاجر اور صناع عرب سے آکر سندھ میں آباد ہوئے۔ مقامی باشندوں میں اسلام رائج ہوا اور یہ سرزمین فرزندانِ توحید کا گہوارہ بن گئی۔ آج سندھ اسی طرح اسلامی خطہ ہے جس طرح عراق اور مصر۔ ہم عربوں کی فتح سندھ کی عظمت، اس کی تاریخی اہمیت اور اس کے نتائج کے منکر نہیں ہو سکتے۔" (ایضاً، ص ۴۰)

۵۔ ۹۸۶ء (چوتھی صدی ہجری) میں سبکتگین غزنوی نے پشاور کے قریب جے پال کو شکست دے کر لمغان (جلال آباد) سے دریائے سندھ تک کے تمام علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ان لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ برِصغیر کی عسکری کمزوری مسلمانوں پر عیاں ہو گئی اور سندھ پار کے علاقے میں ایک طاقتور اسلامی حکومت قائم ہو گئی جو بعد ازاں پنجاب اور برِصغیر کے دوسرے حصوں پر چھا گئی۔ نیز برِصغیر کی فتح کے دروازے کھل گئے۔

سبکتگین کے عہد کا دوسرا اہم واقعہ افغان قوم کے معرضِ وجود میں آنے کا ہے۔ افغان پشاور اور غزنی کے درمیانی علاقہ کے باشندے تھے اور متعدد قبائل میں بٹے ہوتے تھے۔ سبکتگین نے ان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ان سے دوستانہ مراسم استوار کئے اور وہ تمام علاقے جو اُن کے قبضہ میں تھے ان کے سپرد کر دیئے۔ نتیجتاً افغان قوم کی بنیاد پڑی۔ نیز یہ قبائل نہ صرف حلقہ بگوش اسلام ہوئے بلکہ سلاطین غزنہ کی افواج میں بھرتی بھی ہو گئے۔" (ایضاً، ص ۶۴)

۶۔ سبکتگین کے بعد سلطان محمود غزنوی (۹۹۷ء تا ۱۰۳۰ء) کا دور آتا ہے جس نے پہلا حملہ ۱۰۰۰ء میں برِصغیر پر کر کے درۂ خیبر کے نواحی علاقوں کی تسخیر کی۔ اس نے کُل ۱۷ حملے برِصغیر پر کئے تھے۔ آخری حملہ ۱۰۲۵ء میں کیا جس میں سومنات کو فتح کیا۔ اس دوران محمود غزنویؒ نے برِصغیر کے جن علاقوں کو فتح کیا اُن کے نام یہ ہیں:

درۂ خیبر اور اس کے نواحی علاقے، ملتان (یہاں کا حاکم شیخ حمید لودی مسلمان تھا، لیکن محمود غزنوی کی مخالف اور بھیرہ

کے راجہ بجے رائے کا حلیف تھا) پنجاب، کانگڑہ، نگرکوٹ، تھانیسر، نندنہ، کشمیر، قنوج، کالنجر، گوالیار اور سومنات۔

فتح سومنات کے متعلق ابنِ اثیر، ابن خلدون اور فرشتہ کا بیان ہے کہ:

"جب محمود نے برِ صغیر پاک و ہند کے مختلف راجگان کو شکست دی اور ہندوؤں کے متعدد مندر اس کے ہاتھوں تاخت و تاراج ہوئے، تو ہندوؤں نے کہنا شروع کر دیا کہ جن دیوتاؤں کے مندر برباد ہوئے ہیں ان سے شوجی (سومنات کا بڑا دیوتا) ناراض تھے۔ اگر محمود نے سومنات پر حملہ کیا، تو منہ کی کھائے گا۔" چنانچہ محمود نے ہندوؤں کے اس خیال کو باطل ثابت کرنے کے لئے اور بُتوں کی جھوٹی عظمت کو ختم کرنے کے لئے سومنات پر حملہ آور ہونے کا عزمِ صمیم کیا۔ تاکہ لوگوں پر بُتوں کی بے بسی اور بے ثباتی واضح ہو جائے اور لوگ بُت پرستی اور شرک کو ترک کر دیں۔ پھر جب محمود نے سومنات کو بھی فتح کر لیا۔ تو اس فتح کی خبر نے عالمِ اسلام میں مسرت کی لہر دوڑا دی۔ اور خلیفہ بغداد نے خوش ہو کر سلطان محمود اس کے بیٹوں اور بھائی کو خطابات اور اعزازات سے نوازا۔ سومنات کا بُت تباہ و برباد ہو گیا اور سلطان محمود کے نام کو شہرت و دوام حاصل ہو گئی۔" (ایضاً ص ۷۱)

سلطان محمود غزنوی (م ۱۰۳۰ء) کے بعد اُس کے جانشین مزید ڈیڑھ سو سال یعنی ۱۱۸۶ء تک ان علاقوں پر قابض رہے۔ جن کے نام ہیں؛

۱۔ سلطان مسعود	(۱۰۳۰ء تا ۱۰۴۰ء)	۲۔ سلطان مودود (۱۰۴۲ء تا ۱۰۴۹ء)
۳۔ ″ ابوالحسن علی	(۱۰۴۹ء تا ۱۰۵۱ء)	۴۔ ″ عزالدولہ عبدالرشید (۱۰۵۱ء تا ۱۰۵۲ء)
۵۔ ″ فرخ زاد	(۱۰۵۳ء تا ۱۰۵۹ء)	۶۔ ″ ابراہیم (۱۰۵۹ء تا ۱۰۹۹ء)
۷۔ ″ مسعود سوم	(۱۰۹۹ء تا ۱۱۱۴ء)	۸۔ شیر زاد (۱۱۱۴ء تا ۱۱۱۵ء)
۹۔ ارسلان	(۱۱۱۵ء تا ۱۱۱۷ء)	۱۰۔ بہرام شاہ (۱۱۱۷ء تا ۱۱۵۲ء)
۱۱ خسرو شاہ	(۱۱۵۲ء تا ۱۱۶۰ء)	۱۲۔ خسرو ملک (۱۰۶۰ء تا ۱۱۸۶ء)

، غزنی خاندان کے بعد خاندانِ غور ہند پر قابض ہوتا ہے۔ سلطان شہاب الدین محمد غوری نے سب سے پہلے حملہ ۱۱۷۵ء میں ملتان کو فتح کیا۔ جس پر غزنویوں کے بعد دوبارہ قرامطی برسرِ اقتدار آ گئے تھے۔ محمد غوری نے بھی ہندوستان کے بہت سے علاقوں کو فتح کیا۔ پھر غوریوں کے بعد ہندوستان میں خاندانِ غلاماں خلجی، تغلق، سادات اور لودھی برسرِ اقتدار آئے پھر ۱۵۲۶ء میں بابر نے ہندوستان میں مغلیہ خاندان کی بنیاد رکھی اور یہ مغلیہ

خاندان ۱۸۵۷ء تک برِصغیر پاک و ہند میں برسرِ اقتدار رہا۔

یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷۱۲ء یا ۹۲ھ سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کوئی وقت ایسا نہیں گزرا جب کہ برِصغیر کے کسی نہ کسی حصے پر مسلمانوں کی حکومت موجود نہ رہی ہو۔ اب صوفیاء کی طرف سے دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ پہلے صوفیاء ہندوستان گئے۔ انہوں نے وہاں اشاعتِ اسلام کا فریضہ انجام دیا اور مسلمان حکمرانوں کے حملہ اور فتح کے لئے زمین ہموار کرتے رہے۔ لیکن تاریخی حقائق کی روشنی میں صوفیاء کے اس مزعومہ دعوے کو کیوں کر باور کیا جا سکتا ہے جبکہ صُوفی تو پیداوار ہی تیسری صدی ہجری کی ہیں اور پہلے صوفی جو ہندوستان تشریف لائے وہ اسمٰعیل بخاری ہیں جو ۱۰۰۵ء (۳۹۵ھ) میں محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان تشریف لاتے ہیں جبکہ مسلمان حکمرانوں کا ۷۱۲ء (۹۳ھ) سے لے ۱۸۵۷ء تک ایسا تسلسل قائم رہا ہے کہ اس میں ایک دن کا بھی انقطاع واقع نہیں ہوا۔

زیادہ سے زیادہ جو چیز باور کی جا سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ محمود غزنوی چونکہ خود بھی صُوفی منش اور صوفیاء کا قدردان تھا اس لئے اس نے یہ تحریک پیدا کی کہ دوسرے علمائے دین کی طرح صوفیاء بھی اس سرزمین میں تشریف لائیں اور مفتوحہ علاقوں میں اشاعتِ اسلام کا فریضہ سرانجام دیں۔ چنانچہ پہلے صُوفی، جن کا نام تذکروں میں ملتا ہے وہ اسمٰعیل بخاری ہیں جنہیں ۱۰۰۵ء میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ حالانکہ وہ خود ۱۰۰۱ء سے ہندوستان پر حملے کر رہا تھا۔

۱۰۔ صُوفیائے کرام کی تعلیم کی خصوصیات

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ صوفیاء کی آمد سے پہلے برِصغیر میں جو بھی اسلام پھیلا تھا وہ خالص اسلام تھا اور اس میں دینِ طریقت کی آمیزش نہ تھی اور ان میں سے زیادہ تر اہل الحدیث تھے۔ چنانچہ عرب کے مشہور سیاح علامہ بشاری مقدسی ۳۷۵ھ میں ہندوستان تشریف لائے۔ وہ اپنی کتاب "احسن التقاسیم" میں صوبہ سندھ کے شہر منصورہ کے حال میں لکھتے ہیں کہ وکانوا اکثرھم اھل الحدیث یہاں کے مسلمانوں میں سے اکثر اہل الحدیث ہیں۔ (تاریخ سندھ، ص ۱۲۴، ج ۲)

مگر جو اسلام صوفیاء کے ذریعہ پھیلا وہ درج ذیل خصوصیات کا حامل تھا۔

ا۔ کشف و کرامات

۱۔ اس اسلام کی اشاعت کا انحصار اسلامی تعلیمات پر نہیں بلکہ کرامات پر ہوتا تھا یعنی جو بزرگ زیادہ اور بڑی

کرامتیں دکھلا سکتا تھا۔ اس کی اشاعتِ اسلام کا دائرہ بھی اسی مناسبت سے وسیع ہوتا تھا۔ چنانچہ خلیق نظامی صاحب اپنی کتاب "تاریخ مشائخ چشت" میں گلزار ابرار کے حوالہ سے نظام الدین اولیاء کی کرامات اور ان کرامات کے ذریعے اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں یوں رقمطراز ہیں کہ :

"آپ کی بارگاہِ خلافت سے وقتاً فوقتاً نئے نئے خلیفہ روانہ ہوتے تھے۔ ان کی فیض پاشی سے ہند کا ہر مکان اور ہر قطعہ زمین آباد تھا۔ آپ نے بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے مرتبہ اور بڑی بڑی کرامتوں والے سات سو ایسے خلیفہ روانہ کئے تھے کہ ہر شخص کے سینہ سے عرفان کا آفتاب طلوع ہوا کرتا تھا۔ نیز ان سینوں سے بزرگوار پیر کے اسرار عیاں ہوتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ جب کسی شخص کو کسی بزرگ کی خدمت سے معرفت کا سرمایہ ہاتھ آجاتا ہے اور ایک منزل سے دوسری منزل کو اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور فنا کے درجات سے عبور کر کے بقائے اصلی کے مقام کو پہنچ جاتا ہے تو اس وقت نام اور صورت میں فرق کے سوا کسی قسم کی دوئی کی شکل ان دونوں شخصوں میں قائم نہیں رہتی۔" (گلزار ابرار (اردو) ص ۸۴، ۸۵)

۲۔ قبوری شریعت اور شرکیہ افعال

شریعتِ اسلامیہ نے قبروں کو پختہ کرنا، ان پر مزارات تعمیر کرنا ناجائز قرار دیا تھا مگر صوفیاء کا کام ہی چونکہ کشفِ قبور اور مزارات پر چلہ کشیوں پر منحصر تھا۔ لہٰذا اس طرح کا اسلام یہاں برصغیر میں رائج ہو گیا۔ پروفیسر سلیمان اظہر سیرت محمد بن عبدالوہاب کے مقدمہ میں اس صورتِ حال کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :

"عوام عموماً ہندومت سے تائب ہو کر صوفیاء کے توسط سے مسلمان ہوئے تھے لیکن تبدیلیٔ مذہب سے ان کی معاشرت میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ پہلے مندروں میں بتوں کے سامنے سربسجود تھے تو اب مقابر سجدہ گاہ بن گئیے پہلے دیوتاؤں کے سامنے دستِ دعا دراز کیا جاتا تھا، تو اب صوفیاء اور پیروں سے مرادیں مانگی جانے لگیں۔ احکام اسلام کی پابندی اور اعمالِ حسنہ کی کوئی قیمت نہ تھی۔ روحانی مدارج شرکیہ وظائف قبروں[1] پر چلہ کشی اور مرشد کی توجہ کے محتاج ہو کر رہ گئے تھے۔" (مقدمہ سیرت محمد بن عبدالوہاب، ص ۵)

پھر ان بزرگوں کی غیب دانی، حاجت روائی، مشکل کشائی اور تصرف فی الامور اور تصورِ شیخ جیسے مشرکانہ عقائد اس قدر عام ہوتے کہ کوئی ایسی باتوں کو شرک سمجھتا بھی نہ تھا۔ اس ظلمت کدہ کفر و شرک میں چند علماء صوفیاء مثلاً

---

[1] شریعتِ اسلامیہ نے کسی دیوی کے چرنوں میں ڈنڈوت بجا لانے اور کسی قبر پر چلہ کاٹنے یا معتکف ہونے دونوں کو شرک قرار دیا ہے۔ پھر صوفیاء کے برصغیر کے مسلمانوں پر جس احسانِ عظیم کا تذکرہ جناب خورشید احمد گیلانی صاحب نے فرمایا ہے۔ اس کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی نے بعض مشرکانہ افکار و نظریات پر کاری ضرب لگائی مگر چوں کہ ان کا دامن بھی طریقت میں الجھا ہوا تھا۔ اس لئے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہو سکے۔

۳۔ غیر مسلموں کے ساتھ مخلوط معاشرت

ان بزرگوں نے الخلق عیال اللہ کی غلط تعبیر[1] پیش کر کے ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں سب کو اپنی خانقاہوں میں جمع کر لیا تھا اور ایک ایسا مخلوط معاشرہ پیدا کیا جو اپنے خیالات، عقائد اور مذہب کے مختلف ہونے کے باوجود ان بزرگوں کو یکساں عزت و تکریم کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اور یہی دینِ طریقت کا وہ عنصر ہے جو دینِ طریقت کو اسلام سے جدا کر دیتا ہے۔ خلیق نظامی صاحب اپنی کتاب "تاریخ مشائخ چشت" میں اس حقیقت کو یوں پیش فرماتے ہیں:

"اگر تاریخ کے اشاروں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سماجی نظام مشائخ چشت کی کوششوں کا مرہونِ منت تھا۔ انہوں نے ان علاقوں میں بسنے والے مختلف الخیال اور مختلف المذاہب لوگوں میں اتحادِ عمل اور اتحادِ فکر پیدا کیا اور ان منتشر طبقوں کو ایک ایسے سماجی رنگ میں رنگ دیا جس نے ایک مضبوط معاشرہ کی شکل اختیار کر لی۔ ان بزرگوں کی خانقاہوں میں ہندو اور مسلمان سب ہی جمع ہوتے تھے۔ ان مشائخ نے ان اختلافات کے پردوں کو ہٹا کر ان میں ہم دلی اور ہم زبانی پیدا کی اور عمدہ سماجی ماحول پیدا کر دیا۔"

(تاریخ مشائخ چشت، خلیق نظامی، ص ۱۹۷)

نیز شیعوں کے فرقہ اسماعیلیہ کے ایک تذکرہ نگار اپنی تصنیف نور مبین میں رقمطراز ہیں کہ:

"پیر صدرالدین (م ۸۔ رجب ۸۱۹ھ) نے ہندوستان واپس آکر امام حاضر اسلام شاہ کی زیارت کے بعد خود مختارانہ اسمٰعیلی مذہب کی دعوت کو نہایت زور سے کرنا شروع کیا۔ نتیجۃً تین شہروں میں بڑی جماعتیں قائم ہوگئیں۔ پنجاب جماعت کے مکھی سیٹھ شام داس لاہوری، کشمیر جماعت کے مکھی سیٹھ تلسی داس، اور سندھ جماعت کے مکھی ترکیم کو قائم کیا اور ضلع سندھ کے شہر کوٹری میں پیر صدرالدین کی حاضری میں پہلا جماعت خانہ تعمیر ہوا۔ اور مال واجبات حضرت امام زمانہ کے حق کو تمام جماعتوں سے وصول کر کے پیر صدرالدین نے ایران میں امام کی خدمت میں مریدوں کے ذریعہ بھجوایا۔ . . . پیر صدرالدین ہندوستان کے اولیاء اللہ میں سید صدرالدین الحسینی کے نام سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے بارہ قبائل کے آدمیوں کو فہمائش کر کے امام زمان کا تعارف

---

[1] الخلق عیال اللہ کی صحیح تعبیر کتاب ہذا کے ص ۲۵۰ پر ملاحظہ فرمائیے۔

کرایا تھا۔ اس لیے انہیں باؤگر بھی کہتے ہیں۔ ہنود کے قدیم وید شاستر کی انہیں خوب واقفیت تھی۔ اس لیے پیر صدر الدین، ہر چند اور سوہ دیو یعنی بڑے درویش کے نام سے بھی مشہور ہیں (نور مبین ص۴۸۷-۴۸۸ مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند بمبئی)

مندرجہ بالا اقتباس بار بار پڑھیئے اور دیکھئے کہ ہمارے اولیاء اللہ اور پیر جو ہندوؤں کو مسلمان بناتے تھے۔ تو وہ کس قسم کا اسلام ہوتا تھا۔ مسجد کے بجائے جماعت خانے بنائے جاتے تھے۔ جن میں ایسے نو مسلم اکٹھے ہوتے تھے۔ جہاں بالادستی ہندوؤں کی ہی ہوتی تھی۔ مکھی دراصل جماعت خانے کا بڑا منتظم ہوتا ہے جو پنجاب کی جماعت کا بھی ہندو تھا اور کشمیر کی جماعت کا بھی، اور غالباً سندھ کا مکھی بھی ہندو ہی تھا۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بہتر نہ ہوگا کہ ہمارے اولیاء اللہ اور پیر ہندوؤں کو مسلمان نہیں بناتے تھے۔ بلکہ خود بھی ہندو بن جاتے تھے۔ جیسا کہ صدر الدین، ہر یش چندر یا سوہ دیو (بڑا درویش) کے نام سے بھی مشہور ہیں۔

برِ صغیر میں مندرجہ بالا اوصاف سے متصف طرز کی اشاعتِ اسلام کرنے والے مندرجہ ذیل صوفیاء کے نام قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ معین الدین چشتی سنجری اجمیری (م ۶۳۳ھ) ۲۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م ۶۳۴ھ)
۳۔ مخدوم علاؤ الدین صابر کلیری (م ۶۹۰ھ) ۴۔ بابا فرید گنج شکر (م ۶۶۴/۶۶۸ھ)
۵۔ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی (م ۷۵۷ھ) ۶۔ شیخ نظام الدین اولیاء (م ۷۲۵ھ)
۷۔ بہاؤ الدین زکریا ملتانی (م ۶۶۷ھ) ۸۔ سید محمد گیسو دراز (م ۸۲۵ھ)
۹۔ شیخ رکن الدین ابو الفتح ملتانی (م ۷۳۵ھ) ۱۰۔ شیخ صدر الدین عارف (م ۶۸۴ھ)
۱۱۔ شیخ جلال الدین تبریزی (م ۶۴۲ھ) ۱۲۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت (م ۷۸۵ھ)
۱۳۔ بو علی قلندر (م ۷۲۴ھ) ۱۴۔ سید محمد غوث گیلانی قادری (م ۹۲۳ھ)
۱۵۔ پیر صدر الدین (م ۸۱۹ھ) ۱۶۔ لال شہباز قلندر
۱۷۔ منگھو پیر المعروف مگر مچھ پیر (ہندو انہیں لالہ جے راج کے نام سے مانتے تھے)۔

چونکہ یہ بزرگ صوفیاء موجودہ حکومت کے وفادار ہوتے تھے اور کسی بھی غیر شرعی حکومت کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنا اُن کی تعلیمات سے خارج تھا۔ لہٰذا یہ گروہِ صوفیاء سلاطینِ وقت کا ہمیشہ سے منظورِ نظر رہا ہے۔ سلاطین وقت اُن کا اسی وجہ سے احترام کرتے، اُن کے آستانوں اور مزاروں پر حاضر ہوتے اور اُن کی خانقاہوں کے لئے جاگیریں وقف کر دیا کرتے تھے۔ تاکہ یہ حضرات اُن کی حکومتوں کو مضبوط و مستحکم بنانے کے سلسلہ میں موثر کردار

ادا کرتے رہیں اور قوم کو اسی طرح کے اشغال میں مصروف و منہمک رکھیں تاکہ سیاسی صورتحال میں مداخلت کی طرف انہیں بھولے سے خیال بھی نہ آسکے۔ مزارات اور خانقاہوں کے ساتھ جاگیروں کا الحاق آج بھی اس حقیقت کا زندہ ثبوت مہیا کر رہا ہے۔

ابتداء میں کچھ صوفیاء ایسے بھی تھے جو سرکاری درباروں میں آمدورفت کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ البتہ ان کے عطا کردہ وظائف اور جاگیریں قبول فرما لیا کرتے تھے مگر بعد میں آنے والے بزرگوں نے یہ ریت بھی ختم کر دی اور سرکاری درباروں سے باقاعدہ مراسم بھی شروع کر دیئے۔

۱۱۔ صوفیاء کی تعلیم و تربیت کا ردِ عمل (بھگتی تحریک)

اب ہندوؤں نے یہ سوچا کہ اگر مسلمان صوفی اور بزرگ اپنی خانقاہوں میں ہندوؤں کو رکھ سکتے ہیں تو آخر ہم اپنے تیرتھوں میں مسلمانوں کو کیوں نہیں رکھ سکتے۔ پھر چند باتیں ایسی بھی تھیں جو ان سب مذاہب میں مشترک تھیں، مثلاً:

۱۔ اگر مسلمان صوفیاء اتحاد و حلول کے قائل تھے تو ہندو رشی منی سادھو، سنت بھی اسی اتحاد و حلول کے قائل تھے۔

۲۔ اگر مسلمان فقراء کرامات دکھلا سکتے تھے تو اس طرح کی کرامات جوگیوں اور رشیوں منیوں کے ہاں بھی موجود تھیں۔

۳۔ ہندو اپنے دیوی دیوتاؤں کی (جو ان کے بزرگوں کے مجسمے ہوتے تھے) حیاتِ جاودانی تسلیم کرتے تھے۔ جبکہ مسلمان اپنے فوت شدہ بزرگوں کی حیاتِ جاودانی کے قائل تھے اور جہاں تک حاجت روائی اور مشکل کشائی کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں بھی دونوں یکساں تھے۔ ہندو اپنے دیوی دیوتاؤں کے سامنے نذر و نیاز پیش کرتے اور مرادیں مانگتے تھے، تو مسلمان بھی یہی کام اپنے بزرگوں کی قبروں اور آستانوں سے لیا کرتے تھے۔ اس طرح غیر اللہ سے حاجت روائی اور مشکل کشائی پر بھی دونوں کا اتحاد ہو جاتا ہے اور مسلمان بزرگوں نے انہیں یہ سمجھایا تھا کہ اگر نذر و نیاز اور مرادیں دیوی دیوتاؤں کے سامنے پیش کی جائیں تو یہ عین شرک ہے مگر وہی کام اگر قبروں پر سرانجام دے لئے جائیں تو اس سے توحیدِ الٰہی میں چنداں خلل نہیں پڑتا۔

البتہ ایک بات مابہ النزاع ضرور تھی اور وہ تھی ذات پات کی تمیز۔ جس کا اسلام میں کوئی تصور نہ تھا اور فی الحقیقت فرد تر ہندو طبقہ کو اسلام کی طرف مائل کرنے والی یہی چیز تھی۔

اب ہندوؤں نے یہ سوچا کہ اگر ہم ذات پات کی تمیز کو ختم کر دیں تو ہم مسلمان صوفیاء کی اس اشاعتِ اسلام کا سدِ باب کر سکتے ہیں۔ رہی صوفیاء کی توحیدِ الٰہی تو ایسی توحید جس میں صرف یہ فرق ہو تو بتوں، دیوی دیوتاؤں کے بجائے قبروں کے بزرگوں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے تو ایسی توحید انہیں بھی گوارا تھی۔ چنانچہ ہندوؤں کے کچھ پیروں فقیروں نے کمر ہمت باندھی اور بھگتی تحریک کے نام سے اس مشن کا آغاز کیا گیا۔ چند ایک ایسے ہندو اولیاؤں کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:

۱۔ رامانج

یہ بھگتی تحریک کے بانی ہیں ۱۰۱۶ء عیسوی میں مدراس کے ایک نواحی گاؤں میں ایک برہمن کے گھر پیدا ہوئے (یاد رہے کہ پہلے بزرگ صوفی شیخ اسمٰعیل بخاری ۱۰۰۵ء میں برصغیر میں وارد ہوئے تھے) وہ وحدانیت کے حامی تھے۔ آپ کے نزدیک برہما اور ایشور ایک ہی ہے اور وہی روحِ اعظم ہے اس کی ذات وصفات میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ ہر فعل سے مبرا ہے۔ اسی سے روح اور مادہ نکلتے ہیں۔ روح خدا کو صرف بھگتی (ریاضتِ شاقہ) سے حاصل کر سکتی ہے پہلی منزل ادائے فرض ہے، دوسری منزل ریاضت ہے اور تیسری بھگتی۔ یعنی آپ نے شریعت و طریقت دونوں کی پابندی کو اصلی عبادت اور باعثِ نجات قرار دیا اگرچہ آپ ذاتوں کی تقسیم کے قائل تھے، لیکن آپ نے شودروں اور چنڈالوں کے حقِ عبادت کو تسلیم کیا۔

۲۔ سوامی رامانند

۱۲۹۹ء میں الٰہ آباد میں ایک برہمن کے ہاں پیدا ہوئے۔ رامانج کے پانچویں خلیفہ تھے۔ انہوں نے اپنے گرو (روحانی پیشوا) کے بعد اگلا قدم یہ اٹھایا کہ ذات پات کی بھی سخت مخالفت کی اور زبانِ سنسکرت کو بھی ترک کر کے عام زبان میں وعظ کرتے۔ ہر ذات کے لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ انہوں نے تمام تیرتھوں کا سفر کیا۔ رامچندر اور سیتاجی کو وشنو کا مظہر (اوتار) قرار دے کر ان کی پوجا کو رواج دیا۔ ان کے ۱۲ چیلے (خلفاء) بڑے مشہور ہیں۔

۳۔ سوامی ولبھ اچاریہ

دکن کے ایک برہمن کے ہاں ۱۴۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ کم عمری میں ہی علم وفضل میں کمال حاصل کیا۔ کرشن جی کو وشنو کا اوتار قرار دیتے تھے۔ ولبھ اچاریہ نے ریاضت نفس کشی اور ترکِ دنیا کی تعلیم دی۔ وہ بھگتی (مجاہدہ و ریاضت) کو دولت کے جال سے نکلنے کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک کرشن اور رادھا کی محبت میں شریک ہونا دائمی مسرت اور بھگتی کا آخری مقصد تھا۔

۴۔ سوامی چے تینیہ
بنگال کے ایک برہمن کے ہاں ۱۴۸۵ء میں پیدا ہوئے ۲۵ برس کی عمر میں تارک الدنیا ہو کر سنیاسی بن گئے۔ بھگتی کے مشہور پرچارک تھے۔ ملک بھر میں دورہ کر کے پریم اور شانتی کا پرچار کرنے لگے۔ ان میں بلا کی کشش و جاذبیت تھی۔ ان کی تعلیم تھی کہ کرشن ہر آتما میں موجود ہے۔ اس لئے ہر ذی رُوح سے محبت کرو۔ وہ ذات پات کی تمیز کے قائل نہیں تھے۔ اچھوتوں اور چنڈالوں کو گلے لگا لیا کرتے تھے۔ آج تک لاکھوں ہندو انہیں سری کرشن کا اوتار (مظہر) مانتے ہیں۔

۵۔ بھگت کبیر
۱۴۴۰ء میں ایک برہمن بیوہ کے ہاں پیدا ہوئے جو انہیں بنارس کے ایک تالاب کے کنارے چھوڑ گئی۔ وہاں سے نیرو نامی ایک جولاہا اٹھا کر اپنے گھر لے آیا۔ نیرو اور اس کی بیوی نے انہیں اپنا متبنّٰی بنا لیا اس طرح بھگت کبیر نے ایک مُسلم گھرانے میں پرورش پائی۔ وہ رامانند کے چیلوں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ تذکرہ اولیائے ہند میں ان کا نام شیخ کبیر مرقوم ہے۔ انہوں نے اسلامی تصوف کے خیالات بھیکا چشتی اور شیخ تقی سہروردی اور ہندو ویدانت کے تخیلات رامانند سے سیکھے اور دونوں قوموں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ وہ وحدانیت کے علمبردار اور بُت پرستی کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے ذات پات کی تمیز اور چھوت چھات کو گمراہ کن قرار دیا اور عرفان یا معرفتِ الٰہی پر بہت زور دیا۔ ان کی پاکیزہ تعلیمات کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے لوگ ان کے مرید تھے۔ ہندو انہیں کبیر پنتھی اور مسلمان انہیں شیخ کبیر کہتے تھے۔ اسرارِ معرفت اور حقائقِ زندگی سے معمور ان کے سادہ اور دلآویز دوہے آج بھی برِ صغیر کی ادبی میراث کا ایک انمول حصہ ہیں۔

۶۔ باباگورو نانک
۱۴۶۹ء میں ضلع شیخوپورہ کے ایک قصبہ تلونڈی (ننکانہ صاحب) میں پیدا ہوئے۔ ۳۰ سال کی عمر میں تارک الدنیا ہو کر دُور دُور کے ممالک کی سیاحت اور وہاں کے تیرتھوں، خانقاہوں اور مقدس مقامات پر جا کر سادھوؤں، سنتو یوں کی صحبت سے استفادہ کیا۔ پھر اپنے مسلک کی تبلیغ شروع کر دی اور بھگت کبیر کے انداز پر نہ صرف ذات پات بلکہ اختلافِ مذاہب کی بھی مخالفت کی۔ آپ کے خیالات پر اسلام کا گہرا اثر تھا۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں مسلمانوں کی مذہبی کتب اور متصوفانہ خیالات سے بہت استفادہ کیا۔ چنانچہ آپ کے خیالات میں اسلامی تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کی وسیع المشرب تعلیمات نے آگے چل کر سکھ مذہب کی شکل اختیار کر لی۔ اگرچہ مُسلم حکومت سے سکھوں کا تصادم بھی ہوا لیکن سکھ آج تک توحید پرستی کے قائل بُت پرستی کے دشمن ہیں۔ ان کی عبادت و ریاضت اور اوراد و وظائف کے طریقے بڑی حد تک مسلمانوں سے

ملتے جلتے ہیں۔ آپ نے ۱۹۳۸ء میں کرتار پور کے مقام پر وفات پائی۔

مندرجہ بالا اقتباسات میں ہم نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے اضافہ نہیں کیا البتہ اختصار ضرور کیا ہے اور یہ سب اقتباسات تاریخ پاک و ہند مصنفہ عبداللہ ملک سے لئے گئے ہیں۔ اب آپ خود ہی ملاحظہ فرما لیجئے کہ مسلمان صوفیوں اور ہندو سادھوؤں اور سنتوں کے طریق تعلیم و تربیت میں کس قدر یگانگت تھی وہی ترک دنیا، وہی ریاضت و مجاہدات، وہی اتحاد و حلول کے عقیدے، وہی اسرار معرفت اور عرفان الٰہی کے سبق، ایک ہی قسم کے اوراد و وظائف کے طور طریق، خانقاہوں اور تیرتھوں میں یکساں طریق تربیت۔ اگر کچھ فرق ہے تو ناموں کا۔ اسی حقیقت کو کسی مسلمان صوفی شاعر نے یوں بیان کیا کہ

ملتِ عشق از ہمہ ملت جدا ست　　عاشقاں را مذہب و ملت خدا ست

اور عبدالغفور عرشی صاحب اپنی کتاب ریاض السالکین کے صفحہ ۲۵۶ پر لکھتے ہیں:

ہو گیا میں بری حد و ملاد سے نہ خیال ثواب عذاب رہا　　نہ تو مسلم رہا نہ ہی کافر رہا، سوا عشق کے میرا ایمان نہ رہا

اور کسی دریدہ دہن شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

در مذہب عاشقاں یک رنگ　　ابلیس و محمد ہست ہم سنگ

یعنی عاشقوں کے مذہب میں ابلیس لعین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم سنگ و ہم وزن ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک الخرافات۔ (تذکرہ غوثیہ، ص ۲۵۵ بحوالہ رضاخانی مذہب، ص ۹۳)

پھر یہ بھی دیکھ لیجئے کہ مندرجہ بالا امور میں سے کوئی بات بھی تعلیمات اسلامیہ سے مطابقت نہیں رکھتی اور ایسا ہی اسلام ہمارے صوفیائے کرام نے برصغیر پاک و ہند ــــ اور اسی طرح بعض دوسرے ممالک ــــ میں پھیلایا تھا۔ گو آج کا مسلمان ان حقائق سے کسی حد تک آگاہ ہو چکا ہے اور پیری مریدی کے سلسلہ کا پہلا سا دم خم نہیں رہا۔ اور بعض حقیقت پسند صوفیہ نے ایسے باطل عقاید پر کڑی تنقید بھی کی ہے تاہم خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ابھی ایسے باطل افکار و نظریات اور عقائد و اعمال کو دور کرنے میں ابھی مزید کتنی مدت درکار ہوگی۔

باب (۸)

معجزات، کرامات اور استدراج

معجزہ کی غرض اور اقسام

معجزہ اور کرامت میں فرق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر کسی خرقِ عادت بات کا ظہور کسی نبی کی ذات سے ہو تو وہ معجزہ ہے اور اگر کوئی ایسی بات یا واقعہ کسی ولی سے صادر ہو تو وہ کرامت ہے۔ لہٰذا کرامت کا صحیح مفہوم متعین کرنے سے پہلے معجزہ اس کی حقیقت اور اقسام کو سمجھنا ضروری ہے۔ معجزہ کی بڑی اقسام دو ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ ایسا معجزہ جو کسی نبی کو اس کی نبوت کی دلیل کے طور پر عطا کیا جاتا ہے۔ پھر اس کی بھی دو ذیلی اقسام ہیں:

ا۔ ایسے معجزات جن کی حیثیت کسی حد تک دائمی ہوتی ہے اور نبی کو جب ضرورت پیش آتی ہے وہ ایسا معجزہ دکھلا سکتا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسے دو معجزے عطا ہوئے تھے۔ (۱) لاٹھی کا سانپ بن جانا اور (۲) یدِ بیضا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا اور جنات پر حکومت کرتے تھے۔ نیز پرندوں کی بولیاں سن اور سمجھ سکتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں میں لوہا موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔

انبیاء علیہم السلام کو اپنی نبوت کا دعویٰ پیش کرنا فرض ہوتا ہے۔ لیکن اولیاء اللہ کو اپنی ولایت کا دعویٰ تو دُور کی بات ہے۔ اس کا چھپانا بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا اولیاء اللہ کو اس دائمی قسم کی کرامات کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

(ب) ایسے معجزات جو ہوتے تو نبوت کی دلیل کے طور پر ہیں، لیکن اُن کی حیثیت عارضی اور وقتی ہوتی ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کا گلزار بن جانا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پتھر پر لاٹھی مارنا اور چشموں کا

پھوٹ نکلنا یا سمندر پر لاٹھی مارنا اور درمیان میں خشک راستہ بن جانا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور وفات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج اور انشقاقِ قمر وغیرہ اسی قبیل سے ہیں۔ نبی کو ایسے واقعات کا نہ پہلے سے علم ہوتا ہے، نہ اُن کے متعلق کوئی دعویٰ کر سکتا ہے۔

ج۔ ایسے معجزات جن کا خود کفار کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ایسے معجزات کبھی تو اللہ تعالیٰ عطا کر دیتے ہیں۔ جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے مطالبہ پر پہاڑ میں سے حاملہ اونٹنی برآمد ہوئی اور کبھی یہ مطالبہ اللہ تعالیٰ منظور نہیں فرماتے۔ جیسے کفارِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ آپ کے لئے یا تو سونے کا گھر ہو یا عمدہ قسم کا باغ ہو یا ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ کر کتاب لاؤ، وغیرہ۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ مطالبات تسلیم نہیں کئے اور نہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معجزات عطا فرمائے۔ اس قسم کے معجزات میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اگر کفار کے مطالبہ پر کسی نبی کو کوئی ایسا معجزہ دیا جائے اور وہ پھر بھی ایمان نہ لائیں، تو اُن پر عذاب الیم نازل ہوتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے آپ کو اس قسم کے معجزات عطا نہیں کئے گئے [اور اس طرح کی کرامات کی اولیاء اللہ کو بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

۲۔ ایسے معجزات جو کسی اہم دینی یا دنیوی غرض کو پورا کرنے کے لئے عطا کئے جاتے ہیں۔ اور اس قسم کے بکثرت معجزات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کئے گئے تھے۔ مثلاً جنگِ بدر میں آپ کا مٹھی بھر ریت کفار کی طرف پھینکنا۔ جس کو اللہ نے کفار کی آنکھوں تک پہنچا دیا اور وہ اندھے ہو گئے اور بالآخر شکست کھائی یا مثلاً دورانِ جہاد لشکرِ اسلامی سخت پیاسا ہو گیا۔ اور پانی کے آثار کہیں نظر نہ آتے۔ تو آپ نے پانی کے پیالہ میں اپنا دستِ مبارک ڈالا تو انگلیوں سے پانی کے سوتے پھوٹنے لگے۔ اور اس پیالہ سے سارا اسلامی لشکر سیراب ہو گیا۔ پھر بھی پانی ختم ہونے کو نہ آتا تھا (جیسا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے لئے چشمہ زمزم اور حضرت مریم علیہا السلام کے لئے ایک چھوٹی سی نہر جاری ہو گئی تھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور کا دوسرا واقعہ بھی دورانِ جہاد اور پیاس سے متعلق ہے۔ آپ نے ایک خشک اور دُبلی سی بکری پر ہاتھ پھیر کر اتنا دودھ دوہ لیا کہ اس سے آپ اور آپ کے سب صحابہ سیراب ہو گئے۔ جنگِ خندق کے دوران جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی تمام صحابہ بھی مشقت کرتے تھے اور کھانے کو کچھ نہ ملتا تھا اور سب بھوک سے نڈھال اور پیٹوں پر پتھر باندھے ہوئے تھے، تو اس دوران کسی صحابی نے صرف آپ کی دعوت کی۔ تو آپ نے چولہے پر رکھی ہنڈیا اور آٹا گوندھتے وقت آٹے میں اپنا لعابِ مبارک شامل کر دیا جس سے اتنی برکت ہو گئی کہ تمام مجاہدین نے سیر ہو کر کھانا

کھالیا۔ اس قسم کے واقعات اللہ کی طرف سے ہوتے اور برکت سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے کسی نہ کسی صورت میں تھوڑی بہت چیز موجود ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ضرورت کے مطابق اس میں نبی کی دُعا سے برکت ڈال دیتے ہیں۔ آپ کے بیشتر معجزات اسی قبیل سے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے۔ غزوہ تبوک کے دوران جب صحابہؓ کی رسد ختم ہونے لگی، تو آپؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

يَا رَسُوْلَ اللهِ اُدْعُهُمْ بِفَضْلِ اَزْوَادِهِمْ ثُمَّ	اے اللہ کے رسُول! لوگوں سے کہیے کہ بچا کھچا راشن لائیں۔
اُدْعُ اللهَ لَهُمْ عَلَيْهَا بِالْبَرَكَةِ فَقَالَ نَعَمْ. فَدَعَا	پھر اس پر آپ برکت کی دُعا فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا:
بِنِطَعٍ فَبَسَطَ ثُمَّ دَعَا بِفَضْلِ اَزْوَادِهِمْ. فَجَعَلَ	ٹھیک ہے۔" آپؐ نے ایک چمڑے کا دسترخوان منگوایا۔
الرَّجُلُ يَجِيْءُ بِكَفِّ ذُرَةٍ وَيَجِيْءُ الْاٰخَرُ بِكَفِّ	جو پھیلا دیا گیا۔ پھر لوگوں کو بچا کھچا راشن لانے کو کہا تو کوئی مٹھی بھر
تَمْرٍ وَيَجِيْءُ الْاٰخَرُ بِكَسْرَةٍ حَتّٰى اجْتَمَعَ عَلَى	چنے لاتا، کوئی مٹھی بھر کھجور اور کوئی روٹی کے ٹکڑے۔ حتیٰ کہ
النِّطَعِ شَيْءٌ يَسِيْرٌ فَدَعَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ	دسترخوان پر جو سامان جمع ہوا وہ تھوڑا ہی تھا۔ پھر آپؐ نے اس
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْبَرَكَةِ فَقَالَ: خُذُوْا فِيْ	پر برکت کی دُعا فرمائی۔ پھر فرمایا: اپنے اپنے برتن بھر کر لیتے جاؤ
اَوْعِيَتِكُمْ فَاَخَذُوْا فِيْ اَوْعِيَتِهِمْ حَتّٰى	لوگ برتن بھر بھر کر لے جانے لگے۔ حتیٰ کہ لشکر میں کوئی ایسا
مَا تَرَكُوْا فِي الْعَسْكَرِ وِعَاءً اِلَّا مَلَئُوْهُ قَالَ	برتن نہ رہا جس کو بھرا نہ گیا ہو۔ (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ
فَاَكَلُوْا حَتّٰى شَبِعُوْا وَ	راوی) کہتے ہیں کہ پھر سارے لشکر نے سیر ہو کر کھایا مگر پھر
فَضَلَتْ فَضْلَةٌ (بخاری کتاب الجہاد والسیر باب حمل الزاد ....)	بھی خوراک بچ رہی۔

یا پھر ایسے معجزات ملتے ہیں مثلاً ہجرت کے وقت سراقہ کا گھوڑا دھنس گیا۔ غارِ ثور کے منہ پر مکڑی نے جالا تن دیا۔ رکانہ پہلوان نے آپؐ کو کُشتی کی دعوت دی، تو آپؐ نے اسے تین بار پچھاڑ دیا۔ یہ سب واقعات و معجزات کوئی نہ کوئی غرض پوری کر رہے ہیں پیغمبر کو پہلے سے اس قسم کے معجزات کے صدور کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ اور معجزات یا خرقِ عادت امُور کی یہی قسم ہے جس کا صدور اولیاء سے ممکن ہے اور یہ کرامت کہلاتی ہے۔

کرامت کا مفہوم

کرامت کے لفظی معنی "بزرگی" ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ کبھی کبھار کسی بزرگ سے ایسا واقعہ صادر ہو جائے جو عام حالات میں ناممکن ہو۔ مثلاً ایک پہلوان ہے۔ جو پانچ مَن وزن اٹھا سکتا ہے وہ اگر کسی وقت پانچ مَن کا وزن اٹھا لے تو یہ اس کی کرامت

نہیں۔ البتہ ایک ایسا شخص جو صرف ایک من بوجھ اٹھانے کی قوت رکھتا ہے اگر وہ کسی وقت اللہ کی مہربانی سے کسی معرکہ، مقابلہ یا ضرورت کے وقت پانچ من کا بوجھ اٹھائے تو یہ کرامت ہوگی۔ حضور اکرم ﷺ نے رکانہ پہلوان کو تین بار مقابلہ میں پچھاڑ دیا۔ یا جنگِ خندق کے موقع پر ایک ایسے پتھر کو توڑ دیا جسے کئی صحابہ مل کر بھی نہ توڑ سکے، تو یہ معجزہ تھا۔ اور اگر یہی واقعہ کسی دوسرے بزرگ سے واقع ہو تو کرامت کہیں گے۔

انہی واقعات سے مسئلہ علمِ غیب اور تصرف فی الامور کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ سب باتیں کسی نبی یا ولی کی ذات کا خاصہ ہرگز نہیں۔ اللہ اگر چاہے تو کسی خاص موقع پر نبی کو وحی کے ذریعہ اور ولی کو الہام کے ذریعہ مطلع کر دے تو یہ اس کی مہربانی ہے۔ نہ کرے تو بھی اس کی مرضی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو مطلع کر دیا کہ ایک عورت حاطب بن ابی بلتعہ کا رقعہ لے کر مکہ کو جا رہی ہے۔ مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے افک کے موقع پر آپ پورے ایک ماہ پریشان رہے اور وحی نہ ہوئی۔ حضرت یعقوب کو مصر سے روانہ ہونے والے کی خوشبو تو آ گئی۔ مگر کنعان ہی کے ایک کنویں میں پڑے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی میں ہلکان ہوئے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا۔ تو ایسے واقعات کبھی کبھار پیش آتے ہیں روزانہ معمول کی بات نہیں ہوتی۔ چنانچہ پورے دورِ صحابہ میں ایسی کرامات کی دس بارہ سے زیادہ مثالیں نہیں ملتیں۔ اب دیکھئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ چوبیس ہزار کے لگ بھگ تھی، جو وہاں موجود تھے اور وفاتِ نبویؐ کے وقت صحابہ کی کل تعداد چار لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ پھر یہ دورِ صحابہ بھی پوری ایک صدی یعنی ۱۱۰ھ تک پھیلا ہوا ہے مگر ایسے واقعات صرف دس بارہ ہیں۔ پھر ان میں سے بھی بعض کی صحت محلِ نظر ہے۔ صحاح ستہ میں صحابہ کی کرامات علیحدہ عنوان کے تحت مذکور نہیں۔ خطیب بغدادی نے آٹھویں صدی میں مشکوٰۃ المصابیح کو مرتب کیا، تو اس میں علیحدہ باب الکرامات کا اندراج کیا۔ یہ کل بارہ واقعات ہیں جو حدیث کی درجہ اول، دوم، سوم، چہارم سب قسم کی کتابوں سے اکٹھے کیے گئے ہیں۔ واضح رہے کہ اوّل درجہ کی کتب بخاری اور مسلم ہیں۔ دوم درجہ کی باقی صحاح ستہ کی چار کتابیں۔ باقی کتب احادیث کی روایات علیٰ قدرِ مراتب سوم اور چہارم درجہ کی شمار ہوتی ہیں۔ درجہ سوم اور چہارم کی بیشتر احادیث ناقابلِ اعتماد و احتجاج ہیں۔ اب جو بارہ واقعات مشکوٰۃ میں درج ہیں۔ ہم انہیں انہی درجات کی ترتیب سے یہاں پیش کر رہے ہیں۔

***

کراماتِ صحابہ

اوّل درجہ کی کتب سے

(۱) عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ اصحاب صفہ فقیر لوگ تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس دو شخصوں کا طعام ہو وہ تیسرے کو بھی لے جائے اور جس کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہو وہ پانچویں بلکہ چھٹے کو بھی لے جائے۔ سو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو تین شخصوں کو لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس شخصوں کو لے گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رات کا کھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں کھایا۔ پھر عشار کی نماز آپ کے ساتھ پڑھی۔ نماز کے بعد پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا کھایا۔ پھر کافی رات گئے گھر آئے تو بیوی نے کہا مہمانوں کا پتہ نہیں۔ آپ نے پوچھا "انھوں نے ابھی کھانا نہیں کھایا"۔ بیوی نے کہا "وہ کہتے تھے جب تک آپ نہ آئیں گے ہم کھانا نہ کھائیں گے۔" اس بات سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رنجیدہ ہو گئے اور کہا کہ میں تو کبھی کھانا نہ کھاؤں گا۔ پھر بیوی نے بھی اور اسی طرح مہمانوں نے بھی کھانا نہ کھانے کی قسم اٹھائی۔ تب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے یہ تو شیطان کا کام ہے۔ آپ نے کھانا منگا کر کھانا شروع کیا اور مہمانوں نے بھی کھایا۔ ہوتا یہ تھا کہ جتنا کھانا وہ کھاتے اُس سے زیادہ نیچے سے اُبھر آتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سے کہا "اے بنو فراس کی بہن! یہ کیا؟" بیوی کہنے لگی۔ "میری آنکھوں کی ٹھنڈک! یہ کھانا پہلے سے تین گنا زیادہ ہو گیا ہے۔" پس ان سب نے کھانا کھایا۔ پھر اس میں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بھیجا۔ روایت کیا گیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کھانے میں سے کھایا۔

اس باب مندرج ۱۲ روایات میں سے سب سے معتبر روایت یہی ہے جو کھانے میں برکت سے تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ روایت بخاری و مسلم دونوں نے روایت کی ہے۔ اب یہ برکت مہمانوں کی وجہ سے تھی۔ یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وجہ سے یا آپ کی بیوی کی وجہ سے یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی وجہ سے؟ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کرامت کو کسی خاص ایک شخص سے منسوب کرنا بھی مشکل ہے اور قرینِ قیاس بات یہ ہے کہ یہ برکت ہر ایک کے خلوص کی وجہ سے اجتماعی شکل میں صادر ہوئی تھی۔

۲۔ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک عورت اروی بنتِ اوس نے سعید بن زید بن عمرو بن نفیل

سے جھگڑا کیا اور مروان بن حکم (گورنر مدینہ) کے پاس دعوے کر دیا کہ سعید نے میری زمین کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ سعید بن زیدؓ کہنے لگے۔ "میں کیسے قبضہ کر سکتا ہوں جبکہ میں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔" مروان نے کہا: "آپؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کیا سنا ہے؟" حضرت سعید رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ "جس شخص نے از راہِ ظلم کسی کی ایک بالشت زمین پر قبضہ کر لیا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سات زمینوں تک اس کے گلے کا طوق بنا دے گا۔"
مروان کہنے لگا: "میں اب یہ سننے کے بعد تجھ سے ثبوت کا مطالبہ نہیں کرتا۔" حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کہنے لگے "یا اللہ! اگر یہ عورت جھوٹی ہے تو اس کی بینائی کو اندھا کر اور اس کی زمین میں اسے موت دے۔"
حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ (راوی) کہتے ہیں کہ وہ عورت فی الواقع اندھی ہو گئی۔ ایک دن جب وہ اپنی زمین میں چل رہی تھی تو ایک گڑھے میں گر کر مر گئی (متفق علیہ) اور مسلم میں محمد بن زید بن عبداللہ بن عمرؓ سے اسی مضمون کی روایت ہے کہ انہوں نے اس عورت کو دیکھا کہ اندھی ہو گئی تھی۔ دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر چلتی اور کہتی تھی کہ "مجھے سعید کی بد دعا لگ گئی۔" اس کے گھر میں ہی ایک کنواں تھا اور اسی جگہ کے لیے اس نے جھگڑا کیا تھا وہ اس میں گر گئی اور وہ اس کی قبر بن گیا۔"

یہ روایت متفق علیہ ہونے کی وجہ سے معتبر ضرور ہے لیکن اصطلاحی معنوں میں کرامت ہے ہی نہیں۔ مقدمہ یا جھگڑا کے درمیان ظالم یا مظلوم کی بد دعا ہے۔ جیسا کہ لعان کی صورت میں بھی ہوتی ہے اور ایسی بد دعا بسا اوقات اپنا رنگ دکھلاتی ہے۔

(۳) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب جنگ اُحد کا وقت آیا تو میرے باپ نے رات مجھے بلایا اور کہا مجھے یوں گمان ہوتا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں پہلے پہلے شہید ہو جانے والوں میں سے ہوں گا اور رسول اللہ ﷺ کی ذات کے بعد تم سب سے زیادہ میرے عزیز ہو اور دیکھو! مجھ پر قرضہ ہے اسے ادا کرنا اور اپنی بہنوں سے بہتر سلوک کی میں تمہیں وصیت کرتا ہوں۔" پھر جب جنگ شروع ہوئی تو میرا باپ پہلا شہید تھا جسے میں نے ایک اور شہید کے ساتھ قبر میں دفن کیا۔ (بخاری)
یہ روایت معتبر ہے لیکن یہ بھی معروف معنوں میں کرامت نہیں۔ یہ تو ایک مومن کی شہادت کی آرزو ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پورا فرما دیا۔

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اسید بن حضیرؓ اور عباد بن بشیرؓ ایک دفعہ اپنی کسی ضرورت کے

سلسلہ میں رات گئے تک رسول اللہ ﷺ سے باتیں کرتے رہے۔ جب جانے لگے تو رات گھپ اندھیری تھی۔ جب گھروں کو روانہ ہونے لگے تو ان دونوں کے ہاتھوں میں ایک ایک لاٹھی تھی۔ ان دونوں میں سے ایک کی لاٹھی روشن ہوئی۔ جس کی روشنی میں دونوں چلنے لگے اور جہاں دونوں کا راستہ جدا ہوتا تھا تو دوسرے کی بھی لاٹھی روشن ہو گئی۔ جس کی لو میں وہ چلنے لگا۔ یہاں تک کہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ (بخاری)

یہ روایت معتبر اور صحیح معنوں میں کرامت یا معجزہ ہے۔ اگر تو یہ رسول اللہ ﷺ کی برکت یا دعا سے ہوا تھا تو یہ معجزہ تھا۔ ورنہ یہ فی الواقعہ کرامت تھی جو ایک اہم ضرورت پوری کر رہی تھی اور اقرب الی الحق یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ آپ کا معجزہ تھا۔

دوسرے درجہ کی روایات

(۵) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "جب نجاشی (شاہِ حبشہ) مر گیا تو ہم سے لوگ بیان کرتے تھے کہ نجاشی کی قبر پر ہمیشہ نور نظر آتا ہے۔" (ابوداؤد)

ابوداؤد کی یہ روایت معتبر ہے لیکن اس میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب نجاشی کا اسلام لانا ہی محل نظر ہے، تو یہ کرامت کیسے ہوئی۔ دوسرے یہ لوگوں کی باتیں ہیں۔ جن کا تعلق زیادہ حسن ظن سے تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نہ اس بات کی تصدیق کرتی ہیں نہ تکذیب۔

(۶) ابو خلدہ (تابعی)، کہتے ہیں کہ میں نے ابو العالیہ سے کہا، "کیا حضرت انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے حدیثیں سنی ہیں؟" تو ابو العالیہ کہنے لگے کہ "حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بارہ سال رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی اور رسول اللہ نے اُن کے حق میں دعا فرمائی۔ اُن کا ایک باغ تھا جو سال میں دو بار پھل لاتا اور اس باغ سے کستوری کی خوشبو کی طرح خوشبو آتی تھی۔" اسے ترمذی نے روایت کیا اور کہا کہ یہ حدیث "حسن غریب ہے۔"

یہ حدیث ایک تو صحیح حدیث کے تقاضے پورے نہیں کرتی۔ امام ترمذی جس حدیث کو حسن غریب کہہ دیں وہ عموماً ناقابل احتجاج ہی ہوتی ہے۔ دوسرے اگر یہ صحیح بھی تصور کر لی جائے تو یہ رسول اللہ ﷺ کی دعا کا نتیجہ اور برکت ہے۔ اس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی کیا کرامت ہے؟ یہ ہمیں سمجھ نہیں آئی۔

تیسرے اور چوتھے درجہ کی روایات

یہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ صحاح ستہ کے بعد باقی کتب احادیث کی روایات میں سے بیشتر ناقابلِ اعتماد

اور ناقابلِ احتجاج ہیں اور جو روایات واقعی صحابہ کی کرامات ثابت کرتی ہیں وہ کچھ اسی قسم کی ہیں۔ مثلاً:

(۷) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب صحابہؓ نے آپ کو غسل دینا چاہا، تو صحابہؓ کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آپؐ کو ایسے ہی ننگا کر کے غسل دیا جائے، جیسے دُوسروں کو دیا جاتا ہے یا کپڑوں سمیت غسل دے دیا جائے۔ جب اختلاف ہوا تو اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ پر نیند طاری کر دی۔ حتیٰ کہ اُن کی ٹھوڑیاں سینوں پر آگئیں۔ اسی حالت میں گھر کی ایک جانب سے کسی کہنے والے نے، جسے کوئی نہیں جانتا تھا، کہا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کپڑوں سمیت غسل دو۔" پس صحابہؓ نے کپڑوں سمیت غسل دینا شروع کیا۔ آپ کی قمیص پر پانی گراتے پھر اسی قمیص سے بدن کو ملتے تھے۔ (بیہقی فی دلائل النبوۃ)

اب دیکھئے کہ اس روایت میں کرامت یا معجزہ "ہاتفِ غیبی کی ندا" ہے۔ یہ روایت اسنادی حیثیت سے جیسی بھی ہے یہ خیال رہنا چاہئے کہ بیہقی نے اسے نبوت کے دلائل میں بیان کیا ہے نہ کہ بطورِ کراماتِ صحابہ۔

(۸) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر تیار کیا جس پر ایک ساریہ نامی شخص کو سپہ سالار بنایا۔ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ کے دوران کہا یَا سَارِیَ الْجَبَلَ (اے ساریہ! پہاڑ کی طرف ہو جاؤ) پس ایک ایلچی لشکر سے آیا اور کہنے لگا۔ "اے امیرالمومنین! ہماری دشمن سے مڈھ بھیڑ ہو گئی تو اس نے ہمیں شکست دے دی۔ اس وقت ہم نے ایک پکارنے والے کی پکار سنی کہ یاساری الجبل تو ہم نے اپنی پشتیں پہاڑ کے ساتھ لگا لیں پس اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی۔ (بیہقی فی دلائل النبوۃ)

اس روایت کو امام بیہقی نے (پانچویں صدی ہجری) میں واقدی کذاب کی تاریخ مغازی سے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں درج کیا۔ یہ روایت دو سندوں سے مذکور ہے۔ پہلی سند میں ابن عجلان راوی مجروح اور منکر الحدیث ہے۔ اور دوسری میں فرات بن السائب منکر الحدیث ہے۔ (التاریخ الکبیر للبخاری، ج ۴، ص ۳)

(۹) ابوالجوزا کہتے ہیں کہ "ایک دفعہ مدینہ میں شدید قحط پڑ گیا۔ لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس شکایت کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کو دیکھو۔ اس کی چھت میں ایک روشندان بنا دو کہ قبر اور آسمان کے درمیان کوئی چھت نہ رہے۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا تو بارش ہوئی اور گھاس اُگی اور اُونٹ اس قدر موٹے ہوئے کہ چربی سے پھٹے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے اس سال کا نام عام الفتق پڑ گیا۔" (دارمی)

یہ روایت منقطع بھی ہے اور ضعیف بھی۔ امام بخاری کہتے ہیں فی اسنادہ نظر (التاریخ الکبیر للبخاری، ص ۱۸۰،۱۷، ج ۲) (میزان الاعتدال، ج ۱، ص ۱۲۹، تہذیب التہذیب، ج ۱، ص ۲۸۴)

۱۰۔ ابن المنکدر سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ کا ایک سفینہ نامی غلام زمین شام میں لشکر کا راستہ بھول گیا۔ یا کافروں کے ہاتھوں اسیر ہوا۔ پھر وہاں سے بھاگ نکلا اور لشکر کی تلاش میں تھا کہ ایک شیر یکدم ظاہر ہوا۔ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ نے کہا "اے ابوالحارث! (شیر کی کنیت) میں رسول اللہ ﷺ کا آزاد کردہ غلام ہوں اور میرے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے۔ شیر دم ہلاتا ہوا آگے آیا اور حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ پھر جب کوئی خوفناک آواز سنتا تو شیر اُس کی طرف قصد کرتا۔ پھر پہلو میں آکر آگے آگے چلنے لگتا۔ یہاں تک کہ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ لشکر میں پہنچ گئے پھر شیر واپس ہو گیا۔" (رواہ البغوی فی شرح السنۃ)

۱۱۔ سعید بن عبد العزیز سے روایت ہے کہ "جب حرہ کا واقعہ (۶۳ھ) پیش آیا تو مسجد نبوی میں تین دن نہ اذان دی گئی نہ جماعت ہوئی۔ اس دوران حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں ہی ٹھہرے رہے۔ آپ کو نماز کا وقت صرف اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ قبر نبوی سے ایک خفیف سی آواز سنتے تھے۔"[۱] (دارمی)

۱۲۔ نبیہہ بن وہب کہتے ہیں کہ حضرت کعب (احبار تابعی) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے تو رسول اللہ ﷺ کا ذکر چھڑ گیا۔ کعب کہنے لگے کہ کوئی دن ایسا نہیں چڑھتا کہ اس میں ستر ہزار فرشتے اُترتے ہیں اور قبر نبوی کو گھیر لیتے ہیں۔ اپنے پَر ملتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ یہاں تک کہ شام ہو جاتی ہے تو وہ آسمانوں کی طرف چڑھ جاتے ہیں۔ پھر اتنے ہی فرشتے اُترتے اور ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ زمین پھٹے گی (یعنی قیامت کو) تو آپ اسی حال میں قبر سے باہر نکلیں گے کہ ستر ہزار فرشتے آپ کو گھیرے ہوتے ہوں گے۔[۲] (دارمی)

مندرجہ بالا تفصیل ہم نے اس لئے پیش کی ہے کہ صحابہ کی کرامات کی تعداد اور صحیح پوزیشن واضح ہو جائے جو خوارق عادت باتیں اسنادی حیثیت سے قوی ہیں ان کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی ذات سے ہے یعنی وہ معجزات ہیں اور جن باتوں کا تعلق صحابہ یا تابعین (مثلاً کعب احبار) سے ہے۔

---

[۱] نمازوں کے اوقات کا تعین سورج سے اور رات اور فجر کی نماز کے اوقات کا تعین چاند ستاروں سے بھی ہو سکتا ہے۔ تو پھر اس خفیف سی آواز سے نمازوں کے اوقات معلوم کرنا عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ [۲] اگر یہ روایت صحیح بھی تسلیم کر لی جائے تو اس میں کسی صحابی کی کرامت کی کیا بات ہے؟

ان کی اسنادی حیثیت کمزور ہے اور ان سے احتجاج مشکل ہے۔

صحابہؓ اور تابعینؒ سے کرامات کا صدور کیوں نہ ہوا؟

اگرچہ بعض حقیقت پسند صوفیہ نے اس بات کا برملا اعتراف کر لیا ہے کہ کشف و کرامات ولایت کے لئے ضروری نہیں۔ مگر اولیاء اللہ کے تذکرے پکار پکار کر یہی کہتے ہیں کہ ولایت اور کشف و کرامات لازم و ملزوم ہیں۔ اور کشف و کرامات کی کمی بیشی ہی کسی ولی کی ولایت کا صحیح پیمانہ ہے۔ مولانا اللہ یار خان اپنی کتاب دلائل السلوک کے صفحہ ۱۷ پر فرماتے ہیں کہ تصوف کے لئے کشف و کرامات شرط نہیں۔ اور صفحہ ۲۰ پر اس میں کچھ لچک پیدا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خرقِ عادت امور نہ شرطِ ولایت ہیں نہ جزوِ ولایت۔ ہاں دلائل و علامات ولایت کی حیثیت سے بطورِ سند عطا کئے جاتے ہیں۔ اور صفحہ ۱۹۸ پر فرماتے ہیں کہ کشف و الہام کا ہونا تصوف کے لوازمات سے ہے۔ اس لئے کہ دین کو تسلیم کرنے کے ساتھ اس کے اہم جزو تصوف و احسان کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اسے تسلیم کیا تو کشف و الہام کو ماننا پڑے گا کیونکہ یہ لازم و ملزوم ہیں۔

گویا سچی بات آپ کے منہ سے نکل ہی گئی اب اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرون ثلٰثہ کے مسلمانوں سے کشف و کرامات کا صدور کیوں نہ ہوا، تو اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کا تعلق عوام کے قوت و ضعفِ ایمانی کے ساتھ ہے۔ ایمان قوی ہو تو کشف و کرامات کے صدور کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایمان میں ضعف آگیا تو ایسے امور کی زیادہ ضرورت پیش آئی۔ دورِ صحابہ میں ان حضرات کے ایمان نہایت قوی تھے۔ لہٰذا انہیں ایسی چیزوں کی ضرورت نہ تھی۔ بعد میں ایمان کمزور ہو گئے تو ان اسناد کا مطالبہ ہونے لگا.... دورِ صحابہ میں جب خود وحی موجود تھی۔ حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ آفتاب عالم تاب کی طرح برابر ضیا پاشی کر رہی تھی تو نائب وحی (کشف و الہام) کی کیا ضرورت تھی اور سورج کے مقابلے میں ان چاند ستاروں اور قندیلوں کی کیا ضرورت تھی۔ قاعدہ ہے کہ آفتاب کے غروب ہونے کے بعد فوری طور پر تاریکی نہیں چھا جاتی، بلکہ آہستہ آہستہ روشنی کم ہوتی ہے تاریکی بڑھتی اور پھیلتی جاتی ہے۔ یہی صورت صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے معاملہ میں پیش آئی۔ صوفیاء کرام نے بعد کی تاریکیوں میں روشنی پھیلانے کا اہتمام جاری رکھا۔ ان کے فیض سے کہیں کوئی چراغ روشن ہوا، کہیں شمع، کہیں کوئی ستارہ ابھرا، کہیں کوئی چاند نکلا۔ بہرحال ان کے دم قدم سے روشنی خواہ

کسی درجے کی سہی موجود رہی۔ بہرحال ہمیں یہ بتانا مقصود ہے کہ کشف و الہام کی کمی بیشی قوت و ضعف ایمانی کے تناسب سے ہوتی ہے۔ دورِ صحابہ کے بعد ہی کشف و کرامات کا اظہار اصولاً ہونا چاہیئے تھا اور ایسا ہی ہوا۔" (دلائل السلوک، ص ۲۰۰، ۲۰۱)

مولانا موصوف کے اقتباس بالا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دورِ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں نہ کشف و کرامات کی ضرورت تھی نہ ان چیزوں کا صدور ہوا۔ اور چونکہ کشف و الہام اور تصوف لازم و ملزوم ہیں۔ لہٰذا تصوف کی از خود نفی ہوگئی۔ بالفاظِ دیگر تصوف ایک بدعت ہے۔ پھر جب یہی بات ہم کہتے ہیں تو مولانا اس کا انکار کرکے دوسری تاویلوں میں مصروف ہوجاتے ہیں جن کا ہم جائزہ لے چکے ہیں۔

پھر آپ کے اس جواب میں بھی کئی باتیں محلِ نظر ہیں، مثلاً:

۱۔ آپ یہ فرماتے ہیں کہ کشف و کرامات کا تعلق ضعفِ ایمان کے ساتھ ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو کیا وجہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے آخری ایام میں بھی آپ سے بے شمار معجزات کا صدور رہا۔ مثلاً غزوہ تبوک ۹ھ میں دورانِ جنگ قلتِ رسد کا مسئلہ آپ کی برکت سے حل ہوا۔ اس وقت مسلمانوں میں ایمان کی کمزوری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور عرب کا تقریباً سارا علاقہ بھی مسلمان ہو چکا تھا لہٰذا کفار کے لیے سند کی ضرورت نہ تھی۔ پھر اس زمانہ میں اور بھی بہت سے معجزات آپ سے صادر ہوئے۔ جن کا بیان کرنا یہاں صرف طوالت کا باعث ہوگا۔

۲۔ نبوت کا سورج تو صرف ۲۳ سال چمکا۔ پھر اس کے بعد ۲۰۰ سال تک تاریکیاں ہی بڑھتی رہیں اور اس دو سو سال کے عرصہ میں کسی قندیل، شمع یا چاند ستارے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ حالانکہ واقعاتی اور مادی دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ سورج تقریباً ۱۲ گھنٹے چمکتا ہے تو اس کے غروب ہونے کے صرف ایک گھنٹہ بعد اتنی تاریکی چھا جاتی ہے کہ شمعوں اور قندیلوں کے بغیر گزارہ مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ بیان کردہ وجہ بھی معقول معلوم نہیں ہوتی۔

۳۔ جو لوگ حضورِ اکرم ﷺ کے فیض اور تربیت یافتہ اور ایسی شمعوں اور قندیلوں کے اہل تر تھے۔ انہوں نے تو ایسی شمعیں فروزاں نہ کیں اور جو لوگ ان سے درجہ میں کم تر تھے انہوں نے ایسے چاند ستارے روشن کر دیئے جو آفتاب عالم تاب کو بھی ماند کرنے لگ گئے۔

بات دراصل وہی ہے جو ہم بوضاحت پیش کر آئے ہیں کہ کشف و کرامات کا معاملہ جب ایک کسب

اور فن کی شکل اختیار کر گیا اور اس کے حصول کے ذرائع شریعتِ اسلامیہ کے بجائے خارجی دنیا سے مہیا ہونے لگے تو جن لوگوں نے اس کسبی فن پر خصوصی توجہ مبذول فرمائی۔ وہ اس تصوف کی دنیا میں چندے آفتاب و چندے ماہتاب بن کر سامنے آئے اور یہ دور تیسری صدی ہجری سے شروع ہو کر ساتویں صدی ہجری میں اپنے عروج تک پہنچتا ہے۔

کرامات اور استدراج

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر بزرگوں کو ان کرامتوں پر قدرت بھی حاصل ہوتی ہے وہ ہر ملاقاتی کے دلی حالات سے واقف ہوتے ہیں اور اس کو اس خیالات سے مطلع بھی کر دیتے ہیں۔ پھر کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی شکلیں تبدیل کرنے پر قادر ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ ادھر ہاتھ بڑھایا، تو انگور کا خوشہ ہاتھ میں آگیا۔ کچھ ایسے ہیں جو اپنی جوتی آسمان پر بھیجتے ہیں کسی ہندو کی جوتی کو مار مار کر نیچے لے آتی ہے۔ وہ بلند بانگ دعوے بھی کرتے ہیں۔ پھر ان کو پورا کر کے بھی دکھا دیتے ہیں۔ یہ تو واضح ہے کہ ایسے واقعات پر مفہوم کے اعتبار سے "کرامت" کا لفظ فٹ نہیں بیٹھتا۔ اب کرامت کے بعد استدراج ہی باقی رہ جاتا ہے۔ جس کے لئے شیطانی قوتیں مصروفِ عمل رہتی ہیں اور جس کا ذکر ہم پہلے باب میں شاہ ولی اللہؒ کے اقتباس پیش کر چکے ہیں۔

کرامت کا معیار اور اہمیت

لہٰذا ہمیں سنجیدگی سے کرامت اور استدراج کے درمیان فرق کو سمجھ لینا چاہئے۔ جو درج ذیل ہے:

۱۔ کرامت کا صدور کبھی کبھار یا شاذ ہی ہوتا ہے اور اس کا صاحبِ کرامت کو نہ پہلے سے علم ہوتا ہے نہ وہ اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کیونکہ اگر وہ کوئی چیز دعوے سے پیش کر سکتا ہے، تو یہ قدرت ہے کرامت نہیں۔

۲۔ معجزات کی طرح کرامت بھی وہبی چیز ہے۔ کسبی چیز استدراج ہے جسے دعویٰ سے بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں سب سے پہلے صاحبِ کرامت کی زندگی پر غور سے نگاہ ڈالنی چاہئے کہ کوئی چیز سنت کے خلاف تو نہیں، سنت کے خلاف یہ باتیں ہیں۔ مجاہدات و ریاضت کی خاطر جنگلوں میں مدتوں قیام کرنا۔ مزارات پر چلہ کشیاں، کشفِ قبور کے طریقے سیکھنا۔ نکاح سے خود پرہیز اور دوسروں کو متنفر کرنا۔ معکوس لٹک کر عبادت کرنا، حبسِ دم، ذکر و اذکار کے بدعیہ اور شرکیہ طریقے۔ متواتر اور وصلی روزوں کے ذریعہ بدن کو نحیف و کمزور بنانا اور نفس کشی کرنا۔ ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر عبادت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب طریقے غیر شرعی ہیں اور یہی کسبی اور اکتسابی ہیں جن کے

ذریعہ کشف و کرامات کے فن کو حاصل کیا جاتا ہے۔ ان طریقوں سے حاصل شدہ کمال استدراج ہوگا کرامت نہ ہوگی

۳۔ کرامت کسی اہم دینی یا دنیوی غرض کو پورا کرنے کے لئے عطا کی جاتی ہے اور یہ بالعموم اتفاقاً سرزد ہوتی ہے۔ جبکہ استدراج دعوے سے پیش کیا جاتا ہے اور بسا اوقات اس سے مقصود اظہار نمود و نمائش اور اپنی ولایت کی دھاک بٹھلانا ہوتا ہے اور اس سے اگر کوئی غرض پوری ہوتی بھی ہے تو وہ حقیر، ادنیٰ اور انفرادی قسم کی ہوتی ہے۔

کرامات سے متعلق جنید بغدادی کا فتوےٰ

حضرت جنید بغدادی ـــ جو صوفیاً میں سید الطائفہ کے لقب سے مشہور ہیں ـــ کا فرمان ہے کہ "اگر کسی شخص کو ہوا میں چار زانو بیٹھا ہوا دیکھو، پھر بھی اس کی پیروی اس وقت تک نہ کرو۔ جب تک کہ اللہ تعالیٰ کے امر و نہی میں اس کا عمل درست نہ پالو۔" (مقربان حق ص ۳۵)

انہی حضرت جنید کا ایک واقعہ بھی سن لیجئے:

"ایک شخص کچھ عرصہ تک آپ کی خدمت میں رہا۔ پھر رخصت کی اجازت چاہی۔ آپ نے پوچھا "کیوں جاتا ہے؟" اس نے کہا: "میں نے سنا تھا کہ آپ بہت بڑے صاحب کرامت بزرگ ہیں۔ میں اتنی مدت آپ کی خدمت میں رہا مگر کوئی کرامت نہ دیکھی اس لئے رخصت چاہتا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "اس تمام عرصہ میں تو نے میرا کوئی کام خلافِ شریعت بھی دیکھا؟" اس نے کہا: "یہ تو میں نے نہیں دیکھا" آپ نے فرمایا: "بس یہی میری کرامت ہے۔ اب جانا چاہے تو چلا جا۔"

اس واقعہ سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ مریدوں کو اتباعِ رسول کی پرواہ نہیں ہوتی، کرامات کی جستجو ہوتی ہے اور یہی اُن کے نزدیک بزرگی کا معیار ہے۔

۲۔ ولایت کا اصل معیار اتباعِ رسول ہے، کرامات نہیں۔

لیکن اکثر پیر اپنی بزرگی کو جتلانے کے لئے یا مریدوں کو مطمئن کرنے یا اپنی دکان چمکانے کے لئے شیطانی راستوں پر پڑ کر کرامات کے حصول ہی کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں اور مرید بھی یہی کچھ سیکھنے کے لئے "آستانہ عالیہ" پر تشریف لاتے ہیں اور جب ایسے شیطان کے جال میں پھنس گئے تو سمجھتے ہیں کہ ہم کامل ہو گئے۔ چنانچہ انہی حضرت جنید بغدادی سے متعلق درج ذیل واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

"نقل ہے کہ آپ کے ایک مُرید پر یہ دیوانگی چھائی کہ وہ کامل ہو گیا ہے۔ اسے ہر رات دکھائی دیتا کہ فرشتے اسے سواری پر بٹھا کر جنّت کی سیر کراتے اور طرح طرح کے میوے کھلاتے ہیں۔ آپ اس کے پاس گئے، دیکھا بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھا ہے۔ آپ نے کیفیت پوچھی تو اس نے بڑے فخر سے اپنے بلند مقام اور بہشت کی سیر کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: "آج جب بہشت میں جاؤ، تو میوے کھانے سے پہلے لاحول ولاقوۃ پڑھنا۔" چنانچہ حسبِ معمول جب وہ بہشت میں پہنچا، تو حضرت کا فرمان یاد آگیا اس نے جب لاحول پڑھا تو ایک چیخ سنی اور بہشت کو آنِ واحد میں غائب دیکھا اور اپنے آپ کو خود ایک گندی جگہ پر بیٹھے ہوئے پایا۔ گر بٹ اور مُردوں کی ہڈیاں آگے پڑی ہوئی تھیں۔ سمجھا کہ یہ شیطانی جال تھا اور وہ شیطانی استدراج میں مبتلا تھا۔ پس حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہوا۔" (مقربانِ حق ص۱۴۴)

تصریحات بالا سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ اولیاء اللہ کی صحیح پہچان یہ ہے کہ وہ متبع سنت ہوں خواہ ان سے کبھی کسی کرامت کا ظہور ہو یا نہ ہو۔

۲۔ جس بزرگ سے بکثرت کرامات کا ظہور ہونے لگے وہ سمجھ لے کہ شیطان کے جال میں پھنس گیا۔ اسے اپنے متعلق جلد از جلد غور کرنا چاہیئے اور توبہ و استغفار کرنا چاہیئے۔

التعرف میں کرامت پر تبصرہ

چنانچہ التعرف جو صوفیاء کی مستند کتاب اور اوّلین ماٰخذ میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے مصنف کلاباذی (م ۳۸۰ ھ) لکھتے ہیں کہ:

"جب ولی سے کوئی کرامت ظاہر ہو تو اس کا عجز و انکسار بڑھ جاتا ہے ..... ولی سے جو کرامات ظاہر ہوتی ہیں، انہیں ان کا علم ہی نہیں ہوتا .... ولی کی کرامت ان امُور میں ہوتی ہے دُعا کی مقبولیت، حال کی تکمیل، عمل کرنے کے لئے مزید قوّت اور روزی سے بے فکری۔ جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ لے لیتے ہیں اور انبیاء کے معجزات کسی معدوم چیز کو عدم سے لانا اور ایک چیز کی ہیئت بدل ڈالنا ہوتا ہے ..... ولی کو اپنی ولایت کا علم ہونا جائز نہیں اس لئے کہ اس سے ولی سے خوف جاتا رہتا ہے۔" (اقتباس از ص ۱۰۸، ۱۰۹ ترجمہ التعرف مطبوعہ المعارف، مترجم پیر محمد حسن)

مولانا اشرف علیؒ تھانوی کا تبصرہ

"بعض بزرگوں کا قول ہے الکرامات حیض الرجال، یعنی جس طرح عورت حیض سے شرماتی ہے اسی

طرح اہل اللہ اپنی کرامتوں سے شرماتے ہیں۔ بہت سے اہلِ کرامت بزرگوں نے تمنا کی۔ کاش ہم سے کرامت کا صدور نہ ہوتا۔ وجہ یہ کہ انہوں نے بقدر اپنی کرامت کے آخرت کے درجات میں کمی محسوس کی۔" (تجدید تصوف سلوک، ص ۹۱)

اب خدارا کہیئے کہ اولیاء اللہ یا ان کی جو کرامات تذکروں میں مندرج ہیں یا جو ہم نے درج کتاب کی ہیں وہ اس معیار پر پوری اترتی ہیں ؟ پھر یہ کرامات ہیں بھی ایسی کہ ان کے سامنے انبیاء کے معجزات بھی ہیچ نظر آنے لگتے ہیں۔ ہم ذیل میں ایسی ہی چند کرامات کا ذکر کریں گے۔

اولیاء اللہ کی کرامات

۱۔ مُردہ کو زندہ کرنا

حضرت عیسٰی علیہ السلام کا مُردوں کو زندہ کرنا ایک عظیم الشان معجزہ ہے اور اسی بنا پر اُن کو خدا سمجھا گیا تھا۔ اب ہمارے اولیاء کا کم از کم معیار یہ ہے کہ مُردوں کو تو زندہ کر کے دکھا سکیں۔ مثلاً خواجہ فریدالدین گنج شکر کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے :

چشتیہ کا معیارِ ولایت ہی مُردوں کو زندہ کرنا ہے

"پھر آپ نے فرمایا کہ اے درویش! خواجہ قطب الدین دبختیار کاکی) چشتی قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا کہ حضرت یہ کیونکر معلوم ہو کہ اب سلوک کا مرتبہ تمام ہو گیا اور یہ شیخ کمال کو پہنچ گیا۔ فرمایا : " اگر وہ کسی مُردہ پر دم کرے تو وہ مُردہ خدا کے حکم سے زندہ ہو جائے تو اس وقت سمجھ لو کہ وہ کمالیت کو پہنچ گیا۔" پھر آپ نے فرمایا : "کہ خواجہ قطب الدین چشتی قدس سرہ العزیز اسی محل پر یہ فوائد فرما ہی رہے تھے کہ ایک عورت روتی ہوئی آئی اور قدموں میں سر رکھ دیا اور کہا کہ ایک بچہ رکھتی تھی کہ اسے بادشاہ نے بے گناہ دار پر کھنچوا دیا۔ خواجہ اس کی عرض داشت سن کر کھڑے ہو گئے۔ اور عصا ہاتھ میں لے کر اس کے ساتھ ہو لئے۔ آپ کے اصحاب بھی آپ کے ساتھ ہو لئے اور اس دار کشیدہ لڑکے کے پاس پہنچے۔ ہندو مسلمان کی ایک بھیڑ لگ گئی۔ خواجہ نے کہا : " الٰہی ! اگر اسے بے گناہ بادشاہ نے دار پر کھینچا تو اسے زندہ کر دے۔ آپ کہہ ہی رہے تھے کہ وہ لڑکا زندہ ہو گیا اور ساتھ

چلنے لگا۔ یہ کرامت دیکھ کر کئی ہزار ہندو مسلمان ہو گئے۔ پھر آپ اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ : "مرد کی کمالیت اس سے زیادہ نہیں ہے۔" (اسرار الاولیاء ملفوظات خواجہ فرید گنج شکر، ص ۱۱۰ مرتبہ خواجہ بدر اسحٰق، ترجمہ غلام احمد بریاں، مطبع مجتبائی دہلی سنہ ۱۹۱۶)

مندرجہ بالا اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں مستفاد ہوتی ہیں :

۱۔ انبیاء سب ہی کامل ہوتے ہیں لیکن ان میں سے صرف حضرت عیسٰی علیہ السلام کو باذن اللہ مردہ زندہ کرنے کا معجزہ عطا ہوا لیکن خواجگان چشت کے کئی باکمال کم از کم اتنا "تصرف" ضرور رکھتے ہیں۔ اور وہ یہ معجزہ دعوے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

۲۔ یہ بزرگ دوسروں سے سجدہ کرانا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ اگر یہ انہیں ناپسند ہوتا تو ضرور اس عورت کو روک دیتے۔

۳۔ کاش کہ انبیاء کو اللہ تعالٰی یہی طریقہ تبلیغ و اشاعت دین سمجھا دیتے اور عطا کر دیتے کہ لوگ ایک ہی کرامت دیکھ کر ہزارہا کی تعداد میں مسلمان ہو جاتے۔ اور انہیں "متٰی نصر اللہ" بھی نہ پکارنا پڑتا۔ پھر جو لوگ اس طرح کی کرامتیں دیکھ کر مسلمان ہوتے، وہ ان پیروں کے خادم تو ضرور بن جائیں گے، لیکن اسلام وہ بے چارے کیا سمجھ سکیں گے؟

لَا اِلٰہ سے مارنا اور اِلّا اللہ سے زندہ کرنا

اب دیکھئے صاحب حدیقۃ الاولیاء صفحہ ۷۹ پر شاہ ابو المعالی چشتی صابری کے بیان میں لکھتے ہیں کہ :

"عند اللہ کرہ حضرت شاہ نے فرمایا کہ مرگ و حیات کلمہ نفی اثبات لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ میں ہے۔ جنہوں نے دل سے یہ کلمہ پڑھا ہے اگر وہ لفظ لا الٰہ زندہ کے کان میں کہہ دیں تو مر جائے اور اگر الا اللہ کہہ دیں تو جی اٹھے۔ حاضرین مجلس نے التماس امتحان کی۔ حضرت مجلس سے اٹھے اور ایک گاؤ میش کے کان میں جو اسی گھر میں بندھی تھی لا الٰہ کا لفظ کہا۔ وہ فی الفور گر پڑی اور مر گئی پھر دوسرے کان میں الا اللہ کا لفظ کہا فی الفور گاؤ میش جی اٹھی اور چارہ چرنے لگی۔"

اسے کہتے ہیں ہتھیلی پر سرسوں جما دینا۔ کیا جادو کی اس سے بڑھ کر تاثیر ہو سکتی ہے۔ افسوس کہ قرون اولٰی کے مسلمانوں، صحابہ اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی اس تاثیر کا علم نہ ہو سکا، ورنہ

حضور اکرم ﷺ کم از کم اپنے چچا ابو طالب اور زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو ہی زندہ کر لیتے، جن کی غمی کی وجہ سے اس سال کا نام ہی "عام الحزن" قرار پایا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ اسی مندرجہ کتاب کے صفحہ ۱۵۱ پر مذکور ہے جو سید جلال الدین شیر شاہ سے تعلق رکھتا ہے، فرماتے ہیں:

"ناگاہ آپ کا گزر ایک مجمع پر ہوا، پوچھا کیسا مجمع ہے؟ لوگوں نے کہا اس مردہ کی نماز جنازہ پڑھتے ہیں۔ کہا کہ: "نماز پڑھ کر پھر کیا کرو گے؟" کہا "اس کو زمین میں دفن کر دیں گے۔ یہ بات سن کر حضرت جلال رح جلال میں آ گئے اور نعرہ اللہ اکبر مار کے مردہ کے منہ سے پردہ اٹھایا اور فرمایا: "قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہ! مردہ فی الفور جی اٹھا اور چالیس برس تک زندہ رہا۔"

پیرانِ پیر کی مسیحائی

"پیران پیر تو اس کام میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ ایک چیل آپ کے وعظ کے دوران اوپر منڈلانے لگی اور چلانے لگی تو آپ نے ہوا کو حکم دیا کہ اس کا سر قلم کر دے۔ بیچاری چیل کا سر تن سے جدا ہوا اور اس کا سر اور دھڑ آپ کے سامنے زمین پر آ پڑے۔ پھر آپ نے لوگوں کے سامنے اس کا دھڑ اور سر جوڑ کر اسے اڑا بھی دیا۔" (سیرت غوث ص ۱۹۲۔ پانچ کتب تذکرہ کے حوالہ سے۔ گویا یہ روایت نہایت ثقہ ہے)

پھر ایک دفعہ یوں ہوا کہ آپ نے مرغی کا سالن کھا کر ہڈیاں ایک طرف رکھ دیں۔ پھر ان ہڈیوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا قُومِی بِاِذْنِ اللّٰہ۔ تو وہ مرغی زندہ ہو گئی تھی۔ (سیرت غوث، ص ۱۹۱۔ آٹھ کتب تذکرہ کے حوالہ سے۔ گویا یہ روایت پہلی سے بھی ثقہ ہے)

اور آپ کا اصل شاہکار یہ ہے کہ ایک دن ایک عیسائی اور مسلمان جھگڑ رہے تھے۔ عیسائی کہتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام افضل ہیں اور مسلمان کہتا تھا کہ ہمارے رسول ﷺ افضل ہیں۔ آپ کا ادھر سے گزر ہوا تو عیسائی سے آپ نے پوچھا کہ حضرت کیسے افضل ہیں؟ وہ کہنے لگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قم باذن اللہ کہہ کر مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا "میں رسول کریم ﷺ کا تابع اور غلام ہوں۔ اگر میں زندہ کر دوں تو ایمان لے آؤ گے؟" عیسائی کہنے لگا "ہاں!" آپ نے عیسائی کو کہا کہ کوئی بہت پرانی قبر دکھاؤ۔ اس نے قبر دکھائی تو آپ نے فرمایا: "دیکھو! یہ ایک گوئیے کی قبر ہے اگر تم چاہو تو میں یہ بھی کر سکتا ہوں کہ وہ گاتا ہوا اٹھے۔" عیسائی نے کہا میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" اب حضرت

عیسیٰ علیہ السلام تو قم باذن اللہ کہہ کر مُردہ زندہ کرتے تھے، مگر پیرانِ پیر نے 'قم باذنی' کہا، جس کے ساتھ ہی قبر پھٹی اور مُردہ گاتا ہوا نکل آیا۔ یہ کرامت دیکھ کر وہ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔" (تفریح الخاطر ص ۱۰)

عیسٰے کے معجزوں نے مُردے جلا دیئے　　محمد کے معجزوں نے مسیحا بنا دیئے

(سیرت غوث، ص ۱۹۲)

اب دیکھئے کہ:

۱۔ عیسائی کے جھگڑے کی دلیل ہی یہ تھی کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام تو مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے لیکن تمہارے نبی ایسا نہیں کرتے تھے اور یہ ہے بھی درست۔ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کونسے معجزوں نے مُردوں کو زندہ کرنے والے مسیحا کیسے بنا دیئے۔ جو کام استاد نہیں کر سکتا وہ شاگرد کیسے کر سکتا ہے؟ کیا یہ شاگرد اپنے استاد سے یا غلام آقا سے بڑھ گئے ہیں؟

۲۔ پیرانِ پیر کی کرامت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے بڑھ چڑھ کر ہے اور اس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

ا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قم باذن اللہ کہہ کر مُردہ زندہ کرتے تھے لیکن آپ قم باذنی کہہ کر مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔

ب۔ حضرت عیسٰے علیہ السلام کسی کہنہ قبر کا مُردہ زندہ نہیں کرتے تھے۔

ج۔ اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں یہ کمال تھا کہ اگر مُردہ گویا ہے تو وہ گاتا ہی اٹھے۔

شیخ علی بن ہیتی اور مقتول کا کلام

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ مذکور ہے، کہ کوئی شخص قتل ہو گیا، لیکن قاتل کا سراغ نہیں ملتا تھا سب ایک دوسرے پر الزام تھوپتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسٰے علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوگوں سے کہیں کہ ایک گائے ذبح کریں۔ پھر اس مذبوحہ گائے کا ایک ٹکڑا اس مقتول کے جسم پر ماریں، تو وہ لاشہ قاتل کا نام بتلا دے گا۔ (سورہ بقرہ) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اب ہمارے اولیاء اللہ کی کرامات ایسے معجزات سے بلند ہیں۔ کیونکہ وہ مقتول اور اس کی کلام کے درمیان کسی قسم کا واسطہ لائے بغیر ان سے جواب حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ علی بن ہیتی کے متعلق مذکور ہے کہ:

"ایک روز آپ قصبہ ہز ملک میں گئے۔ دیکھا کہ وہاں کے لوگ ایک مقتول کے سرہانے کھڑے

جھگڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے پر قتل کا الزام رکھ رہے ہیں۔ آپ نے یہ نزاع دیکھی تو مُردے سے مخاطب ہو کر کہا "بندۂ خدا! خود کیوں نہیں بتا دیتا کہ تیرا قاتل کون ہے؟" مُردے نے فی الفور آنکھیں کھولیں اور کہا کہ: "میرا قاتل فلاں بن فلاں ہے۔" اور پھر آنکھیں بند کر کے مر گیا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۴۴)

صرف نظر پڑنے سے مُردہ کا زندہ ہو جانا

اِن بزرگوں کے بعد تو ایسے ایسے عظیم الشان اولیاء اللہ پیدا ہونے لگے کہ ان کی صرف نظر پڑنے سے ہی مردے زندہ ہو جایا کرتے تھے مثلاً:

۱۔ خواجہ محمد فضیل قادری نوشاہی (م ۱۱۱۱ھ) کا ذکر ہو رہا ہے:

"جس فاسق و فاجر پر حالتِ جذب و سکر میں نظر پڑ جاتی۔ عارف کامل ہو جاتا۔ کسی مُردہ پر نظر پڑتی تو زندہ ہو جاتا۔ نگاہِ غضب سے کسی کی طرف دیکھتے تو اس کی جان تن سے نکل جاتی۔ غرض آپ کے احوال و مقامات عجیب و غریب تھے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۷۷)

اب دیکھئے صاحب خزینۃ الاصفیاء فرما رہے ہیں کہ "جس فاسق و فاجر پر حالت جذب و سکر میں نظر پڑ جاتی وہ عارفِ کامل ہو جاتا۔" اس سے آپ اندازہ لگا ہی سکتے ہیں کہ خود خواجہ محمد فضیل کس پایہ کے عارف کامل ہوں گے۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان نوشاہی اولیاء اللہ کے کردار کا تعارف ہم کسی دوسرے مقام پر کرا چکے ہیں۔

پیر شمس سبزواری (تبریزی م ۶۵۵ھ) کا مُردہ کو زندہ کرنا پھر سورج کو زمین کے قریب لانا

اب فرقہ شیعہ امامیہ اسماعیلیہ کے ایک ولی اللہ پیر شمس سبزواری (تبریزی ثم ملتانی) کی کرامات ملاحظہ فرمائیے:۔

جس زمانہ میں پیر شمس ملتان میں تھے۔ اسی زمانہ بادشاہ کا اکلوتا فرزند مر گیا۔ بے حد مغموم ہوا۔ اس نے فقراء، حکماء، اور صوفیاء سے کہا۔ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم اللہ کے مقرب ہو۔ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو میرے لڑکے کو زندہ کر دو۔ ورنہ میں سب کو کولہو میں پلوا دوں گا۔" یہ ماجرا سن کر سب گھبرا گئے۔ اور اپنی زندگی کی سلامتی کے لیے ان سب کی نظر انتخاب پیر شمس پر پڑی۔ پیر شمس نے مطالبہ منظور کر لیا۔ اور مردہ فرزند کے پاس جا کر فرمایا فرمایا۔ قُمْ باذن اللہ مگر شاہزادہ نہ اٹھا۔ پھر آپ نے کہا قُمْ بِاِذْنِی۔ تو شاہزادہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا مگر ان فقراء نے پیر شمس کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اس پر یہ تہمت دھری کہ اس نے اپنے حکم سے فرزند کو زندہ کیا۔ لہٰذا اس پر شرعی حکم نافذ ہونا چاہیئے۔ اور ان کی جیتے جی جسم کی کھال اتار لینی چاہیئے۔ پیر شمس نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اپنے جسم پر ایک کالی کمبلی ڈالی۔ اور اپنے

سر کے بالوں کو ہاتھ میں پکڑ کر تمام جسم کی کھال کھینچ کر علماء کے سامنے پھینک دیا۔ انہوں نے یہ دیکھ کر کانپنا شروع کر دیا۔ اور ان کے کہنے پر لوگوں نے پیر شمس سے تمام کاروبار اور لین دین ترک کر دیا۔"

"عرصہ دراز اسی طرح گزر گیا اور جب بھوک معلوم ہوئی تو لوگوں سے کھانا مانگا مگر کسی نے نہ دیا۔ آخر ایک قصاب کو رحم آیا اور اس نے خفیہ طور پر ایک گوشت کا ٹکڑا دے دیا۔ اب پکانے کی فکر ہوئی۔ اسی حالت پر غور کرتے ہوئے آپ ملتان شہر کے باہر چلے آئے اور سورج کی طرف نظر کر کے فرمانے لگے (اشعار کا ترجمہ) اے آفتاب تیزی مت کر تیزی مت کر۔ ایک پل کے لیے تھم جا۔ میں زمانہ قدیم سے تیرا عاشق ہوں۔ . . . گلزار شمس میں لکھا ہے کہ یہ اشعار پیر شمس کی زبان سے تمام ہوتے ہی آفتاب نیچے اتر آیا اور تمام ملتان شہر گرمی کی شدت سے بے چین ہو گیا۔ کئی اشخاص دوڑتے ہوئے پیر شمس کے پاس آئے اور پاؤں پکڑ کر معافی مانگی۔ ایک لحظہ میں گوشت پک جانے پر سورج اپنی جگہ پر چلا گیا جس جگہ سے سورج اتر اتھا وہ جگہ اسٹیشن سے بہت قریب ہے۔ ہر سال وہاں میلا لگتا ہے۔ یہ جگہ سورج کنڈ کے نام سے مشہور ہے اس جگہ کیشو پوری نامی ایک مندر ہے جس میں پیر کی کرامت کی تصویر دیوار پر کھینچی ہوئی ہے" (نور مبین ص۸۵ تا ۸۹ ملخصاً مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند بمبئی)

مندرجہ ذیل طویل اقتباس سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:۔

۱۔ حضرت عیسیٰ تو قم باذن اللہ کہہ کر مردے زندہ کیا کرتے تھے مگر پیر شمس والا وہ قم باذن اللہ سے تو حرکت میں نہ آیا۔ بلکہ قم باذنی پر زندہ ہوا۔ اس سے تین نتیجے نکل سکتے ہیں (۱) اگر یہ کرامت ہے تو حضرت عیسیٰ کے معجزہ بدرجہا بڑھیا ہے (۲) یہ کھلا ہوا جادو ہے کیونکہ شریعت کے مطابق نہیں جیسا کہ اس وقت کے علماء نے سمجھا (۳) یہ واقعہ ہی کذب و اختراع پر مبنی ہو۔

۲۔ پیر شمس نے علماء کی تعزیر کے مطابق خود ہی اپنے بال پکڑ کر اپنی کھال کھینچ کر علماء کے سامنے پھینک دی تھی۔ البتہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہاتھوں سے آپ نے سر کے بالوں کو پکڑا ہوا تھا تو ہاتھوں کی کھال اترتے وقت ہاتھ یقیناً چھوٹ گئے ہوں گے۔ پھر آپ اپنی کھال اتارنے میں کیونکر کامیاب ہوئے تھے؟

۳۔ جب سورج پیر شمس کے گوشت کا ٹکڑا بھوننے کے لیے بالکل نزدیک آ گیا۔ تو گوشت کا ٹکڑا تو گل گیا مگر پیر صاحب کا اتنی شدید گرمی سے کچھ بھی نہ بگڑا۔ اور ملتان کے سب لوگ تو اس قدر سورج کی تپش کی وجہ سے بے چین ہو گئے، مگر باقی دنیا جس پر سورج کی نزدیکی سے یہ مصیبت نازل ہوئی ان کا غالباً کچھ بھی نہ بگڑا تھا۔ ورنہ یہ واقعہ تاریخ کی کتابوں میں مذکور رہتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ان کراماتی نگاروں نے لوگوں کو الو سمجھ رکھا ہے۔ اور حقیقت سے بھی یہی کرا ولیاء اللہ نے عوام کی عقلوں کو اس قدر چاٹ لیا ہے۔ کہ ان کی ہر طرح کی خرافات پر یقین کرنے لگتے ہیں۔

۲۔ اسی طرح کے ایک اور نوشاہی "اولیاء اللہ" ہیں، عبدالرحمٰن المعروف بہ پاک رحمان یا رحمٰن دیوانہ بھڑی والا۔ یہ بزرگ خواجہ محمد فضیل سے بازی لے جاتے ہیں۔ کیونکہ خواجہ فضیل کی تو اپنی "نظر" یہ اور وہ کرشمے دکھلاتی تھی۔ لیکن آپ ایسے کرشموں کا تصرف دوسروں کو بھی عطا فرما سکتے تھے۔ چنانچہ صاحب خزینۃ الاصفیاء رقمطراز ہیں کہ:

"ایک روز آپ اپنے خادم شیخ سعدی (صحیح نام شادی ہے جو کیلیانوالہ کا باشندہ تھا۔ تذکرہ نوشاہی) پر بے حد مہربان ہو کر فرمانے لگے: "ہم نے اللہ تعالیٰ سے نہانے کے لئے یہ چاہا ہے کہ "جس مریض پر تیری نظر پڑے وہ صحت یاب ہو جائے۔ جس مُردہ کی طرف تو متوجہ ہو وہ زندہ ہو جائے اور جس فاسق و فاجر پر تیری نظر پڑے وہ ولی کامل ہو جائے۔" بارگاہِ خداوندی میں آپ کی یہ دُعا قبول ہو گئی۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۳۰۵)

اب بتلائیے کہ انبیاء کے معجزات ہمارے ان "اولیاء اللہ" کی کرامات کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟

۲۔ ہوا پر حکومت

اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کر دیا تھا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کا ہوا پر حضرت سلیمان علیہ السلام سے زیادہ کنٹرول ہے۔

ا۔ حبیب اعجمیؒ کی ہوا پر حکومت

"نقل ہے کہ ایک عورت حضرت حبیب اعجمی کے پاس روتی ہوئی آئی اور کہا کہ میرا لڑکا عرصہ سے گم ہے۔ دُعا کریں خُدا اسے ملا دے۔" آپ نے فرمایا: تیرے پاس کچھ ہے؟ اس نے تھوڑی سی چاندی پیش کی۔ آپ نے لے کر درویشوں میں بانٹ دی اور کہا "جاؤ تیرا لڑکا تیرے گھر کے دروازے پر کھڑا ہے۔" وہ آئی تو لڑکے کو موجود پایا۔ سینہ سے لگا کر پوچھا "بیٹا! تو کہاں تھا؟" اس نے کہا "میں کرمان میں تھا۔ میں نے سُنا کوئی کہہ رہا ہے "اے ہوا اس کو اٹھا کر اس کے گھر پہنچا دے، حبیب کی دُعا اور صدقہ کی برکت سے" پس میں نے اپنے آپ کو یہاں پایا۔" (مقربانِ حق، ص ۴۲)

اب حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ تو فقط اتنا تھا کہ وہ ایک ماہ کا سفر چند گھنٹوں میں طے کر لیتے تھے، لیکن معاملہ یہاں تک نہیں، بلکہ ہمارے صوفیاء کا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص بلقیس کا تخت پلک جھپکنے میں لایا تھا وہ "ولی" تھا اور اس کا تصرف حضرت سلیمان علیہ السلام (جو کہ نبی تھے) سے زیادہ تھا اس کی تحقیق ہم پہلے پیش کر چکے ہیں کہ وہ نہ جن تھا نہ کوئی انسان بلکہ اللہ کے ان فرشتوں سے ایک فرشتہ تھا جو مشیتِ الٰہی کے تحت تدبیرِ کائنات پر مامور ہیں۔ البتہ ہمارے ولی اس کے مقابلہ میں پورے اُترتے ہیں۔

کرامات کا معجزات سے بڑھیا ہونے کا شرعی ثبوت

اب نبوت سے ولایت کی فضیلت کا اقرار انہی صوفیاء کی زبان سے سنئے۔ اسی واقعہ سے آگے مذکور ہے:

حضرت عطارؒ فرماتے ہیں اگر کوئی اعتراض کرے تو اسے تخت بلقیس مع بلقیس کے ایک طرفۃ العین میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچنے کی حکایت قرآن سے پڑھنی چاہیئے۔ اگر اس پر ایمان ہے تو یہ اس سے سہل تر ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"میری اُمت کے علماء پہلے انبیاء کی مثل ہوں گے (اور کرامات کا ظہور اس سے بھی بڑھ کر ہوتا رہا ہے)" (مقربانِ حق، ص ۴۳)

اب دیکھئے کہ صاحب مقربانِ حق نے:

۱۔ تخت بلقیس کے ساتھ "مع بلقیس" کا اضافہ اپنی طرف سے کر لیا ہے۔

۲۔ جس حدیث سے (یعنی عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْل) آپ استدلال فرما رہے ہیں یہ حدیث آئمہ حدیث کے نزدیک مجروح اور ناقابلِ احتجاج ہے۔ علاوہ ازیں کہ کسی امتی کا (خواہ وہ امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے کیوں نہ ہو) درجہ کسی بھی نبی کے برابر نہیں ہو سکتا۔

۳۔ پھر اس حدیث میں بھی ذکر علماء کا ہے۔ عباد، زہاد، صالحین، صوفیاء، اولیاء اللہ کا ذکر نہیں اور یہ تو ظاہر ہے کہ کشف و کرامات کا تعلق دوسرے گروہ سے ہے نہ کہ علماء سے۔

۴۔ پھر اس مجروح حدیث کے ساتھ بریکٹوں میں ان الفاظ کا اضافہ "کرامات کا ظہور اس سے بڑھ کر ہوتا رہا ہے۔" اپنی طرف سے کر لیا ہے اور اس طرح یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اگر ہمارے اولیاء اللہ کی کرامات

انبیاء کے معجزات سے زیادہ عظیم الشان ہیں، تو اس کی بھی شرعی بنیاد موجود ہے۔ اَلَا سَاءَ مَا یَحْکُمُوْن۔

۲۔ رابعہ بصریہ کی پانی اور ہوا پر حکومت

"حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت رابعہ کو دجلہ کے کنارے بیٹھے دیکھا میں نے اپنا مصلیٰ دجلہ میں ڈالا اور کہا: "رابعہ! یہاں آکر نفل پڑھو۔" آپ نے فرمایا: "آپ اپنی بزرگی دنیا پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔" پھر اپنا مصلیٰ ہوا میں بچھا دیا اور کہا: "یہاں آؤ تاکہ دنیا کی نظر سے چھپ جائیں۔"

(مقربانِ حق، ص ۴۷)

اس کرامت پر تبصرہ کرنا کچھ زیب نہیں دیتا، کیونکہ شرعی نقطہ نظر سے اجنبی عورت اور مرد کا اس طرح کا اختلاط حرام ہے، خواہ وہ اولیاء اللہ ہی کیوں نہ ہوں، بلکہ اولیاء اللہ کے لیے اور زیادہ پرہیز ضروری ہے۔ پھر یہ واقعہ تاریخی لحاظ سے بھی غلط ہے، کیونکہ حسن بصری اور رابعہ بصریہ کی ملاقات بھی ثابت نہیں۔ حسن بصری کا سن وفات بالاتفاق ۱۱۰ھ ہے اور رابعہ بصری بقول بعضے ۹۵ھ اور بقول بعضے ۹۹ھ میں پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی میں آپ کو کسی نے پکڑ لیا، پھر آگے فروخت کر دیا۔ آپ کی پاک طبیعت کی وجہ سے مالک نے آپ کو آزاد کر دیا۔ (دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱۰، ص ۹۲) اب ان حالات میں اندازہ فرما لیجئے کہ ان کی ملاقات کا کوئی امکان ہے؟

۳۔ ہوائی سفر اور عثمان ہارونی

منقول ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں خواجہ عثمان ہارونی کے ساتھ سفر میں تھا۔ ہم دجلہ کے کنارے پہنچے تو کوئی کشتی موجود نہ تھی۔ خواجہ عثمان نے فرمایا "تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔" میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر جو آنکھیں کھولتا ہوں تو اپنے آپ کو خواجہ کے ہمراہ دریا کے اس پار پاتا ہوں۔ میں نے خواجہ سے پوچھا: "خواجہ آپ نے کیا کیا؟" فرمایا: "پانچ دفعہ سورہ فاتحہ پڑھی۔"

دیکھئے! اگر آپ پانچ دفعہ سورہ فاتحہ پڑھیں، تو چنداں فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ اگر صحابہ کرام بھی پڑھتے تو اس طرح کبھی دریائے دجلہ عبور نہ کر سکتے۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ پہلے کسی شیخ کامل کا فیض حاصل کر کے سورہ فاتحہ کی زکوٰۃ نکالی جائے۔ سورہ فاتحہ کی زکوٰۃ کیا ہے؟ اس کی تفصیل باب زیرِ عنوان "ولایت کی تعلیم" میں ملاحظہ فرمائیے!

عثمان ہارونی صاحب نے اس سورہ فاتحہ کی زکوٰۃ سے کئی بار کرامات دکھلائی تھیں۔ جن کا ذکر اس کتاب میں مناسب مقامات پر آچکا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے اولیاء اللہ ہیں، جو اس کام میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ مثلاً:

۴۔ خواجہ ابو اسحٰق چشتی م ۳۲۹ھ

"جب سفر کا ارادہ فرماتے، تو دو سو آدمیوں کے ساتھ آنکھ بند کر کے فوراً منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۲)

اب بتلایئے کیا حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہوائی تخت بہتر تھا یا آپ کی یہ کرامت۔ جس میں آپ اپنے علاوہ مزید دو سو آدمیوں کو آنکھ جھپکنے میں منزل مقصود تک پہنچا دیتے تھے۔

۵ ایک اور ولی اللہ خواجہ مودود چشتی م ۵۲۷) کو طی الارض حاصل تھا۔ چنانچہ جب طواف کو جی چاہتا ہوا کے ذریعہ مکہ مکرمہ پہنچ جاتے تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۹)

۵۔ حسین لاہوری کا کرشمہ

بعد ازیں تو یہ ہوائی حکومت اور طی الارض کا کسب و فن اتنا عام ہوا کہ حسین لاہوری جیسے ولی بھی اس میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ حسین لاہوری خود داڑھی مونچھ چٹ، کسی کو اس وقت تک مرید ہی نہ بناتا جب تک وہ داڑھی نہ منڈاتا اور شراب نہ پیتا۔ شراب کا رسیا، ہر وقت صراحی و جام ساتھ رہتا۔ ڈھول کی تھاپ پر رقص کرتا اور ہندو لونڈے مادھو لال سے عشق بازی فرمایا کرتا تھا۔ ایک شخص حاجی یعقوب مدینہ منورہ کا رہنے والا شیخ کو ہر روز روضہ نبوی ﷺ میں معتکف دیکھتا۔ ایک دفعہ ہندوستان آیا تو حسین کو لاہور میں شراب میں دھت، ڈھول کی تھاپ پر رقص کرتے دیکھ کر پوچھا: یہ کیا حال ہے؟ حسین لاہوری نے کہا، آنکھیں بند کرو۔ اس نے آنکھیں بند کرتے ہی اپنے کو مدینہ منورہ میں اور حسین لاہوری کو روضہ نبوی ﷺ میں معتکف پایا۔ (خزینۃ الاصفیاء) پھر یہی حسین لاہوری اپنے معشوق کو اسی طرح آنکھیں بند کرا کے گنگا جل میں اشنان کرانے لے گیا اور پھر اسی طرح واپس لاہور بھی لے آیا تھا۔ اسی کرامت سے متاثر ہو کر مادھو لال مسلمان ہو کر حسین لاہوری کی بیعت ہوا، پھر خلیفہ بنا اور اسی عشق بازی کی بنا پر یہ دونوں پیرانِ طریقت لاہور میں ایک ہی جگہ مدفون ہوئے۔ واضح رہے کہ حسین لاہوری نے بھی ۲۶ سال جنگلوں میں ریاضت و مجاہدہ کیا تھا۔ یہ سب شعبدہ بازیاں اسی مجاہدہ کا ثمرہ تھیں، لہٰذا یہ بات خوب ذہن نشین کر لیجئے، جس ولی اللہ نے جتنی زیادہ ریاضت و مجاہدہ جنگلوں میں کیا ہوگا۔ اسی

طرح کی شعبدہ بازیاں ضرور جانتا ہوگا۔ پھر ہمیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تصوف اور کشف و الہام لازم و ملزوم ہیں اور تصوف و احسان دین کا اہم جزو ہی نہیں بلکہ جسد میں روح کی مانند ہے، البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس "روح فی الجسد" کی ضرورت نہ تھی۔

۷۔ ابوالحسن خرقانی قطب عالم کی ہوا پر حکومت

ابوالحسن خرقانی کے ایک مرید نے آپ سے اجازت چاہی کہ میں کوہ لبنان میں جا کر قطب عالم کی زیارت کروں۔ آپ نے اجازت دے دی۔ جب وہ مرید وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک جنازہ رکھا ہے اور لوگ قبلہ رو بیٹھے کسی کی انتظار کر رہے ہیں۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ قطب عالم آئیں گے اور اس کی نماز جنازہ پڑھائیں گے اور وہ پانچوں وقت یہاں تشریف لا کر ہر نماز کی امامت کراتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ شیخ خرقانی تشریف لائے اور امامت کرائی۔ میں یہ منظر دیکھ کر بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو لوگوں سے پوچھا کہ یہ امام صاحب کون تھے اور اب دوبارہ کب آئیں گے؟ جواب ملا کہ "یہ ابوالحسن خرقانی تھے اور اب دوسری نماز کے وقت تشریف لائیں گے۔" مجھے اپنے آپ پر سخت افسوس ہوا کہ آپ کا مرید ہونے کے باوجود اتنا بھی نہیں جانتا کہ قطب عالم آپ ہی ہیں اور خواہ مخواہ یہ دور دراز کا سفر اختیار کیا۔ پھر جب نماز کا وقت ہوا آپ تشریف لائے اور امامت کرائی۔ جب سلام پھیرا تو میں نے آپ کا دامن پکڑ کر کہا۔ میں بے حد شرمندہ ہوں، براہ کرم مجھے واپس لے چلیے۔ آپ نے فرمایا: "اس شرط پر لے چلتا ہوں کہ جو کچھ یہاں دیکھا ہے، کسی کے سامنے بیان نہ کرنا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی ہے کہ مجھ کو دنیا میں خلقت سے پوشیدہ رکھیں۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۱۰)

اس اقتباس سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ قطب عالم کا کوہ لبنان سے بڑا گہرا تعلق ہے اور یہ تعلق اتنا مشہور و معروف ہے کہ آپ کے مرید کو بھی اس کا علم تھا۔

۲۔ کوہ لبنان میں غالباً کوئی بہت بڑی مسجد ہے۔ جہاں جنازے بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ اس مسجد کی امامت قطب عالم ہی کے سزاوار ہے۔

۳۔ آپ خرقان سے مہینوں کا سفر لمحوں میں طے کر کے دن میں پانچ بار کوہ لبنان پر آ کر امامت فرمایا کرتے تھے۔ جب کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک ماہ کا سفر طے کرنے میں ایک پہر یا تقریباً تین گھنٹے درکار ہوتے

تھے۔ لہٰذا آپ کی یہ کرامت حضرت سلیمان علیہ السلام کے معجزہ سے بہت برتر ہے۔

۴۔ حضرت سلیمان علیہ السلام صرف ایک مقام پر موجود ہوتے تھے لیکن شیخ خرقانی صاحب بیک وقت خرقان میں بھی موجود رہتے تھے اور کوہِ لبنان میں بھی موجود ہوتے تھے اور یہی ہمارے اولیاء اللہ کی وہ شان ہے جو انبیاء سے بڑھ کر ہے۔

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور اولیاء اللہ

ہاتفِ غیبی یا ندائے غیبی

اسی طرح حضرت موسےٰ علیہ السلام کی ایک بہت بڑی فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِن سے بلاواسطہ فرشتہ کلام فرمایا۔ اور اس کا قرآن میں کئی جگہ ذکر فرمایا۔ اسی وجہ سے وہ کلیم اللہ مشہور ہوئے۔ لیکن ہمارے اولیائے کرام ہر وقت خدا سے مخاطب ہوتے، بالمشافہ سوال وجواب کرتے اور ہاتفِ غیبی کی آوازیں سنتے رہتے ہیں۔ اور ایسے واقعات اس کثرت سے ہیں کہ ان کا حصر ناممکن ہے۔ اور اس کتاب میں ضمناً بہت سے ایسے واقعات مذکور ہو بھی چکے ہیں۔ پھر کچھ اولیاء اللہ ایسے بھی ہیں کہ ندائے غیبی کے ساتھ ایک چمچہ بھی غیب سے برآمد ہوتا ہے۔ جس میں تیل ہوتا ہے۔ اور ندائے غیبی یوں پکارتی ہے کہ اس تیل کو درد کے مقام پر اس طرح لگاؤ۔ اور فلاں فلاں چیز کھاؤ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے۔ باب زیرِ عنوان " نظام الدین عمری کا طریقِ تربیت۔"

یدِ بیضا

حضرت موسےٰ علیہ السلام کو ایک معجزہ دیا گیا تھا کہ اپنا ہاتھ بغل میں ڈالتے پھر باہر نکالتے تو وہ روشن ہو جاتا تھا، لیکن ہمارے اولیاء بغل میں بھی ہاتھ نہیں ڈالتے بلکہ انگلیوں پر صرف پھونک مار دیتے ہیں تو وہ دھک سے شمع کی مانند روشن ہو جاتی ہیں۔ مثلاً:

" نقل ہے کہ ایک بار حضرت حسن بصری اپنے اصحاب کے ہمراہ حضرت رابعہ بصری کی زیارت کو گئے۔ اِن کے پاس چراغ نہ تھا۔ آپ نے انگلیوں پر پھونک ماری۔ انگلیاں دَھک سے شمع کی مانند روشن ہوگئیں۔" (مقربانِ حق، ص ۴۶)

یہ کرامت اس لئے غلط ہے کہ حضرت رابعہ اور حضرت بصری کی تاریخی اعتبار سے ملاقات بھی

ثابت نہیں کی جا سکتی۔ اور اس کی تفصیل ہم کسی دوسری جگہ پر لکھ چکے ہیں۔ پھر کچھ ایسے اولیاء اللہ بھی ہیں کہ ہر ایک مہمان کے لئے الگ الگ شمعیں روشن کرتے ہیں۔ پھر یہ شمعیں اتنی راسخ ہوتی ہیں کہ پھونک مارنے سے نہیں بجھتیں۔ حتیٰ کہ اوپر مٹی ڈالنے سے بھی نہیں بجھتیں۔ چنانچہ جب احمد خضرویہ کے ہاں ستر درویش مہمان ہوئے تو آپ نے ان کے لئے ایسی ہی ستر شمعیں روشن کی تھیں۔ اور ان شمعوں کا دوسرا کرشمہ یہ تھا کہ اُنہوں نے ۷۰ کافروں کے تاریک دلوں کو جا منور کیا تھا اور وہ اسلام لے آئے تھے (مقربانِ حق، ص ۱۸۰) اسی طرح ایک دفعہ ابوبکر شبلی نے انہیں صفات کی حامل چالیس شمعیں مہمانوں کے لئے روشن فرمائیں لیکن اِن شمعوں نے کسی کافر کے ظلمت کدہ کو روشن نہیں کیا تھا۔

(مقربانِ حق، ص ۱۵۲)

لاٹھی مارنے سے چشمہ پھوٹنا

حضرت موسےٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ جب آپ کی قوم نے پانی کا مطالبہ کیا۔ پینے کو پانی دُور دُور تک کہیں نہ تھا۔ ادھر ستر ہزار بنی اسرائیل پیاسے مر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسےٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ پتھر (یا پہاڑ) پر اپنی لاٹھی مارو، تو اس سے بنی اسرائیل کے قبیلوں کی تعداد کے تناسب سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ اس میدان میں بھی ہمارے اولیاء اللہ کسی سے کم نہیں رہے۔ "ایک دفعہ ابو یوسف سمان چشتی (م ۴۵۹ھ) اپنے ہمراہیوں کے ساتھ گرمیوں میں تشریف لے جا رہے تھے سخت گرمی کے وقت رفقاء کو پیاس لگی۔ پانی کہیں نہ تھا۔ حضرت نے اپنی لاٹھی پتھر پر ماری تو اس سے فوراً چشمہ ابلنے لگا۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۷)

عصائے حضرت موسےٰ علیہ السلام

حضرت موسےٰ کو علیہ السلام کو ایک معجزہ یہ بھی عطا ہوا تھا کہ وہ اپنا عصا پھینکتے تو اژدہا بن جاتا تھا۔ جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے۔ ایسی کوئی کرامت کسی ولی اللہ سے ظاہر نہیں ہوئی۔ نہ ہی کسی تذکرہ نگار نے بیان فرمائی۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ خود بھی ایسی کرامت سے ڈر جاتے ہوں۔ ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ کرامت بیانی کا اصل مقصد تو عوام کو پیروں کے جال میں پھنسانا ہوتا ہے۔ ایسی کرامت دیکھ کر اگر لوگ بدک جائیں تو ایسی کرامت دکھانے کا تو فائدہ کے بجائے نقصان ہوگا۔ ایسی کرامت سے اولیاء اللہ اور تذکرہ نگاروں نے پرہیز ہی مناسب سمجھی۔ وہ اپنے عصا کو البتہ روشن کر سکتے ہیں مثلاً:

پیرانِ پیر نے ہتھیلی پر سرسوں جما کر ایسا کرشمہ دکھلا دیا تھا "عبداللہ زیال کہتے ہیں کہ میں آپ کے مدرسہ میں کھڑا تھا آپ عصا لیئے باہر آئے کہ اس عصا سے کوئی کرامت دکھلائیں۔ آپ نے اسے پھینک کر سانپ نہیں بنایا، بلکہ زمین میں گاڑ دیا، تو وہ روشن ہو کر چمکنے لگا اور گھنٹہ بھر اسی طرح چمکتا رہا۔ اُس کی روشنی آسمان پر چڑھتی جاتی تھی۔ وہ جگہ نورٌ علیٰ نور ہو گئی۔ (یعنی سورج کی روشنی بھی اور عصا کی بھی) گھنٹہ بعد آپ نے عصا زمین سے نکالا تو وہ اپنی پہلی حالت میں آگیا۔ پھر پیرانِ پیر نے فرمایا: "اے زیال! تم اسی چیز کے خواہشمند تھے۔" (بہجۃ الاسرار ص ۷۷۔ قلائد الجواہر ص ۲۹۔ بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۱۵۷)

اب بتلایئے اس کرامت نے کوئی اہم دینی یا دنیوی غرض پوری کی ہے ؟ اگر ایسا نہیں تو کیا اسے کرامت ہی کہیں گے ؟

دریا میں خشک راستہ بنانا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک معجزہ یہ بھی عطا ہوا تھا کہ آپ نے فرعون کے تعاقب کے وقت دریا پر اپنا عصا مارا تو پانی درمیان سے کٹ گیا اور پانی اپنی جگہ پر رُک گیا۔ اس میدان میں بھی ہمارے اولیاء اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پیچھے نہیں رہے۔ ایک دفعہ دریائے دجلہ میں شدت کی طغیانی آئی اور لوگ حیران و پریشان ہو گئے۔ لوگوں کی استدعا پر پیرانِ پیر اپنا عصا لیئے دریا کی طرف چل پڑے اور کنارے پر پہنچ کر اپنا عصا دریا کی اصلی حد پر نصب کر دیا اور دریا کو فرمایا بس یہیں تک۔ یہ فرمانا ہی تھا کہ اسی وقت پانی کم ہو کر آپ کے عصائے مبارک تک آگیا۔ (بہجۃ الاسرار، ص ۷۶۔ قلائد الجواہر، ص ۴۸ بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۱۰۲)

اب دیکھئے ! دریا کی شدید طغیانی سے دریا کے آس پاس کا سارا علاقہ زیر آب آیا ہوا تھا اور اسی وجہ سے لوگ پریشان تھے۔ ہم یہ تو مان لیتے ہیں کہ پیرانِ پیر پانی کے اوپر ہی اوپر چل کر دریا کے کنارے تک پہنچ گئے ہوں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پانی کی اصلی حد تک پانی میں آپ کا عصا نصب کیسے ہو گیا اور پانی کے اندر سے آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ پانی کی اصلی حد یہ ہے۔ پھر آپ کے وہاں کھڑے کھڑے اتنا کثیر پانی فوراً اُتر کر غائب بھی ہو گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں سیلاب آیا تھا۔ پانی جمع تو چالیس دن میں ہوا مگر اُترنے میں چھ ماہ لگ گئے۔ مگر پیرانِ پیر پل بھر میں اتنا کثیر پانی غائب فرما دیتے ہیں۔ آخر پیرانِ پیر جو ہوئے۔

عبدالواحد بن زید کا دریا کو خشک کر دینا

"کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ کا کسی دریا پر گزر ہوا۔ ملاح اہلِ ثروت سے دام لے کر کشتی

پر بیٹھا رہا تھا اور جن کے پاس دام نہ تھے اُن کو چھوڑتا جاتا تھا آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ دریا سے عبدالواحد کی طرف سے کہہ دو کہ خشک ہو جاوے۔ ان فقراء نے آپ کا پیغام پہنچا دیا۔ دریا اس قدر کم ہو گیا کہ لوگ بے تکلف گزر گئے۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۲۷)

اب دیکھئے کہ: عبدالواحد خود دریا پر موجود ہیں۔ پھر بھی دریا کو پیغام ان غریبوں کے واسطہ سے بھجواتے ہیں، جو آپ کے پاس ہی کھڑے تھے اور جنہوں نے آپ سے ایسی کوئی التجا تک بھی نہ کی تھی۔ پھر دریا جو پایاب ہو گیا تو جو لوگ کشتی پر سوار تھے وہ بھی اُتر آئے ہوں گے کیونکہ اب کشتی تو چل ہی نہ سکتی تھی اور ملاح جو مزدور بھی ہوتے ہیں آپ کو دُعائیں بھی دیتے ہوں گے کہ ان کی روزی کا ذریعہ چند فقراء پر اس ہمدردی اور کرامت کی وجہ سے ختم ہو گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دریائے فرات کی طغیانی

"ایک دفعہ کوفہ کے نواح کے لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ دریائے فرات میں بڑی طغیانی آئی ہے اور ہماری فصلیں تباہ ہو گئی ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ پانی کا بہاؤ کوفہ کو بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ دُعا فرمایئے کہ پانی حدِ اعتدال سے نہ بڑھے اور لوٹ جائے۔ آپ نے یہ شکایت سنتے ہی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جُبّہ پہنا۔ یاد رہے کہ یہ جُبّہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق پہلے ہی خواجہ اویس قرنی کو دے آئے تھے۔ پیراہن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بغل میں لیا۔ عصائے محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ میں اور عمامہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سر پر رکھا اور شہریوں کے ہمراہ دریائے فرات کے کنارے پہنچ گئے۔ دو رکعت نماز ادا کی اور فرات کے کنارے کھڑے ہو کر اسی عصا سے دریا کی طرف اشارہ کیا۔ ایک اشارے سے ہی ایک گز پانی اُتر آگیا۔ اسی طرح آپ نے تین بار کیا اور تین گز پانی نیچے اُتر گیا۔ جب چوتھے گز کی نوبت آئی تو اہلِ شہر چلا اُٹھے "یا حضرت! اس سے کم نہیں ہونا چاہئے۔ نہیں تو ہم پانی سے محروم ہو جائیں گے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۶۱)

اب دیکھئے کہ:

۱۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ دریائے فرات کے کنارے پہنچ کر دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ طغیانی کا قصہ سراسر غلط ہے، کیونکہ کنارہ تو زیرِ آب تھا۔ وہ طغیانی ہی کیا ہوتی جس میں لوگوں سمیت دریا کے کنارے پر پہنچ کر دو رکعت نماز ادا کر لی جاتی۔ ان دونوں میں ایک ہی بات ہو سکتی ہے، یا

طغیانی ہی نہ آئی تھی یا پھر آپ نے کنارے پہنچ کر نماز ادا نہیں کی تھی یا پھر شاید پانی پر ہی مصلیٰ ڈال کر کر لی ہو۔

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود بھی کوفہ کے رہنے والے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ عصا سے اشارہ کرنے میں اتنے محو تھے کہ انہیں اتنا بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اگر چوتھی بار بھی عصا سے اشارہ کر دیا، تو پانی یہاں سے پیچھے ہٹ جائے گا۔ لوگ چلائے تو پھر آپ عصا کے اشارہ سے رُکے۔ اگر لوگ نہ چلاتے تو عصا کے اشاروں سے دریا کو یکسر خشک ہی کر چھوڑتے، تو کیسا بُرا حال ہوتا۔

۴۔ متفرق کرامات جو معجزات کا چربہ ہیں

یانارُکونی بردًا وسلامًا

یہ معجزہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔ جب آپ نے توحید باری کی خاطر اپنے آپ کو آگ میں جھونک دیا جانا بھی گوارا کر لیا تب جا کر اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ دکھلایا اور آگ کو حکم دیا کہ "حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا۔" چنانچہ آگ گلزار بن گئی اور آپ اس میں سے صحیح سلامت باہر نکل آئے۔ لیکن رفاعی سلسلہ کے پیروں فقیروں نے اپنی ولایت کا معیار ہی یہ مقرر کیا ہوا تھا کہ وہ آگ میں کود جاتے اور آگ ان پر اثر نہیں کرتی تھی۔ اگرچہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی اس شعبدہ بازی کا پول کھول کے رکھ دیا تھا۔ مگر یہاں بحث یہ تو ہے ہی نہیں کہ ان کا یہ فعل شعبدہ بازی تھا یا کرامت۔ یہاں سوال یہ ہے کہ یہ اولیاء اللہ لوگوں کو ایسی کرامات دکھلا سکتے ہیں۔ اور جب چاہے دکھلا سکتے ہیں تو پھر ان کے طلسم کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معجزہ کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے؟

اسی طرح عثمان ہارونی صاحب (م ۶۱۷ھ) نے ایسا کرشمہ بربنائے دعویٰ اور محض اپنی ولایت کی نمائش کی خاطر دکھلا دیا تھا۔ ہُوا یہ کہ:

"ایک دفعہ آپ آتش پرستوں کے شہر تشریف لے گئے اور نصیحت کی کہ آگ قابلِ پرستش چیز نہیں اگر تم اس کی پوجا کرتے ہو تو بھی یہ تمہیں جلائے گی۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اگر اس کی پوجا نہ کرو گے تو یہ آخرت میں نہیں جلائے گی۔" وہ کہنے لگے "اچھا! آپ آگ کو نہیں پوجتے تو اس میں جا کر دکھلائیے کہ جلاتی ہے یا نہیں۔" آپ نے یہ سن کر وضو فرمایا اور دوگانہ ادا کیا اور سردار کے ایک کمسن بچے کو گود میں لے کر اس آگ میں

چلے گئے۔ اور دو گھنٹہ اس میں رہے۔ آگ نے بچہ تک میں کوئی اثر نہیں کیا۔ یہ ولایت ابراہیمی تھی، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معجزہ کا پرتو تھا۔ اس پر وہ سب کے سب مع اس سردار کے مسلمان ہو گئے۔" (تاریخ مشائخ چشت۔ مولانا زکریا، ص ۱۶۴)

اس اقتباس میں درج ذیل امور قابلِ غور ہیں:

۱۔ ولایتِ ابراہیمی کے الفاظ لا کر شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نے صوفیاء کے اس عقیدہ کی طرف واضح اشارہ فرما دیا کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے۔

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کافروں نے اپنے بتوں سے گستاخی کی سزا کے طور پر انتقاماً آگ میں جھونک دیا۔ آپ کو مجبوراً اور اضطراراً آگ میں جانا پڑا، لیکن ہارونی صاحب اپنی مرضی سے اور بر بنائے دعوائے اس میں داخل ہوتے ہیں۔

۳۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو قطعاً یقین نہ تھا کہ آگ ان پر کوئی اثر نہ کرے گی۔ وہ اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کرنے پر تیار تھے۔ جبکہ ہارونی صاحب کا مقصد کرامت کا اظہار تھا۔

۴۔ اس اقتباس میں یہ بات کہ سردار کے بچہ کو ہارونی صاحب اپنے ساتھ آگ میں لے گئے۔" عقلاً محال ہے۔ کیونکہ سردار تو اپنا بچہ اسی صورت میں ہارونی صاحب کے حوالے کر سکتا تھا کہ اسے بھی ہارونی صاحب کی طرح پہلے یقین ہوتا کہ آگ اس پر کچھ اثر نہ کرے گی۔ اگر انہیں پہلے سے یقین ہوتا تو وہ ہرگز امتحان نہ لیتے۔

۵۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب آگ سے صحیح سلامت نکلے تو ایک شخص بھی اسلام نہ لایا، مگر جب ہارونی صاحب آگ سے صحیح سلامت نکلتے ہیں، تو سب کے سب مسلمان ہو جاتے ہیں۔ اب جس معاملہ کی ابتداء، مقصد اور نتیجہ سب میں تضاد ہو، تو پھر ہارونی صاحب کی یہ کرامت معجزۂ ابراہیمی علیہ السلام کا پرتو کیسے ہوا، بلکہ اس سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ ہارونی صاحب کی کرامت کے مقابلہ میں بالکل ہیچ تھا۔

آگ میں کودنے کی مقابلہ بازی

شیخ ابو الحسن خرقانی کا ذکر چل رہا ہے:

"ایک روز شیخ المشائخ ابو العباس آپ (ابو الحسن خرقانی) کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ کے سامنے پانی کا بھرا ہوا ایک طشت رکھا تھا۔ شیخ ابو العباس نے پانی میں ہاتھ ڈال کر ایک زندہ مچھلی نکال کر آپ کے سامنے رکھ دی۔ شیخ خرقانی کے قریب ایک آتش

تنور تھا۔ آپ نے اس میں ہاتھ ڈال کر ایک زندہ مچھلی شیخ المشائخ کے سامنے رکھ دی اور فرمایا کہ پانی میں سے مچھلی نکالنا آسان ہے۔ آگ سے نکالنی چاہئیے۔ شیخ المشائخ نے کہا۔ آؤ ہم دونوں اس جلتے ہوئے تنور میں کود پڑیں اور دیکھیں کہ کون اس میں سے زندہ نکلتا ہے۔ اس پر شیخ خرقانی نے فرمایا "آؤ ہم اپنی نیستی میں غوطہ لگائیں اور دیکھیں کہ اس کی ہستی سے زندہ ہو کر کون باہر نکلتا ہے۔" یہ سن کر شیخ المشائخ ابوالعباس خاموش ہو گئے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۰۸)

اقتباس بالا سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ شیخ المشائخ کے لئے کم از کم اتنی کرامات ہونا ضروری ہیں کہ وہ (ا) پانی کے طشت میں ہاتھ ڈال کر زندہ مچھلی نکال سکتا ہو۔ (ب) دعوےٰ کے ساتھ آگ میں کود جائے۔ پھر اس پر آگ کچھ اثر بھی نہ کرے۔

۲۔ شیخ خرقانی کے مقابلہ میں شیخ المشائخ کی یہ کرامات بالکل ہیچ تھیں کیونکہ آپ (ا) پانی کے بجائے آگ سے بھی دعوےٰ کے ساتھ زندہ مچھلی نکال سکتے تھے۔ اور (ب) آگ لوگوں کو جلا کر مارتی ہے پھر بھی مادی جسم کے اجزا کسی نہ کسی صورت میں باقی رہ جاتے ہیں۔ پوری نیستی نہیں ہوتی۔ شیخ المشائخ انہیں جلے ہوئے اجزاء سے غالباً دوبارہ زندہ ہو کر نکلتے ہوں گے مگر شیخ خرقانی نے جو مکمل نیستی کے سمندر میں غوطہ لگانے کا ذکر کیا، تو شیخ المشائخ کے لئے چپ ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، کیونکہ شیخ خرقانی دعوےٰ کے ساتھ نیستی کے سمندر میں غوطہ لگانے کے بعد بھی واپس آسکتے تھے۔

۳۔ ولایت کے اس مقابلہ میں شیخ المشائخ نے بالآخر زک اٹھائی اور اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ انہوں نے خود مقابلہ کی دعوت دی تھی۔

شیخ محمد فضیل قادری نوشاہی (م ۱۱۱۱ھ) اور چٹان کا پھٹنا

"دورِ نبوی میں جنگِ خندق کی کھدائی کے دوران ایک سخت چٹان آگئی۔ جس کی وجہ سے کھدائی رک گئی۔ ادھر دشمن سر پر آرہا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عاجز آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی، تو آپ نے گینتی پکڑ کر زور سے ضرب لگائی اور نعرۂ تکبیر بلند کیا، تو یہ سخت پتھر پاش پاش ہو گیا اور یہ آپ کا معجزہ تھا۔

اب شیخ محمد فضیل قادری، نوشاہی کی کرامت بھی ملاحظہ فرمائیے:

"نقل ہے کہ کابل کے ایک شاہی باغ میں پہاڑ کی ایک چٹان آگری۔ وہ اس قدر وزنی تھی کہ اٹھائے

نہیں اٹھتی تھی۔ باغبان لوگ آپ کی خدمت میں آئے اور چٹان اٹھانے میں مدد مانگی۔ آپ نے چٹان کے قریب کھڑے ہو کر "الا اللہ" کا نعرہ لگایا۔ چٹان اسی وقت پھٹ گئی اور اُس کے ٹکڑے دُور دُور جا پڑے۔ زمین خالی ہو گئی۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۷۸)

اب دیکھئے یہ کرامت کئی لحاظ سے معجزہ نبوی ﷺ سے بڑھیا ہے۔ ایک تو رسول اللہ ﷺ نے گینتی استعمال فرمائی، لیکن فضیل صاحب کو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑی دوسرے خندق والی چٹان پھٹنے کے بعد وہیں کی وہیں رہی، لیکن شیخ صاحب کی پھٹی ہوئی چٹان کے ٹکڑے بھی دُور دور پڑ کر زمین بھی خالی ہو جاتی ہے۔

۵۔ چند دلچسپ کرامات

یہاں ہم ایسی کرامات درج کریں گے، جو محض اولیائی کی نمائش کے لیے تیار کی گئی ہیں اور کوئی دینی یا دنیوی اہم غرض پوری نہیں کرتیں۔

حضرت ابراہیم بن ادھم کا ذکر ہو رہا ہے:

"نقل ہے کہ ایک بار آپ نے کنویں میں ڈول ڈالا۔ نکالا تو چاندی سے بھرا ہوا تھا۔ پھینک دیا۔ پھر ڈالا، تو سونے سے لبریز آیا، اُسے بھی اُلٹ دیا۔ پھر نکالا، تو موتیوں سے بھرپور تھا۔ کہنے لگے: "الٰہی! مجھے خزانہ نہیں چاہیئے، پانی چاہیئے تاکہ مَیں وضو کروں اور تیری بندگی بجالاؤں۔" اللہ اللہ!" (مقربانِ

اب دیکھئے کہ حضرت ابراہیم بن ادھم کو ضرورت تو پانی کی ہے، وہ تو آتا نہیں اور سونے چاندی اور موتیوں کے ڈول نکلتے آرہے ہیں۔ لہٰذا ایسی "کرامت" کرامت نہیں، کچھ اور ہی چیز ہے۔ یا پھر یہ واقعہ ہی من گھڑت ہے۔

۲۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور گرا ہوا دہی

"ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ درہ ہاتھ میں پکڑے جا رہے تھے۔ ایک دہی فروش راہ میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ آپ نے پوچھا: "کیا ہوا؟" کہنے لگا: "میرا دہی زمین پر گر گیا۔ زمین اس دہی کو نگل گئی۔" حضرت عمرؓ کو اُس کی سادگی پر بڑا ترس آیا۔ آپ نے زمین پر دُرّہ مار کر کہا: "زمین! اس غریب کا دہی واپس کر دو۔ ورنہ انصاف کے درے سے تمہیں سزا دوں گا۔" زمین اسی وقت پھٹ گئی اور وہ دہی جو نگل چکی تھی اس دہی فروش کو لوٹانے میں کامیاب ہو گئی۔ اُس نے سارا برتن بھرا اور چلتا بنا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۵۶)

اب دیکھئے کہ:

۱۔ اگر دہی زمین پر گر جائے، تو زمین صرف اس میں موجود پانی کو جذب کرتی ہے۔ دہی کا اصل مواد زمین کے اوپر ہی رہتا ہے۔ چنانچہ جب دہی فروش نے کہا کہ میرا دہی زمین نگل گئی، تو حضرت عمر نے اس بات کو ماننے کے بجائے اس کی سادگی پر محمول فرمایا۔

۲۔ تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رزق کھانے کی وجہ سے اور زمین کے اس ظلم کی وجہ سے زمین کو درہ مار دیا۔ اور مزید سزا کی وعید بھی سنائی، تو زمین واقعی پھٹ گئی اور دہی جو کھا گئی تھی اسے واپس بھی لوٹا دیا۔ تب تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی یقین آگیا ہوگا کہ دہی فروش سادہ ہی نہ تھا بلکہ سچا بھی تھا۔

۳۔ اب جو دہی فروش نے دہی سے اپنا برتن بھرا، تو اس میں تو زمین کے مٹی کے ذرات بھی ضرور شامل ہوں گے۔ اس بات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انصاف حرکت میں نہ آیا کہ دہی فروش اپنی دہی کے ساتھ مٹی کے ذرات بھی لے گیا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ زمین درہ کھا چکی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے پر ظلم کی شکایت ہی نہ کی ہوگی۔

۳۔ سری سقطی کی بھنگن

"ایک روز شیخ کی بہن آئی۔ دیکھا کہ گھر میں ہر طرف کوڑا کرکٹ بکھرا پڑا ہے، شیخ سے جھاڑو دینے کی اجازت مانگی۔ آپ نے اجازت نہ دی۔ دوسرے روز شیخ کی بہن پھر آئی۔ دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت گھر میں جھاڑو دے رہی ہے۔ کہا "سبحان اللہ! مجھے تو جھاڑو دینے کی اجازت نہ دی مگر اس نامحرم عورت کو دے دی" فرمایا: "اے ہمشیر! یہ بوڑھی عورت نہیں ہے، یہ دنیا ہے، جو میرے عشق میں جلتی تھی اور مجھ سے محروم تھی۔ اب اس نے اللہ سے چاہا کہ اپنا نصیبہ مجھ سے حاصل کرے۔ اس لئے اس کو میری جاروب کشی کا حکم ہوا ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء ص ۱۳۲)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ سری سقطی گھر میں رہائش پذیر تھے۔ بس عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ گھر کی صفائی کا مطلق خیال نہ ہوتا تھا۔ نہ آپ کو نہ آپ کے گھر والوں کو۔ بس ہر طرف کوڑا کرکٹ ہی بکھرا رہتا تھا۔

۲۔ دنیا بڑی مدت سے اس عاشق الٰہی کے عشق میں جل رہی تھی اور شیخ سے اپنا نصیبہ حاصل کرنے کی دعا بھی کرتی رہی تھی، مگر اس کی یہ دعا اسی روز ہی قبول ہوئی، جب آپ کی بہن نے شیخ کے گھر میں کوڑا کرکٹ کا ڈھیر دیکھا۔

۴۔ شاہ مقیم حجرہ والے کا دردِ زہ کا علاج

"نقل ہے کہ آپ کے برادرِ حقیقی کی بیوی کو وضع حمل کے وقت شدت کا درد ہوا۔ شاہ مقیم صاحب سے دعا کی درخواست کی گئی تو فرمایا: "انشاء اللہ درد دور ہو جائے گا اور نہ رہے گا۔" آپ کی زبان سے یہ لفظ نکلتے ہی آپ کی بھاوجہ کا حمل غائب ہو گیا اور جب تک زندہ رہیں، حاملہ نہ ہوئیں۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۴۹)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ سے دعا کی درخواست کی گئی، تو آپ سخت جلالت میں تھے کہ دعا، بددعا سے بدل گئی اور بیچاری بھاوجہ کو ہمیشہ کے لئے بانجھ بنا دیا۔ دراصل خاندانی منصوبہ بندی والوں کو ایسے اولیاء اللہ کی بہت ضرورت ہے، مگر افسوس یہ محکمہ دیر بعد معرضِ وجود میں آیا ہے۔

۵۔ میاں میر بالا پیر اور سانپ کا طواف

"ایک روز آپ دریائے راوی کے کنارے بیٹھے تھے کہ ایک مارِ سیاہ آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور ایسی زبان میں گفتگو کی جسے کوئی اور نہ سمجھ سکتا تھا۔ پھر تین بار آپ کے گرد طواف کیا اور لوٹ گیا۔ حاضرین کے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا: "سانپ یہ کہتا تھا کہ میں نے عہد باندھ رکھا تھا کہ جب آپ کو دیکھوں گا، تو تین بار آپ کا طواف کروں گا۔ میں نے اجازت دے دی اور وہ طواف کر کے چلا گیا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ۲۳۷)

اب دیکھئے کہ:

۱۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو صرف منطق الطیر سکھلائی گئی تھی، لیکن بالا پیر سانپوں کی بولی بھی سمجھتے تھے۔

۲۔ کسی جاندار نے کسی نبی کا طواف نہیں کیا، کیونکہ طواف ایک عبادت ہے جو صرف اللہ کے گھر کے لئے سزاوار ہے، لیکن سانپ نے اس شرکیہ فعل کا عہد باندھا تھا۔

۳۔ سانپ ایک غیر مکلف مخلوق ہے جسے شرعی عبادات کا نہ علم ہو سکتا ہے نہ شعور۔ لہٰذا یہ قصہ ہی سراسر غلط ہے۔

۴۔ ان سب باتوں کو اگر درست تسلیم کر بھی لیا جائے تو بتلائیے کہ اس سے کون سی اہم دینی یا دنیوی غرض پوری ہوتی۔ سوائے اس کے کہ میاں میر صاحب کی ولایت کی نمائش ہو۔ پھر یہاں سندِ ولایت کی ضرورت بھی نہیں۔ کیونکہ حاضرین آپ کو پہلے ہی ولی سمجھتے تھے۔

بات وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ طبقہ عوام پر اپنی اولیائی کی دھاک بٹھلانے کے لئے ایسی کرامتیں تراشتا اور پھر انہیں مشہور کرتا رہتا ہے۔

باب (۹)

دلائلِ صوفیاء

اس باب میں ہم ایسی باتوں کا ذکر کریں گے جن کی کچھ نہ کچھ صورت شریعت میں موجود ہے۔ ہمارے صوفیہ نے ان امور میں غلو سے کام لیکر انہی امور کو پوری شریعت سمجھ کر ان پر دین طریقت کا محل کھڑا کر دیا ہے۔ پھر اس دین طریقت کو شریعت ہی سے ماخوذ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۔ مجاہدہ اور ریاضت

مجاہدہ و ریاضت کو جائز ثابت کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کے قبل از بعثت غارِ حرا میں تشریف لے جانے اور وہاں قیام فرمانے سے استدلال کیا جاتا ہے۔ یہ استدلال کئی لحاظ سے غلط ہے، مثلاً:

۱۔ یہ واقعہ قبل از بعثت کا ہے، جو حجت نہیں بن سکتا۔ پھر آپ نے اس قسم کے مجاہدہ سے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو سختی سے منع بھی فرما دیا، جو صوفیوں کے ہاں رائج ہے اور اسی کا ثبوت یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی اس قسم کا مجاہدہ نہیں کیا۔ نہ ہی آپ نے کبھی ایسا مجاہدہ کیا۔ گویا آپ کو پہلی وحی کے بعد ہی ایسے مجاہدہ سے اٹھا لیا گیا تھا۔

۲۔ غارِ حرا آپ کے گھر سے صرف چند میل کے فاصلہ پر تھا۔ آپ ہر تیسرے چوتھے دن گھر تشریف لاتے تھے اور گھر سے آب و دانہ ساتھ لے جاتے تھے۔ پھر آپ نے اپنی بیوی اور بال بچوں سے بھی تعلق منقطع نہیں کیا تھا۔ جبکہ ہمارے بزرگ کئی کئی سال جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ نکاح نہیں کرتے اور اگر پہلے سے شادی شدہ ہوں تو بیوی بچوں سے تعلق منقطع کر لیتے ہیں۔ پھر آب و دانہ کا انتظام تو در کنار، یہ نفس کو مارنے کے لئے بھوکوں رہنا پسند فرماتے ہیں۔ ان کے ہاں جو مقولہ معراج الفقراء الجوع رائج ہے۔ یہ اس کی پابندی ضروری خیال کرتے ہوئے ایسے فقر کے متلاشی ہوتے ہیں جس کی سرحدیں قدیم رہبانیت سے ملتی ہیں۔ اسلامی فقر سے ان کا چنداں تعلق نہ ہوتا۔

ے۔ دیکھئے باب (۴) میں عبادات میں غلو کے تحت

۴۔ آپ غارِ حرا میں جاکر ذکر و فکرِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے جبکہ یہ حضرات معتکف اور اد و وظائف کے چلّوں کے ذریعے تسخیرِ جنات اور کرامات کے حصول کا فن سیکھتے ہیں۔

اب ان اولیاء اللہ کے مجاہدات کا مختصر ذکر بھی ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) تیس سال تک شام کے جنگلوں میں ریاضت مجاہدہ کرتے رہے۔ ایک سال آپ (بسطام سے) حج پر گئے تو ہر قدم پر دوگانہ ادا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بارہ سال میں مکہ معظمہ پہنچے اور فرمایا کہ "دنیا کے بادشاہ کی بارگاہ نہیں، جو یکبارگی چلا جائے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۸۹)

۲۔ عبدالواحد بن زید (م ۱۷۸ھ) آپ نے بیعت سے قبل چالیس سال مجاہدہ کیا۔ (تاریخ مشائخ چشت مولانا زکریا، ص ۱۲۲)

۳،۴۔ ابو ہبیرہ بصری (م ۲۸۷ھ) اور علو ممشاد دینوری (م ۲۹۸ھ) دونوں نے تیس تیس سال مجاہدہ فرمایا۔ (ایضاً ص ۱۴۷۔ ۱۴۹)

۵۔ شریف زندنی (م ۵۸۰) چالیس سال ایک متوحش جنگل میں قیام فرمایا اور درختوں کے پتوں پر گزارا کرتے رہے۔ (صفحہ ۱۶۵)

۶۔ عثمان ہارونی (م ۶۰۳) آپ نے ستر (۷۰) سال مجاہدہ فرمایا۔ ساتویں دن منہ بھر پانی پیتے تھے۔ (ایضاً ۱۶۳)

۷۔ نظام الدین عمری (م ۱۰۲۴) نے اس قدر سخت مجاہدہ کیا کہ حجرہ کے دروازہ پر دیوار کھینچ لی تھی اور اندر ہی مہینہ بھر تک رہے۔ (ایضاً ۲۱۴)

۸۔ پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۶۱ھ) فرماتے ہیں کہ "مدت مدید تک شہر کے ویران اور بے آباد مقامات پر زندگی بسر کرتا رہا پچیس سال تک عراق کے جنگلوں میں تنہا پھرتا رہا۔ ایک سال تک ساگ، گھاس اور پھینکی ہوئی چیزوں پر گزارا کرتا رہا اور پانی مطلقاً نہ پیا۔ پھر ایک سال تک پانی بھی پیتا رہا۔ پھر تیسرے سال صرف پانی پر گزارا رہا پھر ایک سال نہ کچھ کھایا نہ پیا اور نہ ہی سویا۔" (طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۱۲۹، جامع کرامات اولیاء، ج ۱، ص ۲۰۲۔ قلائد الجواہر ص ۱۰، بحوالہ غوث الثقلین، ص ۸۳)

غالباً پہلے بزرگ جنہوں نے مجاہدہ کے لئے الٹا لٹکنا بھی ضروری سمجھ کر اس کا آغاز فرمایا وہ خواجہ محمد چشتی ہیں۔ چنانچہ صاحبِ سیر الاولیاء لکھتے ہیں کہ:

۹۔ **معکوس لٹک کر عبادتِ الٰہی کرنا**

منقول ہے کہ خواجہ محمد چشتی (م ۴۱۱ھ) اکثر اوقات عالمِ تحیر میں ڈوبے رہتے تھے اور سالہا سال آپ کا مبارک پہلو زمین پر نہ پہنچا۔ آپ مجاہدہ کے انتہائی درجہ اور غلبہ شوق میں سرنگوں ہو کر عبادت کرتے تھے۔ آپ کے مکان میں ایک عمیق اور گہرا کنواں تھا۔ اس میں الٹے لٹک کر عبادتِ الٰہی میں مصروف

رہتے۔" (سیر الاولیاء، ص ۴۶)

پھر بعض اولیاء اللہ ایسے بھی پیدا ہوئے جنہوں نے مجاہدہ میں معکوس لٹکنے کے علاوہ حبسِ دم کو بھی ضروری سمجھا صاحبِ خزینۃ الاصفیاء لکھتے ہیں کہ :

۱۰ شیخ عبدالرحمٰن نوشاہی (م ۱۱۵۲ھ) "مجاہدہ یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ تمام رات بہ حبسِ دم ذکرِ خفی کرتے اور بعض اوقات معکوس لٹک کر رات بھر ذکر میں مشغول رہتے۔ خلوت اختیار کرتے تو قبر کھدوا کر اس میں بیٹھ جاتے اور اوپر سے بند کرا دیتے۔ چالیس چالیس روز ایسی حالت میں مراقبہ اور ذکر و فکر میں محو رہتے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۳۰۵)

اب آپ خود ملاحظہ فرما لیجئے کہ ان حضرات کے مجاہدہ و ریاضت اور رسول اللہ کے قیامِ غارِ حرا میں کوئی نسبت ہے؟

۲۔ بیعت

بیعت دینِ طریقت میں شمولیت کے لئے لازمی امر اور اس کا اہم رکن ہے۔ لیکن اسلام میں اس بیعت کی یہ اہمیت ہرگز نہیں۔

بیعت دو قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) بیعت، اطاعتِ خلیفہ یا امیر : اسلام میں یہ بیعت ضروری قرار دی گئی ہے تاکہ مسلمان تشتت و انتشار کا شکار نہ ہوں۔ اسی لئے آپ کا ارشاد ہے : "کہ اگر دو خلیفوں کی بیعت ہونے لگے، تو بعد والے کو قتل کر دو۔" ظاہر ہے کہ اس قسم کی بیعت کا اطلاق اِن اولیاء اللہ کی بیعت پر نہیں ہو سکتا اور اس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں :

۱۔ اس پورے شجرۂ طریقت میں کوئی بزرگ ایسا نہیں جسے زمام کار یا خلافت نصیب ہوئی۔ یہ حضرات حسن بصری کے ذریعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تک سلسلہ ملاتے تو ہیں، مگر محدثین اور محققین کے نزدیک ان کی ملاقات بھی ثابت نہیں۔

۲۔ اس سلسلۂ طریقت میں کئی ایک بزرگ بیک وقت موجود ہوتے ہیں اور الگ الگ بیعت لیتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان حضرات کی بیعت کا اس بیعت سے چنداں تعلق نہیں، جسے اسلام میں امام کی اطاعت کے سلسلہ میں ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ایسی بیعت صرف ایک ہی امام کی ہو سکتی ہے۔

پھر ایسی بیعت بھی مملکت کے تمام مسلمانوں کے لئے ضروری نہیں۔ بلکہ دار الخلافت کے مسلمانوں کی بیعت تمام مملکت کے مسلمانوں کی بیعت سمجھی جاتے گی۔

دوسری قسم کی بیعت کسی بھی بزرگ کے ہاتھ پر کسی نیکی کے کام یا خدا کے احکام کی تعمیل کی شکل میں ہو سکتی ہے مثلاً :

۱۔ بیعتِ رضوان : یہ وہ بیعت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر موجود صحابہ سے جان کو جانِ آفرین کے سپرد کرنے کے سلسلہ میں لی تھی۔ یہ بیعت بھی ان اولیاء اللہ کے کام کی چیز نہیں۔ کیونکہ یہ حضرات

جہادِ اکبر (نفس کشی) کے مقابلہ میں جہادِ اصغر (جہاد بالسیف یا جان جانِ آفرین کر دینے کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔

۲۔ بیعتِ نسواں : یہ بیعت رسول اللہ نے چند شرعی احکام کی پابندی پر لی تھی۔ جن کا ذکر قرآن کریم میں مذکور ہے۔ تمام مسلمان عورتوں سے یہ بیعت نہیں لی گئی۔ لیکن جس قسم کی غیر مشروط اطاعت (یعنی غیر شرعی احکام کی تعمیل) یہ بزرگ حضرات اپنے مریدوں سے لیتے ہیں۔ اس قسم کی بیعت قطعاً حرام ہے۔ جس کی چند مثالیں ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

بیعت اگر مسنون طریقہ سے احکامِ شرعیہ کی پابندی کی بنیاد پر کی جائے، تو اس کا فائدہ ضرور ہے۔ بیعت لینے والا مرشد مرید پہ نظر رکھتا ہے اور مرید بھی ایفائے وعدہ اور یادگیری کی بنا پر اس کا پاس رکھتا ہے، لیکن اس فائدہ کے باوجود یہ بیعت اسلام میں ضروری قرار نہیں دی گئی۔ اویس قرنیؒ کو رسول اللہ ﷺ نے مسلمان ہی نہیں خیر التابعین کے لقب سے نوازا۔ حالانکہ اویس قرنیؒ نے آپ کی بیعت تو درکنار، آپ کو دیکھا تک نہ تھا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام میں اس بیعت کو لازم قرار نہیں دیا گیا۔ جبکہ دینِ طریقت میں بیعت اہم رکن سلوک سمجھا جاتا ہے۔ جس کے بغیر سلوک کی منازل طے کرنا ممکن نہیں۔

اویسی نسبت

بیعت کے سلسلہ میں صوفیہ نے ایک اور شاندار کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ اویس قرنیؒ نے رسول اللہ ﷺ کو نہ دیکھا نہ بیعت کی، تو اُن کی ارواح کی آپس میں بیعت کروا دی۔ اور اسے نسبتِ اویسیہ کا نام دیا اور راستہ کی اس رکاوٹ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ فلاں شیخ کی فلاں شیخ سے ملاقات ہی ثابت نہیں، یا پیر کی وفات کے بہت عرصہ بعد مرید کی پیدائش ہو تو وہ یہی نسبتِ اویسیہ[1] قائم کر کے اپنا سلسلہ جاری فرما کر

---

[1] چنانچہ پیران پیر براہِ راست رسول اللہ ﷺ کے اویسی ہیں۔ اسی طرح ابوالحسن خرقانی بایزید بسطامی کے اویسی ہیں۔ حالانکہ ان میں چھ واسطے ہیں، جو اس طرح ہیں۔ ابوالحسن خرقانی۔ ابومظفر۔ ترک طوسی۔ خواجہ اعرابی۔ خواجہ محمد مغربی۔ بایزید بسطامی۔ لیکن سلسلہ طریقت میں بایزید کے بعد فوراً دوسرا نمبر ابوالحسن کا آجاتا ہے (صوفیائے نقشبند ص ۱۰۳) اسی طرح حضرت ایشاں کی خواجہ بہاؤالدین نقشبند سے نسبتِ اویسیہ تھی (ایضاً ۲۶)

پھر وراثت کی طرح نسبت میں بھی عزل و نصب کا سلسلہ چلتا ہے یعنی اولیاء اللہ دوسرے اولیاء کی یہ نسبت سلب بھی کر لیتے ہیں مثلاً مولانا درویش محمد (م ۹۷۰ھ) سے جب کوئی درویش ملنے آتا تو آپ اس کی نسبت سلب کر لیا کرتے تھے (ایضاً ص ۱۸۵) اسی طرح شیخ محمد طاہر بندگی لاہوری بھی (م ۱۰۵۶ء) بھی دوسروں کی نسبت چھین لیا کرتے تھے۔

پھر یہ اویسی سلسلہ صرف نسبت میں ہی نہیں چلتا۔ خلافت میں بھی چلتا ہے۔ گویا ابوالحسن خرقانی بایزید کے اویسی خلیفہ ہیں۔ ان صوفیاء نے خلافت کے سات مندرجہ ذیل طرق اختیار کر رکھے ہیں۔ جن میں آخری طریق "اویسی" ہے۔

خلافت کے سات طریق

۱ اصالۃً ــــ جب کوئی شیخ اللہ کے حکم سے کسی کو خلیفہ بنائے، اسے خلافتِ الٰہی کہتے ہیں۔ ۲۔ اجازۃً ــــ جب کوئی شیخ

کام چلا لیتے ہیں۔

۳۔ توجہ یا تصرّفِ باطنی

توجہ اور تصرفِ باطنی کو مشروع اور اس کے ذریعہ حصولِ فیض کو درست ثابت کرنے کے لئے مولانا اللہ یار خاں صاحب نے اپنی کتاب دلائل السلوک میں پانچ واقعات سے استشہاد فرمایا ہے۔ جن میں سے پہلے چار درج ذیل ہیں :

۱۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رُوح القدس سے تائید فرمائی۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے دُعا کی کہ یا اللہ! حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی رُوح القدس کے ذریعہ تائید فرما۔

۳۔ جنگِ بدر میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو فرشتوں کی تائید سے ثابت قدم رکھا۔

۴۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی بار وحی ہوئی، تو جبریل علیہ السلام نے آپ سے کہا کہ "اِقْرَاْ" تو آپ نے فرمایا کہ مَا اَنَا بِقَارِئٍ۔ دوسری بار بھی ایسا ہی سوال و جواب ہُوا۔ پھر حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ کو سینہ سے لگا کر بھینچا جس کا اثر یہ ہوا کہ تیسری بار جب جبریل علیہ السلام نے "اقرأ" کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ بھی سینہ سے لگا کر بھینچنا بھی دراصل توجہ اور تصرفِ باطنی ہی کی قسم سے تھا۔

ان مندرجہ بالا چاروں واقعات سے استشہاد درست نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ سب فرشتوں کا عمل ہے جو مامور من اللہ ہوتے ہیں اور اس کے حکم سے سرتابی بھی نہیں کر سکتے۔ اسی لئے فرشتوں کے عمل کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف ہی منسوب فرماتے ہیں۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ تو ایسی توجہ کے بغیر بھی حصولِ فیض سے بہت زیادہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ان واقعات سے پیر اور مرید کے درمیان توجہ اور باطنی تصرف اور حصولِ فیض کو کیونکر ثابت کیا جا سکتا ہے۔

لے دے کے ایک پانچواں واقعہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا رہ جاتا ہے جس میں ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے اور دوسری طرف حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔ اس لئے اس واقعہ پر ہم ذرا تفصیل سے بات

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ سے)
اپنی مرضی سے کسی کو خلیفہ بنا دے، اسے خلافتِ رضائی کہتے ہیں۔ اور یہ عام ہے۔ ۳۔ اجماعاً — جب شیخ کی وفات کے بعد قوم کسی اہل شیا مرید کو خلیفہ بنائے، اسے خلافتِ قبرائی کہتے ہیں۔ یہ بزرگوں کے ہاں غیر معتبر ہے۔ ۴۔ وارثاً — مرنے کے بعد کسی نااہل وارث کی خلافت۔ یہ بھی غیر معتبر ہے الّا یہ کہ باطن میں فوت شدہ شیخ اس کا حکم دے۔ ۵۔ حکماً — حاکم وقت کسی کو فوت شدہ شیخ کا قائم مقام بنا دے۔ یہ بھی معتبر ہے۔ ۶۔ تکلفاً —

کریں گے۔ آپ نے مشکوٰۃ ص ۱۹۲ کے حوالہ سے متعلقہ حدیث کا ٹکڑا بمعہ ترجمہ نقل فرمایا ہے، جو یہ ہے:

فَسَقَطَ فِی نَفْسِی مِنَ التَّکْذِیبِ وَلَا اِذْ کُنْتُ فِی الْجَاهِلِیَّةِ فَلَمَّا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَاقَدْ غَشِیَنِی ضَرَبَ فِی صَدْرِی فَفِضْتُ عِرْقًا وَکَاَنِّی اَنْظُرُ اِلَی اللّٰهِ[1] (دلائل السلوک ص ۱۱۱)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اسلام کی تکذیب زمانہ جاہلیت سے بھی زیادہ میرے دل میں واقع ہو گئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا تو میرے سینے پر ہاتھ مارا تو میں پسینہ پسینہ ہو گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ گویا میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔

بعد ازاں آپ نے صاحب مرقاۃ (شارح مشکوٰۃ) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آپ کے سینہ میں ہاتھ مارنے سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو مقام مشاہدہ و حضور حاصل ہو گیا۔ پھر اس واقعہ اور تشریح سے درج ذیل نتائج پیش کئے گئے ہیں:

۱۔ توجہ کی غرض غفلت کو دور کرنا اور ایمان کو تیز کرنا ہوتا ہے۔ ۲۔ توجہ سے انکشاف ہوتا ہے۔

۳۔ مجاہدات اور ریاضت کے ذریعے سالہا سال میں بھی اتنا فائدہ نہیں ہوتا جو شیخ کی تھوڑی سی توجہ سے حاصل ہو جاتا ہے۔

۴۔ شیخ کی توجہ کے بغیر محض مجاہدات سے منازل سلوک طے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ تصوف اور سلوک القائی اور انعکاسی عمل ہے۔

۵۔ توجہ کے لئے قلب میں قبولیت کی استعداد ہونا ضروری ہے۔ اس لئے اس اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں کہ ابولہب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصرف کیوں نہ کیا؟

اب دیکھئے کہ:

۱۔ ان نتائج میں مولانا موصوف نے بار بار توجہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ حالانکہ یہ تادیب و تعزیر کا عمل تھا۔ آپ نے

---

[1] واضح رہے کہ حدیث کا صرف اتنا ٹکڑا نقل کرنے میں بھی آپ نے چار مقامات پر غلطی کی یا تصرف فرمایا ہے۔ مثلاً

(۱) ضَرَبَ کی جگہ اصل لفظ ضَرَبَ ہے۔ (۲) فُضْتُ کی جگہ اصل لفظ فِضْتُ ہے (۳) کَاَنِّی کے بجائے اصل لفظ کَاَنَّمَا ہے (۴) انظر الی اللہ کے بعد آپ نے فَرَقًا کا لفظ درج نہیں فرمایا جس کا معنی غزنوی مترجم مشکوٰۃ میں "ڈر کی وجہ سے" اور منجد میں فرق فَرَقًا کے معنی گھبرانا اور ڈرنا درج ہے۔ (دیکھئے مسلم کتاب فضائل القرآن۔ باب بیان ان القرآن انزل علی سبعۃ احرف) صوفیاء کی یہ بے احتیاطی یا غَفْلَةُ الصّٰلِحِيْنَ تو قرون اولیٰ سے زبان زد ہے۔ اب اگر صرف نقل کے معاملہ میں بھی مولانا اللہ یار خان جیسے مولانا کی کتاب کا یہ حال ہو تو دوسرے تذکرہ نگاروں کا حال آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے سینہ پر ہاتھ مارا جس کی وجہ سے آپ گھبرا بھی گئے تھے۔

کیا ہمارے ہاں مروجہ سلسلہ ہائے طریقت میں ایسی توجہ کسی مُرشد نے اپنے مرید پر فرمائی ہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر آپ کے اس عمل پر توجہ کا اطلاق کیسے ہو سکتا ہے؟

۲۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو حضور اور مشاہدہ کا مقام حاصل ہو گیا تھا۔ اب کسی بات کے فی الواقعہ "ہونے" اور "گویا کہ ہونے" میں۔ جیسا کہ "کانما" کے لفظ سے ظاہر ہے۔ جو فرق ہے وہ واضح ہے اس کی مثال یُوں سمجھیئے کہ حدیثِ جبریل میں ہے کہ "احسان یہ ہے کہ تُو عبادت اس طرح کرے گویا کہ تُو اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکثر صحابہ کی عبادت ایسی ہی تھی۔ پھر کہیں یہ بھی منقول ہے کہ وہ فی الواقعہ اللہ کو عبادت کے وقت دیکھتے تھے؟ یا انہیں صوفیاء کا تجویز کردہ مقام حضور و مشاہدہ حاصل ہو گیا تھا؛

۳۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ رسول اللہ کا یہ عمل توجہ ہی کی ایک قسم تھا اور یہ بھی فرض کر لیں کہ اسلام کا منشائے مقصود سلوک و تصوف کی منازل طے کرانا اور مقام حضور و مشاہدہ تک، اس سے آگے، مقام فنا فی اللہ تک لے جانا ہے، تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اور صحابی پر ایسی توجہ فرمائی تھی؟ کیا باقی سب صحابہ میں ابوطالب کی طرح اس توجہ کی قبولیت کی استعداد نہ تھی؟

۴۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس "توجہ" سے مقام حضور و مشاہدہ پر پہنچ جاتے ہیں، صوفیہ کا کوئی بھی سلسلہ اپنے شجرہ طریقت کو ان تک نہیں پہنچاتا اور جن صحابہ کو یہ حضرات اپنے شجرہ طریقت میں یا اپنے تذکروں میں شمار کرتے ہیں مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ یا حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ ان میں سے کسی پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی توجہ ثابت نہیں۔

۵۔ مروجہ سلسلہ ہائے طریقت میں "توجہ" سے پہلے بیعت بھی ضروری ہے۔ بیعت کے بغیر توجہ کا کوئی امکان نہیں اور اس بیعت کا بھی ایک مخصوص طریق مروج ہے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے اس مخصوص طریقہ کی بیعت لیا کرتے تھے؟ اور بالخصوص آپ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ایسی بیعت لینے کے بعد "توجہ" فرمائی تھی؟ علاوہ ازیں منازلِ سلوک طے کرانے کے لئے مرشد کو کئی بار اور مسلسل توجہ کرنا پڑتی ہے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل سے پہلے یا بعد پھر کبھی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر ایسی توجہ فرمائی تھی؟ مرشدِ کامل تو اپنے صاحب استعداد مریدوں پر بار بار توجہ ڈالتے رہتے ہیں۔

بات سیدھی سی تھی جسے مولانا نے خواہ مخواہ پُرپیچ بنا دیا۔ ہوا یہ تھا کہ اختلافِ قرأت کی بنا پر حضرت ابی بن کعب

کو ایسا تردد لاحق ہوا کہ انہیں اللہ کے قرآن نازل کرنے اور آپ کی رسالت پر بھی شک ہونے لگا تھا رسول اللہ نے یہ کیفیت بھانپ لی اور آپ کے سینہ پر ہاتھ مارا جس سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو انشراح صدر ہو گیا اور اللہ، قرآن کے نازل کرنے والے پر ایسا پختہ یقین ہو گیا جیسا کہ عین الیقین کی بنا پر ہوتا ہے اور اس درجہ کا ایمان دوسرے بھی بہت سے مومنوں کو نصیب ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زندگی بھر کے اس ایک عمل کو بھلا صوفیاء کے معمولاتِ توجہ سے کیا تعلق ؟ جس کے ذریعہ مریدوں کو بار بار توجہ کرنے سے ایک منزل سے دوسری پھر دوسری سے تیسری منزل تک پہنچایا جاتا ہے۔

۴۔ مشاہدۂ حق

ہم پہلے باب میں بیان کر آئے ہیں کہ اس دنیا میں اللہ تعالٰی کا دیدار ممکن نہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر بھی اس دیدارِ الٰہی کی تاب نہ لا سکے تو اور کسی کی کیا مجال ہے ؟ لیکن ہمارے صوفیاء کرام بضد ہیں کہ دیدارِ الٰہی صرف ممکن ہی نہیں، بلکہ بڑے بڑے بزرگوں کو ایسا دیدارِ الٰہی ہوتا بھی رہتا ہے

اب ان کے دلائل یا تاویلات ملاحظہ فرمایئے: آیہ لن ترانی کی تاویل کرتے ہوئے صاحب تفسیر رُوح البیان لکھتے ہیں:

دیدارِ الٰہی کا قرآنی ثبوت (تاویل نمبر ۱)

وَ اِنَّكَ اِذَا نَظَرْتَ بِكَ اِلَىَّ لَنْ تَرَانِىْ لِاَنَّهٗ لَا يَرَانِىْ اِلَّا مَنْ كُنْتُ لَهٗ بَصَرًا فَبِهٖ يُبْصِرُ	اور تو جب اپنے ساتھ میری طرف نظر کرے گا تو مجھے نہ دیکھ سکے گا۔ کیونکہ مجھے وہی دیکھ سکتا ہے جس کے لئے میں خود بصیر ہوں۔ پھر وہ اس (بصارت) کے ساتھ دیکھے۔

اس سے بھی معلوم ہُوا کہ کوئی اس کو اپنے ساتھ دیکھے گا تو نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے ساتھ اسی کو دیکھے گا۔"

(ریاض السالکین، ص ۰۰، بحوالہ تفسیر رُوح البیان، ص ۷۷، جلد ۱، سطر ۱)

اس گورکھ دھندے کو کچھ سمجھے آپ ؟ اگر نہیں سمجھے تو کوئی بات نہیں۔ جب یہ گورکھ دھندا حضرت موسیٰ خود بھی نہ سمجھ سکے، تو پھر ہمارا اور آپ کا ذکر ہی کیا ہے ؟ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام ان صوفیاء نہ اسرار و رموز کو جانتے ہوتے تو شاید اللہ تعالٰی کا دیدار فرما لیتے اور مایوس نہ ہوتے مگر وہ تو اپنے ساتھ اللہ کو دیکھ رہے تھے۔ اگر اللہ کو اللہ کے ساتھ دیکھتے تو ضرور کامیاب ہو جاتے۔

تاویل نمبر (۲)

بَلْ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ وَھُوَ حُجَّۃُ اَھْلِ السُّنَّۃِ وَالْجَمَاعَۃِ عَلٰی جَوَازِ رُؤْیَۃِ اللّٰہِ تَعَالٰی[1]	بلکہ حضرت موسے علیہ السلام نے کہا کہ مجھے اپنا آپ دکھلا کہ میں تیری طرف دیکھ سکوں " یہ بات اہل السنۃ والجماعۃ کے لئے رؤیت اللہ تعالٰے کے جواز پر حجت ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت موسے علیہ السلام کا اللہ کے دیدار کا سوال کرنا تمام حدوں سمیت پورا پورا دیکھ لینا، یعنی اس کا احاطہ کر لینا اور عدمِ احاطہ سے عدمِ رؤیت لازم نہیں آتی جیسا کہ علم کو احاطہ نہ کر لینے سے عدمِ علم لازم نہیں آتا مگر جائز ہے کہ رؤیت ہو مگر احاطہ کے ساتھ نہ ہو جس کی آیت میں نفی کی گئی ہے۔" دریاض السالکین، ص ۸۰

اب دیکھئے کہ :

۱ حضرت موسٰے علیہ السلام کے سوال دیدارِ الٰہی کو تو آپ اہل السنۃ والجماعۃ کے لئے دیدارِ الٰہی کے جواز پر حجت تبلا رہے ہیں لیکن اللہ تعالٰے کے انکارِ رؤیتِ الٰہی کا ذکر تک نہیں فرماتے۔ کیا حضرت موسے علیہ السلام کا سوال ہمارے لئے حجت ہے یا اللہ تعالٰے کا تردیدی جواب ؟

۲ پھر عرشی صاحب ریاض السالکین نے حضرت موسٰی علیہ السلام کے دیدارِ الٰہی کے سوال کے ساتھ جو "تمام حدوں سمیت پورا پورا دیکھ لینا یعنی اس کا احاطہ کر لینا" کے اپنی طرف سے اضافے فرماتے ہیں، کیا آیتِ مذکورہ میں ایسی پابندیوں کی کہیں گنجائش نظر آتی ہے ؟

۳ نیز عرشی صاحب کا طرزِ استدلال بھی ملاحظہ فرمائیے کہ "جو علم کو احاطہ نہ کر سکنے سے عدمِ علم لازم نہیں آتا" یعنی اگر آپ کسی بات کے عالم نہیں، تو ضروری نہیں کہ وہ بات ہی نہ ہو اور اس کا علم ہی نہ ہو جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر حضرت موسٰی علیہ السلام اللہ کو نہیں دیکھ سکتے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی دوسرا بھی نہ دیکھ سکے۔ ہم تو ایسے خیال کو بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ صوفیاء کے ہاں اگر یہ درست ہو تو بھی ایسے نظریات انہی کو مبارک ہوں۔

حدیثِ قدسی سے دیدارِ الٰہی کا ثبوت

یہی عرشی صاحب اپنی کتاب ریاض السالکین کے صفحہ ۲۴۴ پر مشکوٰۃ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں :

حضرت ابی قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

مَنْ رَاٰنِیْ فَقَدْ رَاَی الْحَقَّ (مشکوٰۃ، ص ۳۹۲)	جس نے مجھ کو دیکھا، اس نے خدا کو دیکھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ جب میں نے یہ پڑھا، تو دم بخود ہو گیا اور خیال آیا کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ خود تو درکنار، تمام صحابہ نے بھی اللہ تعالٰی کا دیدار کیا تھا۔ بہرحال مشکوٰۃ میں مولہ بالا روایت

---

[1] ان عبارات میں عربی عبارات صاحب تفسیر روح البیان کی ہیں، ترجمہ ہماری طرف سے ہے اور تشریح صاحب ریاض السالکین کی طرف سے۔

دیکھی تو معلوم ہوا کہ یہ روایت مشکوٰۃ میں "باب الرؤیا" میں مندرج ہے اور اس سے پہلے ایک متفق علیہ حدیث بھی اسی مضمون کی مندرج ہے اور وہ یہ ہے :

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے
وَسَلَّمَ قَالَ : مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي	فرمایا کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا، بیشک اس نے مجھے ہی
فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ فِي صُوْرَتِي	دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا۔"
متفق علیہ (مشکوٰۃ، ص ۳۹۴)	(بخاری و مسلم)

اب اسی باب میں اگلی روایت وہ ہے، جو عرشی صاحب نے درج فرمائی ہے جس کا واضح مطلب تو یہ ہے کہ جس نے مجھے دیکھا اس نے فی الحقیقت مجھے ہی دیکھا۔ اب عرشی صاحب نے ایک تو یہ ذکر نہ کیا کہ یہ روایت خواب سے متعلق ہے۔ دوسرے "حق" "یعنی حقیقت، سچ یا سچائی" کے کرنے کے اس کا ترجمہ "خدا" کر کے دیدارِ الٰہی کو ثابت کر دکھایا۔ ان صوفیاء کی یہی وہ بے اعتدالیاں اور کارستانیاں ہیں جن کی وجہ سے محدثین ابتداء ہی سے ان سے بدگمان رہتے اور ان سے مروی روایت قبول کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔

دراصل عرشی صاحب بھی مجبور ہیں کیونکہ ان کے بڑے بڑے بزرگ ایسا ہی کچھ لکھ گئے ہیں۔ چنانچہ اسی کتاب "ریاض السالکین" کے صفحہ ۱۷ پر لکھتے ہیں کہ : "تفسیر عرائس البیان" میں (ص ۷/۱، س ۱۰) شیخ روزبھان ثعلبی شیرازی جو ایک بہت بڑے بزرگ، ولیٔ کامل اور عارف باللہ ہوئے ہیں، فرماتے ہیں کہ

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ. عُمْيٌ عَنْ	.... وہ لوگ اندھے ہیں، جو اولیاء اللہ کی پیشانی میں
رُؤْيَتِ أَنْوَارِ جَمَالِ الْحَقِّ فِي سِيْمَاءِ الْأَوْلِيَاءِ	حق تعالیٰ کے جمال کے انوار نہیں دیکھتے۔

دیکھئے! عرشی صاحب نے صرف "عُمْيٌ" کا مطلب تبلایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے صُمٌّ کے معنیٰ یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ اولیاء اللہ کی بات نہیں سنتے اور بُكْمٌ کے یہ معنیٰ ہوں گے کہ وہ ایسے اولیاء اللہ کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے اور ان کی تصدیق نہیں کرتے اور فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ وہ ان اولیاء اللہ کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے... اور یہ صفات اللہ تعالیٰ نے چونکہ منافقین کی بیان فرمائی ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو اولیاء اللہ کی پیشانیاں دیکھنے سے دیدارِ حق یا مشاہدۂ انوارِ جمالِ حق نہیں ہوتا وہ سب منافق ہیں۔

اس کے بعد صاحب عرائس البیان لکھتے ہیں کہ :

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِرْآةُ الْحَقِّ	نبی اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کا آئینہ ہیں جلال اور جمال کیساتھ

يَتَجَلّٰى بِجَلَالِهٖ وَجَمَالِهٖ لِلْأُمَنَاءِ وَالصِّدِّيقِيْنَ مِنْهُ يَرَوْنَ اللّٰهَ بِرُؤْيَتِهٖ لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ: مَنْ رَّاٰنِیْ فَقَدْ رَاَی الْحَقَّ" (تفسیر عرائس البیان ص، ج، ش)

امینوں اور صدیقوں کے لئے۔ اور وہ حضور ﷺ کو دیکھنے سے اللہ تعالےٰ کو دیکھ لیتے ہیں۔ کیونکہ آپ نے فرمایا ہے کہ جس نے مجھ کو دیکھا، اس نے خدا کو دیکھا۔" (ریاض السالکین، ص ۱۱)

اسے کہتے ہیں "بنائے فاسد علی الفاسد" یعنی پہلے حدیث کے مفہوم میں فریب سے کام لیا اور یہ ثابت کیا کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا اس نے خدا کو دیکھا۔ پھر اس غلط مفہوم کو اصل بنیاد قرار دے کر یہ ثابت کر دکھایا کہ اولیاء اللہ کو دیکھنے سے بھی دیدارِ حق نصیب ہو جاتا ہے۔ گویا طریقت کی دنیا میں یہ چیز اتنی ارزاں ہے کہ کسی بھی ولی کو دیکھنے سے مل جاتی ہے لیکن شریعت کی دنیا میں یہ اتنی مہنگی ہے کہ حضرت موسیٰ کو التجا کے باوجود نہ مل سکی۔

۵۔ دیدارِ رسول اللہ

احادیثِ صحیحہ سے یہ تو ثابت ہے کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا اس نے واقعی آپ ہی کو دیکھا، کیونکہ شیطان آپ کا روپ نہیں دھار سکتا، لیکن علماء اس پر یہ شرط ضرور عائد کرتے ہیں کہ یہ خوشخبری صرف صحابہ کے لئے ہے جنہوں نے آپ کو دیکھا تھا اور شکل پہچانتے تھے، دوسروں کو شیطان خواب میں دھوکا بھی دے سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ یہ یقین دلا دے کہ میں فی الواقعہ (نعوذ باللہ) رسول اللہ ہوں جبکہ حقیقتاً ایسا نہ ہو۔ لیکن طریقت کی دنیا ہی الگ ہے۔ وہ صرف کتبِ احادیث میں مذکور حلیہ مبارک کی بنا پر ہی یقین کر لیتے ہیں حالانکہ کئی آدمیوں کا حلیہ ایسا ملتا جلتا ہوتا ہے کہ ان کا فرق واضح کرنا مشکل ہوتا ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا حلیہ مبارک بھی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ سے ملتا جلتا تھا۔ اسی بنا پر جنگِ اُحد کے دوران جب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے، تو ابن قمیئہ نے مشہور کر دیا کہ (نعوذ باللہ) حضرت محمد ﷺ شہید ہو گئے۔ (سیرت ابنِ ہشام اردو، غزوہ احد، ص ۵۵)

یہ تو خیر خواب کی بات تھی، لیکن صوفیاء کرام تو حالتِ بیداری میں بکثرت آپ کی زیارت سے مشرف ہوتے رہتے ہیں اور اس کی بنیاد درج ذیل حدیث ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ رَّاٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَسَيَرَانِیْ فِی الْيَقَظَةِ وَلَا يَتَمَثَّلُ الشَّيْطَانُ بِیْ (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو عنقریب وہ مجھے بیداری میں بھی دیکھ لے گا، کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ (بخاری، مسلم)

(مشکوٰۃ ۳۵۴)

اس حدیث کی شرح میں علماء نے درج ذیل اقوال نقل کئے ہیں:

۱۔ یہ بیداری کی زیارت قیامت کو ہوگی، اس سے پہلے نہیں (حاشیہ نمبر، مشکوٰۃ، ص ۳۹۴)

۲۔ صحیح مسلم میں ان الفاظ کے بعد یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

أَوْ لَكَأَنَّمَا رَآنِي فِي الْيَقَظَةِ۔ یعنی کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ ایسا ہے جیسا کہ اس نے مجھے جاگتے میں دیکھا (یعنی راوی حدیث کہتا ہے کہ مجھے یاد نہیں کہ رسول اللہ نے پہلے الفاظ کہے تھے یا دوسرے۔ (مسلم، کتاب الرویا، ج ۲، ص ۲۴۲)

امام نووی نے اس حدیث کی شرح میں تین اقوال نقل فرمائے ہیں:

(i) اس سے صرف آپ کے اہل عصر مراد ہیں، یعنی جو لوگ مکہ میں ہیں اور ہجرت کرکے مدینہ ابھی نہیں آئے۔ وہ ہجرت کرکے آکر آپ کو بیداری میں بھی دیکھیں گے۔

(ii) آپ کی یہ زیارت آخرت میں ہوگی۔

(iii) یہاں رؤیت سے مراد رؤیت خاص ہے یعنی قیامت میں اسے آپ کا قرب حاصل ہوگا اور آپ اس کی شفاعت کریں گے۔ (مسلم، حوالہ ایضاً)

۳۔ شارح بخاری احمد علی سہارنپوری محدث نے بھی یہی مندرجہ بالا تینوں اقوال اس کی شرح میں نقل فرمائے ہیں۔ (بخاری، کتاب التعبیر، ج ۲، ص ۱۰۳۵، حاشیہ ۱۳)

یہ ہے حدیث مذکورہ بالا کی وہ تشریح جو شارحین حدیث اور علمائے امت نے بیان فرمائی، لیکن صوفیاء اس کا بالکل الگ اور نرالا مطلب بیان فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جس کسی صوفی نے آپ کو خواب میں دیکھا وہ اپنی زندگی میں ہی آپ کو بیداری کی حالت میں بھی ضرور دیکھ لے گا۔ چنانچہ ان اولیاء اللہ کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی بزرگ بھی آپ کی زیارت سے بیسیوں مرتبہ مشرف ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم پیران پیر کا ایک مشہور واقعہ نقل کرتے ہیں، جو تذکروں کی اکثر کتابوں میں درج ہے:

"ایک دن آپ وعظ فرما رہے تھے۔ شیخ علی ابن الہیتی پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کو نیند آگئی۔ پیران پیر نے حاضرین کو خاموش بیٹھنے کا اشارہ کیا، خود منبر سے اتر کر شیخ علی بن الہیتی کے سامنے مؤدب کھڑے ہوگئے۔ جب شیخ موصوف بیدار ہوئے، تو پیران پیر نے پوچھا، آپ کے پاس رسول پاک تشریف لائے، تو انہوں نے کیا کہا؟ شیخ نے جواب دیا: "آپ کی خدمت میں حاضری کی تاکید فرمائی۔" پیران پیر نے کہا "میں اس لئے مؤدب کھڑا ہوگیا تھا اور جو کچھ تم نے خواب میں دیکھا ہے وہ سب کچھ میں نے حالت

بیداری[1] میں دیکھا ہے۔" (نفحات الانس فارسی صفحہ ۵۶۷۔ مدارج النبوت فارسی بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۲۱۰)

اس واقعہ کو ہمیں خود غلط ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں تذکروں کے دوسرے اقتباسات سے اس واقعہ کا غلط ہونا ثابت ہو جاتا ہے مثلاً:

۱۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ:

"آپ کی مجلس شریف میں کل اولیاء اللہ اور انبیائے کرام جسمانی حیات کے ساتھ اور ارواح کے ساتھ تشریف فرما ہوتے تھے۔" (اخبار الاخیار مصنفہ شیخ عبدالحق، ص ۱۱۔ قلائد الجواہر، ص ۴۔ سفینۃ الاولیاء، ص ۶۴۔ بہجۃ الاسرار، ص ۲۲۔ بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۴۷)

۲۔ یہ اشتباہ بھی نہ رہنا چاہیئے کہ شاید ان انبیائے کرام میں سے رسول اللہ مستثنیٰ ہیں۔ چنانچہ ابوسعید قیلوی فرماتے ہیں کہ:

"میں نے کئی مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو آپ کی مجلس مبارک میں رونق افروز ہوتے دیکھا۔" (بہجۃ الاسرار، ص ۹۵۔ قلائد الجواہر، ص ۴۷۔ بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۵۷)

اب دیکھئے یہ تینوں اقتباسات، جو ایک ہی کتاب سیرتِ غوث الثقلین سے لیئے گئے ہیں ایک دوسرے کی تغلیط کر رہے ہیں۔ وہ اس طرح کہ:

۱۔ جب حضور اکرم ﷺ حالتِ خواب میں شیخ علی بن الہیتی کے پاس تشریف لائے تو آپ کی یہ تشریف آوری صرف پیران پیر ہی پر کیوں ظاہر ہوئی، جبکہ دوسرے انبیاء کرام اور کل اولیاء بھی آپ کی مجلس میں موجود تھے کیا ان کی قلبی آنکھیں وا نہ تھیں؟

۲۔ رسول اکرم ﷺ تو اکثر پیران پیر کی مجلسِ وعظ میں تشریف لایا کرتے تھے، تو آپ ان کی موجودگی میں وعظ کیسے فرمایا کرتے تھے؟ علی بن الہیتی کے پاس حالتِ خواب میں آمد پر آپ نے حاضرین کو خاموش بیٹھنے کی تاکید فرمائی اور خود بھی اس وقت تک مؤدب کھڑے رہے جب تک آپ واپس نہ چلے گئے۔ تو کیا دوسری مجالس میں آپ نے حضور اکرم ﷺ کے لئے یہ طریقِ ادب ختم کر دیا تھا؟ یا پھر وہ پہلا افسانہ بھی محض تراشیدہ ہے۔

۳۔ آپ کی مجالس میں رسول اللہ ﷺ اور دوسرے انبیاء کرام کس غرض سے تشریف لاتے تھے؟ کیا

---

[1] اور صاحب ریاض السالکین نے یہ واقعہ درج کرنے کے بعد یہ اضافہ بھی فرمایا ہے: "کہ اس وقت سات آدمی وجد میں آکر واصل بحق ہوئے۔" (ریاض السالکین، ص ۳۱۱)

وہ خود آپ کی مجلسِ وعظ سے مستفید ہونے کے لئے آتے تھے؟ اگر ایسا ہے تو یہ تو اُلٹے بانس بریلی کو جانے لگے۔ یا وہ انبیاء دوسرے لوگوں کو ترغیب دلانے کے لیے آتے تھے کہ دیکھو! جب ہم اللہ کے نبی ہو کر پیرانِ پیر کی مجلس وعظ میں آگئے ہیں تو تم کیوں نہیں آتے؟

وفاتِ نبوی کے بعد حضورؐ کی زندگی کیسی ہے؟

وفات کے بعد اور یوم البعثت سے پہلے کے درمیانی عرصہ کی زندگی کے تو سب قائل ہیں اور اسے حقیقی زندگی نہیں بلکہ برزخی زندگی کہا جاتا ہے، لیکن صوفیاء کا دعوےٰ یہ ہے کہ رسول اللہ اور اسی طرح دوسرے اولیاء مرتے نہیں بلکہ عوام کی نظروں سے پسِ پردہ چلے جاتے ہیں۔ پھر وہ خواص جن کی قلبی آنکھیں وا ہوتی ہیں وہ انہیں دیکھتے اور ان سے فیوض و برکات حاصل کرتے رہتے ہیں، لیکن عوام انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ اس سلسلہ میں مولانا اللہ یار خان صاحبِ دلائل السلوک کا تو یہاں تک دعوٰئے ہے کہ وہ چھ ماہ کی تربیت کے بعد سالک کو دربارِ نبوی میں پہنچا کر آپ سے بیعت بھی کروا دیتے ہیں۔ (دلائل السلوک، ص ۴۴، ۴۷) اب سوال یہ ہے کہ کیا صحابہ کرامؓ نے بھی کبھی ایسے کام کیے تھے؟ کیا ان کی قلبی آنکھیں وا نہ تھیں؟ کہ وفات النبی کے بعد اس دربارِ نبوی کو دیکھ سکتے اور تابعین کی بیعت کروا دیتے۔

اب یہ تو واضح ہے کہ علمائے حق ایسی باتوں کو کسی قیمت قبول نہیں کرتے اور ہمیشہ سے صوفیاء پر گرفت کرتے چلے آئے ہیں۔ اور صوفیاء کا طریقِ کار یہ ہوتا ہے کہ جب دلائلِ شرعیہ کے سامنے ان کی کچھ پیش نہیں جاتی، تو منکرین کو اپنے رنگ میں رنگ کر ان سے اقرار کروا لیتے ہیں۔ یعنی علمائے شریعت جب تک صوفیاء کے رنگ میں نہ رنگے جائیں، کبھی ایسی باتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ ایسا ہی ایک واقعہ علاؤالدین عطار نقشبند (م ۸۰۲ھ) کے زمانہ میں پیش آیا۔ حکیم سید امین الدین صاحب صوفیائے نقشبند علاؤالدین عطار کی کرامات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک دن بخارا میں علماء کے درمیان رؤیت باری تعالےٰ پر بڑا مباحثہ ہوا۔ جب کسی نتیجہ پر نہ پہنچے تو سب نے بالاتفاق حضرت خواجہ (علاؤالدین عطار) کو ثالث تسلیم کر لیا۔ آپ نے منکرینِ رؤیت سے کہا کہ تم تین دن خاموشی کے ساتھ باوضو ہمارے پاس بیٹھو۔ ہم تین دن کے بعد فیصلہ دیں گے۔ تیسرے روز ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ بے ہوش ہو کر لوٹنے لگے، جب ہوش آیا، تو کہنے لگے ہم رؤیتِ حق پر ایمان لے آئے۔ اور اس کے بعد ہمیشہ آپ کی صحبت میں رہے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۷۵)

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں :

۱۔ تیسرے دن خواجہ موصوف نے ان پر کوئی ایسا عمل یا توجہ کی تھی جس کی وجہ سے وہ علماء بے ہوش ہو کر لوٹنے لگے تھے اور ایسے عمل جوگیوں، سادھوؤں اور مسمریزم کرنے والوں سب کے پاس ہوتے ہیں اور ان کا شریعتِ اسلامیہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

۲۔ جب تک خواجہ موصوف نے علماء پر یہ کیفیت طاری نہیں کی، انہوں نے رؤیتِ حق کا اقرار نہیں کیا۔ البتہ اس کیفیت کے بعد اقرار کر لیا۔

۳۔ شریعت اور طریقت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ اگر شریعت کا رنگ غالب ہو تو صوفیانہ نظریات کا انکار ناگزیر ہے اور صوفیانہ رنگ غالب ہو تو ایسی باتوں کا اقرار کر کے شریعت کو اس کے تابع بنانے کی کوشش کی جاتی اور تاویلات اور حیلوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ پھر بعض بے باک صوفیاء تو شریعت کو درخورِ اعتناء سمجھتے ہی نہیں۔

۶۔ ذکرِ الٰہی

اللہ کے ذکر کی قرآن میں بار بار تاکید آئی ہے۔ ذکر کے معنی اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا بھی ہے۔ بذریعہ تسبیح و تہلیل وغیرہ اور یاد رکھنا بھی۔ یعنی دل میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کا دھیان اور خیال رہے اور افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ ہے۔ ذکرِ اللہ اس گروہِ صوفیاء کا موضوعِ خاص ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں بھی ان حضرات نے بیسیوں قسم کے بدعیہ اذکار دریافت کر لئے ہیں۔ جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں :

اقسامِ ذکر

"ذکر لاہوتی، ذکر جبروتی، ذکر ملکوتی، ذکر ناسوتی، ذکر مکاشفہ، ذکر مشاہدہ، ذکر ثلاثی گنبدی، ذکر ثلاثی مجرد، ذکرِ آہ، ذکرِ روح، ذکر ستر، ذکر اظہارت، ذکر آور دبرد، ذکر ضربِ راست، ذکر مدور حلق، ذکر ثلاثی مغربی بہ دروازہ، ذکر بیکدم جلسہ، ذکر قربان، ذکر حدادی، ذکر مقدس، ذکر بودلہ، ذکر معلّٰی، ذکرِ حیران، ذکر قلندریہ، ذکرِ ضیاء، ذکر نور، ذکر تجلی، ذکر زجاج، ذکر جلابی، اذکارِ طہور، ذکرِ پاس انفاس، ذکرِ خفی استیلائے عشقیہ۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے اذکار ہیں، جو بخوفِ طوالت درج نہیں کئے۔" (ریاض السالکین، ص ۳۴۲)

اب ہمارے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ ان تمام اذکار و اوراد کے طریق اور ان کے فوائد بیان کریں۔ تاہم نمونۃً

چند ایک حاضرِ خدمت ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ بزرگانِ کرام بیسیوں سال مجاہدات میں صرف کر کے کیا کچھ حاصل کرتے رہے ہیں۔

۱۔ ذکرِ قلندریہ اور ارواحِ مقدسہ

چاہیئے کہ جلسہ معبودہ متعین کر کے ہر دو زانو کے درمیان یا حَسَنؑ ناف پر یا حُسَینؑ دائیں شانے پر یا فاطمہؓ بائیں شانے پر یا علیؓ کی ضرب لگائے اور یا محمدؐ کی ضرب اپنے وجود میں لگائے اور پھر از سرِ نو شروع کرے۔ اس ذکر کی مواظبت سے ان حضرات کی ارواحِ مقدسہ تشریف لائیں گی، اور امداد فرمائیں گی اور طالب کو مطلوب تک پہنچائیں گی۔" (ریاض السالکین، ص ۳۲۲)

۲۔ ذکرِ نور اور کشفِ قبور

اس ذکر سے کشف الارواح ہوتا ہے۔ طریقہ اس کا یہ ہے کہ جلسہ معہودہ متعین کر کے دائیں طرف سُبُّوحٌ بائیں طرف قُدُّوسٌ سامنے کی طرف یا رُوح الرّوح آسمان کی طرف ربُّ الملائکۃ اور دل پر الروح کی ضرب لگائے۔ اس ذکر سے اور بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ جو عمل کرنے سے خود روشن ہو جائیں گے۔ کشف قبور حاصل ہو گا۔" (ایضاً)

۳۔ افضل الذکر کا صحیح مقام

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے ذکر کا طریق بھی ملاحظہ فرمائیے:

" درمیان ذکر کلمہ طیبہ بطریق جہر" اوّلاً باوضو، قبلہ رُو، دو زانو بیٹھ کر گیارہ مرتبہ سورۂ اخلاص بالتعوذ بابسم اللہ پڑھ کر ختم بر رُوح پر فتوح حضرت غوث الاعظم کی خدمت میں بھیجے بعدہٗ آنکھیں بند کر کے اور مرشد کی صورت کا دل میں تصور کئے ہوئے ہزار بار کلمۂ پاک لا الٰہ الا اللہ جہر سے پڑھے۔ ہر تسبیح کے خاتمہ پر محمد رسول اللہ کہے بعد ہزار بار اِلّا اللہ ہزار بار بعدہٗ ہزار بار 'ھُوْ' پڑھے اور اثنائے ذکر میں کلمہ شریف کے معنی کو ملحوظ رکھے۔ جب یہ ذکر ختم ہو تو متوجہ بقلب صنوبری ہو کر جو کہ بائیں پستان سے دو انگل نیچے ہے مراقبہ میں بیٹھے اور نہایت توجہ حضورِ دل کے ساتھ اپنی تمام ہمت کو اسم اللہ کی یاد میں مصروف کرے......" (ریاض السالکین، ص ۳۱۶)

دیکھا آپ نے کہ اس افضل اور مسنون ذکر میں بھی ان حضرات نے شرک و بدعات کو کس طرح داخل کر دیا ہے۔ کیا رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ذکر کے یہی طریق سکھلایا کرتے تھے؟

پھر ان حضرات نے کئی قسم کے درود، مثلاً درود تاج، لکھی، ہزارہ وغیرہ۔ کئی طرح کی نمازیں مثلاً صلوٰۃ غوثیہ، صلوٰۃ فاتح، صلوٰۃ خضر، صلوٰۃ الاسرار، صلوٰۃ التسبیح اور کئی قسم کے ختم شریف، شش قفل، ہفت،

ہیکل، چہل کاف اور اسمائے عظام وغیرہ دریافت کر رکھے ہیں۔ جن سے رجال الغیب سے استمداد کی جاتی اور استفادہ کیا جاتا ہے جن کے ذریعہ کبھی رُوحوں کو حاضر کرتے، کشف قبور حاصل کرتے اور مختلف بیماریوں کے لئے تعویذ اور دم جھاڑ تیار کرنے، عورت اور مرد کے درمیان جدائی یا محبت ڈالنے اور اپنی ولایت کی دھاک بٹھاتے ہیں۔ ہمارے صوفیائے کرام میں سے بیشتر ولیوں کی ولایت اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ وہی پرانی کہانت اور ساحری تقدس کا رُوپ اوڑھ کر "ولایت" کی صُورت میں ہمارے سامنے جلوہ گر نظر آتی ہے۔ نقوش و عملیات نے قوم کو جس طرح "بے عمل" بنا دیا ہے، وہ مستزاد ہے۔

۷۔ محبّتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ کی محبت ہر مسلمان کے دین اور ایمان کا جزو ہے جس کے بغیر نہ دین مکمل ہوتا ہے نہ ایمان۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۲/۱۶۵) اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔

پھر اس محبتِ الٰہی کا معیار یہ تبلایا گیا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۳/۳۱) (اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا۔

گویا اتباعِ رسُول اور محبتِ الٰہی لازم و ملزوم ہیں جتنا زیادہ کوئی متبعِ سنت ہوگا اتنا ہی وہ اللہ سے محبت رکھنے والا ہوگا اور اللہ اس سے محبت رکھنے والا ہوگا۔

اب دیکھئے کہ رسُول اللہ کا اسوۂ حسنہ یہ ہے کہ آپ رات کو سوتے بھی تھے اور جاگتے بھی تھے۔ نفلی روزے رکھتے بھی تھے اور چھوڑتے بھی تھے۔ لذاتِ دنیا سے متمتع ہوتے تھے۔ حلوہ آپ کی پسندیدہ اور مرغوب غذا تھی۔ عطر کا استعمال فرماتے تھے۔ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ مقدمات کے فیصلے کرتے تھے۔ جہاد میں شرکت فرماتے اور سپہ سالاری کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ آپ کی کئی بیویاں تھیں۔ ان سے اور اپنی اولاد سے محبت کرتے تھے۔

معاشرتی تعلقات کو بحسن و خوبی نبھاتے تھے۔ زکوٰۃ و صدقات وصُول فرماتے اور انہیں مستحقین میں تقسیم فرماتے تھے۔ غرضیکہ معاشرتی، سیاسی، معاشی اور گھریلو زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس میں آپ نے راہنمائی نہ فرمائی ہو۔

ان سب کاموں کے باوجود آپ اللہ سے سب سے زیادہ محبت رکھنے والے تھے اور آپ اللہ کے حبیب و محبوب تھے۔

اب صحابہ کرام کی طرف آیئے۔ صحابہ کرام اللہ سے محبت رکھنے والے تھے۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و اتباع کے ساتھ ان سے بھی محبت رکھتے تھے حتیٰ کہ آپ کی محبت ہی معیار ایمان قرار پایا۔ پھر صحابہ کرام اپنے بال بچوں سے بھی محبت کرتے تھے۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ کی محبت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اب کسی دوسرے سے محبت کی ہی نہیں جاسکتی۔ ہر ایک سے اس کے مقام اور احکام شرع کے مطابق محبت کرنا یا اس کے برعکس کسی سے بغض رکھنا بھی عین اللہ کی محبت کا تقاضا ہے۔

محبتِ الٰہی بھی اور چہار ترک بھی

لیکن ہمارے صوفیاء کے ہاں محبتِ الٰہی کا معیار بالکل جداگانہ ہے انہوں نے محبتِ الٰہی کا جو طریق اختیار کیا ہے وہ بالکل راہبانہ اور غیر شرعی قسم کا ہے، جو چہار ترک سے شروع ہوتا ہے۔ خواجہ شریف زندنی (ولادت ۴۹۲ھ) نے خواجہ عثمان ہارونی (ولادت ۵۲۶ھ) کو خلافت کے وقت کلاہِ چہار ترکی یعنی چار کلیوں والی ٹوپی پہنائی اور ارشاد فرمایا کہ اس سے چہار ترکوں کی طرف اشارہ ہے۔ (۱) ترکِ دنیا (۲) ترکِ آخرت بجز ذات حق سبحانہ و تعالےٰ۔ (۳) ترکِ خواب و نوم (۴) ترک ہوائے نفس۔ (تاریخ مشائخ چشت مولانا زکریا۔ ص ۱۶۴)

اب دیکھئے ان کے ہاں ترکِ دنیا سے مراد، معاشرتی زندگی کا بائیکاٹ اور ترکِ نکاح وغیرہ ہے۔ ترکِ آخرت سے مُراد یہ ہے کہ نہ دوزخ کے عذاب کی پرواہ نہ جنت کے حصول کی آرزو۔ ترکِ خواب و نوم سے مراد رات اور دن میں کسی وقت بھی نہ سونا۔ اور ترکِ ہوائے نفس سے صرف لذائذ نفس ہی مراد نہیں بلکہ یہ لوگ ضروریات نفس کو بھی ترک کر دیتے ہیں اب دیکھ لیجئے ان میں سے کون سی بات سنت کے مطابق ہے۔ نیز قرآن کے بیان کردہ معیار کے مطابق اللہ سے اُن کو کس قدر محبت ہو سکتی ہے اور اللہ کو ان سے کس قدر؟

یہ حضرات دراصل ایسے صدیوں پرانے راہبانہ طریقوں سے تجلیاتِ ندائے غیب، اور رجال الغیب کی آمد اور ان سے ہمکلام ہونے کے منتظر رہتے ہیں۔ بس یہی ان کی محبت الٰہی ہے۔ اس طرح کی محبتِ الٰہی کے اس دنیا میں خواہاں اور اسی طرح کی محبتِ الٰہی کے عالم آخرت میں آرزومند ہیں۔

ترکِ دنیا

ترکِ دنیا کا جواز بلکہ اس کی افضلیت ثابت کرنے کے لئے مسجدِ نبوی میں درسگاہِ صفہ

اور اس میں قیام پذیر صحابہ کی زندگی سے استدلال کیا جاتا ہے کہ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم دنیا سے آزاد ہو کر وہاں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ یہ استدلال مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر درست نہیں :

۱۔ امت کے افضل ترین بزرگ اصحاب صفہ سے باہر کے لوگ تھے۔ مثلاً چاروں خلفائے راشدین بالترتیب۔ علاوہ ازیں عشرہ مبشرہ میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا، جو اصحاب صفہ کا رکن ہو۔ اسی ایک بات سے ترکِ دنیا کا اصل مقام سامنے آجاتا ہے کہ اسلام ایک معاشرتی دین ہے۔ رہبانیت کا دین نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے ترکِ دنیا کو ناجائز یا حرام قرار نہیں دیا۔

۲۔ اصحابِ صفہ کی تعداد بالعموم ستر (۷۰) رہا کرتی تھی۔ اگرچہ کسی ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو بھی ہو گئے تھے جبکہ اس دور میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ گویا ترکِ دنیا کرنے والوں کی نسبت مسلمان معاشرہ میں ایک فی ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ ایک ہزار میں نو سو ننانوے صحابی تو معاشرتی زندگی بسر کرتے تھے اور ہزارواں آدمی اصحابِ صفہ کا رکن تھا۔ اتنی ہی اس ترکِ دنیا کی گنجائش ہے۔ لیکن تصوف کی دنیا میں ترکِ دنیا اصل الاصول سمجھی جاتی ہے۔

۳۔ صفہ علمِ شریعت کی درس گاہ تھی جہاں سے معلم اور مبلغ دوسرے مقامات پر بھیجے جاتے تھے۔ نہ کہ فنِ تصوف و کرامات کی تربیت گاہ۔ جس میں شرعی علوم کو جب تک پہلے محو نہ کر دیا جائے۔ اس فن کی تحصیل ممکن نہیں ہو سکتی اصحابِ صفہ اور ترکِ دنیا کی درست اور واضح مثال وہ دینی مدارس ہیں جہاں طلبا ترکِ دنیا کر کے کئی کئی سال تک علومِ شرعیہ کی تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہیں۔ موجودہ اولیاء اللہ کی خانقاہوں کا بھلا اس صفہ سے کیا تعلق ؟

۸۔ صحبتِ بزرگاں

صحبت کا اثر ایک فطری بات ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اثر کو ایک مثال سے سمجھایا کہ "اگر تم کسی عطار کی دکان پر بیٹھے ہو تو اگر عطر خرید کر استعمال نہ بھی کرو گے تو جب تک اس دکان میں بیٹھے رہو گے اس کی عطر بیز فضا سے تمہارا دماغ معطر رہے گا اور اگر تم کسی لوہار کی دکان پر بیٹھو گے تو تم چاہو یا نہ چاہو کوئی شرارہ اڑ کر تمہارے کپڑوں کو جلا دے گا۔"

پھر اس صحبت کے اثر کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ کوئی بھی امت کا بزرگ سے بزرگ شخص یا پیر قطب، صحابہ کرامؓ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت میں رہے تھے لیکن

یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی شخص کے درجات کی بلندی کا انحصار محض صحبت پر نہیں ہوتا بلکہ کئی دوسرے عوامل بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کی مثال یُوں سمجھیئے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں حضرات کی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصاحبت کی مُدت برابر ہے، لیکن افضل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ قرار پائے۔ وجہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دینی خدمات اور خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لئے خدمات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ تھیں۔ تو معلوم ہوا کہ کسی شخص کے تزکیۂ نفس اور اس کے متقی بننے میں بہت سے عوامل کا عمل دخل ہوتا ہے جن میں سے ایک یہی صحبتِ صالحہ بھی ہے اور یہی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ مثال سے بھی واضح ہوتی ہے۔

لیکن اس طبقۂ صوفیاء نے اس "صحبتِ بزرگان" کی اہمیت کو اتنا بڑھایا کہ اتقا کے حصُول اور تزکیۂ نفس کے لئے اسی ایک عامل کو اصل الاصول قرار دے دیا۔ اور کسی صُوفی شاعر نے انہی خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ؎

یک زمانہ صحبتے با اولیاء — بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

پھر یہ شعر مساجد کے محراب و منبر پر جھُوم جھُوم کر اور تال سے یُوں پڑھا جانے لگا، گویا یہ کوئی قرآنی آیت یا اس کا ترجمہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر اس شعر کی کچھ حقیقت ہے، تو خواجہ اویس قرنی کی عبادت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جنہیں ایک منٹ کی صحبت بھی نصیب نہ ہوئی اور اس کے باوجود آپ ﷺ نے انہیں خیر التابعین قرار دیا تھا۔

بات دراصل یہ ہے کہ اس طبقہ نے اپنے اس دینِ طریقت کی اہمیت کو جتلانے کے لئے ہر بات میں افراط و تفریط اور مبالغہ آرائی اور غلُو سے کام لے کر کسی اچھی بات کو بھی خواہ مخواہ مشکوک بنا دیا ہے جبکہ شریعت ہر بات کو اس کے جائز مقام پر رکھتی ہے۔ شرعی نقطہ نگاہ سے صُحبتِ بزرگاں اتقاء کے حصُول کے لئے مستحسن اور منجملہ دیگر عوامل کے ایک عامل ہے جبکہ دینِ طریقت اسے اصل الاصُول کے طور پر پیش کرتا ہے۔

۹ معرفتِ الٰہی

گروہِ صوفیاء میں معرفتِ الٰہی کا موضوع جس اہمیت کا حامل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ معرفت کا لفظ ان کے ہاں علم (جو بذریعہ وحی حاصل ہوتا ہے) سے بہت بلند درجہ رکھتا ہے۔ معرفتِ نفس و معرفتِ الٰہی کے لئے ان کے ہاں ایک مشہور وضعی حدیث بھی موجود ہے یعنی مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ اب دیکھئے مولانا اللہ یار خاں صاحب کتنی زبردست دلیل سے معرفت کی ضرورت قرآن کریم سے پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ — میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے
ای لِیَعْرِفُوْنَ — کہ وہ میری عبادت کریں، یعنی میری معرفت حاصل کریں۔

جب معرفتِ الٰہی حاصل ہو گئی تو مقصدِ تخلیق پورا ہو گیا پس ایسے مقبولینِ خدا جو غایتِ تخلیق کا مصداق ہیں۔ ان سے دشمنی رکھنا کور باطنی کی دلیل ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۹۰)

اب دیکھئے مولانا موصوف نے پہلے "لِیَعْبُدُوْنَ" کے آگے بریکٹوں میں "اَیْ لِیَعْرِفُوْنَ" شامل کیا۔ گویا کہ یہ مترادف الفاظ ہیں۔ حالانکہ یہ الفاظ قطعاً مترادف نہیں ہیں۔ پھر ترجمہ میں بریکٹوں کے بغیر یہ لفظ شامل کئے۔ پھر تشریح میں عبادت کا لفظ ختم کر کے اس کی جگہ معرفتِ الٰہی لے آئے۔ اس طرح تخلیق جن وانس کا مقصد عبادتِ الٰہی کے بجائے معرفتِ الٰہی ثابت کر دکھایا۔ اسے کہتے ہیں ہتھیلی پر سرسوں جمانا۔ پھر اس سے معرفت رکھنے والے طبقہ کی شان بھی واضح ہو گئی کہ ان عارفین کے علاوہ عام عابدین کی عبادت بے کار ہے کیونکہ معرفت کے بغیر نری عبادت تخلیق کا مقصد پورا نہیں کرتی اور اس سے ضمناً نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اس معروف طبقہ اولیاء اللہ سے دشمنی اللہ سے دشمنی ہے۔"

چنانچہ مولانا موصوف نے اس عنوان کے تحت یہ آیت درج فرما کر ایسے نادر مسائل کا استخراج فرمایا ہے۔

۱۰۔ الخلق عیال اللہ

عنوانِ بالا حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جس کا مفہوم کئی دوسری حدیثوں سے بھی واضح ہو جاتا ہے مثلاً اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ اسی حدیث کا ترجمہ مولانا حالی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر — خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر

ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے علاوہ جانور بھی ہماری ہمدردی کے حقدار ہیں۔ جیسا کہ احادیثِ صحیحہ سے مروی ہے کہ ایک فاحشہ عورت صرف اس وجہ سے جنت میں چلی گئی کہ اس نے ایک ایسے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا، جو شدتِ پیاس کی وجہ سے مر رہا تھا۔ یا ایک عبادت گزار عورت محض اس وجہ سے دوزخ میں گئی کہ اُس نے ایک بلی کو باندھ کر بھوکوں مار دیا تھا۔

انسانی حقوق

پھر اس انسانی رحم اور ہمدردی کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے جسے ہر مسلمان کو کافروں کے لیے بھی اپنانا ضروری ہے، مثلاً یہ کہ:

۱ انسان کا خون بہرحال محترم ہے اور حق کے بغیر نہیں بہایا جا سکتا۔

۲ عورت، بوڑھے، بچے، بیمار اور زخمی پر کسی حالت میں دست درازی درست نہیں۔

۳ عورت کی عصمت بہرحال قابلِ احترام ہے۔ اسے کسی حالت میں بھی بے آبرو نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ بھوکا آدمی روٹی کا، ننگا آدمی کپڑے کا یا بیمار آدمی علاج یا تیمارداری کا مستحق ہے خواہ وہ دشمن کی قوم سے ہی کیوں نہ تعلق رکھتا ہو۔

ان چند امور کے بعد ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم کی معاشرتی زندگی بالکل جداگانہ نوعیت کی ہوتی ہے۔ باقی تمام تر معاملات میں مسلم تو آپس میں ایک دوسرے کے ہمدرد اور خیر خواہ ہوتے ہیں، لیکن غیر مسلموں کے معاملہ میں وہ سخت گیر ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالےٰ ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ — محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں

عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۲۹/۴۸) — وہ کافروں کے حق میں سخت مگر آپس میں رحمدل ہیں۔

اور یہی وہ اسوۂ حسنہ ہے، جو رسول اللہ ﷺ نے اپنایا اور صحابہ نے آپ کی اتباع میں اس کو عمل پیرا ہو کر دکھایا تھا۔

الخلق عیال اللہ کا صوفیانہ مفہوم

لیکن ہمارے صوفیاء، جو وحدت الوجود پر ایمان رکھتے ہیں اور وحدت الوجود کی عینک چڑھا کر اسلامی تعلیمات کا مطالعہ فرماتے ہیں، تو ان کے نزدیک الخلق عیال اللہ کا مفہوم یکسر بدل جاتا ہے، وہ اپنے ذکر و فکر اور عشقِ الٰہی کی منازل کی تکمیل میں مسلم اور غیر مسلم سب کو ایک سطح پر لے آتے ہیں اور مسلم و کافر میں کچھ امتیاز روا رکھنے کو تنگ نظری اور تعصب کا نام دیتے ہیں۔ جناب خلیق نظامی صاحب اپنی کتاب تاریخ مشائخ چشت میں اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

"نظریہ وحدت الوجود میں اعتقاد کا اثر عملی زندگی میں بڑا زبردست پڑتا ہے۔ اس پر اعتقاد رکھنے والے کا مطمع نظر بلند، ہمدردیاں وسیع اور مقاصد اعلیٰ ہوتے ہیں۔ وہ عملاً الخلق عیال اللہ کا قائل ہوتا ہے۔ وہ ہر نظریہ کو ہمدردانہ سمجھنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر میں حقیقت تو ایک ہی ہے۔ وحدت الوجود پر ایمان لانے کے بعد انسان میں تنگ نظری اور تعصب کا وجود تو رہتا ہی نہیں۔" (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۱۳)

اب دیکھئے قرآن جس کردار کو اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کے الفاظ کے ساتھ مومنوں کی صفت بیان کرتا ہے۔ اسی بات کو وحدت الوجود پر ایمان رکھنے والے صوفی تنگ نظری اور تعصب قرار دیتے ہیں۔ یہ اسی نظریہ کا اثر ہے کہ ان اولیاء اللہ نے جو خانقاہیں قائم کیں ان میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب اکٹھے رہتے اور پیر کامل ان سب کی یکساں تربیت فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ یہی خلیق نظامی صاحب اپنی اسی کتاب کے صفحہ ۱۹۰ پر ذرا وضاحت فرماتے ہیں کہ:

"اگر تاریخ کے اشاروں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سماجی نظام مشائخ چشت کی کوششوں کا مرہونِ منت تھا۔ انہوں نے ان علاقوں میں بسنے والے مختلف الخیال اور مختلف المذاہب لوگوں میں اتحادِ عمل اور اتحادِ فکر پیدا

کیا اور ان منتشر طبقوں کو ایک ایسے رنگ میں رنگ دیا۔ جس نے ایک مضبوط معاشرہ کی شکل اختیار کرلی۔ ان بزرگوں کی خانقاہوں میں ہندو اور مسلمان سب ہی جمع ہوتے تھے۔ ان مشائخ نے ان اختلافات کے پردوں کو ہٹا کر ہم دلی اور ہم زبانی پیدا کی۔" (ایضاً، ص ۱۹۷)

اب تو غالباً آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ الخلق عیال اللہ کا صوفیانہ مفہوم کیا ہے اور اس میں وحدت الوجود کا عقیدہ کیا بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ پھر ان لوگوں کا یہ دعوےٰ بھی ہے کہ ان کی خانقاہیں رسول اللہ ﷺ کے اصحابِ صفہ کا نمونہ ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا کسی کافر کو اصحابِ صفہ میں شامل کرکے اس سے بھی ایسی ہم دلی اور ہم زبانی پیدا کی گئی تھی؟

اور ہم کئی ایسے واقعات درج کر چکے ہیں کہ ان اولیاء اللہ کے ہندو سکھ بھی مرید اور عقیدت مند ہوتے تھے اور مسلمانوں ہی کی طرح ان کے مزارات کی زیارت کرکے یکساں فیض حاصل کرتے رہے۔ پھر کئی اولیاء اللہ ایسے بھی ہیں کہ ان کی موت پر مسلمان بھی تجہیز و تکفین کے ایسے ہی دعویدار ہوتے تھے جیسے ہندو اور سکھ۔ مثلاً بھگت کبیر، گورانند نتھ، بابا نانک اور مادھولال وغیرہ۔ یہ تو خیر دورِ آخر کی اور ہندوستان کی بات ہے۔ صوفیاء کے جدِ امجد معروف کرخیؒ (م ۲۰۶ھ) کی وفات پر بھی ایسا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ چنانچہ صاحب خزینۃ الاصفیاء لکھتے ہیں:

"جب وفات پائی تو یہود و نصاریٰ دعوےٰ کرنے لگے کہ شیخ ہمارے مذہب پر تھے۔ مسلمانوں نے تردید کی، نزاع بڑھی، خدام کہنے لگے کہ ہمارے شیخ کی وصیت تو یہ ہے کہ "جو ہمارا جنازہ زمین سے اٹھاتے گا ہم اسی سے ہیں۔" اس پر یہود و نصاریٰ نے باری باری جنازہ اٹھانے کی کوشش کی مگر اٹھا نہ سکے۔ پھر مسلمان آئے۔ انہوں نے جنازہ اٹھایا اور جس جگہ شیخ نے وفات پائی تھی، وہیں دفن کیا۔ شیخ معروف تجرید و تفرید اور بے سروسامانی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ شیخ ہجویری لکھتے ہیں کہ شیخ معروف کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں۔ علوم میں قوم کے مقتداء اور امام ہیں۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۲۹)

اب سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ آخر معروف کرخیؒ میں وہ کیا صفات تھیں جن کی وجہ سے یہود و نصاریٰ بھی ان کا ہم مذہب ہونے کا دعوےٰ کرنے لگے۔ کیا نعوذ باللہ کسی صحابی کی وفات پر بھی ایسا دعوےٰ ہوا تھا۔ یہ صوفیاء کا گروہ بھی عجیب متضاد نظریات کا شکار ہے۔ ایسے واقعات بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ وحدت الوجود کے فضائل و مناقب بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہجویری صاحب بھی معروف کرخی کے اسی وجہ سے مداح ہیں۔ پھر اس تصوف کو شریعت سے ماخوذ ثابت کرنے بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ اور الخلق عیال اللہ کی آڑ میں اپنے غیر شرعی اعمال

کا شرعی جواز بھی تلاش کر لیتے ہیں۔

۱۱- زُہد زُہد سے یہ حضرات ترکِ دنیا مراد لیتے ہیں یعنی دنیا سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر کے جنگلوں، ویرانوں صحراؤں، دریا کے کناروں پر جا کر سال ہا سال چلّے کاٹتے پھرنا، جس کا مقصد خرقِ عادت امور کا حصول اور وقوع پذیر ہونا ہے جبکہ اسلامی زُہد یہ ہے کہ یہ دنیا کی محبت دِل میں جاگزیں نہ ہو۔ حصولِ دنیا یا کسبِ حلال کو تو اسلام نے صرف جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن قرار دیا ہے یہ حضرات اس معاملہ میں احکامِ نبویؐ کی صریح خلاف ورزی کرتے ہیں۔

۱۲- اخلاقیات مثلاً تقوےٰ، اخلاص، صبر، توکل، قناعت وغیرہ وغیرہ۔ ان چیزوں سے جو کچھ یہ حضرات مراد لیتے ہیں اسے بھی ہم پہلے "اسرار و رموز" کے عنوان کے تحت بیان کر چکے ہیں اور ان پر امام ابنِ قیم کا تبصرہ بھی۔

صوفیائے کرام کا تفسیری انداز

اب ہم صوفیاء کی اُن کوششوں کا جائزہ لیں گے جو اُنہوں نے طریقت کو شریعت ہی سے ماخوذ ثابت کرنے کے سلسلہ میں کی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جب فقہ قرآن وسنّت سے ماخوذ ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں تو اسی طرح تصوف بھی قرآن وسنّت ہی سے ماخوذ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ جن لوگوں نے ظاہری معانی اور اعمال وافعال میں اجتہاد کیا وہ فقہاء کہلائے اور جن بزرگوں نے باطنی معانی اور اعمال وافعال میں اجتہاد کیا، وہ صوفی کہلائے۔ حقیقتاً دونوں گروہوں کا ماخذ قرآن وسنّت ہی ہیں ہم صوفیہ کے اس دعویٰ کے مطابق ان کے اجتہاد واستنباط کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

یہ تو ہم پہلے تبلا چکے ہیں کہ صوفیائے کے بنیادی نظریہ وحدت الوجود کی رُو سے مظاہر پرستی جائز قرار پاتی ہے لیکن قرآن اسے صریح شرک تبلاتا ہے۔ اب صوفیاء کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس نظریہ کو اسلام کے بنیادی کلمہ لاالٰہ الااللہ ہی سے ثابت کر دکھایا ہے۔ وہ اس کا ترجمہ یُوں کرتے ہیں لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اللہُ۔ نہیں کوئی معبود مگر وہ اللہ ہی تو ہے، یعنی جس چیز کی بھی عبادت کی جائے وہ اللہ ہی ہوتا ہے۔

امام غزالی نے خواص کی توحید یُوں بیان کی تھی کہ لا ھُوَ اِلاّ ھُوَ۔ وہ نہیں مگر وہی۔

اور عام صوفیاً لاالٰہ الا اللہ کی تفسیر بھی یُوں کرتے ہیں لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا ھو گویا اِلٰہ کا ترجمہ مَوْجُوْد کر کے نظریہ

وحدت الوجود کو ثابت کر دکھلاتے ہیں۔

۲۔ اسی طرح آیت وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ (۲۳/۱۷) کا ترجمہ یُوں کیا جاتا ہے "اور تیرے رَب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم نہ عبادت کروگے مگر وہ اسی کی ہوگی۔ یعنی جس چیز کی بھی عبادت کروگے وہ اللہ کی عبادت ہی متصور ہوگی۔ یہ ترجمہ ایاك نعبد کے صریحاً خلاف ہے۔

۳۔ اسی طرح ایک آیت ہے فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (۱۱۵/۲) یعنی جدھر تم رُخ کرو اُدھر ہی خدا کی ذات ہے۔ اس کا ترجمہ یُوں کیا جاتا ہے۔ "تم چیز کی طرف بھی منہ کر کے اس کی عبادت کروگے اس طرف اللہ ہی کا منہ ہوگا، چنانچہ خواجہ حسن سنجری کا یہ شعر انہی معانی کو بیان کر رہا ہے ؎

کافراں سجدہ کہ بر روئے بتاں می کردند   ہمہ رُو سوئے تو بود و ہمہ سُوروئے تو بود

ترجمہ: کافر جو بتوں کو سجدہ کرتے ہیں تو ان سب کا منہ تیری ہی طرف ہوتا ہے کیونکہ ہر طرف تیرا ہی چہرہ ہے۔

مندرجہ بالا آیات کی تشریح تو صرف نظریہ وحدت الوجود سے تعلق رکھتی ہے اور ان کا ذکر ہم اس عنوان میں پہلے کر بھی چکے ہیں۔ اب ہم ایسی مثالیں دیں گے جن سے علی الاطلاق دین طریقت کے نظریات اور اعمال و افعال کو ثابت کیا جاتا ہے۔

۱۔ نبہانی کا تفسیری انداز

نبہانی صاحب ایک عالم دین شخصیت ہیں۔ دیکھئے وہ کس طرح درج ذیل آیت کی تشریح کر کے اس سے دینِ طریقت کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ	بر وہ فعل جمیل ہے جس سے دل صاف اور نفس ذبح ہو اور تم ایسے افعال نہیں کرتے ہو جس سے تم تجلی افعال کے مقام سے ترقی کر کے ترقی صفات تک پہنچ جاؤ۔
وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ	اور تم اپنی فطرت کی کتاب پڑھتے ہو جو تم کو ایسے دین کا حکم کرتی ہے جس سے تم توحید کی راہ کے مالک بن جاؤ۔
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ	تم اپنی آزاد صفاتِ ذمیمہ کو انوارِ قدیمہ کے فیضان کی رسی سے باندھتے ہو جس کو حقیقی قدرت حاصل ہے۔ تم اسی سے مدد مانگو۔
بِالصَّبْرِ	اس سلوک پر صبر کے ساتھ جو تمہارے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ تاکہ تم مقام رضا تک پہنچ سکو۔
وَالصَّلٰوۃِ	اس سے مراد مراقبہ اور حضورِ قلب ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کو حاصل کیا جا سکے اور مراقبہ گراں ہے سوائے اُن لوگوں کے جن کے دلوں میں انکساری اور نرمی موجود

ہے تاکہ تجلیاتِ رب کو اور اس زبردست سطوت کے غلبے کو قبول کر سکیں یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے حضور میں ہونے کا یقین رکھتے ہیں اور یہی اپنی صفات کو اس کی صفات میں فنا اور گم کر کے اس کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ وہ بادشاہ باریک بیں اور زبردست کی شان وصفات کے علاوہ اور محسوس نہیں کرتے۔

یہ اتامرون الناس بالبر سے لے کر انہم الیہ راجعون (۲/۴۴) کی تفسیر ہے (غایۃ الامانی فی الرد علی النبھانی ترجمہ اردو ۲/۱۱)

غور فرمائیے! علامہ نبہانی صاحب نے کس طرح صرف ایک آیت کی تشریح سے تصوف کے کتنے اہم مسائل مثلاً مراقبہ، نفس کشی، تجلیاتِ الٰہی، مقامِ رضا اور مقامِ فنا تک کو قرآن سے ثابت کر دکھایا ہے۔ جب آپ کی ایسی تشریح رسائل میں چھپنا شروع ہوئی تو غالی صوفیاء کے دلوں کو ٹھنڈا کر دیا۔

اسی طرح کے ایک اور علامہ عبد الغنی نابلسی ہیں۔ ان کا ملکۂ اجتہاد و استنباط بھی ملاحظہ فرما لیجئے:

۲۔ شیخ عبد الغنی نابلسی (م ۱۱۴۳ھ) کا تفسیری انداز

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (۳۰/۷) یہ لوگ تو دنیا کی ظاہری زندگی کو جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں۔

نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "جو شخص ظاہری امور میں مشغولیت اختیار کرتا ہے لیکن اس کے حقائق اور باطنی علم سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ وہ انسان غافل لادین، اسلام سے اس کا کچھ لگاؤ نہیں۔ حالانکہ مقصود علمِ باطنی ہے اور اسی پر نجات کا دار و مدار ہے۔"

اس آیت میں آخرت کا معنیٰ باطنی علم کر کے ان علوم کا قرآن سے ثبوت مہیا کیا گیا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے: "جو شخص کفر اور فسق کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے وہ زندیق ہے اور جو ہر چیز کی نسبت خدا کی طرف کرے وہ صدیق ہے۔" اور ثبوت میں یہ آیت پیش کی ہے:

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (۶۷/۳) تو اللہ کی مخلوق میں کچھ فرق نہ پائے گا۔

نابلسی نے اس آیت کے سیاق اور سباق دونوں سے صرفِ نظر کر کے یہ مطلب نکال لیا۔ حالانکہ اس آیت میں سات آسمانوں اور نظامِ کائنات کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ تفسیر صوفیوں کے نظریۂ "جبر" کا ثبوت پیش کر رہی ہے جو وحدت الوجود کے عقیدہ کا لازمی نتیجہ ہے۔

پس یہ ہے وہ طریقِ اجتہاد و استنباط جس کے ذریعے طریقت کو شریعت سے ہی اخذ کیا جا رہا ہے۔ باطنی

علوم کے لئے آخر طریقۂ استنباط بھی باطنی قسم کا ہی ہونا چاہیئے۔

یہی وہ بات ہے جس کا اعتراف مولوی فضل میراں مترجم "انسانِ کامل" نے اس کے مقدمہ میں کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "شرعی علوم بطریقِ اعتبار واشارہ ان (باطنی علوم کی) کی تائید کرتے ہیں نہ کہ بطریقِ تفسیر و فحوائے کلام اور یہ شرعی علوم کمالاتِ نبوت کی ایک اعجازی صفت ہے۔ ورنہ شریعت کی راہ اور ہے اور ان صوفیوں کی راہ اور۔" (انسان کامل، ص ۹)

اب دیکھئے! فضل میراں چونکہ خود بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان باطنی علوم کی طرفداری ان کے طبعی میلان کا تقاضا تھا، جو انہوں نے یہ لکھ دیا کہ شرعی علوم بطورِ اعتبار و اشارہ ان باطنی علوم کی تائید کرتے ہیں اور یہ شرعی علوم و کمالات کی ایک اعجازی صفت ہے۔" اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ واضح نصوصِ شرعیہ موجود ہوں وہاں اعتبار واشارہ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا یہی ضرورت ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان باطنی علوم کو جو صریح شرک و بدعت کا مرقع ہیں، ان کا تعلق نصوصِ شرعیہ سے جوڑا جاسکے۔ خواہ یہ تعلق اشارہ کنایہ، اسرار و رموز ہی کے ذریعہ ہو؟

۲۔ عبدالکریم جیلی کا تفسیری انداز

سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا آغاز فرمارہے ہیں۔

"جان کہ فاتحۃ الکتاب کا نام سبع مثانی ہے اور وہ سات صفات نفسیہ ہیں کہ وہ حیات، علم، ارادت، قدرت، سمع، بصر، کلام ہیں۔ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ کو اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان تقسیم کیا ہے۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وجود خلق اور حق پر منقسم ہے پس انسان باعتبار اپنے ظاہر کے خلق اور باعتبار اپنے باطن کے حق ہے .... عبد اور رب کے مابین اس کا انقسام اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اگرچہ خلق ہے پر حق اس کی حقیقت ہے۔ پھر جیسا کہ وہ اوصافِ عبودیت کو حاوی ہے ایسا ہی اوصافِ ربوبیت کو بھی حاوی ہے۔ اس لئے کہ اللہ اس کی حقیقت ہے ....پس وہ یعنی عبد فاتحۃ الکتاب ہے اور وہ سبع مثانی ہے اور اس میں بہت سے اسرار ہیں جن کی ان اوراق میں گنجائش نہیں۔" (انسان کامل، ص ۲۱۴)

اب بسم اللہ اور الحمد سے وحدت الوجود کا ثبوت ملاحظہ فرمایئے:

"پھر جب بحرِ توحید میں قلب کا ملاح اسم کی کشتی پر سوار ہوگیا اور رحمانیت کی ہوا اِنِّیْ لَاَجِدُ نَفَسَ الرَّحْمٰنِ مِنْ جَانِبِ الْیَمَنِ کی جو میں چلنے لگی معنی اس حدیث کے یہ ہیں کہ میں یمن کی جانب سے رحمٰن کی ریح طیبہ

کو محسوس کر رہا ہوں۔ یعنی نفس اسم رحیم کی رحمت کی ہدایت سے ذات کے کنارے تک پہنچ گیا۔ پھر وہ (بندہ) اپنے ذات و صفات میں منزہ ہوا اور وجود کی فاتحہ کو کھولا اور ثابت ہوگیا کہ عابد عین معبود ہے۔ پھر کہا الحمد للہ۔ اللہ کے نفس کی ثناء کی ساتھ اس چیز کے جس کا وہ مستحق ہے اور اس کے نفس کی ثناء عین اس کا ظہور ہے اور اس چیز میں اس کی تجلی ہے۔" (انسان کامل، ص ۲۱۵)

اب لفظ "حق" سے وحدت الوجود کے اثبات کے دلائل بھی ملاحظہ فرمایئے :

"فرمایا اللہ تعالےٰ نے وَمَا خلقنا السموٰتِ والارض ومابینھما الا بالحق۔ آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے ہم نے حق سے ان کو پیدا کیا ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ ہر چیز حق سے پیدا ہوئی اور حق مادہ عالم ہے۔ اس کی مثال پانی و برف کی سی ہے۔ جس (یعنی مخلوق، مؤلف) میں حق مثل پانی ہے، جو برف کی اصل ہے اور عالم مثل برف کے ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بستہ چیز پر برف کا نام عاریۃً ہے اور پانی کا حقیقتاً۔" (انسان کامل ص۸۴)

اس آیت میں بالحق کا ترجمہ مِنَ الحق کر کے جیلی صاحب نے اپنے فلسفہ کی بنیاد استوار فرمائی ہے۔

یہ تو تھی وحدت الوجود کے اثبات کے متعلق قرآنی دلیل۔ اب مصنف صاحب کے عقلی دلائل بھی ملاحظہ فرمایئے :

۱۔ "جان کہ خیال جب ذہن میں کوئی صورت بناتا ہے تو وہ صورت مخلوق ہے، جس میں خالق موجود ہے یعنی یہ تخیل و تشکل تجھ میں موجود ہے اور تو اس کا خالق ہے۔ اس مثال سے ظاہر ہے کہ تو حق ہے۔ اس اعتبار سے کہ حق کا وجود تجھ میں ہے۔ پس تیری تصویر حق میں واجب ہوئی اور حق اس میں پایا گیا۔ اس باب میں ایک جلیل القدر راز پر ہم نے تجھے آگاہ کیا۔" (انسان کامل، ص ۸۵)

۲۔ کیا تو اس اعتبار سے اپنے آپ کو نہیں دیکھتا کہ حق سبحانہٗ و تعالےٰ تیرا عین اور تیری ہویت ہے۔ حالانکہ تو اپنی حقیقت سے، جس کا تو زیادہ حقدار ہے، غافل ہے۔ پھر اس اعتبار سے تو اپنے آپ سے عماء (اندھیرے) میں ہے اور تو بہ حیثیت اپنے حق کے اپنے آپ سے پوشیدہ نہیں ہوا۔" (انسان کامل، ص ۹۲)

۳۔ یا ہم دونوں مثل اس شخص کے ہیں جس کے دو نام ہیں اور ذات ایک ہے۔ جس نام سے ذات کو پکارا جاتا ہے وہ نام اسی کو پہنچتا ہے۔ میری ذات، اس کی ذات ہے اور میرا نام، اس کا نام ہے۔ اس سے اتحاد میں میرا نام عجیب و غریب ہے۔ علی التحقیق ہم دو ذاتیں نہیں ہیں کہ دونوں مل کر ایک ہوگئی ہوں، بلکہ خود نفس محب ہی حبیب ہے۔" (انسان کامل، ص ۱۰۵)

بتلایئے کیا سمجھے آپ؟ اگر مصنف کے اتنے عقلی اور نقلی دلائل کے باوجود بھی آپ نہ سمجھیں، تو مصنف

بیچارے کا کیا قصور ؟

۴۔ صوفیاء کے شیخِ اکبر ابن العربی کا تفسیری انداز

شیخ اکبر نظریہ حلول کو قرآن سے ثابت فرما رہے ہیں اور حروفِ مقطعات کی تفسیر کرتے ہوئے رسُول اللہ ﷺ کو اللہ کا اوتار بتلاتے ہیں، چند حروفِ مقطعات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ حٰمٓ اَیْ حَقٌّ اَلْمُحْتَجِبُ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهُوَ حَقٌّ بِالْحَقِيقَةِ مُحَمَّدٌ بِالْخَلِيقَةِ (المومن)

حٰمٓ۔ یعنی حق تعالٰے، محمد ﷺ میں چھپا ہوا ہے۔ پس آپ حقیقت میں حق ہیں اور خلیقت میں محمد (ﷺ) ہیں۔ (تفسیر ابن عربی، ج ۲، ص ۹۸، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۵)

ایک دوسرے مقام پر انہی حروف کی تفسیر ذرا آسان الفاظ میں یوں بیان فرمائی :

۲۔ حٰمٓ ۔ ظُهُورُ الْحَقِّ بِالصُّورَةِ الْمُحَمَّدِيَّةِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حٰمٓ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالٰے کا ظہور صورتِ محمدی ﷺ میں ہے۔ (ایضاً، ص ۱۰۲، سطر ۱۷، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۶)

اور اگر حٰمٓ کے ساتھ عٓسٓقٓ بھی شامل ہو تو اس کی تفسیر یوں ہے :

۳۔ حٰمٓ عٓسٓقٓ۔ اَیْ حَقٌّ ظَهَرَ بِمُحَمَّدٍ ظُهُورَ عِلْمِهٖ بِسَلَامَةِ قَلْبٍ فَالْحَقُّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ظَاهِرًا وَّ بَاطِنًا

حق اللہ، محمد ﷺ کے ساتھ ظاہر ہوا۔ جیسا علمِ الٰہی کا ظہور سلامتی قلب کے ساتھ ہے۔ پس حق تعالٰی ظاہر اور باطن میں محمد ﷺ ہیں۔ (ایضاً، ص ۱۰۷، سطر ۹، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۵)

یعنی اگر صرف حٰمٓ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رسُول اللہ ﷺ ظاہر میں محمد ﷺ اور باطن میں حق تعالٰے ہیں اور اگر حٰمٓ کے ساتھ عٓسٓقٓ بھی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ محمد ﷺ ظاہر میں بھی حق تعالٰے ہیں اور باطن میں بھی۔ یا حق تعالٰے ظاہر میں بھی محمد ہے اور باطن میں بھی۔

۴۔ قٓ ۔ اِشَارَةٌ اِلَى الْقَلْبِ الْمُحَمَّدِيِّ الَّذِي هُوَ الْعَرْشُ الْاِلٰهِيُّ الْمُحِيطُ بِالْكُلِّ

قٓ سے قلبِ محمدی ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور وہ عرشِ الٰہی ہے، جو کہ ہر شے کو محیط ہے۔ (ایضاً ج ۲، ص ۲۰۱، سطر ۱۱، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۶)

۵۔ مولانا اللہ یار خاں صاحب مصنف دلائل السلوک کا تفسیری انداز

آپ فرماتے ہیں:

تجلیاتِ الٰہی کا ثبوت

"ہر انسان کے سینے میں ایک ہی دل ہے اور وہی محل تجلیاتِ باری کے لیے مخصوص ہے۔ اس لیے باری تعالیٰ اس میں غیر کا قبضہ پسند نہیں فرماتا۔ جب قلب تجلیاتِ باری کا مسکن بن جاتا ہے تو تمام رذائل ذلیل ہو کر چلے جاتے ہیں اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً (دلائل السلوک، ص ۲۸)

اب دیکھئے مولانا موصوف نے اپنے دعوے کی تائید میں جو آیت پیش فرمائی ہے اس کا انطباق مشکل ہے اگر ملوک سے مراد تجلیاتِ الٰہی مراد ہوں اور قریہ سے مراد دِل ہو، تو تجلیاتِ الٰہی تو دِل کو سکون بخشتی ہیں، تہس نہس تو نہیں کرتیں، پھر بادشاہ اس بستی کے رہنے والے معزز حضرات کو ذلیل تو بنا دیتے ہیں مگر بستی سے نکال تو نہیں دیتے جبکہ تجلیات سے رذائل نکل جاتے ہیں اور جو پہلے ہی رذائل ہیں اُن کے ذلیل ہونے کا کیا سوال؟ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دنیادار حکمرانوں کا کردار بتلایا تھا۔ آپ نے اس سے تجلیاتِ الٰہی اور رذائل کا ذلیل ہو کر چلے جانا ثابت کر دکھایا ہے۔

معرفتِ الٰہی کا ثبوت

آپ فرماتے ہیں:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (ای لیعرفون) — میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں یعنی میری معرفت حاصل کریں۔

جب معرفتِ الٰہی حاصل ہو گئی تو مقصدِ تخلیق پورا ہو گیا پس اپنے مقبولینِ خدا، جو غایتِ تخلیق کا مصداق ہیں، ان سے دشمنی رکھنا کور باطنی کی دلیل ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۹۰)

اس آیت کے ترجمہ اور تشریح میں جس طرح آپ نے تصرف فرمایا ہے وہ ظاہر ہے کہ پہلے 'لیعبدون' کا معنیٰ 'لیعرفون' لکھا۔ پھر تشریح میں 'لیعبدون' کو ختم کیا اور صرف 'لیعرفون' لا کر ثابت کر دکھایا کہ معرفتِ الٰہی ہی تخلیقِ انسانی کا اصل مقصد ہے۔ معرفت تو اس طرح ثابت ہو گئی، لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر زید یہ کہے کہ 'لیعبدون' کا معنیٰ لِيَجْهَدُوْنَ ہے، تو آپ اس کے دعوے کو کس دلیل سے باطل کر سکتے ہیں؟

ہم نے معدودے چند نمونے پیش کر دیئے ہیں۔ ورنہ یہ سلسلہ بھی خاصا طویل ہے۔ آخر کس کس صوفی کی کون

کون سی تفسیر اس مختصر مضمون میں درج کی جا سکتی ہے۔ بالآخر یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ "این خانہ ہمہ آفتاب است" سچ فرمایا تھا علامہ اقبالؒ نے کہ:

زمن بر صوفی و ملا سلامے ۔۔۔ کہ پیغام خدا گفتند مارا

ولے تاویل شاں در حیرت انداخت ۔۔۔ خدا و جبرئیل و مصطفےٰؐ را

یعنی میں صوفی اور ملا کو سلام کہتا ہوں، جنہوں نے خدا کا پیغام ہم تک پہنچایا، مگر انہوں نے تاویل ایسی نرالی بنائی کہ خدا بھی، جبریل بھی اور حضور اکرم ﷺ بھی سر پیٹ کے رہ جائیں۔ (کہ ہم نے کیا کہا تھا اور ان لوگوں نے اس کا کیا مفہوم بنا لیا۔)

موضوعات اور غلط تاویلات کے سہارے

اگر مندرجہ بالا قسم کا تفسیری انداز اختیار کر لیا جائے تو احادیث کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ایسے مفسرین بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ تیسری صدی ہجری تک ایسی تفسیروں کا رواج تھا اور نہ ہی ان کی ضرورت تھی۔ البتہ وہ دور ایسی موضوع احادیث اور رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے واقعات تراشنے کا ضرور تھا۔ ملا علی قاری (اپنی تصنیف) موضوعاتِ کبیر میں لکھتے ہیں کہ "روافض نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کے فضائل و مناقب میں تین لاکھ روایات وضع کی تھیں۔" (اسلامی تصوف میں باطل نظریات کی آمیزش، از پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ص ۱۱۹، ۱۲۱) روافض کی طرح صوفیاء نے بھی اس میدان میں دل کھول کر حصہ لیا۔ صوفیاء کی امہات کتب میں سے اکثر چوتھی اور پانچویں صدی یا بعد میں تصنیف ہوئیں۔ جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

صوفیاء کی امہاتِ کتب

(۱) حسین بن منصور حلاج (م ۳۰۹) کی کتاب "الطواسین"

(۲) ابو النصر سراج طوسی (م ۳۷۸) " " "اللمع فی التصوف"

(۳) ابو بکر محمد کلاباذی (م ۳۸۰) کی کتاب "التعرف فی مذہب اہل التصوف"

(۴) ابو طالب مکی (م ۳۸۲) " " "قوت القلوب"

(۵) ابو عبد الرحمٰن السلمی (م ۴۱۳) " " "طبقات الصوفیاء"

(۶) ابو الحسن جہضمی (م ۴۱۴) " " "بہجۃ الاسرار"

(۷) حافظ ابو نعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ) " " "حلیۃ الاولیاء" (۱۰ جلد)

(۸) ابوالقاسم قشیری (م ۴۶۵ھ) کی کتاب "رسالہ قشیریہ فی التصوف"
(۹) شیخ علی ہجویری (م ۴۶۵/۴۸۰ھ) " " "کشف المحجوب"
(۱۰) ابواسمٰعیل عبداللہ ہروی (م ۴۸۱ھ) " " "منازل السائرین"
(۱۱) امام غزالی (م ۵۰۵ھ) " " "احیاء العلوم" اور "کیمیائے سعادت"
(۱۲) شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ) " " "فتوح الغیب"
(۱۳) شہاب الدین سہروردی (م ۶۳۲ھ) " " "عوارف المعارف"
(۱۴) عبدالکریم جیلی (م ۸۰۵ھ) " " "الانسان الکامل"

پانچویں صدی کے بعد ان کتب میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ان تمام تر کتب میں ضعیف اور موضوع احادیث کی بھرمار ہے۔ حتیٰ کہ امام غزالی جیسے فضلاء نے بھی اپنی تصانیف میں ایسی احادیث کو درج کرنے کے سلسلہ میں تساہل سے کام لیا ہے۔ تاج الدین سبکی نے صرف "احیاء العلوم" کی بے بنیاد حدیثوں کو جمع کر کے ۲۴ صفحات پر مشتمل فہرست اپنی کتاب "الطبقات الشافعیہ" میں شامل کی ہے۔ (امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ، کوکن عمری، ص ۲۵۰)

صوفیہ نے دینِ طریقت کو شریعت ہی سے ماخوذ کرنے کے لئے چار طرح کے اقدامات کئے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

۱۔ قرآنی آیات کی غلط سلط تاویل و تعبیر، جس کا نمونہ ہم پیش کر چکے ہیں۔

۲۔ احادیثِ صحیحہ کی غلط تاویل و تعبیر، جو ضمناً اس کتاب میں اپنے اپنے مقام پر درج کی گئی ہیں۔

۳۔ موضوع احادیث، یعنی ایسے اقوال، جو رسول اللہ ﷺ کی طرف خواہ مخواہ منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ پھر ان کے ہاں بعض احادیث ایسی بھی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ جسے عُرفِ عام میں حدیث قدسی کہتے ہیں۔

۴۔ موضوع واقعات، یعنی ایسے واقعات جنہیں خود تراشں کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ سردست ہم صرف نمبر ۳ اور نمبر ۴ قسم کے موضوعات کا مختصراً تذکرہ کریں گے۔

موضوع احادیث

ان کا پورا شمار تو ہمارے موضوع سے خارج اور احاطہ سے باہر ہے۔ تاہم چند مشہور موضوع احادیث

کا تذکرہ مختصراً ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ ابتدائے کائنات سے متعلق

اللہ تعالٰی فرماتے ہیں:

۱۔ کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ (حدیث قدسی/ ریاض السالکین، ص ۳) — میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، تو میں نے خلقت کو پیدا کیا۔

اور ایک دوسری روایت میں "فَخَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ" کے الفاظ ہیں۔ ملا علی قاری نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔ (اسلامی تصوف میں باطل نظریات، ص ۱۱۹)

۲۔ نورِ محمدی

اِنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللہُ نُوْرُ نَبِیِّکَ یَا جَابِرُ — اے جابر! اللہ نے سب سے پہلے تیرے نبی (محمدؐ) کے نور کو پیدا کیا۔

اسی موضوع حدیث کو یوں بھی روایت کیا گیا ہے:

اِنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللہُ نُوْرِیْ — رسول اللہ نے فرمایا: بیشک پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی وہ میرا نور تھا۔

یہ حدیث یونانی فلسفہ سے متاثر ہو کر گھڑی گئی ہے۔ فلاسفہ جس چیز کو عقلِ دوم کہتے ہیں صوفیاء اُسے ہی نورِ محمدی کہتے ہیں۔ اس حدیث اور اس فلسفہ پر تفصیلی بحث ص ۴۸۱، ۴۸۲ پر ملاحظہ فرمائیے۔

اب موضوع حدیث کی مزید تفسیر بھی ملاحظہ فرمائیے:

۳۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: "اے جابر! تحقیق اللہ تعالٰی نے تمام اشیاء سے پہلے تیرے نبی کا نور پیدا کیا اپنے نور سے۔ پھر وہ نور قدرتِ الٰہیہ سے، جہاں اللہ کو منظور ہوا، سیر کرتا رہا اور اس وقت نہ لوح تھی نہ قلم تھا اور نہ بہشت نہ دوزخ اور نہ فرشتے۔ نہ آسمان نہ زمین۔ نہ سورج نہ چاند نہ جن نہ انسان۔ پھر جب اللہ تعالٰی نے مخلوق کو پیدا کرنا چاہا، تو اس نور کے چار حصے کئے۔ حصہ اول کا قلم بنایا۔ حصہ دوم کی لوح، تیسرے حصے کا عرش، چوتھے سے کل کائنات۔ (شرح قصیدہ همزیہ، ص ۱۵، بحوالہ ریاض السالکین ص ۲۴۰)

یہ حدیث سننے کے بعد ممکن ہے آپ کو یہ معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہو کہ اس نورِ نبی کو پیدا ہوئے کتنی مدت

گزری ؛ تو لیجئے ایسی موضوع حدیث بھی حاضرِ خدمت ہے:

۴۔ "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے سوال کیا کہ تمہاری عمر کتنی ہے ؛ تو حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کی کہ اے آقا! مَیں اچھی طرح عمر نہیں جانتا، مگر اتنا جانتا ہوں کہ چوتھے حجاب میں ستارہ تھا، جو ستر ہزار سال کے بعد طلوع ہوا کرتا تھا اور مَیں نے اس کو ۷۲،۰۰۰ (بہتر ہزار مرتبہ دیکھا ہے۔" تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "مجھے پروردگار کے عزت و جلال کی قسم! وہ ستارہ میں ہی ہوں۔"

اب دیکھئے! کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنی عمر ۷۰،۰۰۰ × ۷۲،۰۰۰ = ۵۰۴،۰۰،۰۰،۰۰۰ یعنی ایک ارب چوّن کروڑ سال بتلائی ہے اور یہ ستارہ یعنی نورِ نبی اس سے بہرحال مدتوں پہلے کا تھا۔ یہ کتنا پہلے کا تھا؟ اس موضوع حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے نور کی عمر نہیں بتلائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس "حدیث تراش" کو اس سے زیادہ حساب آتا ہی نہ تھا۔

۵۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس نورِ نبیؐ کو اللہ تعالےٰ نے اپنے چہرے کے نور سے پیدا کیا تھا اور اس بات کا اقرار اللہ تعالےٰ خود کرتے ہیں۔ چنانچہ روایت ہے:

قَالَ اللہ تعالےٰ: "خَلَقْتُ مُحَمَّدًا مِنْ نُوْرِ وَجْهِيْ." وَالْمُرَادُ مِنَ الْوَجْهِ ذَاتِ الْمُقَدَّسَةِ۔ (سر الاسرار ص ۱۲، سطر ۸، بحوالہ ریاض السالکین ص ۹۰)	اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (یعنی یہ موضوع حدیث، حدیثِ قدسی ہے) مَیں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چہرے کے نور سے پیدا کیا۔ اور چہرے سے مراد ذات مقدس باری تعالیٰ ہے

۶۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس موضوع حدیثِ قدسی کی تائید ایک اور موضوع حدیث سے فرما دی۔ اور وہ حدیث یوں ہے:

در حدیثِ قدسی وارد است:	حدیثِ قدسی میں وارد ہے کہ اللہ تعالےٰ فرمایا:
یَا مُحَمَّدُ! اَنْتَ اَنَا وَاَنَا اَنْتَ	"اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تو مَیں ہوں اور مَیں تو ہے"

(جواہر غیبی، ص ۲۰۲، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۹۲)

۷۔ پھر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی یوں تائید فرماتے ہیں کہ "میں اللہ کے نور سے ہوں" اور اس کی مزید تشریح یوں بھی کرتے ہیں کہ "مَیں اللہ کے نور سے ہوں اور کُل میرے نور سے ہیں۔" (مدارج النبوت ج ۲، ص ۶۰، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۲۴۹)

اب بات یوں ہوئی کہ اللہ نے سب سے پہلے نورِ نبی کو پیدا اور یہ نورِ نبی ایک ستارہ تھا جس سے حضرت جبریلؑ

نے اپنی عمر کا حساب بتایا تھا۔ اب اس نورِ نبی یا ستارہ سے ہی عرش، لوح و قلم، کرسی، بہشت و دوزخ اور شمس و قمر پیدا کئے جا رہے ہیں۔ یعنی ایک ستارہ سے ہی پوری کائنات کی تخلیق بتلائی جا رہی ہے۔

۷۔ حضرت آدم علیہ السلام سے جب گناہ سرزد ہوا، تو یہی نورِ نبی اس گناہ کی مغفرت کا سبب بنا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکال کر دنیا میں بھیجے گئے، تو ہر وقت روتے اور استغفار کرتے تھے ایک مرتبہ آسمان کی طرف منہ کیا اور عرض کی: "اے باری تعالیٰ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے مغفرت چاہتا ہوں" وحی نازل ہوئی۔ "محمد کون ہیں؟" عرض کیا: "جب آپ نے مجھے پیدا کیا تھا، تو میں نے عرش پر لکھا ہوا دیکھا تھا کہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" تو میں سمجھ گیا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اونچی کوئی ہستی نہیں ہے۔ جن کا نام تم نے اپنے نام کے ساتھ لکھ رکھا ہے۔" وحی نازل ہوئی کہ "وہ خاتم النبیین ہیں، تمہاری اولاد میں سے ہیں، لیکن وہ نہ ہوتے تو تم بھی پیدا نہ کئے جاتے۔" (ریاض السالکین ص ۳۰۷)

اب دیکھئے! اس موضوع حدیث میں یہ ذکر کہیں نہیں آیا کہ پھر حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ بھی قبول ہوئی یا نہیں الٹا اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر حضرت آدم علیہ السلام کو اور بھی مایوس کر دیا کہ اگر وہ نہ ہوتے تو تم بھی نہ ہوتے۔ کسی سائل کو اگر ایسا جواب دیا جائے تو بتلایئے کہ اس کے دل پر کیسی بیتتی ہے۔

البتہ اس حدیث نے اور کئی مسئلے حل کر دیئے۔ مثلاً (۱) خواہ کتنے ہی برس اللہ سے رو رو کر مغفرت چاہیں قبول نہیں ہوتی، جب تک کسی کا وسیلہ نہ پکڑیں اور (۲) یہ وسیلہ اپنے نیک اعمال کا نہیں، ایسی ہستی کا بھی ہو سکتا ہے جو ابھی تک وجود میں نہ آئی ہو۔

کاش! یہ بات حضرت آدم علیہ السلام کو اتنی مدت رونے سے پہلے ہی معلوم ہو جاتی۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت

تیسری بات یہ یاد رکھئے کہ یہ نورِ نبی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی چیز ہیں، کیونکہ ایک اور موضوع حدیثِ قدسی یوں بھی ہے۔

۹۔ عَنْ ابن عباس یقول اللہ: وَعِزَّتِیْ وَ جَلَالِیْ لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الدُّنْیَا۔ (ریاض السالکین، ص ۲۴۴)

ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اگر تم نہ ہوتے، تو میں دنیا کو پیدا ہی نہ کرتا۔"

۱۰۔ ایک دوسری روایت میں یہ موضوع حدیثِ قدسی یوں بھی آئی ہے:

لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ (ریاض السالکین ص ۱۹) "اگر تم نہ ہوتے، تو میں کائنات کی کوئی چیز بھی پیدا نہ کرتا۔"

۱۱۔ پھر چونکہ آپ اللہ کے نور سے نور تھے، لہٰذا آپ کا سایہ نہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ تھا۔ آپ کبھی سورج کے ساتھ نہیں ہوئے مگر آپ کا نور پاک سورج کی روشنی پر غالب ہوتا۔" اور ابن سبع نے کہا: "جب سورج یا چاند میں چلتے تو آپ کا سایہ ظاہر نہ ہوتا، کیونکہ نور کا سایہ نہیں ہوتا۔" (زرقانی ۲۲۰/۴، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۳۴۸)

اب مشکل یہ ہے کہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ "ہمارے گھر میں چراغ جلتا تھا اور آپ کا سایہ بھی ہوتا تھا۔" ہو سکتا ہے کہ سورج اور چاند کی روشنی میں ہی آپ کا نور چمکتا ہو۔ رات کے اندھیرے میں نہ چمکتا ہو۔ پھر یہ چراغ کی روشنی میں آپ کے سایہ کی سمجھ نہیں آتی، حالانکہ یہ چراغ بھی تو آپ کے نور سے ہی پیدا ہوا تھا!

۱۲۔ پھر یہ اللہ کے نور سے نور ہی کا اثر تھا کہ آپ ہر جگہ حاضر و ناظر ہوتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ اس کی دلیل عرشی صاحب ریاض السالکین نے صفحہ ۲۴۴ پر اس قرآنی آیت سے دی ہے:

وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۱۴۳/۲) "اور رسول تم پر گواہ یعنی حاضر و ناظر رہتے ہیں۔ جب رسول پاک ہر وقت گواہ رہتے ہیں، تو پھر اپنے ہر امتی کے اعمال سے باخبر ہیں کہ فلاں کے اعمال کیسے ہیں اور دین کس درجہ پر ہے۔" (ریاض السالکین، ص ۲۴۴)

حاضر و ناظر کی یہ دلیل تو خوب ہے لیکن مشکل یہ آپڑتی ہے کہ اس آیت کا پہلا حصہ یوں ہے کہ "لِتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" پھر کیا تمام صحابہ بھی حاضر و ناظر ہیں، جو دوسرے لوگوں پر گواہ اور ان کے اعمال کے نگران ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر آپ کی خصوصیت کیا رہی؟

البتہ اس کھینچا تانی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر ثابت کرنے کا ایک فائدہ ضرور ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ تمام پیروں، فقیروں یعنی اولیاء اللہ کے حاضر و ناظر ہونے اور اپنے مریدوں کے اعمال پر نگران بنے رہنے کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔

۱۳۔ آپ کے اللہ کے نور سے نور ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ جس طرح اللہ کے لئے یا نور کے لیے موت نہیں، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دائمی زندگی ثابت کی جاتی ہے۔ آپ کا دربار بھی لگتا ہے۔ اس میں باقاعدہ بیعت بھی کرائی جاتی ہے۔ اولیاء آپ کے پاس اور آپ اولیاء کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں اور آپ نے وہ تمام امور بھی سنبھال رکھے ہیں جو اللہ کے ذمہ ہیں اور قیامت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرائض

بجالاتے رہیں گے اور یہ سب کچھ صحیح حدیث کے ایک ٹکڑے "اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ مُعْطِیْ" (میں تو صرف بانٹنے والا ہوں، عطا کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے) سے ثابت کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ الفاظ آپ نے اس وقت ادا فرمائے تھے جب آپ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے۔

ہمارے اولیاء اللہ نے اس تاویل سے بھی جی بھر کر فائدہ اٹھایا ہے۔

۴۔ قبر النبی ﷺ کی زیارت کے متعلق موضوعات

اسی عقیدہ کی بناء پر لوگوں نے آپؐ کی قبر کی زیارت کی فضیلت پر بہت سی حدیثیں تراشی ہیں، جن میں سے چار پانچ ہم قبروں کے بیان (باب ششم) میں ذکر کر آئے ہیں اور علماء نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ ایسی تمام احادیث جو قبر النبی ﷺ کی زیارت اور فضیلت سے تعلق رکھتی ہیں سب موضوع ہیں۔ البتہ صوفیاء کے لئے ایسی موضوعات بہت کار آمد ہیں کیونکہ یہ اُن کی قبوری شریعت کے لئے بنیاد فراہم کرتی ہیں اور پختہ قبروں اور مزاروں کی تعمیر، عرسوں، میلوں، مجاورت اور نذرانوں اور چڑھاووں کے لئے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

۵۔ اولیاء اللہ کی شان کے متعلق موضوعات

۱۵۔ اَوْلِیَائِیْ تَحْتَ قَبَائِیْ لَا یَعْرِفُھُمْ غَیْرِیْ (حدیث قدسی)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے اولیاء میری قبا میں ہیں جنہیں میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (تذکرہ غوثیہ، بحوالہ ریاض السالکین ص۲۴۶)

۱۶۔ اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ تَلَامِیْذُ الرَّحْمٰنِ (حدیث قدسی)

بیشک اولیاء اللہ میرے شاگرد ہیں۔ (جمال، ص ۱۱۹، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۲۴۶)

۱۷۔ اَلشَّیْخُ فِیْ قَوْمِہٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ اُمَّتِہٖ (ریاض السالکین، ص ۲۳۰)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: شیخ اپنے مریدوں میں ایسا ہوتا ہے، جیسے نبی اپنی امت میں۔

۶۔ معرفت کے متعلق احادیث موضوعہ

۱۸۔ معرفتِ نفس کے متعلق یہ حدیث "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ" بھی موضوع ہے۔ مجدد الف ثانیؒ نے اس کو موضوع تو نہیں سمجھا مگر اس کی تاویل کر کے اُسے صحیح رُخ کی طرف ضرور موڑ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"ابن عربی نے 'مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ' کی تاویل میں بھی غلطی کی ہے۔ یعنی اپنے نفس کی معرفت میں خدا کی

۱؎ بایزید بسطامی اسی بناء پر سنت رسول ﷺ سے بے نیاز تھے، وہ کہتے تھے کہ ان راویوں سے احادیث بیان کرتے ہو جو مر چکے ہیں جبکہ ہم اللہ سے براہ راست ہمکلام ہوتے ہیں، جو حیّ لایموت ہے۔

معرفت سمجھتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ عین یک دیگر ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی فطرت کے نقائص اور عیوب کو محسوس کر لیتا ہے، وہ پالیتا ہے کہ فضائل اور کمالات صرف خدا کی ذات میں ہیں۔" حضرت مجدد کا نظریۂ توحید، بحوالہ مکتوب ربانی، دفتر ۲، مکتوب ۲۳۴)

حضرت مجدد کی یہ تاویل، حضرت علی ﷺ کے اس قول عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ سے البتہ مطابقت رکھتی ہے۔

۱۹۔ قَالَ عَلَیْہِ الصلوٰۃ والسلام : مَنْ عَرَفَنِیْ فَقَدْ عَرَفَ الْحَقَّ وَمَنْ رَاٰنِیْ فَقَدْ رَاَی الْحَقَّ۔
(تفسیر عرائس البیان ج ۲، سطر ۳، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۷)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جس نے مجھے پہچانا اس نے اپنے خدا کو پہچانا اور جس نے مجھے دیکھا اس نے خدا کو دیکھا۔

معلوم ہوا کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے بھی اپنے رب کو پہچان لیا اور جس نے رسول اکرم کو پہچان لیا اس نے بھی اپنے رب کو پہچان لیا۔ اب اس معرفتِ الٰہی کا فائدہ درج ذیل موضوع حدیث میں ملاحظہ فرمائیے۔

۲۰۔ مَنْ عَرَفَ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ (مرشد کامل، ص ۸)
جس نے اللہ کو پہچان لیا۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں رہتی۔

۷۔ دینِ طریقت اور باطنی علوم کی فضیلت

۲۱۔ الشریعۃ اَقْوَالِیْ، الطریقۃ افعالی والحقیقۃ حَالِیْ
(مرشد کامل، ترجمہ حدائق الاخیار، ص ۹)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شریعت میرے اقوال، طریقت میرے افعال اور حقیقت میرا حال ہے۔

۲۲۔ حدیث شریف، اِنَّ للقرآنِ ظہرًا وَ بطنًا وَ لبطنہٖ بَطَنٌ اِلٰی سبعۃ ابطنٍ وَفِی روایۃٍ اِلٰی سَبْعِیْنَ بَطْنًا۔ (ریاض السالکین، ص ۳۴۲)

بے شک قرآن مجید کا ایک ظاہری پہلو ہے اور ایک باطنی۔ پھر باطنی پہلو کا ایک اور باطنی پہلو ہے، جو سات پہلوؤں تک ہے۔ اور ایک دوسری روایت ہے کہ ستر باطنی پہلوؤں تک ہے۔

اب بتلائیے کہ جہاں باطنی پہلوؤں کی اتنی گنجائش ہو وہاں تصوف پر باطنیت کی چھاپ نہ ہو تو اور کیا ہو؟ پھر جب ہم یہی بات کہتے ہیں تو ان کرم فرماؤں کو یہ بات بھی بھلی نہیں لگتی۔

۸۔ سماع و وجد کے متعلق موضوعات:

۲۳۔ اَلسَّمَاعُ مُبَاحٌ لِاَھْلِہٖ (مرشد کامل ترجمہ حدائق الاخیار، ص ۱۵۰)
سماع اس کے اہل کے لئے مباح (جائز) ہے۔

اور وہ اہل کون ہے؟ یہ حدیث بھی حاضر ہے:-

۲۴۔ اَلسَّمَاعُ مُبَاحٌ لِمَنْ كَانَ قَلْبُهٗ حَيًّا عَنِ الدُّنْيَا مَيِّتًا (حوالہ ایضاً)

سماع اس شخص کے لئے جائز ہے۔ جس کا دل زندہ، لیکن دنیا کی طرف سے مُردہ ہو۔

۹۔ سماعِ موتیٰ سے متعلق موضوع حدیث :

۲۵۔ "حدیث شریف میں ہے کہ : کسی بھی قبر پر چڑیا یا چڑا بیٹھے تو صاحب قبر کو اتنا بھی معلوم ہوتا ہے کہ قبر پہ مذکر جانور ہے یا مونث۔" (ریاض السالکین، ص ۲۷۳)

پھر یہی صاحبِ ریاض السالکین ایک صحیح حدیث سے سماعِ موتیٰ کا استدلال کرتے ہیں :

۲۶۔ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب مُردہ کو اس کی قبر میں اُتار آتے ہیں اور لوگ واپس ہوتے ہیں تو مُردہ جانے والوں کی جوتیوں کی آواز سنتا ہے۔" بس اس سے ثابت ہُوا کہ اولیاء اللہ ہمیشہ زندہ ہی ہوتے ہیں۔ (ریاض السالکین، ص ۲۳۷)

دیکھا آپ نے کیسا لاجواب ثبوت مہیا فرمایا ہے عرشی صاحب نے۔ بات مُردہ کی ہو رہی ہے اور وہ کافر و مشرک بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس سے دائمی زندگی آپ اولیاء اللہ کی ثابت فرما رہے ہیں۔ اگر اس سے دائمی زندگی ثابت کرنا ہی ضروری ہے، تو اس میں اولیاء اللہ کی خصوصیت کہاں سے آگئی ؟

۱۰۔ شیعیت سے لگاؤ کے متعلق موضوعات :

۲۷۔ عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مَامَرَرْتُ بِسَمَاءٍ اِلَّا وَاَهْلُهَا مُشْتَاقُوْنَ اِلٰی علی ابن ابی طالب (نزہۃ المجالس ج۲، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۱۵۸)

ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میں جس آسمان پر گزرا، وہاں کے رہنے والوں کو علی ابن ابی طالب کا مشتاق پایا۔"

۲۸۔ عن ابن عباسؓ قال : حب علی ابن ابی طالب یاکل الذنوب کما تاکل النار الحطب (ریاض النظرہ، ص ۲۸۵)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کی محبت گناہوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جیسے آگ لکڑی کو۔

۲۹۔ كَانَ اَبُوْ بَكْرٍ رضی اللہ عنہ يُكْثِرُ النَّظَرَ اِلٰى وَجْهِ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ فَسَالَتْ عائشة فقال : سمعت رسول اللہ ﷺ يقول : اَلنَّظَرُ اِلٰى وَجْهِهٖ عِبَادَةٌ۔ (الصواعق المحرقہ بحوالہ ریاض

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اکثر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے باپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا : آپ ایسا کیوں کرتے ہیں، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا : میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ : "علی کے چہرہ کی طرف

السالکین، ص ۱۹۹) دیکھنا عبادت ہے۔"

۳۰۔ "حضور فرماتے ہیں کہ: ذکر علی عبادۃ" یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر عبادت ہے۔ یعنی "علی، علی کہنا عبادت ہے۔" (ریاض السالکین، ص ۱۹۹)

۱۱۔ عشق بازی کی فضیلت:

۳۱۔ مَنْ عَشِقَ فَتَعَفَّفَ وَکَتَمَ فَمَاتَ، مَاتَ شَہِیْدًا (تجدید تصوف وسلوک، ص ۱۳۷)

جس نے عشق کیا اور پارسا رہا اور عشق کو چھپایا، پھر مر گیا تو وہ شہید کی موت مرا۔

۱۲ مجاہدہ و ریاضت کی فضیلت:

۳۲۔ رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر

ہم جہادِ اصغر (جہاد بالسیف) سے جہادِ اکبر (مجاہدہ نفس) کی طرف لوٹ آئے

۱۳۔ خرقہ کی فضیلت:

۳۳۔ مَنْ رَقَّ ثَوْبُہٗ رَقَّ دِیْنُہٗ (مرشد کامل ترجمہ حدائق الاخیار، ص ۶۵)

جس نے اپنے کپڑے کو نرم بنایا اس نے اپنے دین کو نرم بنایا۔

۱۴۔ رجال الغیب سے استفادہ:

یعنی اگر کوئی شخص جنگل میں ہو اور اس کی کوئی چیز گم جائے یا اسے کسی طرح کی مدد درکار ہو تو اسے چاہیے کہ پکارے۔

۳۴۔ اَعِیْنُوْنِیْ یَا عِبَادَ اللہِ — اے اللہ کے بندو میری مدد کرو

تو رجال الغیب مدد کو پہنچتے ہیں۔ یہ حدیث بھی موضوع اور شرک صریح ہے۔ اگرچہ اس طرح فائدہ ہو بھی جائے۔ تب بھی اس کے شرک ہونے میں کوئی شک نہیں۔ یہی حدیث شش فعل اور ہفت ہیکل جیسے مشرکانہ افعال کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

۱۴۔ دنیوی زندگی میں مشاہدہ باری تعالےٰ:

۳۵۔ حدیث قدسی: اِنَّ اَحَدَکُمْ یَرٰی رَبَّہٗ حَتّٰی لَا یَمُوْتَ

تم سے ضرور کوئی نہ کوئی مرنے سے پیشتر اپنے رب کو دیکھ لے گا (تعلیم غوثیہ، ص ۱۰۶، بحوالہ ریاض السالکین ص ۲۲۹)

موضوع (رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب من گھڑت) واقعات

اس طرح کی کئی فعلی موضوع احادیث ہم "شیعیت سے لگاؤ" کے عنوان کے تحت درج کر آئے ہیں

کو بلاکر سوال کرنے اور بالآخر یہ خرقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا کرنے کا واقعہ۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یزید کو کندھے پر اٹھا کر گزرنے کا واقعہ۔ اور یہ فرمانا کہ "دوزخی، بہشتی کے کندھے پر سوار ہے۔" یہ واقعہ بھی فوائد الفواد میں مندرج ہے۔

۳۔ آپ کا حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو کربلا کی سرخ مٹی لا کر دینا اور فرمانا کہ اس کو شیشی میں سنبھال رکھو۔ یہ من گھڑت قصہ خزینۃ الاصفیاء میں مذکور ہے۔ علاوہ ازیں چند اور اسی طرح کے موضوعات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۴۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور درختوں کی شہادت

"حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر مدینہ کے بعض باغات سے گزرے۔ ناگاہ ایک کھجور کے درخت سے آواز آئی:

هٰذَا مُحَمَّدٌ سَيِّدُ الْأَنْبِيَاءِ وَهٰذَا عَلِيٌّ سَيِّدُ الْأَوْلِيَاءِ أَبُو الْأَئِمَّةِ الطَّاهِرِيْنَ

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں کے سردار ہیں اور یہ حضرت علی ہیں جو تمام ولیوں کے سردار اور طاہر اماموں کے باپ ہیں۔

اس کے بعد دوسرا درخت بولا:

هٰذَا مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَهٰذَا عَلِيٌّ سَيْفُ اللّٰهِ

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ کی تلوار ہیں۔

(صواعق محرقہ، ص ۱۲۳، مطبوعہ مصر، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۱۹۹)

معلوم ہوتا ہے کہ دورِ نبوی میں درختوں کی شہادت کا دستور بہت عام تھا۔ پاس کوئی کافر ہو یا نہ ہو وہ شہادت ضرور دے دیا کرتے تھے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں درخت بڑے ڈھیٹ اور بے شرم قسم کے تھے۔ جنہوں نے شہادت کا پہلا جملہ تو ٹھیک ادا کیا، لیکن دوسرا جملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں غلط سلط کہہ گئے۔ وجہ یہ ہے کہ:

۱۔ اولیاء اللہ نے تو تین سو سال بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا سید تسلیم کیا۔ نقشبندیہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا سید تسلیم کرتے ہیں۔ پھر اس وقت یہ شہادت کیسے درست ہو سکتی تھی۔

۲۔ اور آئمہ ظاہرین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا باپ یا امام تسلیم ہی نہیں کرتے۔ بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی اپنا امام اور رہبر تسلیم کرتے ہیں۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سیف اللہ کہا تھا، لیکن یہ دوسرا درخت آپ کے سامنے آپ کے قول کے خلاف شہادت دینے لگا۔ جو کچھ بھی ہوا، کم از کم درختوں نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے

اپنی محبت کا ثبوت تو مہیا کر دیا۔

۵۔ سورج کی واپسی

ایک موضوع واقعہ مشہور ہے کہ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نمازِ عصر قضا ہو گئی، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ سورج کو واپس لوٹایا جائے چنانچہ سورج مغرب سے چمکا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز ادا فرمائی۔

اب صاحب خزینۃ الاصفیاء نے اس موضوع قصہ کے آگے ایک فقرہ مزید بڑھا لیا کہ اس دن غروبِ آفتاب کے وقت ایک دہشت ناک آواز سنائی دی اور دوسرے اس سے ملتا جلتا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب ایک اور واقعہ بیان فرمایا، جو یہ ہے:

"ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ بابل کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔ آپ نے دریائے فرات عبور کرتے وقت دیکھا کہ نمازِ عصر قضا ہو رہی ہے تو آپ نے اور آپ کے چند دوستوں نے تو نماز ادا کر لی، لیکن کچھ دوسرے احباب نماز ادا نہ کر سکے اور سورج غروب ہو گیا۔ یہ لوگ حیران ہو کر آپ کے پاس آئے۔ آپ نے دعا کی تو اللہ تعالےٰ نے سورج کو حکم دیا پھر طلوع ہو جائے۔ اس وقت سورج سے ایک ہولناک آواز سنائی دی۔ یہ تمام تسبیح و تہلیل کی آوازیں تھیں[1]۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۶۵)

اب دیکھئے! ان حضرات سے عجوبہ پرستی اور کرامت بیانی کا شوق کیا کچھ کروا دیتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ ایسی مجبوری کی صورت میں انسان نماز قضاء ادا کر سکتا ہے۔ پھر اس کے لئے حیران و پریشان ہونا اور سورج کی واپسی کی دعائیں۔ پھر سورج کی واپسی۔ اور اس کے ہولناک آوازوں کے مناظر پیش کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے!

حاجی محمد قادری نوشاہی کا سورج اور چاند کو ٹھہرانا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس کرامت کے بعد راستہ اور بھی صاف ہو گیا اور ایسے ایسے اولیاء اللہ پیدا ہونے لگے جو سورج کے علاوہ چاند کو بھی حکماً ایک جگہ ٹھہرا سکتے تھے۔ چنانچہ صاحب خزینۃ الاصفیاء حاجی محمد قادری نوشاہی کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ کا ایک مرید جیون حجام موضع باہو کے (جو نوشہرہ سے دو میل کے فاصلہ پر ہے) میں رہتا تھا۔ ایک دن اس نے عرض کی کہ میری کھیتی پر تشریف لائیں، تو میرے لئے باعث عزت و برکت ہوگا۔ آپ التماس منظور فرما

---

[1] ملا علی قاری مصنف موضوعاتِ کبیر لکھتے ہیں کہ "روافض نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں تین لاکھ روایات وضع کی تھیں۔" (اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش، یوسف سلیم چشتی، ص ۱۱۹ تا ۱۲۱)

کر چل پڑے۔ نوشہرہ پہنچنے پر نمازِ عصر کا وقت ہوگیا۔ خدام نے چاہا پہلے نماز ادا کریں، پھر چلیں گے۔ یارانِ طریقت یہ سُن کر خاموش ہوگئے مگر سب کے دِل میں یہ خدشہ تھا کہ وہاں پہنچنے تک نماز قضا ہو جائے گی۔ مگر جب آپ وہاں (یعنی باہو کے) پہنچے، تو سورج ابھی تک اسی جگہ قائم تھا۔ دیر تک وہاں آرام کیا اور نماز ادا کرنے کا خیال تک نہ تھا۔ سورج بھی اپنی جگہ سے آگے نہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد جیون حجام کی زمین پر جاکر نماز پڑھی۔ نماز ادا کرنے کے بعد حاضرینِ مجلس سے فرمایا: "دوستو! خدا تعالیٰ کے بندے اب بھی ایسے موجود ہیں کہ اگر وہ چاند اور سورج کو یہ حکم دیں کہ ٹھہر جائیں، تو وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کریں گے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۷۰)

دیکھا آپ نے کہ ایک موضوع حدیث کو بنیاد قرار دے کر خارقِ عادت کا کتنا عظیم الشان قصر تعمیر کر لیا گیا ہے پہلے سورج کی واپسی کا معجزہ تراشا گیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کرامت۔ اب یہ بزرگ سورج کے علاوہ چاند کو بھی حکماً ٹھہرانے والے پیدا ہوگئے۔ تاہم ان تینوں واقعات میں ایک قدرِ مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ حکم عصر کے وقت ہی دیا جاتا ہے۔ آگے پیچھے نہیں۔ شاید اس وقت سورج ان حضرات کا زیادہ فرمانبردار ہوتا ہے۔ اب اقتباس بالا کے پروگرام کے مطابق تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورج کم از کم تین گھنٹے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ پھر یہ سورج صرف باہو کے یا نوشہرہ پر تو نہیں چمکتا، بلکہ پوری آدھی دُنیا پر چمک رہا تھا۔ کیا کسی اور جگہ سے بھی اس دن کے تین گھنٹے بڑا ہونے کی شہادت مہیا ہو سکتی ہے؟ نظامِ کائنات میں اتنی بڑی تبدیلی کا علم آخر حاجی محمد نوشاہی اور اس کے مریدوں کو ہی کیوں ہوا؟

۶۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور زمین کی سراغرسانی

بی بی اسماء بنتِ عمیس رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ مجھے بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے شبِ عروسی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ مجھے اس رات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہت ڈر آیا، کیونکہ میں نے سنا کہ زمین آپ سے باتیں کر رہی ہے۔ صبح میں نے سرکارِ دو عالم سے بات کی تو سجدہ ریز ہوگئے۔ پھر سر اٹھا کر فرمایا: "فاطمہ! تمہیں پاکیزگیٔ نسب و نسل کی بشارت ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے شوہر کو تمام خلائق سے فضیلت دی ہے اور زمین کو حکم دیا کہ اپنی خبریں اسے سنا دیا کرے اور مشرق و مغرب کے حالات اس پر واضح کرے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۶)

معلوم ہوتا ہے کہ زمین اپنی اس ڈیوٹی سے غفلت شعار ہی رہی ہے۔ بلکہ تین مواقع پر تو اس کی یہ غفلت افسوسناک ہے۔ ایک جب آپ نے جنگِ صفین کے موقع پر قرآن کو حکم تسلیم کیا، تو آدھی فوج آپ کے برخلاف ہوگئی۔ دوسرے جب آپ نے حضرت موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو حکم تسلیم کر کے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا اور تیسرے جب ایک خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم نے آپ کو صبح کی نماز کی حالت میں شہید کر دیا، تو زمین نے اس کے آنے کی مطلق اطلاع نہ دی۔ ورنہ

آپ ضرور اُس کا کوئی مداوا سوچ لیتے۔

۷۔ حضرت ابراہیم بن محمد رضی اللہ عنہ کی وفات کی اصل وجہ

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسین کو اپنی دائیں ران پر بٹھاتے تھے اور بیٹے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کو بائیں ران پر۔ اسی حالت میں ایک روز حضرت جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے، اور پیغامِ خداوندی سنایا (گویا یہ حدیثِ قدسی ہے) کہ "ہم دونوں کو آپ کے پاس جمع نہیں ہونے دیں گے۔ ایک کو اٹھالیا جائے گا۔ اب آپ کی مرضی ہے جسے چاہیں رکھیں۔" آپ دل میں بڑے فکر مند ہوئے اور سوچا کہ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور خود مجھے بڑا صدمہ ہوگا، لیکن اگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ فوت ہوئے، تو صرف مجھے صدمہ ہوگا، چنانچہ مجھے اپنا صدمہ گوارا ہے، لیکن یہ گوارا نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا غمگین رہیں۔ غرضیکہ اس واقعہ کے تین دن بعد حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ واصل بحق ہو گئے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۴۷)

روایت نگار پتہ نہیں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا ذکرِ خیر کیوں بھول گئے۔ کہیں یا کبھی کبھی انہیں بھی بٹھلا دیتے، تو اچھا تھا۔ آخر حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے صرف ۱۱ ماہ ہی بڑے تھے۔ ان سے ایسی بے اعتنائی کیوں؟ پھر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ذکرِ خیر سے فضائلِ اہلِ بیت، جو کہ روایت نگار کا اصل مقصد ہے۔ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتے۔ رہی حضرت ابراہیم کی ماں کے صدمہ کی بات، تو یہ بات کرامت تراش بھول ہی گئے۔

۸۔ سورج کا گناہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ

"حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہی دہلوی، "راحت القلوب" میں لکھتے ہیں کہ "ایک دفعہ حضرت عمر اپنے گھر میں آفتاب کی روشنی میں طرف رُخ کئے اپنے کپڑوں کو ٹانکے لگا رہے تھے، چونکہ وقت لگ گیا اس لئے سورج کی گرمی نے آپ کو متاثر کیا۔ آپ نے اپنی خشمگین نگاہ آفتاب کی طرف اٹھائی، تو آفتاب سیاہ ہو گیا اور ساری دنیا پر سیاہی چھاگئی۔ اس حال سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بڑے متفکر ہوئے۔ اسی وقت حضرت جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہنے لگے: "یارسول اللہ! آج آفتاب نے آپ کے عمرؓ کو خشمگین کر دیا تھا۔ لہٰذا نورِ آفتاب گہنا گیا ہے۔ ہاں اگر عمرؓ سورج کا گناہ معاف کر دیں تو آفتاب کی روشنی لوٹائی جا سکتی ہے۔ ورنہ قیامت تک آفتاب کو اسی طرح روسیاہ رہنا پڑے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو طلب کیا اور فرمایا کہ آفتاب کا گناہ معاف کیا جائے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے درگزر کیا اور آفتاب کا نور عالم تاب اسے لوٹا دیا گیا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۵۴)

غور فرمایا، آپ نے نظام الدین صاحب جیسے بزرگوں کی باتیں کیسی بزرگ اور لاجواب ہوتی ہیں۔ سیدھی سی بات تھی کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دھوپ لگ گئی تھی، تو سایہ میں آ بیٹھتے، لیکن اس طرح شاید نگاہِ خشمگین کی کرامت کا ظہور ممکن نہ رہتا۔ لہٰذا فسانہ تراش کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہِ خشمگیں یا توجہ کا قصہ تراشنا پڑا۔ ہم تو یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ بیچارے آفتاب کا گناہ کیا تھا؟ وہ تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے اپنی ڈیوٹی پر مامور ہے اور آدم اور بنی آدم کی پیدائش سے بہت پہلے سے یہ فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ آخر اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان میں وہ کون سی انوکھی گستاخی کی تھی جس پر اس قدر برہمی ہوتی تھی کہ قیامت تک کے لئے اس سے نور چھین کر اللہ تعالےٰ کے امر پہ پانی پھیر دینا چاہتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں سورج اس دن گہنایا تھا جب آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی۔ صحابہ نے یہ تاثر لیا کہ شاید اس سانحہ کی وجہ سے سورج گہنایا ہے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ ان دونوں واقعات کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ سورج کا گہنانا تو اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اس موقع پر آپ نے نماز کسوف ادا فرمائی اور اللہ کے حضور مغفرت کے لئے آپ نے اور صحابہ نے گڑگڑا کر دعائیں کی تھیں، مگر نظام الدین فرما رہے ہیں کہ سورج گہنا گیا، تو فوراً آپ پر حضرت جبریل علیہ السلام اترے اور کہا کہ عمرؓ سے کہو کہ جلد سورج کا گناہ معاف کر دیا جائے۔ پھر آپ نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے استدعا کی۔ انہوں نے سورج کو معاف کیا اور اس کی جان بخشی ہوئی۔ پھر اسے روشنی واپس لوٹا دی گئی۔

۹۔ استمدادِ غیبی کا ثبوت

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زوجہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاں اپنی باری کی رات میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے وضو فرمایا اور وضو کے درمیان تین مرتبہ لبیک (حاضر ہوں، امداد کیا گیا، یعنی میں نے تیری مدد کی) فرمایا۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: "آپ کس کے ساتھ ہمکلام ہیں؟" فرمایا، "راجز مجھ سے فریاد کرتا ہے۔" عمرو بن سالم راجز جب مکہ سے مدینہ روانہ ہوا، تو کفارِ مکہ اسے قتل کرنا چاہتے تھے، تو آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غائبانہ پکارنا شروع کیا اور آپ سے امداد طلب کی۔ پس رسول اللہ سے مدد مانگ کیونکہ آپ کی امداد ہر وقت تیار ہے اور اللہ کے بندوں کو پکارو وہ تیری مدد کو پہنچیں گے۔"

(ریاض السالکین، ص ۲۳۶ بحوالہ طبرانی صغیر، ص ۲۰۱)

اب دیکھئے کہ صاحبِ ریاض السالکین عرشی صاحب نے اس موضوع حدیث کا صرف ترجمہ نقل فرمایا ہے۔ یہ موضوع تو اس لئے ہے کہ قرآن کی نصوص صریحہ کے خلاف ہے۔ پھر آپ نے اس کے ترجمہ کے آخر میں اپنی طرف سے جو اضافے فرمائے ہیں وہ لے سے اور بھی چار چاند لگا رہے ہیں۔

غرض اس ولایت کی دنیا میں ایسے واقعات بھی بے شمار ہیں۔ جن میں رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت کر کے آپ کے ذمہ جھوٹ لگایا گیا جس کے بارہ میں آپ نے یوں فرمایا تھا کہ :۔

من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعده من النار (متفق علیہ) — جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا، تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنا لے۔

گھریلو شہادت

اس قسم کی موضوعات اور ایسے بعض دوسرے اولیاء کی کرامات کے من گھڑت قصوں پر جناب پروفیسر حبیب اللہ صاحب تعارف نگار "تاریخ مشائخ چشت" یوں رقمطراز ہیں کہ :

"لیکن اس کتاب "خزینۃ الاصفیاء مصنفہ غلام سرور لاہوری) کا بڑا نقص یہ تھا کہ مصنف نے عقائد کا سہارا لے کر ان تمام اصول اسناد کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا، جو علمائے اسلام کی نظر میں صدیوں تک علم و حکمت کی روح سمجھے جاتے رہے ہیں۔ تنقیدی اصولوں سے چشم پوشی کرنے کے محض عقائد پر علم کی عمارت تعمیر کرنا کبھی نہیں تو کیا ہے اس قسم کی تحریریں متضاد افکار کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہیں اور بالآخر ان کا نتیجہ بدعقیدگی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیاء نے اپنی کتاب میں ہیبت ناک قسم کی کرامات کی تفصیل دی ہے جن کو پڑھ کر انسانی عقل و خرد کو شرم آجاتی ہے۔" (تاریخ مشائخ چشت، زیر عنوان تعارف از پروفیسر حبیب اللہ، ص "س")

اب دیکھئے پروفیسر حبیب اللہ صاحب کو خزینۃ الاصفیاء میں صرف دو خامیاں نظر آئیں :۔

۱ اس کی روایات بلا اسناد ہیں۔

۲ اس میں بیان کردہ کرامات ہیبت ناک قسم کی ہیں، جن کو پڑھ کر انسانی عقل و خرد کو شرم آجاتی ہے۔

اور ہم یہ عرض کریں گے کہ ان کوتاہیوں کے مرتکب بجائے اکیلے صاحب خزینۃ الاصفیاء ہی نہیں، بلکہ تمام تذکرہ نگاروں کا یہی حال ہے۔ اور ان کی روایات یوں شروع ہوتی ہیں، نقل ہے، منقول ہے۔ فرمایا فلاں نے فرمایا۔ اس قسم کی تھوڑی بہت تفصیل ہم پہلے باب میں لکھ چکے ہیں۔ کرامات کی مہیب اور عقل و خرد کو شرمانے والی تصویر پیش کرنے میں بھی سب تذکرہ نگار غلام سرور مفتی صاحب کے ہی ساتھی نظر آتے ہیں، علاوہ ازیں ان تذکروں میں تاریخی لغزشیں، اور بے احتیاطیاں بھی کافی حد تک موجود ہیں۔

باب (۱۰)

شریعت اور طریقت کا تصادم

۱۔ توحید

پچھلے ابواب میں ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ جو توحید ہمیں اسلام سکھلاتا ہے۔ اہل طریقت اسے تفرقہ کا نام دیتے ہیں اور جن بزرگوں نے کچھ قرآن و سنت کا پاس رکھا انہوں نے بھی اتنا ضرور کہہ دیا کہ لا الٰہ الا اللہ عوام کی توحید ہے۔ خواص کی نہیں اور جو خواص کی توحید (یعنی نظریہ وحدت الوجود) ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے وہ خالصتاً شرک ہے پھر جب توحید کی تعریف[1] اور قدر میں تبدیلی اور تضاد واقع ہو گیا، تو شرک کی تعریف خود بخود ہی بدل جائے گی۔ لہٰذا ان دونوں ادیان میں مفاہمت ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں ایسا دور بھی آیا کہ ہندو لوگ مسلمان فقیروں کے مرید بن گئے اور مسلمان ہندو جوگیوں کے گیان دھیان حاصل کرنے میں کوئی عیب نہ سمجھتے تھے۔ کبیر حالانکہ مسلمان تھا مگر اسی وجہ سے جگت کبیر مشہور ہوا کہ دینِ اسلام کے بجائے دینِ طریقت کا پیروکار تھا اور اس کے بیشتر مرید ہندو تھے۔ بابا فرید اور گورو نانک جیسے بزرگوں نے

---

[1] صوفیاء کے نزدیک توحید کی تعریف یہ ہے:

اَلتَّوحِیدُ تَرکُ التَّوحِیدِ فِی التَّوحِیدِ، یعنی توحید کو توحید میں ترک کر ڈالنا ہی توحید ہے۔

سید عبدالقادر جیلانی فرمایا کرتے تھے کہ جب موحد مقام توحید تک پہنچ گیا، تو اس میں موحد ہا نہ توحید نہ واحد، نہ اندک نہ بسیار، نہ خودی نہ خدا، نہ بندہ نہ بندگی، نہ ہستی نہ نیستی، نہ ذات نہ صفات، نہ جبریل نہ قرآن، نہ نبی نہ ولی، نہ ولایت نہ تصرف، نہ صفت نہ موصوف، نہ اسم نہ مسمّٰی، نہ اول نہ آخر نہ ظاہر نہ باطن، نہ بہشت نہ دوزخ، نہ روشنی نہ تاریکی، نہ نفی نہ اثبات، نہ آسمان نہ زمین، نہ عرش نہ فرش، نہ مقام نہ مقیم، نہ طالب نہ مطلوب، نہ عشق نہ معشوق، نہ آدم نہ ابلیس، نہ کفر نہ اسلام، نہ کافر نہ مسلمان، نہ ایمان نہ حلال نہ حرام، نہ وجود نہ عدم، نہ مقام نہ استقامت، جب موحد اس مقام پر پہنچ گیا گویا وہ توحید میں آگیا، تو توحید فی التوحید کا مقام حاصل ہوا۔" (ریاض السالکین، ص ۱۵۷)

غور فرمایا آپ نے، ان اہل طریقت کی توحید کیسی لاجواب چیز ہے۔ کیا یہی وہ توحید ہے، جو کتاب و سنت میں مذکور ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو سکھلائی تھی۔ پیرانِ پیر کا یہی وہ شاندار وعظ ہوتا تھا جسے انسانوں کے علاوہ جن، رجال الغیب، ملائکہ حتیٰ کہ رسول اللہ اور دوسرے پیغمبر سننے آیا کرتے تھے اور جس کی تاثیر سے کئی لوگ فوراً مر جایا کرتے تھے اور بعض دوسرے بیہوش ہو جایا کرتے تھے۔

ہندوؤں کو مسلمان بنانے کے لئے ایسی ملی جلی تبلیغ چلائی جس کے نتیجہ میں دارا شکوہ (برادرِ حقیقی عالمگیر) جیسے صوفی پیدا ہوئے اور جس سے اسلامی نظریات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اس قسم کی تبلیغ کے نتیجہ میں بے علم صوفی گمراہ ہو گئے۔

گویا طریقت کا دین اپنے نظریات کی اتباع چاہتا ہے۔ اسے دینِ اسلام یا دوسرے ادیان سے کوئی سروکار نہیں۔ اسی لئے صوفیاء میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ:

اَلصُّوْفِیُّ لَا مَذْهَبَ لَهٗ   صوفی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا

یہاں مذہب سے مراد الہامی مذہب ہے، جو کسی پیغمبر کے متبعین کا مذہب ہو۔ ورنہ طریقت بذاتِ خود مذہب اور ایک دین ہے۔ اب اگر کوئی شخص، خواہ ہندو ہو یا سکھ، عیسائی ہو یا یہودی اگر اس مذہب میں شامل ہوگا تو اسے اپنے الہامی مذہب کے نظریات و عقائد کو ثانوی حیثیت دینا پڑے گی۔ کیونکہ اب اس کا اصل ایمان طریقت کے عقائد پر ہے۔ ایک دو مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

معروف کرخی کی وفات پر جھگڑا

جب آپ نے وفات پائی تو یہود و نصاریٰ دعوے کرنے لگے کہ شیخ ہمارے مذہب پر تھے۔ مسلمانوں نے تردید کی۔ نزاع بڑھی۔ خدام کہنے لگے کہ ہمارے شیخ کی وصیت تو یہ ہے کہ "جو ہمارا جنازہ زمین سے اٹھائے گا، ہم اسی سے ہیں۔" اس پر یہود و نصاریٰ نے باری باری اٹھانے کی کوشش کی، مگر اٹھا نہ سکے۔ پھر مسلمان آئے، انہوں نے جنازہ اٹھایا تو اٹھ گیا۔ پھر جس جگہ شیخ نے وفات پائی وہیں انہیں دفن کیا۔ شیخ معروف تجرید و تفرید اور بے سرو سامانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔" (خزینۃ الاصفیا ص ۱۲۹)

کچھ سمجھے آپ کہ یہ تفرید و تجرید کیا ہے؟ یہود و نصاریٰ کے راہبوں اور مسلمان صوفیوں میں یہی وہ قدرِ مشترک ہے جس کی بنا پر معروف کرخی کی میت متنازعہ بن گئی تھی اس تجرید و تفرید کو آسان الفاظ میں توحیدِ وجودی کا بلند درجہ سمجھ لیجئے۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ یہ جھگڑا بھی ایک "کرامت" ہی کے ذریعہ ختم ہوا اور یہی کچھ ایسے لوگوں کا مطلوب ہوتا ہے۔

زبدۃ العارفین قدوۃ السالکین حافظ غلام قادر کی شخصیت

"آپ اپنے زمانے کے قطب الاقطاب اور غوث الاغواث اور محبوبِ خدا تھے۔ جن کا فیضِ روحانی ہر خاص و عام کے لیئے اب تک جاری ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو، سکھ، عیسائی، ہر قوم

اور فرقہ کے لوگ آپ سے فیض روحانی حاصل کرتے تھے۔ خاص طور پر کبیر سنگھ بارایٹ لاء کا تمام خاندان آپ کے بے حد معتقد تھے۔ آپ کے عرس میں تمام فرقوں کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ آپ سے بے شمار کشف و کرامات سرزد ہوئی ہیں۔ آپ کے تمام مریدانِ باصفا فیضِ روحانی سے مالا مال اور "پابند شرع شریف" ہیں۔" (ریاض السالکین ص ۲۴۲)

اب یہ مرید جس شرع شریف کے پابند ہوں گے۔ وہ آپ خود اندازہ لگا لیجئے۔

مشہور متصوف عبدالکریم جیلی (م ۸۲۰ھ) کی تصنیف "الانسان الکامل" کے مترجم فضل میراں صاحب جب اس کتاب کا ترجمہ لکھنے بیٹھے، تو اس حقیقت کا آغازِ مقدمہ میں ہی برملا الفاظ میں یوں اعتراف فرماتے ہیں، حالانکہ وہ خود بھی اسی طبقہ صوفیاء سے تعلق رکھتے ہیں:

"اکثر صوفیاء کرام کے حقائق و معارف مسئلہ وحدۃ الوجود کے متعلق ہوتے ہیں اور اس مسئلہ نے خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے۔ صوفیاء کے اس قسم کے علوم سے اکثر اہلِ نفس و ہوا دلیر ہو کر شرعی قیود سے نکل گئے۔ شرعی علوم کو قشور (چھلکے) اور ان علوم کو لُبِ لباب یا مغز خیال کر کے ورطۂ الحاد و زندقہ میں جا پڑے ہیں۔ اول وہ شخص جس نے دلائل عقلیہ و براہین نقلیہ سے اس مسئلہ کے متعلق گفتگو کی ہے، وہ محی الدین ابن عربی ہیں، جنہوں نے علاوہ مکشوفات کے عقلی تصرف کو بھی اس میں دخل دیا ہے۔ مصنف "انسان کامل" کے علوم بھی اسی قبیل سے ہیں..... علمائے ظاہر جب دیکھتے ہیں کہ ایسے علوم جن میں عابد و معبود کی ایک ہی حقیقت ہے۔ تکلیفِ شرعی کو بالکل ساقط کر دیتے ہیں اور جو آیات و احادیث بطور شواہد کے حقائق وجودیہ کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسی ہوتی ہیں، جو خالی از تکلفات نہیں ہوتیں، تو اکثر علمائے کرام صوفیاء سے بد اعتقاد ہو جاتے ہیں۔" (مقدمہ از مترجم، ص ۹)

پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لیکن ان (صوفیاء کے علوم) کے مواطن، ماخذ اور سرچشمے علومِ نبوت کے مواطن اور سرچشمے سے جداگانہ ہیں شرعی علوم بھی بطریق اعتبار و اشارہ ان کی تائید کرتے ہیں نہ کہ بطریق تفسیر و فحوائے کلام اور یہ شرعی علوم و کمالاتِ نبوت کی ایک اعجازی خاصیت ہے۔ ورنہ شریعت کی راہ اور ہے اور ان صوفیوں کی راہ اور، جو مسائل وحدت الوجود بقا و فنا، لطائف کائنہ فطرت کی تہذیب و ترتیب میں اپنی تصنیفات چھوڑ گئے ہیں۔" (ایضاً، ص ۱۰)

دیکھا آپ نے مولوی فضل میراں صاحب نے کس قدر وسعتِ ظرفی سے ان حقائق کا اعتراف کر لیا ہے کہ علمائے شریعت کے یا علوم نبوت کے موطن اور سرچشمے الگ ہیں اور وہ موطن اور سرچشمے وحی الٰہی ہے اور صوفیا کے موطن اور سرچشمے الگ ہیں اور یہ موطن اور سرچشمے ان کے اپنے مکشوفات اور مشاہدات ہیں۔ لہٰذا شریعت کی

راہ اور ہے اور طریقت کی راہ اور۔ اور ان دونوں میں اتحاد ناممکن ہے اور یہیں سے خُدا کی ذات کے متعلق یعنی عقیدۂ توحید سے متعلق اختلاف شروع ہو جاتا ہے۔

بعض صوفیوں نے اپنے اس دینِ طریقت کے دینِ اسلام سے الگ ہونے کا برملا اعتراف کر لیا۔ وہ اپنے اس دین کی ترجمانی درج ذیل شعر سے کرتے ہیں ؎

ملتِ عشق از ہمہ ملت جُداست   عاشقاں را مذہب و ملت خُداست

یعنی عشق کا مذہب تمام مذہبوں سے الگ ہے۔ عاشقوں کا ملت اور مذہب سب کچھ خُدا ہی ہوتا ہے ان کا رسول سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

۲۔ رسالت

توحید کے بعد رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے کہ محمد ﷺ، اللہ کے بندے اور اُس کے رسُول ہیں۔ وہ تا قیامت رسُول ہیں اور سب بنی نوعِ انسان کے لئے رسول ہیں۔ وہ آخری نبی ہیں اُن کے بعد کوئی نہیں آئے گا اور ہر مسلمان پر اُن کی اتباع لازم و واجب ہے۔ وہ خیر البشر اور افضل الانبیاء ہیں ان کی اطاعت اور محبت ایمان کا لازمی حصّہ ہے۔

اس معاملہ میں بھی اہلِ طریقت بھٹک کر اور افراط و تفریط سے کام لے کر کئی راہوں پر چل نکلے:

ایک فریق جو ابنِ عربی کو شیخِ اکبر تسلیم کرتا ہے، اس بات کا قائل ہے کہ نبوّت سے ولایت افضل ہے اور خاتم الانبیاء سے خاتم الاولیاء افضل ہوتا ہے۔ اس فریق نے لاتعداد ولیوں کو رسول اکرم ﷺ سے برتر قرار دے کر آپؐ کی شان میں انتہا درجہ کی گستاخی کی اور آپ کی قدر و منزلت کو اپنے اصل مقام سے نیچے گرا دیا۔ اور شیخِ اکبر خود خاتم الاولیاء کے مقام پر فائز ہوئے اور نبوت کو اکتسابی قرار دے کر آئندہ کے لئے نبوت کا دروازہ کھول دیا۔ چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی اور دوسرے قادیانی حضرات ان کے اقوال سے بکثرت استفادہ کرتے ہیں۔

اب دیکھئے! عبدالکریم جیلی صاحب کس انداز میں مقامِ رسالت بیان فرماتے ہیں:

"نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے لئے تصریح فرمائی، جبکہ اس نے ان کو خواب میں دیکھا اور کہا کہ اے رسولِ خدا! مجھے معذور رکھئے، محبتِ الٰہی نے مجھے آپ کی محبت سے

باز رکھا ہے۔ پھر آپ نے اسے فرمایا کہ "اے مبارک! اللہ کی محبت ہی میری محبت ہے۔ پس جب محمد ﷺ وہاں اللہ کے خلیفہ تھے، تو اللہ یہاں محمد ﷺ کا نائب تھا" اور نائب خلیفہ کو کہتے ہیں اور خلیفہ نائب کو۔ پس وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) یہ (یعنی محمد ﷺ) ہیں۔ اور یہ (محمد ﷺ) وہ (اللہ تعالیٰ) ہیں۔ یہیں سے ہے کہ محمد ﷺ کمال میں متفرد ہوئے۔" (انسان کامل، ص ۲۴۲)

اس اقتباس میں جیلی صاحب نے:

۱۔ اپنے دل سے گھڑی ہوئی بات کو حدیث بنا کر پیش کر دیا اور یہ وضع حدیث کا فتنہ اس طبقہ میں موروثی طور پر پایا جاتا ہے۔

۲۔ پھر اس موضوع حدیث کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی محبت کو جو ایمان کا جزوِ اعلیٰ ہے خارج از بحث قرار دے دیا، حالانکہ اللہ کی محبت کا دعوےٰ تو تمام ادیانِ باطلہ بھی کرتے ہیں اور یہی دین طریقت کا نچوڑ ہے کہ وہ اللہ تک تو رسائی چاہتے ہیں مگر انہیں رسول کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

۳۔ اس موضوع حدیث کے ذریعہ عقیدہ حلول کو بھی ثابت کر دکھایا۔

پھر ایک دوسرے مقام پر جیلی صاحب صوفیانہ اصطلاح قطب اور رسول کا تعلق بیان فرما کر رسالت کا اجراء ثابت کرتے ہیں اور بعد میں آنے والے رسولوں کی نشاندہی بھی فرما رہے ہیں جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے واضح ہے:

نئے رسول

"انسان کامل وہ قطب ہے جس پر اول سے آخر تک وجود کے فلک گردش کرتے ہیں اور وہ جب سے وجود کی ابتدا ہوئی اس وقت سے لے کر ابد الآباد تک ایک ہی شئے ہے۔ پھر اس کے لئے رنگا رنگ لباس ہیں اور کنیسوں اور گرجوں میں ظاہر ہوتا ہے اس کا اصلی نام محمد ﷺ ہے، کنیت ابوالقاسم، وصف عبداللہ اور لقب شمس الدین ہے۔ پھر ہر زمانہ میں زمانہ کے لباس کے مطابق اس کا ایک نام ہے۔ پس میں (یعنی مصنف عبدالکریم جیلی) محمد ﷺ کے ساتھ اپنے شیخ شرف الدین اسمٰعیل الجبرتی کی صورت میں جمع ہوا اور میں نہیں جانتا کہ وہ نبی ﷺ ہیں۔ میں یہی جانتا تھا کہ وہ میرے شیخ ہیں۔ جن کو میں نے زبید میں ۷۹۶ھ میں مشاہدہ کیا ہے اور اس امر کا بھید یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ہر صورت میں متصور ہو سکتے ہیں۔ البتہ صورت کے لحاظ سے نام بدل دیا جاتا ہے۔ اور دراصل وہ نام بجز حقیقت محمدیہ کے کسی اور شئے پر واقع نہیں ہوتا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ جب آپ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی صورت میں ظاہر ہوئے تو

لہ اسی نظریہ کو دارا شکوہ کے استاد ملا بدخشی نے یوں ادا کیا ہے

پنجہ در پنجۂ خدا دارم — من چہ پروائے مصطفےٰ دارم

شبلی نے اپنے تلمیذ سے کہا کہ میں اس امر کی شہادت دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ تلمیذ صاحب کشف تھا۔ اس نے نورِ کشف سے پہچان لیا اور کہا کہ میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ تو اللہ کا رسول ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کا انکار نہیں کیا جاتا۔" (انسان کامل، ص ۲۴۵)

دوسرا فریق وہ ہے جس نے آپ کی شان کو اتنا بلند کیا کہ خدا کے ساتھ ملا دیا۔ آپ کو ہر جگہ حاضر ناظر اور عالم الغیب کُلی قرار دیا۔ آپ کے جسم میں اللہ تعالےٰ کو اتارا اور اس طرح آپ کو خدا ہی تسلیم کر لیا۔ یہ بھی دراصل دینِ طریقت کے نظریات کی مجبوری ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی امت ہونے کی وجہ سے جب تک آپؐ کو اس مقام پر فائز نہ کر لیں، ان کی اپنی راہ صاف نہیں ہوتی۔

رسول اکرم ﷺ کا نور

ایک تیسرا فریق اس سے بھی آگے بڑھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ جملہ کائنات سے پہلے حضور ﷺ کا نور پیدا کیا گیا۔ پھر اس نور سے باقی تمام کائنات وجود میں آئی ہے۔ اللہ تعالےٰ تو فرماتے ہیں کہ:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱/۳۰) اور ہم نے پانی سے ہر چیز کو پیدا کیا۔

لیکن یہ حضرات آپ کے نور سے ہر چیز کے پیدا ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔

پہلے دو فریقوں کے نظریات پر ہم مناسب مقامات پر بحث کر آئے ہیں۔ اب اس تیسرے فریق کے دعوےٰ کا بھی جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ اس کے دعوےٰ کی بنیاد درج ذیل موضوع حدیث ہے۔

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ اللہ نے جو چیز سب سے پہلے پیدا کی وہ میرا نور تھا۔

یہ حدیث موضوع ہونے کے باوجود صوفیاء میں بہت مقبول ہے اور یہ تو ہم تبلا چکے ہیں کہ ان کے ہاں حدیث کی صحت کا معیار، ان کے اپنے مشاہدات، مکاشفات اور نظریات ہوتے ہیں اگرچہ وہ روایت یا درایت کے لحاظ سے کتنی ہی ضعیف ہو۔

اب دیکھئے، اس حدیث کے موضوع ہونے کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ صحاح ستہ میں اس حدیث کا سراغ تک نہیں ملتا۔

۲۔ اس حدیث کا ماخذ "مصنف عبدالرزاق" ہے، جو تیسرے درجہ کی کتاب ہے اور اس میں ضعیف و متروک تو درکنار، موضوعات تک شامل ہیں۔

۳۔ اس حدیث کے راوی حضرت جابر رضی اللہ عنہ بتلاتے گئے ہیں، لیکن اسناد مذکور نہیں۔ لہٰذا ویسے بھی

مردود ہے۔ پھر مصنف عبدالرزاق کی حدیث اور اس حدیث کے الفاظ بھی نہیں ملتے، صرف مفہوم ملتا جلتا ہے اور وہ الفاظ یوں ہیں: اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرُ نَبِیِّكَ یَا جَابِر۔

۴۔ اس کے بجائے ترمذی ابواب القدر میں ایک صحیح حدیث بھی موجود ہے جو یوں ہے:۔

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْقَلَمَ — اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔

لیکن یہ حضرات قلم کو بھی آپ کے نور سے پیدا کر کے صحیح حدیث کو رد کرتے ہیں اور اس موضوع حدیث کو اپناتے ہیں۔

عالمِ اکبر اور عالمِ اصغر

اب سوال یہ ہے کہ صوفیاء میں یہ حدیث کیوں اس قدر مقبول ہے؟ تو اس کا پس منظر یہ ہے کہ اسلامی تصوف پر یونانی فلسفہ کی گہری چھاپ ہے، جو مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ جو کچھ انسان کے بدن میں موجود ہے، وہی کچھ کائنات میں ہے۔ گویا انسان عالمِ اصغر ہے اور کائنات عالمِ اکبر۔ بالفاظ دیگر کائنات "انسانِ اکبر" اور انسان "کائناتِ اصغر"۔ انسان کے افعال و اعمال اس کے ارادہ کے تابع ہوتے ہیں۔ ادھر انسان نے کسی کام کا ارادہ کیا۔ اِدھر اعضاء جوارح نے خود بخود حرکت شروع کر دی اور اس کا منبع انسان کا دماغ یا اس کی عقل ہے۔ گویا اعمال و افعال کے ظہور اور صدور سے پیشتر عقل کا ہونا ضروری ہے۔ پھر چونکہ انسان عالمِ اصغر ہے اس لئے اس کی عقل بھی، عقلِ جزء ہوئی۔ اب عالمِ اکبر یا کائنات کا نظام چلانے کے لئے، جس کے تحت کائنات میں ہر وقت حوادث کا ظہور و صدور ہو رہا ہے، ایسی عقل کا پہلے سے موجود ہونا ضروری ہے، جو کُل کائنات پر محیط اور اس پر کنٹرول کر سکے لہٰذا وہ عقل بھی عقلِ کُل ہوئی۔ اسی عقلِ کُل کو عقلِ اوّل کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اسی عقلِ اوّل یا عقلِ کُل کو مذہب کی زبان میں خدا کہا جاتا ہے۔

نورِ محمد ﷺ اور عقولِ عشرہ

اب اس فلسفہ کا اگلا مرحلہ یہ ہے کہ عقلِ اوّل صرف ایک نئی چیز کو وجود میں لا سکتی ہے اور وہ عقلِ دوم کہلائے گی۔ پھر یہ دونوں عقول مل کر تیسری چیز پیدا کریں گی، جو عقلِ سوم کہلائے گی۔ اسی طرح یہ سلسلہ دس عقلوں یا عقولِ عشرہ تک چلتا ہے اِن عقولِ عشرہ کے بعد عام کائنات وجود میں آئی یا لائی گئی۔ انہیں پیدا شدہ مختلف عقول کو مذہبی زبان میں خدا عرش کرسی اور افلاک وغیرہ وغیرہ کہا جاتا ہے۔

اب صوفیاء کا عقیدہ یہ ہے کہ عقلِ اوّل یا خدا نے جو عقلِ دوم پیدا کی تھی، وہ حضور اکرم ﷺ کا نور تھا، اب سوال یہ ہے کہ وہ دوسری چیز حضور اکرم ﷺ کا نور کیوں تھا؟ تو اس نکتہ کی باریکیاں تو متکلمین سمجھیں یا فلاسفہ بہرحال صوفیاء کے ہاں یہ مسئلہ مسلّم ہو گیا کہ وہ دوسری چیز حضور ﷺ کا نور تھی۔ اب اس نور کے متعلق اور اس کی

ہمہ گیری کے متعلق صوفیاء کے ارشادات ان کی اپنی زبان میں سنیئے!

"ظاہر ہے کہ دنیا کی اشیاء کا ہدایت پر قائم رہنا الہام الٰہی کے سوا ممکن نہیں اور الہام الٰہی بجز وسیلہ نبی حاصل نہیں پس سب کائنات کا پیغمبر کے زیر سایہ رہنا ضروری ہوا۔" (سرچشمۂ حیات، ص ۵۰)

"دربارِ خاص۔ سلطان باہو کی تصانیف نور الہدیٰ وغیرہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہی فضاؤں میں کسی جگہ سرورِ عالم ﷺ کا دربارِ خاص ہر روز انعقاد پذیر ہوتا ہے۔ جہاں روحانی ہستیوں کی وساطت سے باریابی حاصل کی جا سکتی ہے" (سرچشمۂ حیات، ص ۴۳)

"سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جو چیز پیدا کی ہے وہ آنحضرت ﷺ کا نور ہے۔ پھر اس سے ایک جوہر پیدا کر کے اسے بنظرِ قبولیت دیکھا وہ پانی ہو گیا اور اس پر جھاگ آگئی۔ جھاگ سے خدا نے روحیں پیدا کیں۔ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی روح، پھر انبیاء، پھر مومنوں کی ارواح پیدا کیں۔ اسی طرح اس سے اجسام پیدا کئے۔ اسی وقت ارواح کا اجسام سے تعلق پیدا ہو گیا۔ پہلے عالمِ ارواح ہے، پھر عالمِ اجسام۔ ارواح کے مدارج مختلف ہیں۔ سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کی روح۔ پھر اولو العزم رسل کی ارواح، پھر انبیاء، پھر صدیق، پھر اولیاء، پھر عارف، پھر زاہد، پھر عابد اور سب سے گھٹیا عامۃ المسلمین کی ارواح ہیں۔"

"اہل معرفت کہتے ہیں کہ کافروں کی روحیں ایمان کے مقام تک نہیں پہنچتیں۔ حیوانات و نباتات کی روحیں عالمِ سفلی سے ہیں۔ عالمِ علوی کی طرف چڑھ نہیں سکتیں۔ عالمِ علوی کی روحیں اپنے مقام سے عالمِ سفلی کی طرف اترتی اور جسموں میں قرار پکڑتی ہیں اور جب تک قالب میں رہتی ہیں کمال حاصل کرتی رہتی ہیں۔" ...... اس کے بعد ہندوؤں کے مسئلہ تناسخ کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔ (مرشدِ کامل، ص ۲۸)

عقلِ اوّل کی مختلف توجیہات

اب اس عقلِ اول کے متعلق دیگر صوفیانہ اسرار و رموز عبدالکریم جیلی کی زبان سے سنیئے:

"پھر جان کہ عقلِ اوّل کا علم اور قلمِ اعلیٰ ایک ہی نور ہیں کہ جب بندہ کی طرف اس کی نسبت کرے گا، تو اس کا نام عقلِ اوّل ہوتا ہے اور جب حق کی طرف اس کی نسبت کریں، تو اس کا نام قلمِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ پھر عقلِ اوّل جو محمد ﷺ کی طرف منسوب ہے۔ اوّلاً اس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو پیدا کیا ہے پس آنحضرت ﷺ اس جہت سے جبریل علیہ السلام کے باپ اور جمیع عالم کے اصل ہیں ... عقلِ اوّل کا نام روح امین اس جہت سے رکھا گیا ہے کہ وہ علمِ الٰہی کا خزانہ اور امین ہے اور حضرت جبریل علیہ السلام کا یہ نام اصل کے نام پر فرع کا نام رکھنا ہے۔ اس لئے کہ وہ عقلِ اوّل کی فرع ہیں۔ فافہم۔" (انسانِ کامل، ص ۲۰۶)

اس گورکھ دھندے کو بار بار پڑھئے اور بتلایئے کہ عقل اول قلم اعلیٰ ہے یا آنحضرت ﷺ یا حضرت جبریل علیہ السلام (روح الامین)؟ نیز یہ بھی کہ حضور اکرم ﷺ حضرت جبریل علیہ السلام کے باپ کیسے ہوئے؟ اور یہ بھی کہ کیا ابتدائے کائنات سے متعلق اسلام کی سادہ اور فطری تعلیم کا صوفیاء کے اس فلسفیانہ گورکھ دھندے سے کچھ تعلق ہے؟

پھر اس کے بعد جیلی صاحب فرشتوں کی پیدائش کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں کہ:

'جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے فکرِ محمدی کو اپنے اسم 'ہادی، رشید' کے نور سے پیدا کیا اور اس پر اپنے اسم مُبدِء، ومعید سے تجلی فرمائی۔ پھر اس کی طرف اپنے اسم باعث شہید کی آنکھ سے دیکھا، جب فکر (محمدی) نے ان اسماء حسنیٰ کے اسرار جمع کر لیے اور ان صفات عُلیا کے لباس میں عالم میں ظاہر ہوئی، تو اللہ تعالیٰ نے فکرِ محمدی سے تمام آسمانوں اور زمینوں کے فرشتوں کی رُوحیں پیدا کیں۔" (انسان کامل، ص ۲۸۵)

قرآن

قرآن کریم وہ ہدایت کی کتاب ہے، جو وحی کے ذریعے رسول اکرم ﷺ پر نازل ہوئی، وہ ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس پر ایمان لانا اور اس کے جملہ احکام کی پیروی کرنا، سب مسلمانوں پر لازم و واجب ہے۔

اس سلسلہ میں بھی اہلِ طریقت افراط و تفریط کا شکار ہوئے ہیں۔ ایک فریق تو ابن عربی کا ہے۔ یہ صوفیاء کے شیخ اکبر قرآن کا جواب لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ جب یہ وحدتُ الوجود کی عینک لگاتے ہیں، تو انہیں تمام مشرک لوگ موحد نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر ان ہی کے خوشہ نشیں تلمانی صاحب فرماتے ہیں کہ "قرآن میں توحید ہے کہاں۔ وہ تو شرک سے پُر ہے۔ ایسے قرآن و حدیث کو دروازے باہر پھینک دو" وغیرہ وغیرہ، جن کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔

دراصل یہ لوگ جب اپنے مشاہدات و نظریات کی سان پر قرآن کو چڑھاتے ہیں اور یہ ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا، تو انہیں کتاب اللہ میں بھی شک پیدا ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض مسلم بزرگ ہستیوں سے بھی ایسے الفاظ نکل گئے، مثلاً

فرشتوں کا سجدہ اور مجدد الف ثانیؒ

اللہ تعالیٰ نے ان سب فرشتوں سے اشرف المخلوقات حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کروایا تھا۔ اس کی خبر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم

میں دو مقامات پر ان الفاظ سے دی ہے۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۔ پھر سب کے سب فرشتوں نے اکٹھے ہو کر سجدہ کیا۔

(ص ۳۸، آیت ۷۳، الحجر ۱۵، آیت ۳۰)

اب حضرت مجددؒ الف ثانی نے فنا فی اللہ ہونے کی حیثیت سے ذاتِ الٰہی سے متصل ہو کر انسانیت کی ابتدا سے متعلق جو بہ چشمِ خود نظارہ فرمایا، وہ یوں ہے:

"اس فقیر کو بھی اللہ کے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صدقے بعض اوقات یہ حالت پیش آئی ہے اور میں نے ملائکہ کو عین سجود کی حالت میں پایا ہے، جو وہ حضرت آدم علیہ السلام کو کر رہے تھے کہ اب تک انہوں نے سجدہ سے سر بھی نہیں اٹھایا تھا اور ملائکہ علیین کو جنہیں سجدہ کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ ان سجدہ کرنے والے فرشتوں سے الگ دیکھا۔ کہ وہ اپنے مشہود میں (جس کا وہ مشاہدہ کر رہے تھے) فنا اور غرق ہیں۔" (ترجمہ مبداء و معاد مصنفہ شیخ احمد سرہندی۔ مترجم زوار حسین صاحب ص ۱۸۸)

آپ کے مکاشفہ یا مشاہدہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ قرآن کریم کی دو آیتوں کی تصحیح ہو گئی۔ یہ غلطی کس مقام پر واقع ہوئی۔ حضرت جبریل سے یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ملائکہ میں بھی دینِ طریقت رائج ہے اور کچھ اونچے درجہ کے فرشتے اللہ کی ذات میں فنا اور غرق رہتے ہیں۔ وہ اس کے احکام کے پابند نہیں ہیں۔

مجدد الف ثانی سے پیشتر عبدالکریم جیلی نے بھی فرشتوں کے متعلق اپنا ذاتی مشاہدہ اسی طرح اور زیادہ تفصیل سے پیش کیا تھا، بلکہ اس نے تو بعض مقربین کے نام بھی بتلا دیئے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ:

"پھر میں نے (یعنی عبدالکریم جیلی نے ساتویں آسمان پر) ان سو فرشتوں میں سے سات کو دیکھا کہ وہ ان سب سے آگے ہیں اور ان کا نام قائمۃ الکروبیین ہے اور ان سات میں سے میں نے تین کو دیکھا، جو ان سات پر مقدم تھے اور ان کا نام اہل المراتب والتمکین تھا اور ایک کو میں نے سب پر مقدم پایا، جس کا نام عبداللہ تھا اور یہ تمام وہ عالین فرشتے ہیں، جو سجودِ آدم کے لئے مامور نہ تھے اور ان کے اوپر بھی فرشتے ہیں مثلاً نون فرشتہ اور قلم فرشتہ اور ان کی مانند اور بھی کہ وہ بھی عالین میں داخل ہیں اور باقی ملائکہ مقربین ان سے ادنیٰ اور ان سے نیچے ہیں۔ مثلاً جبرائیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل اور ان کی مانند اور فرشتے۔"

دیکھ لیا آپ نے ان لوگوں کے مشاہدات و مکاشفات کس قدر وحی الٰہی سے متصادم ہوتے ہیں۔

قرآن کا ثواب

پھر ایک دوسرے گروہ کو قرآن کے احکامات اور تعلیمات سے کچھ سروکار نہیں۔ وہ اس قرآن کے تعویذ اور عملیات بنانے اور محض اس کی تلاوت میں اتنا ثواب حاصل کرنے یا فوت شدہ لوگوں کو بھیجنے میں مصروف ہے۔ جس کا آپ وہم و گمان بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھئے ایک بزرگ حضرت بشر حافی قرآن کی برکات اور اس کا ثواب کس انداز میں پیش کر رہے ہیں:

آپ نے فرمایا: "ایک بار میں نے قبرستان میں مُردوں کو دیکھا کہ آپس میں کچھ بانٹ رہے ہیں، میں نے دُعا کی: "الٰہی! ان کے حال سے آگاہ فرمایئے۔" حکم ہوا "ان ہی سے پوچھو۔" میں نے پوچھا: کیا بانٹ رہے ہو؟" انہوں نے کہا: "آٹھ روز ہوئے کہ ایک اللہ کا بندہ اس طرف سے گزرا۔ اس نے تین بار قُل شریف کا ثواب پڑھ کر ہم کو بخشا، اسی کو اب تک بانٹ رہے ہیں اور ابھی ختم نہیں ہوا۔" (مقربانِ حق، ص ۸۱)

دیکھئے! اس کرامت کی اختراع سے کتنے متنازعہ مسائل حل ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ رُوحیں اِس جہان میں قبرستانوں میں واپس آتی ہیں، دوسرے سماع موتی کا مسئلہ حل ہوا، تیسرے صوفیاء کے کشف اور ان رُوحوں کے جواب دینے کا اور چوتھے قبروں میں بیٹھ کر قرآن پڑھنے کی بدعت کا۔ آخر کیوں نہ ہو، ثواب بھی تو اتنا زیادہ تھا۔

۴۔ اتباعِ سُنت

کہنے کو تو صوفیاء اتباعِ سنت کی تلقین کرتے ہی رہتے ہیں مگر جو حضرات نبوت سے ولایت کو افضل اور قرآن و حدیث کے علم سے کشفی علم کو زیادہ معتبر سمجھتے ہوں وہ بھلا کہاں تک سنت کی اتباع کر سکتے ہیں۔ ایسے بہت سے احکامات کی ہم نشان دہی کر چکے ہیں۔ جہاں یہ لوگ رسول کے حکم کی پرواہ تک نہیں کرتے۔ مثلاً مزارات کے وجود سے حضور اکرم ﷺ نے بہت سختی سے منع فرمایا۔ اب کتنے بزرگ ہیں جو اپنے مقبرے نہیں بنتے یا وہ مقبروں پر جا کر مراقبہ نہیں کرتے۔ ایسے مسائل تو بے شمار ہیں مگر ہم یہاں صرف نفلی عبادات نماز، روزہ اور شب بیداری کا ذکر کریں گے۔ اس کے بعد نکاح کے متعلق تبصرہ کریں گے۔ نفلی عبادات کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی درج ذیل ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ	عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرے والد
اَنْكَحَنِیْ اَبِیْ امْرَاَةً ذَاتَ حَسَبٍ	(عمرو بن عاص) نے ایک حسب والی (قریش کی) عورت سے
فَكَانَ يَتَعَاهَدُ كَنَّتَهٗ فَيَسْاَلُهَا عَنْ بَعْلِهَا	میرا نکاح کر دیا اور ہمیشہ اس کی خبر گیری کرتے رہتے

فَتَقُوْلُ: "نِعْمَ الرَّجُلُ مِنْ رَجُلٍ لَمْ يَطَأْ لَنَا فِرَاشًا وَ لَمْ يُفَتِّشْ كَنَفًا مُذْ اَتَيْنَاهُ" فَلَمَّا طَالَ ذٰلِكَ عَلَيْهِ ذَكَرَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: "اَلْقِنِيْ بِهٖ" فَلَقِيْتُهُ بَعْدُ فَقَالَ: "كَيْفَ تَصُوْمُ؟" قَالَ: "كُلَّ يَوْمٍ" قَالَ: "وَكَيْفَ تَخْتِمُ؟" قَالَ: "كُلَّ لَيْلَةٍ!" قَالَ: "صُمْ فِيْ كُلِّ شَهْرٍ ثَلٰثَةً وَ اقْرَاِ الْقُرْاٰنَ فِيْ كُلِّ شَهْرٍ" قُلْتُ: "اُطِيْقُ اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ" قَالَ: "صُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ فِي الْجُمُعَةِ" قُلْتُ: "اُطِيْقُ اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ" قَالَ: "اَفْطِرْ يَوْمَيْنِ وَ صُمْ يَوْمًا" قُلْتُ: "اُطِيْقُ اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ" قَالَ: "صُمْ، اَفْضَلَ الصَّوْمِ صَوْمَ دَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ صِيَامَ يَوْمٍ وَ اِفْطَارَ يَوْمٍ وَ اقْرَاْ فِيْ كُلِّ سَبْعِ لَيَالٍ مَرَّةً" فَلَيْتَنِيْ قَبِلْتُ رُخْصَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ ذٰلِكَ اِنِّيْ كَبِرْتُ وَ ضَعُفْتُ فَكَانَ يَقْرَاُ عَلٰى بَعْضِ اَهْلِهِ السَّبْعَ مِنَ الْقُرْاٰنِ بِالنَّهَارِ

اور اس کے خاوند (یعنی میرے) متعلق پوچھتے رہتے۔ وہ کہتی: "اچھا آدمی ہے مگر جب سے اس کے نکاح میں آئی ہوں، نہ تو اس نے میرے بستر پر قدم رکھا اور نہ میرے کپڑے میں ہاتھ ڈالا۔ پھر جب ایسے ہی ایک مدت گزر گئی، تو میرے والد نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: "اسے میرے پاس لاؤ" چنانچہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ نے پوچھا: "روزے کیسے رکھتا ہے؟" میں نے کہا: "ہر روز روزہ رکھتا ہوں۔" پھر آپ نے پوچھا: "قرآن کتنے دنوں میں ختم کرتا ہے؟" میں نے کہا: "ہر رات میں ختم کرتا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "ہر مہینہ میں تین روزے رکھ اور ایک ماہ میں قرآن ختم کر۔" میں نے کہا: "میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "اچھا تو پھر ہر ہفتہ میں تین روزے رکھ۔" میں نے کہا: "میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "اچھا تو پھر دو دن روزہ چھوڑ اور ایک دن روزہ رکھ۔" میں نے عرض کیا: "مجھ میں اس سے زیادہ طاقت ہے۔" آپ نے فرمایا: "اچھا تو روزوں میں سے سب سے بہتر روزہ یعنی حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ اختیار کر لو۔ ایک دن روزہ رکھ اور دوسرے دن روزہ چھوڑ۔ اور قرآن کو سات راتوں میں صرف ایک بار ختم کیا کر۔" (عبداللہ بن عمرو کہا کرتے تھے) کاش! میں رسول اللہ ﷺ کی رخصت کو قبول کر لیتا اب میں بوڑھا اور ضعیف ہو گیا ہوں۔ مجاہد کہتے ہیں کہ بڑھاپے

وَالَّذِي يَقْرَءُوهُ يَعْرِضُهُ مِنَ النَّهَارِ لِيَكُونَ أَخَفَّ عَلَيْهِ بِاللَّيْلِ وَ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَتَقَوَّى أَفْطَرَ أَيَّامًا وَأَحْصَى وَ صَامَ مِثْلَهُنَّ كَرَاهِيَةَ أَنْ يَتْرُكَ شَيْئًا فَارَقَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

میں عبداللہ بن عمرو یُوں کرتے کہ قرآن کا ساتواں حصہ یعنی ایک منزل دن میں کسی کو سنا دیتے یعنی جورات کو پڑھنا ہوتا وہ دن کو سنا رکھتے تاکہ رات کو اس کا پڑھنا آسان ہو جائے۔ اور قوت حاصل کرنے کے لئے یوں کرتے کہ چند روز تک برابر افطار کرتے اور دن گنتے جاتے۔ پھر اتنے ہی دن برابر روزہ رکھتے، کیونکہ انہیں یہ بُرا معلوم ہوا کہ جو بات نبی ﷺ سے ٹھہرائی تھی اس میں کمی واقع ہو۔

وَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ وَ قَالَ بَعْضُهُمْ فِي ثَلٰثٍ وَفِي خَمْسٍ وَأَكْثَرُهُمْ عَلَى سَبْعٍ

(بخاری، کتاب فضائل القرآن باب في كم يقرء القرآن)

امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض راوی تین راتوں یا پانچ راتوں میں ختم کرنے کے متعلق بھی کہتے ہیں، مگر ان کی اکثریت سات راتوں میں ختم کرنے کی ہی روایت کرتی ہے

(۲) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اقْرَءِ الْقُرْآنَ فِي شَهْرٍ " قُلْتُ: إِنِّي أَجِدُ قُوَّةً قَالَ: فَاقْرَأْهُ فِي سَبْعٍ وَلَا تَزِدْ عَلٰى ذٰلِكَ۔ (بخاری، حوالہ ایضاً)

عبداللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قرآن مہینے میں ایک بار ختم کر" میں نے کہا "میں اس سے زیادہ طاقت اپنے آپ میں پاتا ہوں۔" آپ نے فرمایا اچھا تو پھر سات راتوں (یا دنوں) میں ختم کر اور اس سے زیادہ مت پڑھ۔"

(۳) عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "لَا تُوَاصِلُوا" قَالُوا: "إِنَّكَ تُوَاصِلُ" قَالَ: "لَسْتُ كَأَحَدٍ مِنْكُمْ إِنِّي أُطْعَمُ وَأُسْقٰى"

(بخاری، کتاب الصیام، باب الوصال)

حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "وصلی روزہ نہ رکھا کرو۔" لوگوں نے کہا: "یارسول اللہ ﷺ آپ تو وصل کرتے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی بھی میرے جیسا نہیں۔ میں (اللہ تعالٰے کی طرف سے کھلایا اور پلایا جاتا ہوں۔"

(۴) عَنْ أَبِي الْعَبَّاسِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنِّي

حضرت ابو العباس بن صائب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے سنا جو کہتے تھے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا

أُخْبِرُ أَنَّكَ تَقُوْمُ اللَّيْلَ وَ تَصُوْمُ النَّهَارَ" قُلْتُ إِنِّي أَفْعَلُ ذٰلِكَ" قَالَ: فَإِنَّكَ إِذَا فَعَلْتَ هَجَمَتْ عَيْنُكَ وَ نَفِهَتْ نَفْسُكَ وَ إِنَّ لِنَفْسِكَ حَقًّا وَ لِأَهْلِكَ حَقًّا فَصُمْ وَ أَفْطِرْ وَ قُمْ وَ نَمْ۔

(بخاری، کتاب التہجد)

"مجھے خبر ملی ہے کہ تُو ساری رات عبادت کرتا اور دن کو روزہ رکھتا ہے۔" میں نے کہا: "ہاں! میں ایسا کرتا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "اگر تو ایسا کرے گا، تو تیری آنکھیں بیٹھ جائیں گی اور تیری جان کمزور ہو جائے گی اور تُو یہ سمجھ لے کہ تیری جان کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا بھی تجھ پہ حق ہے۔ روزہ رکھ بھی اور افطار بھی کر اور رات کو قیام کر بھی اور سو بھی۔

مندرجہ بالا احادیث سے درج ذیل نتائج نکلتے ہیں:

۱۔ نفلی روزوں کی زیادہ سے زیادہ حد یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھا جائے اور دوسرے دن نہ رکھا جائے بعض دوسری صحیح احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس نے متواتر نفلی روزے رکھے، اس کا نہ روزہ ہے نہ افطار۔ یعنی اُسے ثواب ملنا تو درکنار، اُلٹا آپ کے حکم خلافِ عمل کا مرتکب ہوگا۔

۲۔ وصلی روزہ (یعنی متواتر بلا روزہ کھولے دو دن کا روزہ رکھنا) صرف حضور اکرم ﷺ کے لئے روا تھا امت کو آپ نے وصلی روزہ سے منع فرمایا۔ اس کی مثال بالکل وہی ہے کہ نمازِ تہجد آپ پر فرض تھی، مگر امت پر فرض نہیں اور یہ باتیں خصائص انبیاء سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک دوسری حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ اجازت، جو آپ نے دی وہ یہ ہے کہ شام کو اگر چاہے تو نہ کھائے مگر سحری ضرور کھائے اور یہ روزہ ۲۴ گھنٹے کا ہوگا۔ جیسا کہ ابتدائے اسلام میں روزہ کا دستور تھا۔ کہ وہ ۲۴ گھنٹے کا ہوتا تھا۔ بعد میں آسانی پیدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس میں تخفیف کر کے روزہ طلوعِ فجر سے غروب آفتاب تک قرار دیا۔

۳۔ مرفوع احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن سات دن یا رات سے پہلے ختم نہ کرنا چاہیئے اور رسول اللہ ﷺ سے یہ بات حکماً ثابت ہے۔ اسی بنا پر قرآن کی سات منازل مقرر کی گئیں کہ ہر روز ایک منزل پڑھ لی جائے۔ تاہم بعض صحابہ یا تابعین سے تین دن یا پانچ دن میں بھی ختم کرنا منقول ہے۔ جیسا کہ امام بخاریؒ نے ذکر کر دیا۔ پھر بھی ترجیح سات دنوں میں ختم کرنے کو دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرفوع احادیث کے مقابلہ میں صحابہ یا تابعین کے اقوال حجت نہیں ہیں اور اس کی بے شمار مثالیں احادیث میں مذکور ہیں۔ اسی بنا پر علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ تین دن سے پہلے قرآن ختم کرنا حرام ہے (بخاری، حوالہ مذکور۔ حاشیہ از وحید الزمان) پھر بعض روایات ایسی بھی ملتی ہیں کہ بعض صحابہ یا تابعین نے ایک دن میں قرآن ختم کیا، تو اس کی دو ہی توجیہات ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ

وہ روایت بذاتِ خود ضعیف ہو، دوسرے یہ کہ ان حضرات تک یہ مرفوع اور متصل احادیث نہ پہنچی ہوں اور یہی دوسری توجیہہ زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ کسی صحابی کو رسول اللہ ﷺ کی صحیح مرفوع حدیث مل جائے اور وہ اس کا خلاف کرے۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جو نفلی عبادات کے سلسلہ میں بہت زیادہ حریص اور اپنے میں ان نفلی عبادات کے لئے بہت قوت پاتے تھے انہیں بھی زیادہ سے زیادہ یہی اجازت ملی کہ (۱) قرآن سات دن یا رات میں ختم کریں۔ (۲) روزہ ایک دن چھوڑ کر رکھ سکتے ہیں۔ (۳) وصلی روزہ کی کوئی اجازت نہیں۔ پھر عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو اپنی اس نفلی عبادت میں زیادتی کے اصرار کے باوجود بعد میں پچھتانا پڑا۔ اور فرمایا کرتے تھے۔ "کاش! میں رسول اللہ ﷺ کی رخصت کو قبول کر لیتا۔

۵۔ ساری رات کی شب بیداری خلافِ سنت ہے اور اس سے آپ نے سختی سے منع فرما دیا۔ کیونکہ اس سے ایک تو جسم و جان کمزور پڑ جاتے ہیں اور نفس پر ظلم ہے۔ دوسرے انسان اپنی بیوی کے حقوق ادا نہیں کر سکتا اور یہ اس پر ظلم ہے اور یہی شکایت لے کر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے والد رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے تھے۔

ہم اب ان واضح احکامات کی روشنی میں اولیاء اللہ کی زندگی پر نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ وہ کس طرح کے متبع سنت ہیں اور اس کے لیے بنیاد ہم "تاریخ مشائخ چشت، از مولانا زکریا صاحب" کو بنائیں گے، کیونکہ آپ کم از کم شیخ الحدیث تو ہیں۔ گو ضمناً بعض دوسرے اولیاء کا ذکر بھی آ جائے گا۔

اولیاء اللہ کے خلافِ شرع کام

۱ وصلی روزہ

۱۔ خواجہ عبدالواحد بن زید (م ۱۷۰ھ) تین دن کے بعد روزہ افطار کرتے تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۲۲) ۲۔ خواجہ فضیل بن عیاض (م ۱۸۷ھ) آپ پانچ دن کا وصلی روزہ رکھتے تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۱) ۳۔ خواجہ حذیفہ المرعشی (م ۲۰۲ھ) آپ چھ دن کا وصلی روزہ رکھتے تھے (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۴۹) ۴۔ خواجہ ابواسحاق (م ۲۲۹ھ) آپ سات دن کا وصلی روزہ رکھتے تھے (ص ۱۵۳)

دیکھا آپ نے کس طرح یہ اولیاء اللہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس سنت کی خلاف ورزی میں بتدریج آگے بڑھ رہے ہیں، حتیٰ کہ پیرانِ پیر (۵) کا زمانہ آیا، تو آپ چالیس دن کا روزہ رکھتے تھے اور چالیس روز کے بعد جنگل کے پتوں اور اشیائے مباح یا پانی سے روزہ افطار فرمایا کرتے تھے۔ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۹۴)

۲۔ متواتر روزے

خواجہ فضیل بن عیاض (م ۱۸۷ھ) آپ ایک تو ۵ دن کے بعد روزہ افطار فرماتے دوسرے صائم الدھر تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۱) ۲۔ علو ممشاد دینوری (م ۲۹۸ھ)

آپ مادر زاد ولی اور صائم الدھر تھے۔ آپ نے بچپن میں بھی کبھی ماں کا دودھ نہ پیا تھا۔ (تاریخ مشائخ چشت ص ۱۴۹)

۳۔ خواجہ محمد بن ابی احمد (م ۴۱۱ھ) آپ مادر زاد ولی تھے۔ پیدا ہوتے ہی کلمہ پڑھا۔ ۱۲ سال حجرہ میں تنہا رہے ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۵۵) ۴۔ خواجہ سید ابویوسف (م ۴۵۹ھ) آپ ایک مرتبہ عبادت میں کچھ کاہل ہو گئے تھے، تو تیس برس تک پانی نہ پیا۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۵۸)

۳۔ ساری رات جاگنا

۱۔ سری سقطی (م ۲۵۰ھ) آپ نے پورے ۹۸ سال زمین پر پہلو نہیں رکھا۔ سوائے بیماری اور مرض الموت کے۔ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۳۲) ۲۔ جنید بغدادی (م ۲۹۸ھ) آپ نے کامل تیس سال عشاء کی نماز پڑھ کر اور ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر اللہ اللہ کی ہے۔ (صوفیائے نقشبند ص ۹۰)

۳۔ خواجہ ابو احمد ابدال چشتی (م ۳۵۵ھ) آپ تیس برس تک بستر پر نہیں سوئے۔ قطب ابدال تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۵۵) ۴۔ پیران پیر (م ۵۶۱ھ) آپ نے چالیس سال تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کی۔ (خزینۃ الاصفیاء ص ۹۴) ۵۔ معین الدین چشتی اجمیری (م ۶۳۲ھ) حضرت کثیر المجاہدہ تھے۔ ستر برس رات کو نہیں سوئے۔ (تاریخ مشائخ چشت ص ۱۵۵)

۴۔ قرآن خوانی

۱۔ ابو ہبیرہ بصری (م ۲۸۷ھ) آپ روزانہ دو کلام مجید ختم فرمایا کرتے تھے۔ (ایضاً ص ۱۴۷) ۲۔ خواجہ ابو احمد ابدالی چشتی (م ۳۵۵ھ) آپ کی عادت ایک قرآن دن میں اور دو قرآن شب میں ختم کرنے کی تھی (یعنی تین قرآن روزانہ) (ایضاً ص ۱۵۵) ۳۔ ابو یوسف بن سمعان (م ۴۵۹ھ) آپ نے سورۂ فاتحہ سو دفعہ پڑھی قرآن حفظ ہو گیا۔ آپ روزانہ پانچ قرآن ختم کرتے تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ۱۵۰) ۴۔ پیران پیر (م ۵۶۱ھ) آپ پندرہ سال تک نماز عشاء کے بعد طلوع صبح سے پہلے ایک قرآن شریف ختم کرتے تھے اور آپ میں دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر یہ قرآن شریف ختم کئے (خزینۃ الاصفیاء ص ۱۶۴) ۵۔ کشف المحجوب میں علی ہجویری فرماتے ہیں۔ میں نے ابو العباس عطاء سے پوچھا۔ آپ ہر روز کتنا قرآن پڑھ لیتے ہیں تو فرمایا: "اس سے قبل رات دن میں دو مرتبہ قرآن ختم کیا کرتا تھا۔ مگر اب چودہ سال ہو گئے کہ ابھی تک سورۂ انفال تک پہنچا ہوں۔" (ریاض السالکین، ص ۲۰۸) ؎

بہ بین تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا

ہم نے بغرض اختصار صرف چار پانچ مثالیں قرون اولیٰ کے اولیاء اللہ سے پیش کر دی ہیں۔ اب ان کے عمل اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا موازنہ آپ خود فرما لیجئے۔

نکاح مسنون اور اس کی اہمیت

اسلام جن عائلی بنیادوں پر معاشرہ کی تعمیر چاہتا ہے اُن میں نکاح کو بہت اہمیت حاصل ہے حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ — نکاح میری سنت ہے۔ جس نے میری سنت سے منہ موڑا، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "اگر کوئی مستحق نکاح کی قدرت نہیں رکھتا، تو اسے چاہیئے کہ روزے رکھے: تاکہ اُس کی شہوت قابو میں رہے اور وہ حرام کاری کی طرف مائل نہ ہو۔ بس یہی ایک جائز صورت ہے۔ حرام کاری کو قابلِ حد جرم قرار دیا گیا اور اس کے تمام چور دروازے بھی بند کر دیئے گئے۔

نکاح سے گریز

اب دیکھئے صوفیاء کا بیشتر طبقہ نکاح سے گریز کرتا اور اس کو اپنی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا ہے۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ علی ہجویریؒ جیسے بزرگ نے زندگی بھر نکاح نہیں کیا آپ نے اپنی آپ بیتی میں اعتراف فرمایا کہ "ایک مرتبہ کسی کی تیرِ نگاہ سے بسمل ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ بے تاب رہے، لیکن آخر کار فضلِ ایزدی نے زخم کا مرہم پیدا کر دیا۔" (خلاصہ تصوفِ اسلام، ص ۱۰)

اسی طرح خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے زندگی بھر نکاح نہیں کیا اور یہ داستان بھی عجیب ہے۔ صاحب حدیقۃ الاولیاء فرماتے ہیں:

"یہ مہربانی کا کلام سُن کر سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء (اپنے پیر فریدالدین گنج شکر) کی تعظیم کو اٹھے، چونکہ پاجامہ آپ کا اس وقت پھٹا ہوا تھا۔ حضرت (فریدالدین) نے اپنا پاجامہ منگوا کر ارشاد کیا کہ پہن لے۔ سلطان المشائخ نے اپنے پاجامہ کے اوپر اس کو پہن لیا، جب ازار بند باندھنے لگے، تو مارے جلدی کے ازار بند ہاتھ سے چھوٹ کر پاجامہ پاؤں پر گر پڑا۔ حضرت نے فرمایا کہ ازار بند مضبوط کر کے باندھ لے۔ عرض کی کہ "کس قدر مضبوط باندھوں؟" فرمایا: "اس قدر کہ سوائے روزِ قیامت کے نہ کھلے اور اگر کھلے تو حورانِ بہشت پر کھلے۔" عرض کی کہ "بہتر ہے۔" اس روز سے سلطان المشائخ نے ارادۂ نکاح فسخ کیا اور تمام عمر مجرد رہے۔ (حدیقۃ الاولیاء، ص ۴۴)

سو یہ ہے مرید اور مرشد دونوں کی سنتِ رسول ﷺ سے محبت اور اتباع کا نمونہ۔

ایک اور بزرگ شیخ شاہ محمد مشہور بہ مُلا شاہ قادری ہیں جنہوں نے عمر بھر نکاح نہیں کیا۔ فرمایا کرتے تھے۔ "عمر ہم کو غسل جنابت اور احتلام کی حاجت نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ دونوں غسل نکاح اور نیند سے متعلق ہیں اور ہم

نے نہ تو نکاح کیا اور نہ سوئے ہیں۔" (حدیقۃ الاولیاء، ص ۵۷)

پھر صرف یہی نہیں کہ خود نکاح نہیں کرتے بلکہ اس کو بُرا سمجھتے اور اس سے روکتے بھی ہیں:

نکاح ایک عہد و پیمان کا نام ہے

نکاح ایک عقد یا عہد و پیمان ہے۔ نکاح کی مجلس میں میاں بیوی اس عہد و پیمان کو نباہنے کے لئے گواہوں کے سامنے اقرار کرتے ہیں اور اس عہد و پیمان کو بخیر و خوبی نباہنے سے ہی اسلام کے تجویز کردہ عائلی نظام کے مقاصد پورے ہو سکتے ہیں مگر ان بزرگوں میں سے اگر کچھ حضرات نکاح کرتے بھی ہیں، تو اسے ایک کھیل تماشا بنا کے رکھ دیتے ہیں۔ درج ذیل واقعات ملاحظہ فرمائیے:

عبداللہ خفیف کا نکاح اور طلاق

(حضرت عبداللہ خفیف کا ذکر ہو رہا ہے) "نقل ہے کہ ایک بار آپ نے اپنے غلام سے کہا "مجھے نکاح کی حاجت ہے کوئی نیک عورت لاؤ، تاکہ نکاح کروں۔" خادم نے حکم کی تعمیل کی اور آپ نے نکاح کیا۔ آپ کو خدا نے ایک خوب صورت لڑکا عطا کیا۔ کچھ مدت کے بعد لڑکا فوت ہو گیا، آپ نے بیوی سے فرمایا۔ اب چاہو تو طلاق لے لو۔ اگر رہنا چاہو تو مجھے ضرورت نہ ہو گی۔ بیوی نے سبب پوچھا، تو فرمایا، "میں نے خواب دیکھا تھا کہ قیامت قائم ہے۔ بے شمار مخلوق غرقِ گناہ ہے۔ ناگاہ ایک لڑکا آیا اور اس نے ہجوم میں سے اپنے ماں باپ کو پکڑا اور پُل صراط سے گزر کر بہشت میں لے گیا۔ پس میں نے سمجھا کہ اس معصوم کی شفاعت سے اس کے ماں باپ بخشے گئے۔ اس سبب سے میں نے نکاح کیا تھا۔ (مقربانِ حق، ص ۱۹۰)

اب یہ ملاحظہ فرمائیے کہ یہ بزرگ کس جرم میں اس عورت کو طلاق دینے یا اس سے ترکِ تعلق پر آمادہ ہو گئے۔ کیا قرآنی ارشاد وَ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ کا یہی مطلب ہے؟

گویا آپ کو ایک معصوم بیٹے کی شفاعت مطلوب تھی، جب یہ مطلب حاصل ہو گیا، تو رسول اللہ کے اس ارشاد اِنَّ اَبْغَضَ الْحَلَالِ عِنْدَ اللّٰہِ الطَّلَاقُ کی بھی چنداں پروا نہ کی۔

ابو محمد مرتعش کا نکاح اور طلاق

اب ایک دوسرے بزرگ ابو محمد مرتعش کا معاشقہ، نکاح اور پھر اس سے فرار کا قصہ سنیئے:

"نقل ہے کہ آپ بغداد کی کسی گلی میں گزرتے ہوئے دروازے پر کھڑے ہو کر پانی مانگا۔ ایک لڑکی پانی لائی، تو آپ اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد صاحب خانہ آیا اور دریافت کیا

کہ کیوں بیٹھے ہو؟" آپ نے فرمایا: "تیرے گھر سے ایک لڑکی پانی پلا کر میرا دل لے گئی ۔" صاحب خانہ سمجھدار اور نیک آدمی تھا، آپ کو جانتا تھا، کہنے لگا: "وہ میری ہی لڑکی ہے اگر آپ چاہیں؛ تو نکاح کر دوں" فرمایا: "یہ نہایت مہربانی ہوگی ۔" اس نے نوکروں کو حکم دیا کہ آپ کے بوسیدہ کپڑے اتار کر نہلائیں اور اچھی پوشاک پہنائیں پھر قاضی کو بلایا اور نکاح کر دیا، جب آپ دُلہن کے خلوت کدے میں پہنچے، نوادلئے شکر کے طور پر پہلے نماز میں مشغول ہوئے۔ یکایک آپ نے شور مچا دیا کہ "میری گدڑی لاؤ، میری گدڑی لاؤ اور اپنی پوشاک لے لو۔" غرض آپ نے وہ ریشمی لباس اتار پھینکا اور اپنی گدڑی پہن لی اور عورت کو طلاق کہہ کر بھاگ نکلے۔ لوگوں نے پوچھا: "کیا معاملہ ہوا؟" فرمایا: "جب میں نے نماز شروع کی، تو میرے سر میں ندا آئی کہ ایک نظر کے بدلے، جو تو نے ہمارے مخالف پر کی، ہم نے تیرے بدن سے اپنے دوستوں کا ظاہری لباس (گدڑی) اتروالیا۔ یاد رکھ! اگر تو نے دوسری نظر ڈالی، تو تیرے باطن سے بھی اپنی دوستی کا لباس اتار لیں گے۔" پس میں ڈر گیا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔" (مقربانِ حق، ص ۲۰۶)

اب اس بزرگ کے واقعہ سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱ - نکاح ملنگنے کا طریق یہ ہے کہ جو لڑکی اچھی لگے اس کے مکان کے سامنے دھرنا مار کے بیٹھ جاؤ۔

۲ اگر عورت کو بغیر خلوت طلاق کی ضرورت پیش آئے تو اس کو نصف حق مہر جس کی ادائیگی (جس کا قرآن نے حکم دیا ہے) کی ضرورت نہیں۔ شاید نکاح بھی بغیر حق مہر کے تعین کے ہوا ہو۔

۳ بیوی پر نظر ڈالنا بھی غیر اللہ پر نظر ڈالنا ہے جس کی سزا بڑی سخت ملتی ہے۔ یہ ہے ان بزرگوں کی اتباع سنت کا نمونہ اور جو حضور ﷺ نے اتنے نکاح کئے تھے۔ اس کے متعلق کیا ارشاد ہے؟

قطب الدین بختیار کاکی (م ۶۲۶ھ) کے طلاق دینے کی وجہ

آپ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رئیس نامی نے خواب میں ایک عظیم الشان قبہ دیکھا جس کے گرد خلق کا ہجوم تھا اور ایک ٹھگنا شخص بار بار اس قبہ میں آمد و رفت کر رہا ہے اور خلق، جو اپنے پیغام دیتی ہے، قبہ میں جا کر ان کے پیغام پہنچاتا اور جواب لا کر سناتا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس قبہ میں رسول اللہ ﷺ ہیں اور یہ ٹھگنا شخص حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ میں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیجئے کہ میں آپ کے دیدار سے مشرف ہونا چاہتا ہوں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ گئے اور باہر آکر مجھے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں

کہ: "ابھی تجھ میں میرے دیکھنے کی قابلیت نہیں ہوئی۔ البتہ تو بختیار کاکی کے پاس جا کر میرا سلام پہنچا اور کہہ کہ تیرا بھیجا ہوا تحفہ مجھے پہنچتا تھا مگر تین روز سے یہ تحفہ نہیں پہنچا، اس کی کیا وجہ ہے؟" رئیس کہتا ہے جب میں بیدار ہوا، تو بختیار کاکی کے پاس جا کر سلام بھی پہنچایا اور پیغام بھی دیا۔ شیخ قطب الدین نے اسی وقت اپنی بیوی کو جس سے ابھی ابھی نکاح ہوا، طلب کیا اور مقررہ حق مہر اس کے حوالے کر کے طلاق دے دی بعد ازاں فرمایا کہ: "بیشک میں تین راتوں سے تزویج میں مشغول تھا اور یہ تزویج کا شغل رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تحفہ پیش کرنے سے مانع تھا اور وہ تحفہ یہ تھا کہ آپ تین ہزار مرتبہ درود شریف پڑھ کر سویا کرتے تھے۔" (سیر الاولیا، ص ۵۶)

غور فرمایا آپ نے! رسول اللہ ﷺ کو تحفہ بھیجنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ یہی صحیح طریقہ بیوی کو طلاق دینے کے بعد ہی ہاتھ آسکتا ہے۔ پھر صاحب سیر الاولیاء کا کمال یہ ہے کہ اس نے ایسا لاجواب قصہ تراشا کہ اسے تحفہ کے نام پر رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے اس بلا وجہ طلاق کے استحباب کا سامان بھی مہیا کر دیا اور بختیار کاکی کے اس صریح خلافِ سنت اجتہاد کو مستحسن قرار دیا تاہم اس قصہ میں ایک خوبی بھی ہے اور وہ یہ کہ ایسے قصے نکاح و طلاق کے سلسلہ میں ان اولیاء اللہ کے ذہن کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔
البتہ اگر کرامت تراش کر حساب لگا لیتا کہ تین ہزار مرتبہ درود پڑھنے پر کم از کم کتنا وقت لگتا ہے تو یقیناً وہ تعداد کم لکھتا۔

شیخ اکبر کا فلسفہ نکاح

اب ایک بہت جلیل القدر بزرگ محی الدین ابن عربی ہیں، جو ان صوفیاء کے شیخ اکبر ہیں۔ وہ دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ مشاہدہ حق ہوتا ہی اس وقت ہے جب انسان عورت سے جماع کرتا ہے، اپنی عورت سے ہو یا غیر سے۔ وہ اپنی دو سالہ عمر کی بچی سے بھی نکاح کا مسئلہ پوچھ سکتے ہیں اور حلال و حرام کی تمیز سے بے نیاز۔ اس کی تفصیل ہم عشق و مستی، (باب صوفیاء کے مخصوص مسائل) میں ذکر کر آئے ہیں اور ان کے خوشہ چیں عفیف الدین تلمسانی نے ایسا فتوے بھی دے دیا تھا۔

اتباعِ سنّت کن باتوں میں؟

صوفیاء کی ان سب باتوں کے باوجود ہمیں یہ تسلیم کرنے میں باک نہیں کہ ان بزرگ ہستیوں کو بھی بعض دفعہ شریعت کی پاسداری اور اتباعِ سنت کا خیال آ ہی جاتا ہے اب جس طرح کی باتوں کا انہیں خیال آتا ہے وہ بھی چند مثالیں حاضر خدمت ہیں:

۱۔ اویس قرنیؒ کا دانت توڑنا

آپ کے متعلق یہ قصہ زبانِ زد ہے کہ آپ نے اپنے سارے دانت محض اس خیال سے شہید کر ڈالے تھے کہ معلوم نہیں کہ جنگِ اُحد میں رسول اللہ ﷺ کے کون سے دو دانت شہید ہوئے تھے۔ اور یہ خواجہ صاحب کی رسول اللہ ﷺ سے محبت کا تقاضا تھا۔ غور فرمایئے! کیا سارے کے سارے دانت توڑنے سے واقعی اتباعِ سُنت ہو گئی تھی؟

۲۔ بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) اور والدین کا حق

"بچپن میں آپ مکتب میں پڑھتے تھے جب اس آیت پر پہنچے اَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ یعنی شکر کر میرا اور اپنے والدین کا۔" گھر آ کر والدہ سے کہنے لگے کہ میں نے قرآن میں سبق پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "شکر کر میرا اور اپنے والدین کا۔ تو اب میری عرض یہ ہے کہ میں دو گھروں سے تعلق نہیں نباہ سکتا یا تو مجھے آپ خدا سے مانگ لیجئے بالکل آپ ہی کا ہو رہوں یا خدا کو سونپ دیجئے کہ بالکل اسی کا بن جاؤں۔" والدہ نے فرمایا: "میں نے تمہیں اپنا حق بخش دیا۔ یہ سُن کر آپ بسطام سے نکلے اور تیس سال تک شام کے جنگلوں میں ریاضت مجاہدہ کرتے رہے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۸۶)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ اللہ کا شکر اور والدین کا شکر، دونوں احکام کی بجا آوری، اولیاء اللہ کی بساط سے باہر ہے کیونکہ قرآن کے احکام عام لوگوں کے لیے ہیں۔

۲۔ والدہ کی اجازت لے لیں۔ تو والد کا حق از خود ادا ہو جاتا ہے۔

۳۔ اللہ کا شکر جنگلوں میں جا کر ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ معین الدین چشتی اور انگلیوں کا خلال

ایک بار آپ وضو میں انگلیوں کا خلال کرنا بھول گئے تو غیب سے آواز آئی کہ "محبتِ رسول کا دعوٰے اور سنت کا ترک؟" آپ نے فوراً توبہ کی کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۶۷)

آپ جب علی ہجویری کی قبر پر چلہ کشی فرما رہے تھے، تو اس وقت آپ کو سُنتِ رسول یاد نہیں آئی۔ پھر ستر برس تک رات بھر سوئے بھی نہیں۔ اس وقت بھی سنتِ رسول یاد نہ آئی۔ انگلیوں کا خلال شاید ان باتوں سے بڑھ کر ہو۔

۴۔ جلال الدین عمری (م ۹۸۰ھ)

آپ کی مرض الموت میں آپ کو کھانے کی دوا دی گئی۔ صاحبِ فراش تھے۔ خادموں سے فرمایا۔ مجھے پہنچے

بٹھلا دو۔ جب بیٹھ گئے، اس وقت دوا نوش فرمائی اور فرمایا: "نبی اکرم ﷺ سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے تختِ سریر پر بیٹھ کر کوئی چیز کھائی ہو۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۲۱۰)

۵۔ میاں جی نُور محمد (م ۱۲۵۹ھ)

حضرت میاں جی صاحب کا مزار خام ہے۔ البتہ اس کا حلقہ پختہ ہے۔ بعض لوگوں نے چاہا کہ اس کو ایک ہاتھ سے اونچا کر دیں، مگر آپ نے کسی کو خواب میں ارشاد فرمایا: "یہ خلافِ سنت ہے۔ ایسا نہ کرو۔ ایک ہی ہاتھ اونچا رہنے دو۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۲۳۶)

یہ وہی میاں جی صاحب ہیں جنہوں نے فرمایا کہ فقیر نہیں مرتا۔ اس کی قبر سے وہی فائدہ ہوگا، جو ظاہری زندگی میں ہوتا تھا۔ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۲۳۴)

۶۔ بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) کا تقویٰ

ایک روز آپ نے صحرا میں اپنا کپڑا دھویا۔ ایک ارادتمند ساتھ تھا، وہ بولا: ہم اس کو انگوروں کی دیوار پر لٹکا دیتے ہیں۔ فرمایا: "لوگوں کی دیوار میں میخ نہ لگاؤ۔" مُرید نے کہا: "درخت پر لٹکا دیتے ہیں۔" فرمایا: "ایسا نہ کرنا۔ درخت کی شاخیں ٹوٹ جائیں گی۔" عرض کیا: "گھاس پر بچھا دیتے ہیں۔" فرمایا: "ایسا نہ کرنا، گھاس چارپایوں کا چارہ ہے۔ ہم کپڑے سے اس کو نہیں چھپاتے۔" پس آپ کپڑے کو پشتِ مبارک پر رکھ کر دھوپ میں کھڑے ہو گئے۔ جب ایک طرف سوکھ گئی تو دوسری طرف الٹ دی۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۹۲)

دیکھ لیا آپ نے تقویٰ کسے کہتے ہیں۔ اگر بایزید جیسے بزرگ کے علاوہ آپ کے سامنے کوئی اور شخص ہوتا تو آپ ایسے سوال و جواب پر اُسے یقیناً دیوانہ کہتے۔ نہ تو انگوروں کی دیوار میں میخ لگانے کی ضرورت تھی۔ نہ ہی کپڑا ڈالنے سے درخت کی شاخیں ٹوٹتی ہیں اور نہ ہی اس چند فٹ کی جگہ پر کوئی مویشی چرنے آ گئے تھے۔ بہرحال یہ مرید و مرشد کی اسرار و رموز کی مقدس باتیں ہیں۔ ہم اور آپ انہیں کیا جانیں۔ یا پھر یہ تذکرہ نگاروں کی پروازِ تخیل ہے۔

۷۔ خواجہ امیر کلال (م ۷۷۳ھ) کا تقویٰ

خواجہ صاحب نے بھی بالکل اسی طرح کپڑے سکھائے تھے اور ساتھ ہی اس کی وجہ یوں بیان فرمائی کہ اگر باڑ کو نقصان پہنچ جائے یا شاخیں ٹوٹ جائیں یا مویشیوں کی گھاس خراب ہو جائے، تو باغ کے مالک کو کیا جواب دو گے؟ دوسروں کی ملکیت میں تصرّف کرنا خلافِ شرع ہے۔ گناہ صغیرہ کو معمولی اور آسان نہیں سمجھنا چاہیئے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۵۹)

۵۔ جنّت اور دوزخ کا استہزاء

دینِ اسلام کی تیسری نظریاتی بنیاد آخرت میں اپنے اعمال کی جزا و سزا کا عقیدہ ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا (۶/۶۶) — اے ایمان والو! اپنے آپ کو اپنے اہل و عیال کو آتشِ جہنم سے بچاؤ۔

نیز یہ بھی فرمایا:

سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ (۵۷/۲۱) — اپنے پروردگار کی بخشش اور جنت کی طرف لپکو۔

اور حضورِ اکرم ﷺ نے اپنی مکہ کی تیرہ سالہ زندگی اسی جزاء و سزا کے عقیدہ اور جنت اور دوزخ کے اوصاف بیان کرنے میں گزار دی، چنانچہ مکی سورتوں میں جنت اور دوزخ کا یہ تصوّر نمایاں طور پر پایا جاتا ہے اور اس عقیدہ کو کئی انداز سے ذہن نشین کرایا گیا ہے اور حقیقت میں یہی عقیدہ انسان کی عملی زندگی کی جان ہے لیکن ابنِ عربی نے وحدت الوجود کا نظریہ پیش کر کے اس عقیدہ کو بھی بدل ڈالا۔ جب سب چیزیں اللہ کا حصہ اور اس کی عین قرار پائیں، تو پھر بھلا وہ کون سا "الٰہ" ہے، جو اپنے آپ جہنم کے سپرد کرے گا۔ اس نظریہ سے خیر و شر کی کوئی تمیز باقی نہ رہی۔ جزا و سزا اور جنت و دوزخ بے معنی چیزیں بن گئیں۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں کہ:
"اللہ نے مسلمانوں سے اُن کی جانیں اور اموال خرید لیے ہیں اور اس کے عوض انہیں جنت عطا فرمائے گا۔" مگر یہ لوگ جنت کو خاطر میں ہی نہیں لاتے اور یہ نظریہ اتنا عام ہُوا کہ عام لوگ بھی اس کے تاثرات سے نہ بچ سکے۔ کسی شاعر نے اس نظریہ کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے — او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

علو ممشاد دینوری (م ۲۹۸ھ) کی جنت سے بے نیازی

"آپ کے وصال کے وقت ایک بزرگ پاس بیٹھے تھے۔ وہ جنت کے ملنے کی دُعا کرنے لگے۔ حضرت ممشاد نے ہنس کر فرمایا: "تیس سال تک جنت اپنی ساری دلکشیوں سمیت میرے سامنے آتی رہی، مگر میں نے ایک مرتبہ بھی اُن کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھا۔ مَیں تو جنت کے مالک کا مشتاق ہُوں۔"

(تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۱)

اب دیکھئے! معراجِ نبوی کے دوران جنت آپ کو بھی دکھائی گئی تھی۔ پھر کیا آپ نے ایسی بے اعتنائی فرمائی تھی جیسا کہ ممشاد صاحب فرما رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو وفات کے وقت یُوں فرمائیں کہ "اگر مَیں

برابر سراسر جھوٹ جاؤں تو غنیمت ہے۔" لیکن آپ پر تیس سال سے جنت اپنی پوری رعنائیوں سے پیش ہوتی رہی، لیکن آپ اسے خاطر میں ہی نہیں لاتے۔

دوزخ مقامِ لذّت ہے

اب جنت اور دوزخ کی حقیقت اور اس کا فلسفہ مشہور متصوف عبدالکریم جیلی، جو ابنِ عربی کی کتاب فصوص الحکم کے شارح ہیں، کی زبان سے سنیئے، فرماتے ہیں:

"اور مَیں (یعنی عبدالکریم جیلی مصنف انسانِ کامل) ایک مرتبہ افلاطون سے (کشف میں) ملا۔ جس کو اہلِ ظاہر (یعنی علمائے دین) کافر کہتے ہیں۔ مَیں نے ایسی حالت میں اس کو پایا کہ عالمِ غیبی نُور اور بہجت (رونق) سے بھر گیا تھا۔ اور اس کا ایسا مرتبہ مَیں نے دیکھا کہ بعض کے سوا کسی ولی کو بھی یہ رتبہ نصیب نہیں ہُوا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ تُو کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مَیں قطبِ زمان اور اپنے وقت کا یکتا (یعنی فرد) ہُوں ہم نے اس قسم کے تمہارے لئے بہت سے عجائب و غرائب دیکھے ہیں۔ جن کا ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس باب میں ہم نے تیرے لئے رمز کے طور پر بہت سے اسرار رکھے ہیں۔ جس میں لسانِ رمز کے سوا کلام کرنے کی ہم کو گنجائش نہیں ہے۔ پس میرے کلام کے پوست کو پھینک دے اور اگر تو عقلمند ہے تو مغز کو لے لے۔ ان اوراق میں مَیں نے وہ علوم جمع کئے ہیں کہ دوزخیوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے کسی دوسری شے کی احتیاج باقی نہیں رہتی۔" (انسان کامل، ص ۳۰۶)

پھر جو کچھ افلاطون نے مصنف کتاب انسانِ کامل عبدالکریم جیلی کو بطورِ رمز بتلایا، اس کا خلاصہ آپ نے ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے:

"دوزخیوں کو دوزخ میں لذت ہوگی۔ جیسے اس شخص کو لڑائی بھڑائی میں لذت آتی ہے، جو اس کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ ہم نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ لڑائی بھڑائی میں لذت پاتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہوتے ہیں کہ وہ اس میں تکلیف پا رہے ہیں، لیکن وہ ربوبیت جو اُن کے نفس میں پوشیدہ ہے۔ ان امور میں خوض کرنے پر اُن کو آمادہ کرتی ہے۔ پھر اُن کے لئے ایک اور بھی لذت ہے، جو خارش والوں کی لذت کے مشابہ ہے کہ اگرچہ کھجلا کھجلا کر اُن کا بدن کٹ جاتا ہے اور چھل جاتا ہے، مگر وہ اس کے کھجلانے میں لذت پاتا ہے، اور وہ عذاب و لذت کے مابین ہوتا ہے...... پھر اُن کے لئے ایک مختلف لذت ہے۔ حتّٰی کہ میرا ایک جماعت سے (کشف میں) ملنے کا اتفاق ہُوا، جو دوزخ کے سخت ترین عذاب میں تھے۔ اس حالت میں مَیں نے

اُن کو دیکھا کہ جنت اُن پر پیش کی جاتی تھی اور وہ اسے اچھا نہیں جانتے تھے ... پھر جاننا چاہیئے کہ دوزخیوں میں ایسے آدمی بھی ہیں جو اللہ کے نزدیک بہت سے جنتیوں کی نسبت اچھے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ان کو دارالشقاوۃ میں داخل کیا ہے تاکہ اس میں ان پر تجلی کرے اور اشقیاء میں سے وہ شخص اس (یعنی خدا) کی نظر کا محل ہو اور یہ ایک عجیب و غریب امر و راز ہے یَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيدُ" (انسانِ کامل، ص ۳۰۰)

پھر اپنے فلسفہ کی تائید میں قرآن کریم کی آیت وَمَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ سے ثبوت یُوں پیش فرماتے ہیں:

"کیا تو اس بات کی طرف خیال نہیں کرتا کہ جب تک وہ (آدم علیہ السلام) جنت میں تھے۔ جس چیز کا اپنے جی میں تصور کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ اُن کی حس میں اس کو پیدا کر دیتا تھا اور جو جنت میں داخل ہو گا۔ اس کے لئے بھی یہی ہو گا۔ اور جب عالمِ دنیوی میں وہ (آدم علیہ السلام) نازل ہوئے تو یہ بات ان کے لئے نہ رہی۔ اس لئے کہ ان کی حیات مصورہ یعنی وہ زندگی کہ جس چیز کا وہ تصور کرتے تھے وہ موجود ہو جایا کرتی تھی۔ جنت میں بالذات تھی۔ اور اس دنیوی زندگی میں رُوح سے تھی کہ وہ اہلِ دنیا کے لئے مُردہ کا حکم رکھتی ہے مگر اس شخص کی رُوح جس کو حیاتِ ابدیہ سے خدا تعالیٰ نے زندہ فرمایا اور اسے اس نظر سے دیکھا جس نظر سے اپنی ذات کو دیکھا۔ اور اپنے اسماء وصفات سے اسے مستحق کیا۔ پس ایسے شخص کو (یعنی اس گروہِ صوفیاء میں سے اکثر کو۔ مؤلف) دنیا میں قدرت حاصل ہوتی ہے، جو اہلِ جنت کو دارالآخرت میں حاصل ہو گی۔ وہ جس کا تصور اپنے جی میں کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ اس کی حس میں اس کو پیدا کر دیتا ہے۔" (انسان کامل، ص ۳۱۴)

یہ تو خیر ان لوگوں کا دوزخ کو لذت کا مقام ثابت کرنے کا فلسفہ تھا۔ اب جس طرح ان لوگوں نے مذاق اڑایا ہے یہ داستان بھی ملاحظہ فرمایئے۔ خواجہ حسن دہلوی راوی ہیں:

معروف کرخی کا جنت میں جانے سے انکار

"اسی اثنا میں اولیائے حق اور ان کے کمالِ محبت کا ذکر چلا۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا: کل قیامت کے دن حشر کے میدان میں معروف کرخی کو لایا جائے گا اور وہ یُوں نظر آئیں گے جیسے کوئی حد سے زیادہ مست ہو۔ خلقت انہیں دیکھ کر حیران ہو جائے گی اور پوچھے گی، "یہ کون ہیں؟" پھر وہ یہ آواز سُنے گی کہ یہ ہماری محبت میں مست ہے۔ اسے معروف کرخی کہتے ہیں۔ اس وقت معروف کرخی کو حکم ہو گا کہ بہشت میں چلو۔ وہ کہیں گے "مَیں نہیں جاتا۔ مَیں نے تیری بہشت کیلئے عبادت نہیں کی۔" بعد ازاں فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ انہیں نُور کی زنجیروں میں جکڑ کر کھینچتے کھینچتے بہشت میں لے جاؤ۔" (فوائد الفواد۔ ملفوظات حضرت

خواجہ نظام الدین اولیاء ، مرتبہ حسن دہلوی ، ترجمہ : پروفیسر محمد سرور ، ص ۲۵۲ ، طابع : علماء اکیڈیمی ، پنجاب بیلاہور)

اب ذرا حشر کے میدان کی دہشت ذہن میں لائیے۔ جس دن حضور اکرم ﷺ کے سوا سب نفسی نفسی پکارتے ہوں گے۔ اور حضور اکرم ﷺ اپنے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ " میں اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو سکوں گا، جب تک کہ مجھے اللہ کی رحمت نہ ڈھانپ لے۔" لیکن یہ بزرگ اس دہشت سے بالکل مامون اور مست ہوں گے اور جب خدا ان سے حساب کتاب لئے بغیر بہشت میں جانے کا آرڈر دے گا، تو یہ اٹھکیلیاں کریں گے، لیکن خدا کو انہیں جنت میں بھیجنے کی اتنی ضرورت ہوگی کہ دوبارہ فرشتوں کو حکم دے گا کہ "اسے "نور کی زنجیروں" سے جکڑ کر کھینچتے کھینچتے بہشت میں لے جاؤ۔ یہ نور کی زنجیریں جیسا کہ اللہ کے اپنے نور کی ہوں گی۔ آخر یہ بزرگ واصل باللہ جو تھے۔ اور ان کی بزرگی کی شان یوں نمایاں کی جائے گی۔ پہلے ایک آواز آئے گی : " یہ کون ہیں ؟ " پھر دوسری آواز جواب دے کر ان کا تعارف کرائے گی۔

جنت کے خیال سے عبادت بھی جرم ہے

ابو بکر کلاباذی اپنی کتاب التعرف لمذہب اہل التصوف کے ص ۱۵۵ پر ایک واقعہ درج کرتے ہیں۔ (یہ واقعہ بہت سی کتابوں میں مذکور ہے)

" کچھ لوگ رابعہ بصری کی خدمت میں بیمار پرسی کے لئے حاضر ہوئے۔ پوچھا کیا حال ہے۔ رابعہ بصری نے جواب دیا : " واللہ ! مجھے اپنی بیماری کا کوئی سبب نظر نہیں آتا۔ سوا اس کے کہ مجھ پر جنت پیش کی گئی اور میرا دل اس طرف مائل ہو گیا۔ اس پر میرے آقا نے مجھ پر عتاب کیا ہے۔"

غور فرمائیے ! اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ " اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور اموال جنت کے بدلے خرید لیئے ہیں" اور یہ لوگ جنت کے تصور اور اس کی طرف میلان کو جرم قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جنت اور اس کی نعمتوں کو نزلا من غفور رحیم فرمائیں اور یہ لوگ اللہ کی اس مہمان نوازی کا یوں تمسخر اڑائیں۔ فیا للعجب

انہی رابعہ بصری نے ایک بار فرمایا ، " اگر میں تیری عبادت بہشت کی چاہت میں کروں، تو مجھے اس سے محروم رکھنا اور اگر تیرے دوزخ کے ڈر سے کروں، تو مجھے اس میں جلانا اور اگر تیری عبادت صرف تیری محبت میں کروں، تو مجھے اپنے جمال بے مثال سے محروم نہ رکھنا۔ سبحان اللہ !" (مقربان حق ، ص ۵۱)

یہ ہے ارشاد خداوندی وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا (۷/۵۶) صحیح تاویل و تعبیر۔

بایزید بسطامی کا ایک آہ سرد سے جہنم کو ٹھنڈا کر دینا

خواجہ معین الدین اجمیری کی زبان سے سنیئے :

" ایک بار خواجہ بایزید بسطامی مقام قرب میں تشریف لے گئے۔ ہاتف نے آواز دی اے بایزید ! تمہاری خواستگاری اور ہماری بخشش و عطا کا وقت ہے مانگو

کیا مانگتے ہو، میں تم کو دوں گا۔ خواجہ نے سجدہ میں سر جھکایا اور کہا: "بندہ کو خواستگاری سے کیا کام؟ بادشاہ کی بخشش اور انعام واکرام جس قدر ہو جائیں بندہ اس میں راضی ہے۔" پھر آواز آئی "ہم نے تجھ کو آخرت کی خوبی اور دستگاری عطا کی۔" بایزید نے عرض کیا: کہ الہی! آخرت تو دوستوں کا بندی خانہ ہے۔" پھر آواز آئی: "اچھا ہم نے بہشت اور دوزخ اور عرش اور کرسی، جو کچھ ہماری مملکت ہے تم کو دی۔" عرض کیا، "نہیں!" پھر ندا آئی: "اچھا تمہارا کیا مطلب ہے؟ کچھ مانگو تو دیں۔" عرض کیا: "الہی! جو میرا مطلب ہے وہ تو خود جانتا ہے۔" آواز آئی: "اے بایزید! تو ہم کو ہم سے مانگتا ہے۔ اگر ہم تجھ کو تجھ سے مانگیں، تو تو کیا کرے گا؟ جیسے ہی یہ آواز آئی، خواجہ نے قسم کھا کر عرض کیا کہ "قسم ہے تیرے عزت و جلال کی۔ اگر تو مجھ کو کل قیامت میں طلب کرے گا اور آتشِ دوزخ کے سامنے کھڑا کرے گا تو حاضر ہوں گا اور کھڑا ہو کر ایسی سرد آہ کھینچوں گا کہ دوزخ کی حرارت زائل ہو جائے گی حتیٰ کہ کچھ نہ رہے گی۔ کیونکہ آتشِ محبت کے سامنے اس کی کیا اصل ہے۔ جب بایزید نے یہ فرمایا ندا آئی کہ "اے یزید! ہم جو چاہتی یا فتی" (یعنی جس چیز کی تجھ کو تلاش تھی پالی)

اس اقتباس سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ جس طرح حضورِ اکرم ﷺ کو معراج کے دن قربِ الٰہی حاصل ہوا تھا۔ اولیاء کے لئے ایسے بے شمار مواقع آتے رہتے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ کو تو خود اللہ تعالیٰ لے گیا تھا، لیکن یہ خود پہنچ جاتے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ کی گفتگو عبد اور معبود کے درمیان تھی، لیکن یہاں گفتگو اس انداز سے ہو رہی ہے جیسے

خدا کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں

جو خدا کی ساری مملکت لے کر بھی راضی نہیں ہوتے۔

۲۔ اللہ نے جو اتنی مدت سے جہنم تیار کر رکھا ہے وہ بس اُن کی ایک آہِ سرد کی مار ہے۔ بھلا اس آتشِ جہنم کو آتشِ محبت سے کیا نسبت؟ اگر خدا اس آگ میں پھینک بھی دے تو وہ ان کا کیا بگاڑ لے گی۔

۳۔ آخر خدا نے مجبوراً انہیں واصل باللہ (اپنے ساتھ ملانے کی) خواہش پوری کر دی۔ اس کے بغیر چارہ بھی کیا تھا۔

یہ تو تھا ان بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کا جنت اور دوزخ سے متعلق تصور۔ رہی انسان کے اعمال کی جزا و سزا اور حساب کتاب کی بات، تو اس کو جس طرح ان اولیاء اللہ نے اپنے مریدوں سے وعدے کر کے نجاتِ اُخروی کی ضمانت دے رکھی ہے وہ ہم اولیاء اللہ کے تصرف میں بیان کر چکے ہیں۔

۶۔ ارکانِ اسلام کا استہزاء

دینِ اسلام کا سب سے اہم اور بنیادی عقیدہ توحید اور پھر اس کے بعد جزا و سزا کا عقیدہ ہے۔ دینِ طریقت نے جب بنیادی عقائد پر ہی ہاتھ صاف کیا تو ارکان و اعمال پر اس کا اثر مرتب ہونا لازمی تھا۔ بہت سے پیر ایسے تھے اور ہیں جن کے ہاں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور علی الاعلان یکواس کہتے، لوگوں کو گالیاں دیتے، فحاشی اور بعض کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ وہی جنت و دوزخ سے متعلق ان کا تصور ہے، جو وحدت الوجود کے عقیدہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ اب مشکل یہ آن پڑی کہ عام مسلمان، جاہل ہونے کے باوجود، قرآن، حضور اکرم ﷺ اور سنت سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ اس اس مشکل سے نجات حاصل کرنے کے لئے شریعت، طریقت اور معرفت و حقیقت کا عقیدہ تراشا گیا۔ شرعی اصطلاحات کے "باطنی معنیٰ" تراشے گئے۔ مثلاً عشق و محبت، "ایمان" کے مترادف قرار پایا۔ گویا جس مذہب کے لوگ بھی اس طریقت کے راستے پر گامزن اور عشق و محبت خدا کا دعوے کرتے ہیں۔ سب "مومن" ٹھہرے اسی طرح "دین کے معنیٰ" "تفرقہ کے مقام سے توحید کے مقام میں آنا"۔ یہاں تفرقہ سے مراد کائنات کا ہر چیز کو الگ الگ سمجھنا ہے اور یہ سلوک کی پہلی منزل ہے اور توحید (وحدت الوجود) جو ان کی پانچویں منزل ہے اس مقام پر پہنچ کر آدمی دیندار ہوتا ہے۔ اسی طرح "نماز کے معنیٰ، دل کا خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے۔" یہی وجہ ہے کہ اکثر یہ بزرگ اپنے آپ کو نماز وغیرہ کا مکلف قرار نہیں دیتے۔ ان کا دل، جو خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو گویا ہر وقت وہ نماز ہی ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ "حج اور زکوٰۃ کے معنیٰ برائیوں کو ترک کر کے نیکیوں کو اختیار کرنا اور کعبہ کے معنیٰ مقامِ وصل" ہے۔ (مرشدِ کامل ترجمہ حدائق الاخیار، مصنفہ صادق فرخانی، ص ۲۴۰)

گویا اللہ تعالےٰ کے احکام، اسلام کے ارکان اور شعائر اللہ کا استہزاء و استخفاف ان کا شعار ٹھہرا۔ یہ لوگ نمازِ پنجگانہ کی تحقیر کرتے اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے شیخ کی دعا اس سے افضل و اعلیٰ ہے اور یہ عقیدہ شیعوں کے علاوہ سنیوں میں بھی موجود ہے۔ ان کا ایک گیت ملاحظہ ہو:

تَعَالُوا نُخَرِّبُ الْجَامِعَ وَنَجْعَلُ فِيهِ خَمَّارَهْ	آؤ ہم لوگ مسجد کو ویران کریں اور اس میں شراب کی دکان قائم کریں
وَنُكَسِّرُ الْمِنْبَرَ وَنَجْعَلُ مِنْهُ طَنْبَارَهْ	اور منبر کو توڑ کر اس سے ساز و مزامیر بنائیں
وَنُخَرِّقُ الْمُصْحَفَ وَنَجْعَلُ مِنْهُ زَمَّارَهْ	اور قرآن کو پھاڑ کر اس کی بانسری بنائیں
وَنَنْتِفُ لِحْيَةَ الْقَاضِي وَنَجْعَلُ مِنْهُ أَوْتَارَهْ	اور قاضی کی داڑھی اکھاڑ کر اس کے تانت بنائیں۔

(تاریخ دعوت و عزیمت، ص ۱۹۳ از ابوالحسن علی ندوی)

حج بیت اللہ شریف

ان لوگوں کی تحقیر و تضحیک کا سب سے بڑا ہدف حج اور کعبہ ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ان کے آئمہ و شیوخ کی زیارت حج بیت اللہ سے افضل ہے یہی وجہ ہے کہ جو مناسک بیت اللہ شریف سے مخصوص ہیں مثلاً اس کے سامنے سجدہ ریز ہونا، اس کو چومنا۔۔۔

۔۔۔۔ اس پر غلاف چڑھانا، غلاف پکڑ کر دعا کرنا۔ اس گھر کا طواف کرنا اور سعی وغیرہ، غرض یہ سب شعائر یہ لوگ اپنے بزرگوں کی قبروں پر بجا لاتے ہیں۔ حج کی طرح سال میں ایک بار سالانہ عرس کا دن مقرر کر کے اس کو حج کے مثل یا اس سے بہتر قرار دیتے ہیں۔ یہ "بزرگ" کعبہ کے متعلق عجب عجب خرافات بکتے ہیں، سب سے پہلے منصور حلاج نے یہ فتوٰی دیا کہ اگر کسی کا حج فوت ہو جائے، تو اپنے ہاں کعبہ بنا کر اس کا طواف کر سکتا ہے اور اس پر جتنی رقم خرچ ہو سکتی ہے، وہ صدقہ دے سکتا ہے۔ (مجموعۃ الرسائل الکبریٰ، امام ابن تیمیہؒ، ج ۲، ص ۹۷)

ابن عربی نے اپنا ایک واقعہ لکھا ہے کہ کعبہ اپنی بنیادوں سے اٹھ کر مجھ پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔ اس جرم میں کہ میں عارفین کے مقابلہ میں اس کی تحقیر کرتا ہوں۔ پھر میں نے اس کی تعریف شروع کی، تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ (یہ واقعہ تفصیل سے ہم پہلے درج کر آئے ہیں) ابن عربی بھی یہ فتوٰی دیتا تھا کہ حج پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ اس حج پر جتنا خرچ متوقع ہو صدقہ کر دینا چاہیئے۔ جبکہ اللہ تعالٰی فرماتے ہیں: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا یعنی اللہ کا لوگوں پر یہ حق ہے کہ وہ اس کے گھر کا حج کریں، جو کوئی استطاعت رکھتا ہو۔ لیکن یہ بزرگ اس اللہ کے حق اور رکن اسلام کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔

آپ نے ملاحظہ کیا ہو گا کہ بہت سے پیر لوگ حج کرنے نہیں جاتے۔ اس کی تہہ میں یہی فلسفہ کارفرما ہے کہ جس طرح کعبہ انوار الٰہی کا جائے نزول یا مہبط ہے۔ اسی طرح عارفین کا دل بھی انوار الٰہی کا مہبط یا جائے نزول ہے چنانچہ ان میں یہ مقولہ بھی بہت مشہور ہے:

دل بدست آور کہ حج اکبر است

اور اس کی اصل وجہ وہی ہے جو ان کے اکابر حلاج اور ابن عربی نے پیش کی ہے کہ ان عارفین کو کعبہ کا حج کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ کعبہ کو خود آ کر ان عارفین کا طواف کرنا چاہیئے۔ چنانچہ درج ذیل واقعہ خواجہ معین الدین چشتی سے منسوب ہے۔ آپ بایزید بسطامی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

"پھر خواجہ بایزید نے اسی مقام پر فرمایا کہ "میں مدتوں خانہ کعبہ کا طواف کرتا رہا۔ جب مجھ کو قرب حضوری عطا کی گئی اس وقت خود خانہ کعبہ نے میرے گرد طواف کیا۔" (ترجمہ دلیل العارفین، ملفوظات معین الدین چشتی، مرتبہ بختیار کاکی، ص ۹۹)

خانہ کعبہ کا رابعہ بصریہ کے طواف کو جانا

مزید براں کہ خانہ کعبہ خود بزرگوں کے گرد طواف کرنے کے لیئے چلا جاتا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی لکھتے ہیں کہ خواجہ عثمان ہارونی نے فرمایا کہ: "حتیٰ کہ (ابراہیم بن ادہم) چودہ برس کی مدت میں بلخ سے خانہ کعبہ تک پہنچے، تو اس مقام پر خانہ کعبہ کو نہ پایا۔ نہایت متحیر ہوئے۔ اس حال میں ہاتف غیبی نے آواز دی کہ: "اے ابراہیم! ٹھہرو اور صبر کرو۔ خانہ کعبہ ایک ضعیفہ کی زیارت کو گیا ہے۔ ابھی آیا چاہتا ہے۔ خواجہ یہ آواز سن کر متحیر ہوئے اور عرض کیا کہ "الٰہی! وہ ضعیفہ کون ہیں؟" حکم ہوا کہ جنگل میں ایک ضعیفہ ہیں۔ خواجہ علیہ الرحمتہ روانہ ہوئے۔ تاکہ ضعیفہ کی زیارت سے مشرف ہوں۔ جب جنگل میں پہنچے تو حضرت رابعہ بصری کو دیکھا اور دیکھا کہ خانہ کعبہ ان کے گرد طواف کر رہا ہے۔" (انیس الارواح، ص ۱۷، ملفوظات خواجہ عثمان ہارونی، مرتبہ: خواجہ معین الدین چشتی)

سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم بن اُدھم کا زمانہ دوسری صدی ہجری ہے۔ جبکہ بے شمار مسلمان شب و روز خانہ کعبہ کے طواف میں مشغول رہتے تھے۔ اتنا اہم تاریخی واقعہ کسی نے کیوں ذکر نہ کیا۔ پھر حضرت رابعہ بصری پر ہی کیا موقوف ہے۔ دوسرے اس پایہ کے بزرگوں کے پاس بھی جاتا ہوگا، تو اس طرح خانہ کعبہ کی غیر حاضری بہت پریشان کن بات ہے اور اس سے بھی حیرانگی کی بات یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سمیت مکہ سے صرف چھ میل کے فاصلہ پر تھے اور طواف کعبہ کی غرض سے تشریف لائے جنہیں روک دیا گیا۔ کعبہ سے اس وقت تو یہ نہ ہو سکا کہ وہاں چلا جائے کعبہ بیت اللہ کا طواف نہ کرنا تھا چلا تو جاتا۔ تاکہ صحابہ ہی اس کا طواف کر لیتے۔ کیا ان میں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سمیت کوئی بھی ان بزرگوں کے پائے کا نہ تھا۔ پھر پھر ابراہیم بن ادھم بھی بڑے پائے کے بزرگ ہیں۔ معلوم نہیں انہیں کشف کے ذریعہ یہ کیوں نہ علم ہو سکا کہ کعبہ تو وہاں موجود ہی نہ ہوگا لہٰذا سیدھے رابعہ بصری کے پاس ہی چلے جاتے۔

پھر خانہ کعبہ کا ایسا طواف صرف رابعہ بصریہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں اور بھی کئی ایسے اولیاء اللہ ہیں جن کے گرد خانہ کعبہ خود وہاں پہنچ کر طواف کرتا رہا ہے۔ مثلاً درج ذیل واقعات ملاحظہ ہوں:

خانہ کعبہ کا معین الدین چشتی کے گرد طواف کرنا

آپ فرمایا کرتے تھے کہ حاجی لوگ قالب اور جسم سے خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں لیکن عارف لوگ دل سے عرش و حجاز کے گرد گھومتے ہیں اور لقاء الٰہی چاہتے ہیں۔ آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے ایک مدت تک خانہ کعبہ کا طواف کیا لیکن اب خانہ خدا خود میرا طواف کرتا ہے۔" (سیر الاولیاء، ص ۵۲)

خانہ کعبہ کا خواجہ مودود چشتی (م ۵۲۷ھ) کے ہاں جانا

"منقول ہے کہ جب خواجہ مودود چشتی کو خانہ کعبہ کی زیارت کا اشتیاق غالب ہوتا تو فرشتے خانہ کعبہ کو خدا کے حکم سے خواجہ کے سامنے لا رکھتے۔ خواجہ نہایت ذوق و شوق سے طواف کرتے۔ جب آپ طواف و نماز سے فراغت پا لیتے تو فرشتے خانہ کعبہ کو اٹھا لے جاتے۔" (سیر الاولیاء ص۴۲)

بشر حافی کا نظریہ حج

اب حج کے متعلق بشر حافی کے خیالات ملاحظہ فرمالیجئے۔ یہ بالکل ابن عربی کے خیالات یا فتوے سے ملتے جلتے ہیں:

"نقل ہے کہ ایک شخص نے کہا: "میرے پاس ہزار درہم ہیں، مَیں چاہتا ہوں کہ حج کو جاؤں۔" آپ نے فرمایا: "تُو حج کو نہیں جاتا، سیر و تفریح کو جاتا ہے۔ اگر حج سے خدا کی رضامندی چاہتا ہے، تو یہ درہم کسی آزردہ دِل حاجت مند کو دے یا کسی عیالدار شکستہ دل کو دے تا کہ اس کا دل خوش ہو اور فکرِ عیال سے آرام پائے یا کسی قرضدار کا قرض ادا کر، تاکہ وہ غمِ قرض سے خلاصی حاصل کرے۔ اس کے علاوہ بہت سے مسکین، یتیم اور بیوائیں تیرے ان درہموں کے حاجت مند ہیں۔ ان کی خبرگیری اور بھلائی میں صرف کر۔ کیونکہ تیرے اس ایک حج سے ہزار گنا بڑھ کر اس کا درجہ ہوگا۔" (مقربانِ حق، ص ۱۰۴)

دیکھئے فریضہ حج کی کس خوبصورت انداز میں نفی کی جا رہی ہے اگر یہی اندازِ فکر ہو تو حاجی کبھی حج پر نہیں جا سکتا، کیونکہ حاجت مند تو ہر وقت دنیا میں موجود رہتے ہیں۔ یہ ہے اس "اللہ کے لوگوں پر حق" کی توہین جس کے متعلق حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر استطاعت کے باوجود کسی نے حج نہیں کیا، تو اللہ کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔

عبداللہ بن مبارکؒ کا نظریہ حج

نقل ہے کہ آپ ایک سال حج کو گئے۔ ادائے حج کے بعد تھوڑی دیر سو گئے۔ خواب میں دیکھا کہ دو فرشتے اترے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا: اس سال کتنے لوگوں نے حج کیا؟ دوسرے نے جواب دیا: چھ لاکھ آدمی حج میں آئے پہلے تو کسی کا بھی حج قبول نہ ہوا، لیکن پھر حق تعالیٰ نے علی بن موفق نام کفش دوز کے طفیل جو دمشق میں رہتا ہے اور خود حج میں شامل نہیں ہوسکا، سب کا حج قبول کیا ہے۔[۱]

"آپ تحقیق کے لئے دمشق روانہ ہوئے اور علی بن موفق کو مل کر صورتِ حال دریافت کی، تو اس نے کہا: "مَیں تیس سال سے حج کی آرزو کرتا رہا ہوں اور جوتیوں کو پیوند لگا کر زادِ راہ جمع کرتا رہا۔ اس سال تین سو درہم

[۱] واقعہ کی صحت کی ذمہ داری تذکرہ نگار پر ہے

ہو گئے، تو مَیں حج کے لئے تیار ہُوا۔ میری بیوی حاملہ تھی۔ ایک رات اس نے مجھ سے کہا: "ہمسایہ کے گھر سے سالن کی خوشبو آرہی ہے۔ تھوڑا سا مانگ لاؤ۔" مَیں ہمسائے کے گھر گیا، تو اس نے کہا: "بھائی! دینے میں تو کچھ عذر نہیں، لیکن نہ مانگو تو اچھا ہے۔" مَیں نے وجہ پوچھی، تو اس نے کہا، کئی دنوں سے بچے بھوکے مر رہے تھے۔ آج جنگل میں جاکر مردار کا گوشت لایا ہوں اور وہی پکایا ہے۔" یہ سن کر میرے دل میں اک آگ سی لگی۔ اسی وقت گھر گیا۔ وہ تین سو درہم اس کو دے دیئے اور کہا یہ لو اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو۔ مَیں اسی کو حج سمجھوں گا۔ بس میرا یہ عمل ہوا۔" آپ نے فرمایا: "تو نے سچ کہا۔" (مقربانِ حق، ص ۱۹۶)

ملاحظہ فرمایئے! کہ چھ لاکھ آدمیوں کے بیکلے ہوئے حج صرف اس کفش دوز کے اس نیک عمل کی وجہ سے قبول ہو رہے ہیں جن میں عبداللہ بن مبارک کا اپنا حج بھی شامل ہے۔ جذبہ رحم و ہمدردی کے پردہ میں کس طرح فریضہ حج سے انکار اور اس کی توہین کی جا رہی ہے۔ چھ لاکھ حج اور ان کی مقبولیت اور ثواب کو اس موچی کے صدقہ سے کمتر قرار دیا جا رہا ہے۔ کیا لاجواب افسانہ گھڑا ہے کسی ولی اللہ نے۔

لیکن بات حج بیت اللہ کی توہین تک محدود نہیں۔ اس کے آگے یُوں چلتی ہے کہ مزارات کی زیارت کی اہمیت، بیت اللہ کی زیارت سے بہت زیادہ ہے اور وہ سب اعمال و افعال، جو وہاں جاکر کئے جاتے ہیں ان مزاروں اور مقبروں پر بجا لانے کی بھی فضیلت اس سے کسی صورت کم نہیں جس کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔

عارفوں کی نماز

اب دیکھئے "عارف" لوگوں کو نماز میں کعبہ کی طرف منہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں:

"شیخ جلال الدین تبریزی بدایوں آئے اور قاضی شہر کے مکان پر ملنے گئے۔ خادموں نے کہا نماز میں مشغول ہیں۔ شیخ نے تبسم کے ساتھ فرمایا: "قاضی صاحب نماز پڑھنا جانتے بھی ہیں؟" دوسرے دن قاضی صاحب شیخ کو ملنے آئے اور کہا: "یہ آپ نے کیسے کہہ دیا تھا کہ قاضی صاحب نماز پڑھنا جانتے بھی ہیں؟" شیخ نے کہا: "عالموں کی نماز دوسری ہوتی ہے اور فقیروں کی دوسری۔" قاضی صاحب بولے: "کیا فقیر کوئی اور قرآن پڑھتے ہیں؟ یا رکوع سجود کسی نئے طریقہ پر کرتے ہیں؟" شیخ نے فرمایا: "عالموں کی نماز بس اسی قدر ہے کہ کعبہ کی طرف نظر کریں یا اگر دُور ہیں، تو جہت کعبہ کو۔ لیکن درویشوں کی نماز یُوں نہیں ہوتی وہ جب تک عرشِ الٰہی پر نظر نہیں جما لیتے نماز شروع نہیں کرتے۔" (تصوفِ اسلام، ص ۱۲۰، عبدالماجد دریابادی، بحوالہ فوائد الفواد، ص ۲۳۷ تا ۲۳۹)

دیکھا آپ نے تبریزی صاحب نے کیا دو ٹوک فیصلہ فرما دیا کہ عارفین شریعتِ اسلامیہ کے احکام کے قوانین کے پابند نہیں ہوتے۔ ان کا مذہب جداگانہ ہے اور یہی کچھ ہم کہتے ہیں۔

اشرف علی تھانویؒ کا اعترافِ حقیقت اور مساعی

تو یہ ہیں وہ شرعی بنیادیں جن کے ذریعے طریقت کو شریعت کا ہمنوا یا تابع قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود بھی طریقت ہمیشہ علمائے دین کی نظروں میں کھٹکتی ہی رہی ہے۔ چنانچہ تجدید تصوف و سلوک کے مصنف اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے مُرید خاص عبدالباری سابق استاد فلسفہ و دینیات اس مغایرت کا اظہار ان الفاظ میں کر رہے ہیں:

" پھر یہی اہلِ دنیا ہی نہیں بلکہ ان سے بڑھ کر اکابرین دین تک کو تصوف کے غیر دین یا طریقت کے خلاف شریعت ہونے اور اس کی بدولت اس سے انکار و توحش کا بہت بڑا منشا یہ ہوتا ہے کہ حضراتِ صوفیائے کے بہت سے حقائق و معارف، افکار و اشغال، مجاہدات و مراقبات، احوال و کیفیات، توجہ و تصرفات، کشف و کرامات، ترکِ لذت و تعلقات، بیعت و نسبت اور رسوم و عبادات وغیرہ کی خاص خاص صورتوں کا ان حضرات کو کتاب و سنت کی عام و منصوص تعلیمات میں بظاہر نام و نشان نہیں ملتا اور مغالطہ یہ ہو گیا ہے کہ تصوف و طریقت کی اصل و حقیقت یہی " بدعات " ہیں۔" (تجدید تصوف و سلوک، ص ۳۵)

چنانچہ اشرف علی تھانویؒ نے تصوف و سلوک کو شریعت سے ہم نوا بنانے اور اس کی تجدید کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ آپ کے فیض یافتہ عبدالباریؒ صاحب موصوف لکھتے ہیں:

"اسلامی تصوف کی خود صوفیا محققین کے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ وہ نام ہے عین اسلام و شریعت کا۔ حتیٰ کہ ہمارے صوفیا اپنا سب سے بڑا صوفی حضراتِ صحابہ، بلکہ رسول اللہ ﷺ کو قرار دیتے ہیں۔ اور یہی خلاصہ ہے اس باب میں حضرت مجدد علیہ الرحمۃ (مولانا اشرف علی تھانوی) کی تجدید کا ..... جیسا کہ اوپر پوری طرح معلوم ہو چکا۔"

یعنی دینِ طریقت اور شریعت میں مطابقت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ صحابہ کو بھی "صوفی" ثابت کیا جائے اور حضورِ اکرم ﷺ کو صوفی اکبر۔ چنانچہ یہ مرحلہ بھی سر کر لیا گیا اور حضرت حسن بصری کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت ثابت کر کے حضورِ اکرم ﷺ تک شجرۂ طریقت ملا دیا گیا۔ اس مہم کے لئے جو دوسرا اہم کام کیا گیا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

"اتنا ہی نہیں۔ حضرت (مولانا اشرف علی تھانوی) نے تو قرآن و حدیث سے تصوف کے تقریباً دو ہزار مسئلے صاف صاف دلالت سے ثابت کر دیئے ہیں (الافاضات الیومیہ، حصہ ہفتم، ص ۲۰۰) اور فرمایا اگر غور کرتا تو اتنے ہی اور ثابت کر دیتا۔" (تجدید تصوف و سلوک، ص ۱۲۰)

غور فرمایئے کہ ایسے مسائل جن کے متعلق وہ خود اعتراف کر رہے ہیں کہ بظاہر ان کا کتاب و سنت میں نشان نہیں ملتا۔ پھر وہ خود ہی دو ہزار مسائل قرآن و حدیث سے صاف صاف دلالت سے ثابت کر رہے ہیں، تو یہ دلالت کس قدر صاف صاف ہوگی اور اس کے لئے حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کو کس قدر کھینچا تانی کرنی پڑی ہوگی۔ کیا اس سے یہ بہتر نہیں تھا کہ صرف ایک دو ہی نصوص ہوتیں، جو اس قدر قطعی ہوتیں کہ ان میں کھینچا تانی کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن مولانا احمد سعید اکبر آبادی اپنے ماہنامہ "برہان" دہلی میں تھانوی صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

"اپنے معاملات میں تاویل و توجیہ اور اغماض و مسامحت کی مولانا میں جو خو تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی مرید نے مولانا کو لکھا کہ رات خواب میں میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ ہر چند کلمۂ شہادت صحیح صحیح ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن ہر بار یہ ہوتا ہے کہ لا الہ الا اللہ کے بعد اشرف علی رسول اللہ منہ سے نکل جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کا صاف اور سیدھا جواب یہ تھا کہ یہ کلمہ کفر ہے، شیطان کا فریب اور نفس کا دھوکہ ہے تم فوراً توبہ استغفار کرو، لیکن مولانا تھانوی صاحب صرف یہ کہہ کر بات آئی گئی کر دیتے ہیں کہ "تم کو مجھ سے غایت محبت ہے یہ سب کچھ اسی کا نتیجہ و ثمرہ ہے۔" (برہان، فروری ۱۹۵۲، ص ۱۰۷)

سو یہ ہے ان کوششوں کا خلاصہ اور مختلف تدابیر، جن کے ذریعہ شریعت اور طریقت کو متحد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، مگر ہمارے خیال میں یہ مشرق و مغرب کو اکٹھا کرنے والی بات ہے۔ تا آنکہ موجودہ تصوف سے باطل

نظریات کو کلیتہً خارج نہ کر دیا جائے اور ان باطل نظریات کی بھرپور تردید نہ کی جائے اور بدنام اکابر صوفیا سے بدنامی کا داغ دھونے اور ان کے غلط نظریات کو صحیح ثابت کرنے کی روش کو ترک نہ کیا جائے۔

شریعت اور طریقت میں موافقت کی کوشش

تصوف کی اصلاح و تطہیر کے سلسلہ میں تجدید تصوف و سلوک کے مصنف عبدالباری صاحب اور اُن کے مرشد حکیم الامت اشرف علی تھانوی نے کئی پہلوؤں سے قابلِ قدر کوشش بھی فرمائی ہے اور ان سے ہمیں مکمل اتفاق ہے۔ لہٰذا اس عنوان کے تحت ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھیں گے۔ صرف ان حضرات کے اقتباسات بمعہ حوالہ جات پیش کریں گے۔ کیونکہ یہ اقتباس ہمارے خیالات کی پوری ترجمانی کرتے ہیں۔

۱۔ ذکر کیا ہے؟

حصن حصین میں ہے بل كل مطيع الله فهو ذاكر۔ اس لئے ذکر کے معنی یاد تو سب اطاعت سے ہوتی ہے، نہ کہ محض زبان ہی سے نام لے لے۔ کیا یہ یاد ہے کہ جس کی یاد کا دعوےٰ ہو نہ اس سے بات کرے، نہ اس کے خط کا جواب دے، نہ اس سے ملے نہ اس کا کہنا مانے۔ یہ ہرگز یاد نہیں، تو جو ذکر بدوں اصلاح کے ہو، وہ ایسی ہی یاد ہے۔ (تجدید تصوف سلوک، ص ۹۵، بحوالہ الافاضات الیومیہ، ص ۱۹۵، حصہ ۷)

۲۔ مجاہدہ

نفس کے مطالبات دو قسم کے ہیں۔ حقوق اور حظوظ۔ حقوق وہ جن سے قوامِ بدن اور بقائے حیات ہے اور حظوظ وہ، جو ان سے زائد ہوں۔ پس مجاہدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حقوق باقی رکھے اور حظوظ کو فانی کرے۔" (تجدید، ص ۱۰۱)

" افسوس! ستیاناس کر دیا تصوف کا ان جاہل صوفیوں نے اور فقیری کو ہاؤ دھو بنا رکھا ہے۔ کہتے ہیں چلّے کھینچو۔ بیوی کو طلاق دے دو۔ اولاد کو عاق کر دو۔ دروازہ کو تیغا کر دو اور ایک چار روز کھاؤ۔ بدوں اس کے اصل فقیری نہیں ملتی۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ دوشالوں میں، گدے تکیوں میں، سلطنت میں، مرغن غذاؤں میں، فقیری ملتی ہے، مگر گھر میں نہیں، شیخ کامل کی خدمت میں۔" (اشرف السوانح، حصہ ۲، ص ۱۶۱)

۳۔ زُہد کی حقیقت

بُہت کم کھانا بھی زُہد نہیں نہ یہ مقصود ہے کہ ہمارے کم کھانے سے نعوذ باللہ خدا تعالےٰ کے خزانہ میں توفیر تھوڑا ہی ہو جائے گی۔ ہاں اتنا بھی نہ کھائے کہ پیٹ میں درد ہو جائے۔ ہمارے حاجی (امداد اللہ، اشرف علی کے پیر) کا مذاق تو یہ تھا کہ نفس کو خوب آرام

سے رکھے لیکن اس سے کام بھی خوب لے۔" (تجدید، ص ۵)

"اس لئے صحت کی بہت حفاظت کرے۔ دماغ اور قلب کی تفریح و تقویت غذا، و دوا، کرتا رہے نہ غذا میں اتنی کمی کرے کہ ضعف و یبوست ہو جائے۔ نہ اس قدر افراط کہ ہضم میں فتور ہو جائے۔ جب تک صادق رغبت نہ ہو۔ کھانا نہ کھائے اور ایک آدھ لقمہ کی کسر باقی رہنے پر چھوڑ دے ...... اسی طرح سونے میں اعتدال رکھے۔ نہ بہت زیادہ سوئے کہ کسل ہو۔ نہ بہت کمی کرے کہ یبوست ہو جائے۔" (تجدید، ص ۶)

۴۔ استغراق (سُکر)

"لوگ استغراق کو بڑی چیز سمجھتے ہیں کہ جب تک ہم بے عقل و مدہوش نہ ہوئے تو کمال ہی کیا ہے۔ صاحبو! اللہ تعالےٰ کا نام ہوش بڑھانے کے لئے لیا جاتا ہے نہ کہ کھونے کے لئے..... خواجہ عبیداللہ احرار فرماتے ہیں کہ استغراق میں قرب نہیں بڑھتا۔ کیونکہ اس میں عقل نہیں ہوتا، جو مدار قرب ہے۔" (تجدید، ص ۶)

"حقیقت میں، جو ذی استعداد کامل ہیں، ان پر نفسیاتی کیفیات (تاثر و انفعال یا سکر) طاری نہیں ہوتیں ہاں روحانی جن کا اثر روح پر ہوتا ہے، کاملین پر طاری ہوتی ہیں۔ جن کا عوام کو پتہ بھی نہیں اور ان دونوں میں فرق جیسے گڑ اور قند کی شیرینی میں ہوتا ہے..... تو واقعی جو سالکین متمنی کیفیات کے ہیں وہ دیہاتی گڑ خوار ہیں۔"

(تجدید، ص ۸۷)

۵۔ کشف و کرامات کی حقیقت

"فرمایا لوگ کشف کو بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کو قرب میں کچھ دخل نہیں...... بعضوں کو کشف سے فطرتاً مناسبت نہیں ہوتی۔ لاکھ ریاضت و مجاہدہ کریں، عمر بھر کشف نہیں ہوتا۔ اصل چیز تو عبدیت ہے۔ واللہ اگر کسی کو لاکھ کشف ہوں اور پھر وہ اپنے وجدان کی طرف رجوع کرے، تو محسوس کرے گا کہ ذرہ برابر ترقی نہیں ہوئی۔ برخلاف اس کے اگر وہ دو چار مرتبہ سبحان اللہ سبحان اللہ پڑھ کر اپنے وجدان کو دیکھے تو صاف محسوس ہوگا کہ کچھ نہ کچھ اللہ تعالےٰ کے ساتھ قرب بڑھ گیا۔"

"غرض کشف کوئی بڑا کمال نہیں۔ اگر کافر بھی مجاہدہ و ریاضت کرے تو اس کو ہونے لگتا ہے مجنون (دیوانے) کو بھی کشف ہوتا ہے۔ صاحبِ شرح اسباب نے لکھا ہے کہ مجنون کو کشف ہوتا ہے۔ میں نے خود دیکھا کہ ایک مجنون کو اس قدر کشف ہوتا تھا کہ بزرگوں کو بھی نہ ہوتا تھا، لیکن اس کا مسہل ہوا تو مادہ کے ساتھ کشف بھی نکل گیا۔"

(سوانح، جلد ۲، ص ۸۰، بحوالہ تجدید، ص ۹۰)

"خوارق کا ہونا ولایت کے لئے ضروری نہیں۔ بعض صحابہ سے عمر بھر ایک خرقِ عادت بھی واقع نہیں ہوا خوارق اکثر جوگیوں سے واقع ہوتے ہیں۔ یہ ثمرہ ریاضت کا ہے۔ خرقِ عادت کا مرتبہ ذکرِ قلبی سے بھی کم ہے صاحبِ عوارف نے غیر اہلِ خوارق کو اہلِ خوارق سے افضل لکھا ہے۔ عارفین کی بڑی کرامت یہ ہے کہ شریعت پر مستقیم ہوں اور بڑا کشف یہ ہے کہ طالبانِ حق کی استعداد معلوم کر کے اس کے موافق ان کی تربیت کریں۔"

(تعلیم الدین، ص ۱۰۸، بحوالہ تجدید، ص ۹۰)

"بعض صاف گو حضرات کا فیصلہ ہے کہ الکرامات حیض الرجال، یعنی جیسے عورت حیض سے شرماتی ہے اور اس کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی طرح اہل اللہ اپنی کرامتوں سے شرماتے ہیں۔ بہت سے اہلِ کرامت بزرگوں نے تمنا کی کہ کاش! ہم سے کرامت کا صدور نہ ہوتا۔ وجہ یہ کہ انہوں نے بقدر اپنی کرامت کے درجات آخرت میں کمی محسوس کی۔" (تجدید ص ۹۱، بحوالہ الرفیق فی سواء الطریق، ص ۳۱)

"پس کرامت وہ کہلاتے گی جب ایسے فعل کا صدور متبع کامل المتقویٰ سے ہو۔ اب ہمارے زمانہ میں جس شخص سے کوئی عجب فعل سرزد ہوجاتا ہے اس کو غوث قطب قرار دے دیتے ہیں۔ خواہ اس کے عقائد و اعمال کیسے ہی ہوں۔ بزرگوں نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کسی کو ہوا میں اڑتا ہوا دیکھو یا پانی پر چلتا، مگر شریعت کا پابند نہ ہو، تو اس کو بالکل ہیچ سمجھو۔" (تجدید، ص ۹۲)

۶۔ توجہ و تصرف کی حقیقت

توجہ و تصرف بھی نہ کوئی مقصود یا مامور امر ہے۔ نہ فی نفسہٖ کوئی کمال و قرب اور ولایت و مقبولیت کی علامت۔ بلکہ نفس و خیال کی ایک قوت ہے۔ جو خیال و توجہ میں یکسوئی کی مشق سے مقبول کیا مردود سے مردود شخص بھی حاصل کر سکتا ہے۔ پرانے زمانے میں سحر یا جادوگری اور آجکل کے مسمریزم اور عمل تنویم (ہپناٹزم) کا بڑا مدار یہی ہے۔ اسی نفس یا باطن کی قوت سے کسی پر کوئی اثر ڈالنے کا نام صوفیوں کی اصطلاح میں توجہ و تصرف یا ہمت ہے۔ ...... لیکن یہ قوت کوئی دینی کمال نہیں۔ نہ مقبول و مقرب ہونے کی علامت ہے۔ ہر فاسق و فاجر بھی مشق سے اپنے اندر یہ قوت پیدا کر سکتا ہے۔" (تجدید، ص ۹۲، ۹۳ بحوالہ بوادر النوادر، ص ۲۲۴)

"نیز اس (توجہ و تصرف) کے استعمال میں بعض دینی و دنیوی مضرتیں بھی ہیں۔ خصوصاً اس زمانہ میں حضرت مجدد کا مشورہ اس کے ترک ہی کا ہے۔

دنیوی مضرت تو اس میں یہ ہے کہ اس کے استعمال کی کثرت سے عامل کے دماغی و قلبی قویٰ ضعیف و

مضمحل ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے امراض پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ دینی مضرت یہ ہے کہ عوام اس کو ولایت و بزرگی کی علامت سمجھتے ہیں جو اعتقادی ضرر ہے اور مریدوں کا ضرر یہ ہے کہ اکثر اسی پر قناعت کر بیٹھتے ہیں اور اصلاح کا اہتمام چھوڑ دیتے ہیں، جو عملی ضرر ہے۔ ان ہی مضرتوں کی وجہ سے محققین نے اس کا استعمال چھوڑ دیا ہے۔ سلف کے زمانہ میں یہ مضرتیں قویٰ کی مضبوطی، فطرت کی سلامتی اور خوش فہمی کے سبب موجود نہ تھیں۔ (حوالہ: ایضاً)

"اس کے علاوہ جو لوگ محض شیخ کی توجہ یا تصرف پر قناعت کر لیتے ہیں، تو اس تصرف سے جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ نہ تو ان کا کچھ نفع ہوتا ہے اور نہ اُن کو بقا نصیب ہوتا ہے۔ اصلی نفع و بقا اپنی ہی محنت کی چیزوں میں ہے۔" (تجدید، ص ۹۴)

"چنانچہ بزرگی کا معیار لوگوں نے یہ بھی تراش رکھا ہے کہ جو شخص آنکھیں چار ہوتے ہی مدہوش کر دے اٹھا کر زمین پر پٹک دے، وہ بڑا بزرگ ہے۔ حالانکہ یہ بالکل لغو ہے۔ اگر یہ بزرگی ہے تو حضور اکرم ﷺ کو تو ضرور اس کو برتنا چاہیئے تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جب کفار نے آپ کو قتل کرنا چاہا، تو آپ اس کے منتظر رہے کہ یہ لوگ غافل ہوجائیں، تو میں نکل جاؤں۔ کیوں نہ آپ نے ایک ہی نگاہ میں سب کو مدہوش کر دیا۔" (تجدید ص ۹۱ بحوالہ الرفیق، ص ۵۲)

۷۔ بیعت کی اغراض

۱۔ "بعضے مرید صاحبِ کشف و کرامت بننا چاہتے ہیں، تو اس کا خود شیخ میں ہونا ضروری نہیں، تو مرید اس کی کیا ہوس کرے۔"

۲۔ "بعضے سمجھتے ہیں کہ پیر بخشش کے ذمہ دار ہوجائیں گے۔ حالانکہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ تک کو فرما دیا تھا:

يَا فَاطِمَةُ اَنْقِذِىْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ فاطمہ رضی اللہ عنہا! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ

تو بھلا اور کون پیر کسی مرید کو بچا سکتا ہے۔"

۳۔ "بعضے چاہتے ہیں کہ پیر صاحب ایک ہی نظر میں کامل کر دیں گے۔ اگر اس طرح کام بن جاتا، تو صحابہؓ کو بھی کچھ نہ کرنا پڑتا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کون کامل النظر ہوگا۔ کہیں بطورِ خرق عادت ایسا ہو بھی گیا، تو خوارق میں دوام و لزوم نہیں اور اس بھروسہ پر رہنا بڑی غلطی ہے۔"

۴۔ "بعضے چاہتے ہیں کہ خوب جوش و خروش، شورش و مستی پیدا ہو۔ گناہ آپ سے آپ چھوٹ جائیں۔ خواہش

ہی مٹ جائے گا۔ نیک کاموں میں ارادہ ہی نہ کرنا پڑے۔ بس ایک محویت کا عالم رہا کرے۔ یہ خیال پہلے خیالوں سے پاکیزہ سمجھا جاتا ہے، لیکن منشا اس کا بھی ناواقفی ہے۔ یہ امور منجملہ کیفیات و احوال کے ہیں، جو اختیار سے خارج ہیں اور اگرچہ محمود ہوں مقصود نہیں بلکہ ایسی خواہشوں میں نفس کا ایک خفی کید ہوتا ہے کہ وہ طالب ہے راحت ولذت وشہرت کا اور ان کیفیات میں یہ سب امور حاصل ہیں . . . . پھر ایسا شخص دو قسم کی خرابیوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ اگر یہ کیفیات حاصل ہوگئیں، تو اپنے کو صاحب کمال سمجھنے لگتا ہے یا کم از کم طاعات کو حقیر سمجھنے لگتا ہے اور اگر حاصل نہ ہوئیں، تو ان کے غم میں مرنے لگتا ہے اور جو غیر اختیاری امور کا طالب ہوگا ہمیشہ مبتلائے غم وپریشانی رہے گا۔"

۵ "بعضے سمجھتے ہیں کہ پیر صاحب کے عملیات بڑے مجرب ہیں، بوقتِ ضرورت ان سے تعویذ گنڈے لے لیا کریں گے یا پیر صاحب بڑے مقبول الدعوات ہیں۔ معاملات ومقدمات میں ان سے دعا کرایا کریں گے۔ سب کام ہوجایا کریں گے۔ گویا ساری خدائی پیر صاحب کے قبضہ میں ہے۔ یا خود ہم ایسی ہی چیز سیکھ لیں گے۔ بلکہ ایسے لوگ تمام تر بزرگی کا معیار انہی عملیات اور ان کے آثار کو سمجھتے ہیں، جو محض دنیا کی طلب ہے اس لئے فاسد در فاسد ہے۔"

۶ "بعضے یہ سمجھتے ہیں کہ ذکر وشغل کرنے سے کچھ انوار نظر آیا کریں گے یا کچھ آوازیں سنائی دیں گی۔ اوّل تو ذکر وشغل پر ان آثار کا مرتب ہونا ضروری ہے اور نہ ذکر وشغل سے یہ مقصود ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ انوار واصوات وغیرہ بعض اوقات خود اس کے دماغ کا تصرف ہوتا ہے۔ عالمِ غیب کی اشیا میں سے نہیں ہوتی (محض اس کا تخیل اور وہم ہوتا ہے) تیسرے بالفرض اسی عالم کی چیزیں منکشف ہوگئیں، تو فائدہ کیا۔ کسی عالم کے منکشف ہوجانے سے قرب نہیں بڑھتا۔ قرب کے لئے تو اطاعت بنائی گئی ہے۔ بعض اوقات شیاطین کو ملائکہ نظر آنے لگتے ہیں مگر وہ شیطان کے شیطان ہی رہتے ہیں۔ پھر مرنے کے بعد تو مومن کافر سب ہی کو اس عالم کے بہت سے حقائق منکشف ہو جائیں گے۔ تو کیا اس سے قرب مقصود سب کو حاصل ہو جائے گا۔" (تجدید ص ۴-۱ تا ۱۰۷۔ بحوالہ: قصد السبیل)

۸ بیعت کی ضرورت

اس معاملہ میں فریقین نے افراط وتفریط سے کام لیا ہے۔ ایک فریق اس کو سرے سے بدعت قرار دیتا ہے۔ دوسرا اسے لازم سمجھتا ہے۔

بیعت سے اصل مقصد رضائے حق کو سمجھنا اور اس پر کاربند رہنا ہے۔ بیعت دراصل پیر اور مرید کے درمیان

ایک معاہدہ ہوتا ہے کہ پیر اُسے احکام شریعیہ کے بجالانے اور ذکر کی مداومت کی تاکید کرے اور مرید اس کا نسبتاً زیادہ خیال رکھے۔ مجدد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

"شیخ اسی کی تعلیم کرتا ہے اور مرید کاربند ہوتا ہے۔ اگرچہ کوئی کیفیت معلوم نہ ہو۔ نہ اس کے زعم کے مطابق کوئی کمال حاصل ہو۔ تب بھی آخرت میں اس کا ثمرہ، جو کہ رضا ہے ظاہر ہوگا اور اس رضا سے دخولِ جنت و لقائے حق اور دوزخ سے نجات میسر ہوگی۔ شیخ کی طرف سے اس کی تلقین کا وعدہ اور مرید کی طرف سے اس کے اتباع کا عہد یہی حقیقت ہے پیری، مریدی کی . . . . اور گو یہ تعلیم اور اس پر عمل بدوں بیعت کے بھی ممکن ہے، لیکن بیعت میں طبعًا یہ خاصہ ہے کہ شیخ کو توجہ زیادہ ہو جاتی ہے اور مرید کو فرمانبرداری کا پاس زیادہ ہو جاتا ہے۔ مگر لوگوں نے یوں سمجھ رکھا ہے کہ جو بھید ہیں فقیری کے، وہ جو انچھر ہیں پریم کے۔ وہ مریدوں کو ہی بتائے جاتے ہیں۔ مرید کرتے ہی پیر بس پریم کے دو انچھر بتا دے گا اور ہم اللہ والے ہو جائیں گے۔ میاں خدا و رسول کا نام لو اور احکام بجالاؤ۔ بس یہی انچھر ہیں۔ اصلاحِ نفس کے طریقے پیر سے پوچھو۔ یہی بھید ہیں۔ اگر کوئی کہے کیا باطنی طریق بس یہی ہے، تو ہم بآوازِ دہل کہیں گے کہ ہاں یہی ہے اور اس طریق میں کبھی کبھی بڑے بڑے حالات پیش آئیں گے۔ بڑی بڑی کیفیات بھی طاری ہوں گی مگر یہ مقصود نہیں۔" (نہ ضروری ہے)

(تجدید، ص ۱۰۹ بحوالہ: اشرف السوانح، ج ۲، ص ۱۶۱)

"بیعت کی اصلی بڑی ضرورت یہی رفاقت یا پیر کی صحبت و تعلق ہے تاکہ راستہ کے خطرات یا ان ٹھوکروں سے حفاظت ہو . . . . . اور ہمارے لئے تو صحبت کی حاجت کی سب سے بڑی دلیل صحابیت ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کی فضیلت بھی اعلیٰ سے اعلیٰ محدثین و فقہاء پر مسلّم ہے . . . . اور اس فضیلت کا مدار رسول اللہ کی صحبت پر ہے۔" (تجدید، ص ۱۱۱، ۱۱۲)

تقوے پر ایک وعظ میں اللہ کی محبت پیدا اور قائم رہنے کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"اس محبت کے قائم رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کیجئے۔ زیادہ نہ ہو تو کم از کم ہفتہ میں ایک بار یا مہینہ میں ایک بار۔ اس میں خاصیت یہ ہے کہ اس کے اندر جو چیز ہے، وہ شدہ شدہ آپ کے اندر بھی آوے گی۔" (تجدید، ص ۱۱۷)

۹۔ محبت اور عشق

"البتہ حق تعالےٰ کی محبت میں شانِ عقلیت غالب ہوتی ہے اور اپنے ہم جنس کی محبت میں شانِ طبیعت (عشق) غالب ہوتی ہے اور سرسری نظر میں

محبت عقلی، محبت طبعی کے سامنے مضمحل معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ اَمر بالعکس ہے۔ چنانچہ اسی محبوب طبعی سے نعوذ باللہ حق تعالےٰ کی شان کے خلاف کوئی معاملہ قولی یا فعلی صادر ہو تو وہی محبوب فوراً مبغوض ہو جائے۔" (تجدید، ص ۱۳۳، بحوالہ: اشرف السوانح، ج ۲، ص ۱۲۷)

اشرف علی تھانوی کی مساعی جمیلہ پر تبصرہ

یہ اور ایسی ہی اور بھی کچھ مفید باتیں ہیں، جن سے موجودہ تصوف کی کسی حد تک اصلاح ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ تمام باتیں صرف ایک پہلو سے تعلق رکھتی ہیں یعنی "پیر پرستی" کے سلسلہ میں اصلاح ہوسکتی ہے۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ آپ نے بیعت کے عنوان میں جن اغراض کی نشاندہی فرمائی ہے۔ یہی باتیں تو عوام کے لئے باعثِ کشش ہوتی ہیں۔ اگر یہ باتیں ختم ہو جائیں، تو کتنے لوگ ایسے رہ جائیں گے جو خلوص کے ساتھ اور محض اتباعِ سنت کی غرض سے کسی بزرگ کے در دولت پر بیعت کے لئے حاضر ہوں گے؟

اور اس سے بھی بڑا محاذ قبروں کا وجود ہے۔ جہاں سب اکابر صوفیا چلہ کشی کرتے چلے آئے ہیں۔ حالانکہ حضورِ اکرم ﷺ نے قبروں کے پختہ بنانے ہی سے سختی سے منع فرمایا۔ کیونکہ اکثر شرکیہ افعال کی جڑ تو یہی قبروں اور مزارات کا وجود ہے۔ اس سلسلہ میں تھانوی صاحب اور ان کے شاگرد رشید خاموش نظر آتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جاہل عوام کو زندہ پیروں سے اتنی دلبستگی نہیں ہوتی، جتنی قبروں سے ہوتی ہے۔ قبروں پر جا کر لوگ چلے کاٹتے، نذریں نیازیں چڑھاتے، طواف کرتے، مرادیں مانگتے، سجدے کرتے اور سالانہ حج بھی ادا کرتے ہیں۔ کیا یہ بات قابلِ اصلاح نہیں۔ کیا یہ باتیں بزرگ صوفیا سے تعلق نہیں رکھتیں یا یہ اتباعِ سنت میں نہیں آتیں؟

پھر اس سے بھی بڑا محاذ نظریات کا محاذ ہے۔ جہاں آکر سب کی زبانیں گنگ ہی نہیں ہوتیں بلکہ اکثر یا تو وہ اکابر صوفیاء کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔ بعض دوسرے ایسے مشرکانہ عقائد کو اپنی سمجھ سے بالاتر قرار دے کر اپنا پہلو بچا جاتے ہیں۔ کچھ دوسرے تاویلات کے ذریعہ ان کے نظریات کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا ان اکابر کی خلافِ شرع باتوں کے مقابلہ کے ان کی موافق شرع کی باتیں پیش کر کے ان کی تنزیہہ کرنے لگتے ہیں۔ قرآن نے تو اپنی حقانیت کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ پیش کی ہے کہ اس میں آپ تضاد نہیں پائیں گے، تو پھر جس کے کلام میں صریح تضاد پایا جاتا ہو، اسے حق کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ نظریاتی پہلو ہی دراصل سب سے خطرناک پہلو ہے جس نے بے دین اور مجرم قسم کے پیر وفقیر پیدا کئے، جن سے

کرامتیں وقوع پذیر ہوئیں۔ اور ہمارے خیال کے مطابق صوفیاء اس محاذ پر سب سے زیادہ بدنام ہوتے ہیں، تو کیا یہ پہلو اصلاح یا تطہیر کے قابل نہیں ؟

پھر ایک وہ محاذ بھی ہے جہاں سے اکابر صوفیاء یُوں بولتے ہیں "حدثنی قلبی عن ربی" تو بھلا ایسے بلند مقام پر فائز حضرات احادیث کی کیا پرواہ کرتے ہیں۔ جس چیز کو چاہا حلال اور مباح قرار دے لیا۔ دعویٰ تو وہ اتباعِ سنت کا کرتے ہیں۔ کیا اسی کا نام اتباعِ سنت ہے ؟ بالآخر نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ؎

پنبہ کجا کجا نہم تن ہمہ داغ داغ شُد

سیّد خورشید احمد گیلانی اور رُوحِ تصوّف

جب میں اس کتاب کا مسودہ مکمل کر چکا، تو جناب سیّد خورشید احمد گیلانی صاحب کی کتاب روحِ تصوف پر نظر پڑی جس پر آپ نے موجودہ تصوف پر اعتراضات دُور کرنے اور اسے خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور آپ نے مشورہ دیا ہے کہ اصلی تصوف کو جاننے کے لئے امہاتِ کُتبِ تصوف کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ پھر آپ نے چند مشہور اُمّہاتِ کتب سے تعارف بھی کرایا ہے اور ان کے بعض مندرجات بھی پیش فرمائے ہیں اور اس بات پر زور دیا ہے کہ تصوف کے اصل مسائل اور موضوعات اللہ کا ذکر، تقوٰے، توبہ، صبر، توکل، رجاء، فقر، محاسبہ، تزکیہء نفس، خشیت، امانت، اخلاص، سادگی، قناعت، دنیا سے نفرت اور اللہ تعالےٰ کے لئے حنیف ہونا ہی تو ہیں۔ بتلایئے ! ان موضوعات میں سے کس چیز کی بنیاد شریعت اسلامیہ میں موجود نہیں۔ پھر انہی مسائل پر مختلف امہاتِ کتب کے تراجم سے اقتباسات بھی پیش کیے گئے ہیں۔

ہم آپ کے اس جذبہ کی قدر ضرور کرتے ہیں، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ آپ نے اس طرح سے تصوف کی تطہیر میں جانبداری سے کام لیا ہے۔ جس کے دلائل درج ذیل ہیں :

۱۔ آپ لکھتے ہیں ابوالنصر سراج (م ۳۷۸ھ) نے اپنی کتاب "اللمع" میں اتحاد و حلول جیسے باطل نظریات کی تردید و تغلیط فرمائی ہے۔ (ص ۸۱)

اب سوال یہ ہے کہ اس صوفیاء کے طبقہ نے ابُوالنصر کی اس بات کو تسلیم کیا ہے ؟ اگر یہ حضرات خود ہی تسلیم نہ کریں، تو دوسرے کیسے کر سکتے ہیں اور جناب خورشید احمد صاحب نے جانبداری یہ کی ہے کہ جن امہاتِ کُتب میں یہ نظریات بالوضاحت مذکور ہیں ان کو امہاتِ کُتب کی فہرست سے ہی خارج کر دیا ہے۔ مثلاً :

۱۔ حسین بن منصُور حلاج (م ۳۰۹ھ) کی کتاب "الطواسین" ، حارث محاسبی (م ۲۴۳ھ) کے رسالہ "الوعایۃ"

کے بعد دوسری کتاب تصوف۔

۲ امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کی کتاب "المنقذ من الضلال"

۳ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (م ۶۳۸ھ) کی کتب فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم۔

۴ عبدالکریم جیلی کی کتاب "الانسان الکامل"

۵ مولانا جلال الدین رومی (م ۶۷۲ھ) کی کتاب مثنوی مولانا روم

۶ شیخ فرید الدین عطار (م ھ) کی کتاب "منطق الطیر" وغیرہ وغیرہ بے شمار کتب ہیں، جو امہات کتب میں شمار ہوتی ہیں، لیکن ان کا ذکر آپ اس لئے چھوڑ گئے کہ ان کتب میں اس نظریہ کو بنیاد کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور یہی نظریہ دراصل دین طریقت یا تصوف کی جان ہے، جو شرعی نقطہ نگاہ سے مردود اور باطل ہے اور اسلام سے ہزارہا سال پہلے کی پیداوار ہے۔

۲۔ پھر اس حقیقت کا اعتراف پیش لفظ لکھنے والے جناب سید محمد فاروق القادری صاحب نے بھی ان الفاظ میں کیا ہے، "ہمیں داراشکوہ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ تصوف اسلام سے بہت پہلے انسانی فکر میں آچکا تھا۔ اور اپنشدوں میں اس کی مستند تصریحات ملتی ہیں لیکن اسے اس تصوف سے کیا واسطہ ہے جس کے داعی اپنے تمام معتقدات و معمولات کی بنیاد صرف قرآن کو ٹھہراتے ہیں۔"

اب دیکھیے! جس داراشکوہ کے حوالہ سے آپ نے بات چلائی ہے۔ اسی داراشکوہ کے مرشد ملا بدخشی کا یہ شعر کیا قرآن کے مطابق ہے؟ ؎

پنجہ در پنجہ خدا دارم   من چہ پروائے مصطفےٰ دارم

لیکن بایں ہمہ اس اسلامی تصوف کے طبقہ میں داراشکوہ بھی ایک معزز رکن ہیں اور اس کے استاد ملا بدخشی بھی۔

۳ اگر اپنشدوں میں تصوف کی مستند تصریحات کو اسلامی تصوف سے کوئی واسطہ نہیں تو کیا وجہ ہے کہ ان امہات کتب کے مصنفین عوام کو شروع سے لے آج تک یہ یقین دلاتے چلے آرہے ہیں کہ طریقت بھی شریعت ہی سے ماخوذ ہے لیکن ان کی یقین دھانیوں کے باوجود بھی عوام کو یقین نہیں آتا۔ بات واضح ہے کہ کچھ صوفیاء تو تصوف کو کتاب و سنت سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں اور جو کتاب و سنت کا نام لیتے ہیں ان میں سے بھی اکثر کے اعمال شریعت کے مطابق نہیں ہوتے۔

۴ پھر جن امہاتِ کتب کا خورشید صاحب نے ذکر فرمایا ہے ان کے مندرجات میں سے تنازعہ فیہ مسائل کو عمداً چھوڑ گئے ہیں۔ ہم نے اس کتاب میں آپ کی پسندیدہ کُتب میں سے اکثر کتب کے حوالوں سے ہی یہ وضاحت پیش کی ہے کہ طریقت اور شریعت آپس میں متصادم ہیں۔

گویا آپ نے کیا یہ ہے کہ تصوف کے جو پہلو مستحسن یا گوارا تھے انہیں تو خوب صورت بنا کر پیش کر دیا ہے لیکن جتنے پہلو قابلِ اعتراض تھے ان پر پردہ پوشی کی گئی ہے۔ ایسے انداز کو تحقیقی نہیں کہا جا سکتا۔ علاوہ ازیں جو باتیں اس کتاب میں جواب طلب یا بحث طلب تھیں، وہ چونکہ پہلے ہی زیر بحث آ چکی ہیں، لہٰذا مزید کچھ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی گئی۔

اب ہم شریعت اور طریقت کا ایک تقابلی خاکہ پیش کرتے ہیں تاکہ ایک نظر میں معلوم ہو جائے کہ ان دونوں کا تصادم کون کون سے مقام پر ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ طریقت اور شریعت میں مکمل سمجھوتہ قابلِ عمل ہے بھی یا نہیں؟

شریعت و طریقت کا تقابلی جائزہ

۱۔ توحید: اسلام میں توحید یہ ہے کہ ساری کائنات اللہ کی مخلوق اور اس کی مطیع فرمان ہے۔ حاکمیت اور فرمانروائی بھی اسی کی ہے جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔	۱۔ طریقت کی توحید یہ ہے کہ جملہ موجودات خدا کا حصہ ہیں۔ پھر کوئی انسان اپنی ذات کو خدا میں مدغم بھی کر سکتا ہے اور کسی انسان میں خدا خود بھی حلول کر سکتا ہے، جس کی وجہ سے اس میں خدائی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔
۲۔ رسالت: نبی اور رسول اپنے وقت کے تمام انسانوں میں سے افضل ہوتا ہے۔	۲۔ نبوت سے نبی کی ولایت افضل ہے بالفاظِ دیگر نبی سے ولی افضل ہوتا ہے۔ اسی طرح خاتم الانبیاء سے خاتم الاولیاء افضل ہوتا ہے۔
۳۔ مشاہدہ الٰہی: اس دنیا میں ناممکن ہے نہ ظاہری آنکھوں سے نہ دل کی آنکھوں سے اور اگر کوئی ایسا محسوس کرتا ہے تو وہ شیطانی فریب ہے۔	۳۔ دیدارِ الٰہی ممکن ہی نہیں ضروری ہے اور اسی بنیاد پر اس دین کا دارومدار ہے۔ مشاہدات اور مکاشفات ہی اس دین کے سرچشمے اور بنیاد ہیں۔
۴۔ وحی الٰہی: اکتسابی نہیں بلکہ وہبی چیز ہے اور	۴۔ وحی الٰہی کی ابتداء ریاضت و مجاہدہ ہے اور یہ

نبی کو وحی آنے سے پیشتر خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ نبی بننے والا ہے۔

کسبی چیز ہے۔ انسان کو وحی کی توقع ہوتی ہے اور یہ ایک تدریجی عمل ہے۔

۵۔ معیارِ حق : وحی الٰہی ہے یعنی قرآن و سنت سے شرعی احکام مستنبط ہوتے ہیں اور یہی چیزیں تحقیق اور جانچ کا معیار ہیں۔

۵۔ اصل معیار مشاہدہ و مکاشفہ ہے کیونکہ یہ علم فرشتہ سے واسطہ کے بغیر براہِ راست خدا سے حاصل ہوتا ہے۔

۶۔ نبی یا رسول کی غیر مشروط اطاعت لازم ہے۔

۶۔ نبی کے بجائے اپنے پیر کی غیر مشروط اطاعت لازم قرار دی گئی ہے۔

۷۔ نبی کے صحیح جانشین علماء ہوتے ہیں اور علماء زاہدوں اور عبادت گزاروں سے بہت افضل ہیں۔

۷۔ نبی کے اصل جانشین زاہد اور عابد (صوفیاء) ہیں اور یہ علماء سے افضل ہیں اور مقربینِ حق یہی لوگ ہیں۔

۸۔ روحانی ترقی کا راستہ دنیا کے اندر سے ہو کر جاتا ہے اور اسلام معاشرتی زندگی گزارنے پر زور دیتا ہے

۸۔ روحانی ترقی دنیا کو ترک کرنے سے ہی ہو سکتی ہے، لہٰذا صوفیاء اپنا راستہ دنیا سے باہر رہ کر تلاش کرتے ہیں۔

۹۔ زہد : حصولِ دنیا اور حلال کمائی کرنا بہت نیک عمل ہے البتہ حبِ دنیا ناپسندیدہ چیز ہے اسی چیز کا نام زہد ہے۔

۹۔ حصولِ دنیا اس لئے انتفاع ترقی کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس میں زہد کا تصوّر اسلامی زہد سے بالکل مختلف ہے۔

۱۰۔ نکاح : معاشرتی زندگی کی اصل بنیاد اور فطری چیز ہے، لہٰذا ضروری ہے۔ وہ ایک عہد و پیمان ہے نکاح کے علاوہ دوسرے سب راستے حرام ہیں۔

۱۰۔ نکاح اور عائلی زندگی سے سخت بیزار ہے۔ بعض اتحادی ہر عورت سے زنا کو جائز سمجھتے ہیں اور جماع کو مشاہدہ حق کا بہترین موقع قرار دیتے ہیں۔ بعض دوسرے بزرگ تفننِ طبع کے لئے بھی نکاح کرتے ہیں۔

۱۱۔ جہاد : قومی زندگی کی حیات کے لئے جہاد بالسیف افضل الاعمال قرار دیتا ہے۔

۱۱۔ جہاد بالسیف کو کمتر سمجھتا اور اس کے بجائے مجاہدۂ نفس پر زور دیتا ہے اور روحانی ترقی کی آڑ میں انسانیت کو ذلیل ترین مقام پر لا کھڑا کرتا ہے۔

۱۲۔ تقدیر : انسان اپنے اعمال میں نہ تو مختارِ مطلق ہے نہ مجبورِ محض۔ البتہ ہر عمل مشیتِ الٰہی کے تابع ہوتا ہے۔

۱۳۔ معاشی اور سیاسی نظام کے لئے مکمل ہدایات دیتا اور کلمۂ حق کے استیلاء کے لئے سلطنت کے حصول پر زور دیتا ہے۔

۱۴۔ جزا و سزا : اسلام، اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور اس کے انعامات کی امید رکھتے ہوئے اس کی عبادت کو ایک مستحسن فعل قرار دیتا ہے۔ اخروی زندگی میں نجات کا انحصار اعمال پر ہے۔ بُرے ہوں گے، تو دوزخ ٹھکانہ ہوگا اور اچھے ہوں گے، تو بہشت۔ رضائے الٰہی اور دیدارِ الٰہی صرف اہلِ جنت کو حاصل ہوگا۔

۱۵۔ اتباعِ رسول اور محبت کے تقاضے : اسلام دینی اور دنیوی ترقی کے لیئے اتباعِ رسول کو بنیاد اور اسی کو اللہ اپنی اتباع قرار دیتا ہے۔ اللہ سے اور اس کے رسول سے محبت ایمان کا بنیادی تقاضا ہے پھر رسول کے اہلِ بیت سے محبت بھی رسول کی محبت کا تقاضا قرار دیتا ہے، لیکن اس محبت کا مقصد محض اتباعِ رسول میں عزم ہے نہ کہ عقائد، اصول و اقدار شرعیہ

۱۲۔ نظریہ وحدت الوجود کے مطابق انسان اعمال میں مجبورِ محض ہے۔ اس کی حیثیت محض ایک آلۂ کار کی ہے، جو مشیتِ الٰہی کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوا ہے۔

۱۳۔ ظاہری حکومت کو بیکار سمجھتا اور اس کے بجائے باطنی نظام پر زور دیتا ہے، غوث، قطب، ابدال، اوتار، نجیب وغیرہ کے مناصب مقرر کرتا ہے اور ان کے نصب و عزل کا نظام جاری کرتا ہے۔

۱۴۔ صوفیاء اس نظریۂ عبادت کی توہین کرتے اور اس کو "سوداگری" قرار دیتے ہیں۔ وہ اعمال میں انسان کو مجبور سمجھتے اور جنت اور دوزخ کو بے معنی چیزیں قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں معیار رضاءِ الٰہی ہے۔ رضاءِ الٰہی کی خاطر وہ دوزخ میں بھی بخوشی جانے کو تیار ہیں۔ وہ اسے ایک آہِ سرد سے ٹھنڈا کر کے بیکار بنا سکتے ہیں اور جنت کو پھونک مار کر دوزخ بنا سکتے ہیں۔

۱۵۔ یہاں مقصود صرف روحانی ترقی اور معرفتِ حق ہے اور اس کی بنیاد عشق ہے، جو اللہ کے سوا ہر چیز کو جلا دیتا ہے اور انسان کو بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ گروہ سخت ذہنی انتشار میں مبتلا ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک فریق رسول کی اتباع کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا دوسرا اتباعِ رسول کے بجائے عشقِ رسول میں اتنا غلو کر گیا کہ حضور اکرم ﷺ کو یونانی فلسفہ کے مطابق عقلِ کُل قرار دیتا ہے اور انہیں

کی قربانی۔

لے کر ابد تک حاضر ناظر، علم الغیب اور تصرف کائنات پر قادر سمجھتا ہے۔ ایک تیسرا فریق حبّ اہل بیت میں شیعوں سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ اور ان کے دلائل محض اپنے مشاہدات یا بزرگوں کے ملفوظات ہیں۔

۱۶۔ مزارات کا وجود۔ اسلام انسان کے مرنے کے بعد روح کے اس دنیا میں آنے کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ فلہٰذا سماع موتیٰ، روحوں سے سوال و جواب، ان روحوں کا تصرف سب کو باطل قرار دیتا ہے اور اگر ایسی چیزوں کا ظہور ہو تو اسے شیطانی عمل قرار دیتا ہے۔ لہٰذا اسلام میں پختہ قبروں کے جواز کے سب چور دروازے بند کر دیئے گئے ہیں، جو کہ ایسے شرکیہ افعال کا اصل منبع ہیں۔

۱۶۔ صوفیاء کے نزدیک روحوں کا واپس دنیا میں آنا، سماع موتیٰ، ان سے سوال و جواب اور تصرفات ان کے مشاہدہ کے مطابق سب برحق ہیں۔ لہٰذا اس مذہب کے لئے پختہ قبریں، مقبرے، روضے، مزار، خانقاہیں بنیادی ضرورت کی چیزیں ہیں۔

۱۷۔ اعتکاف: اسلام نے روحانی ترقی اور خاص توجہ الی اللہ کے لئے مساجد میں اعتکاف کرنے کی راہ دکھلائی ہے۔

۱۷۔ صوفیاء مساجد میں اعتکاف کے بجائے مزارات پر مراقبہ کرنے کو اصل نیکی سمجھتے ہیں۔

۱۸۔ حج: اسلام نے حج بیت اللہ کو فرض اور اسلام کا رکن قرار دیا ہے اور مناسکِ حج کو شعائر اللہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔

۱۸۔ اہل طریقت کے نزدیک اتنی ہی رقم سے غریبوں کی امداد کر دینا زیادہ مستحسن عمل ہے۔ بیت اللہ کا درجہ عارف سے کمتر ہے۔ فلہٰذا بیت اللہ خود عارف لوگوں کے گرد طواف کرتا ہے۔ بیت اللہ کی زیارت سے کسی بزرگ کے مقبرہ کی زیارت افضل ہے اور وہاں مناسکِ حج کی ادائیگی زیادہ کارِ ثواب ہے سالانہ عرس حج کا بدل یا اس سے افضل سمجھے جاتے ہیں۔

۱۹۔ کرامات: اولیاء اللہ سے کرامات کا ظہور برحق ہے۔ اولیاء اللہ وہ ہیں، جو اتباعِ رسول کا مکمل نمونہ ہوں۔ کرامت کا مقصد کسی اہم دینی یا دنیوی غرض کو پورا کرنا ہے۔ ولی کو اس کے ظہور سے

۱۹۔ صوفیاء کی کرامات لامحدود ہیں۔ وہ ازل سے ابد تک کے حالات کی خبر لاتے اور تصرف فی الامور میں کافی دسترس رکھتے ہیں زبانی اقرار کے باوجود اتباعِ رسول کو بے معنی اور اپنی کرامات کو دعوے

پہلے سے علم نہیں ہوتا۔ نہ وہ اس کے صدور کا دعوےٰ کر سکتا ہے اور یہ بھی شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوتی ہے۔	سے پیش کرتے اور اپنی بزرگی کی دھاک بٹھلاتے ہیں اور یہ سب کسب و اکتساب سے حاصل کیا جاتا ہے۔
۲۰ علم غیب کُلی اللہ تعالےٰ کا خاصہ ہے وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے، عطا کرتا ہے۔	۲۰ علم غیب رسول اللہ ﷺ کو کلی حاصل تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ خدا کا علم ذاتی ہے اور رسول کا عطائی پھر یہ عطائی علم غیب اکثر اوقات اولیاء اللہ کو بھی ہوتا ہے اور بعض کو تو کلی ہوتا ہے۔
۲۱ وفات کے بعد تمام انبیاء و اولیاء کی زندگی برزخی ہے جس کو ہم سمجھ نہیں سکتے۔	۲۱ رسول اکرم ﷺ اور تمام انبیاء و اولیاء زندہ ہیں وہ مرتے نہیں بلکہ صرف عام دنیا والوں سے روپوش ہو جاتے ہیں اور اہل دنیا کی حاجت برآری میں مشغول رہتے ہیں۔
۲۲ تصرف فی الامور کا رتبہ صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ باقی سب اس کی مخلوق، اس کی محتاج اور اس کے آگے بے بس ہے اور اسی کے رحم و کرم پر ہے۔	۲۲ انبیاء، اولیاء سب کو تصرف فی الامور کا مرتبہ حاصل ہے اور یہ اولیاء، لوح محفوظ میں اللہ کے لکھے ہوئے فیصلوں تک کی تبدیلی بھی کروا سکتے ہیں۔
۲۳۔ قیامت کے دن شفاعت صرف وہی کر سکے گا جس کی اپنی مغفرت ہو چکی ہو اور پھر اُسے اللہ کی طرف سے اس کی اجازت بھی مل جائے۔	۲۳۔ اولیاء اللہ دعوےٰ سے مریدوں کی شفاعت اور مغفرت دونوں کا ذمہ اٹھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ قبر میں منکر نکیر کے سوال کے وقت بھی اپنے بے دین مریدوں تک کو کلاً بخشوا سکتے ہیں۔
۲۴۔ حاضر و ناظر صرف اللہ تعالےٰ کی ذات ہے۔ وہی ہر ایک کی پکار سنتا اور اسے قبول کرتا ہے اس کے بغیر کسی دوسرے کو پکارنا صریح شرک قرار دیتا ہے۔	۲۴۔ تمام انبیاء و اولیاء ہر وقت حاضر و ناظر ہوتے ہیں پکار کے وقت مرید کی جائے مصیبت پر پہنچ کر اس کی مشکل کشائی بھی کر دیتے ہیں۔[1] خواہ یہ پیر صاحب زندہ ہوں یا مُردہ۔

[1] یہ عقیدہ بھی عجب قسم کا تضاد رکھتا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور اولیاء ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔ اور اس کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ مرید کے پکارنے پر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حاضر و ناظر تو وہ پہلے ہی ہیں یہ پہنچ کہاں سے جاتے ہیں۔ اگر حاضر ناظر ہیں، تو پہنچنے والی بات غلط اور لغو ہے۔ اور پہنچنے والی بات ٹھیک ہے، تو حاضر ناظر والی بات لغو اور باطل ہے۔

مشائخ عظام سے چند سوالات

اس کتاب میں دو باتوں کی وضاحت کی گئی ہے :

۱۔ دینِ طریقت بذاتِ خود ایک الگ دین ہے جس کے اپنے مخصوص عقائد و نظریات ہیں ۔

۲۔ جو شخص یہ دین اختیار کرتا ہے، تو اُس پر اسی کا رنگ غالب آجاتا ہے اور اُس کے پہلے دین (مثلاً اسلام، عیسائیت یا ہندومت وغیرہ) کی حیثیت ثانوی بن کر رہ جاتی ہے[1]۔ اگرچہ وہ زبانی اُس کی تردید بھی کرتا رہے ۔

اب ہمارے صوفیاء کو اصرار ہے کہ طریقت شریعت ہی سے ماخوذ ہے ۔ شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ۔ اگر اُن کا یہ دعوٰے صحیح ہے تو کیا براہِ کرم درج ذیل سوالات کا جواب دینے کی تکلیف فرمائیں گے ۔

۱۔ کیا وحدت الوجود کا عقیدہ یا حلول و شہود کے عقائد کی از روئے شرع گنجائش ہے ؟ اگر ہے تو دلائل سے مطلع فرمائیں ۔ ورنہ یہ تبلائیں کہ ایسے عقائد کے حامل صوفیاء کی حمایت کیوں کی جاتی ہے ؟

۲۔ کیا اسلام میں پختہ قبریں بنانے، ان پر سر بفلک عمارات تعمیر کرنے، ان پر چراغ جلانے، روشنیاں کرنے جھاڑو دینے، غلاف چڑھانے، اعتکاف بیٹھنے، طواف کرنے کا جواز ہے ؟

۳۔ قبروں پر چلہ کشی کرنے، حبسِ دم، ہمیشہ روزہ رکھنے، پوری رات قیام کرنے اور ہمیشہ قیام کرنے، نفس کو اذیتیں پہنچا کر مضمحل کرنے، نکاح نہ کرنے کو بہتر سمجھنے اور ترکِ علائق کی از روئے شرع گنجائش ہے ؟

۴۔ کیا جتنی وحی رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تھی خصوصاً جس کا تعلق دین سے تھا۔ وہ آپ نے سب کی سب اُمت کو پہنچا دی تھی یا اس میں سے کچھ باطنی حصہ عوام کو نہیں بتلایا گیا ؟ زیادہ واضح الفاظ میں کیا دین کا کچھ حصہ اسرار و رموز کی صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیا گیا تھا، جو اس طبقہ کے پیشوا تسلیم کئے گئے ہیں ؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو اس کی دلیل درکار ہے، اگر نفی میں ہو تو تصوف میں باطنی علوم کے ماخذ کیا ہیں ؟ اور صوفیاء جو اپنے ہم زمرہ لوگوں سے خلوت میں اسرار و رموز کی باتیں کرتے ہیں، وہ دین کی باتیں ہوتی ہیں یا کچھ اور ؟ اور اگر دین کی باتیں ہوتی ہیں، تو انہیں عوام سے چھپایا کیوں

---

[1] صوفیاء کے ہاں یہ مقولہ بہت مشہور ہے " الصوفی لا مذہب لہ " جس کا یہی مطلب ہے ۔

جانا ہے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً" یعنی کسی کے پاس دین کی صرف ایک بات بھی ہو تو اسے لوگوں تک پہنچانا چاہیئے۔

۵۔ کیا تصورِ شیخ کی از روئے شرع گنجائش ہے؟

۶۔ کیا اخروی نجات کے لئے سلوک کی منازل طے کرنا ضروری ہے؟ اگر جواب نفی میں ہو تو کیا اس کا ترک بہتر نہیں جبکہ اس کے مصالح سے اس کے مفاسد بہت زیادہ ہیں، خصوصاً ایسے ادوار میں جبکہ تحریکِ باطنیت اس تصوف پر بری طرح محیط ہو چکی ہے۔

۷۔ کیا کشف کا علم یقینی ہے۔ اگر جواب نفی میں ہے تو جن صوفیاء نے شریعت کے بجائے اپنے کشف پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

۸۔ جس رہبانیت کو اسلام نے ناپسند فرمایا تھا اس رہبانیت اور موجودہ تصوف میں ما بہ الامتیاز فرق کیا ہے؟

۹۔ محفلِ سماع و وجد اور حال کی کوئی مثال دورِ صحابہؓ میں ملتی ہے اگر یہ چیزیں کچھ فضیلت رکھتی ہیں تو صحابہؓ کا دور ان سے کیوں خالی ہے؟ اور اگر مذموم ہیں تو ان کو اختیار کرنے کے مصالح کیا ہیں؟

۱۰۔ کیا وجہ ہے کہ تین چار لاکھ صحابہ سے، جو پوری ایک صدی پر پھیلا ہوا ہے، تو دس بارہ[1] سے زیادہ کرامات وقوع پذیر نہیں ہوئیں۔ لیکن صوفیاء کے ایک ایک بزرگ سے بیسیوں بلکہ سینکڑوں کرامات وقوع پذیر ہونا تذکروں سے ثابت ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات یہ کرامات اتنی رفیع الشان ہوتی ہیں کہ ان کے مقابلہ میں انبیاء کے معجزات ہیچ نظر آنے لگتے ہیں؟ کیا یہ استدراج تو نہیں ہوتا؟

۱۱۔ ایسی قبور یا مزارات جہاں کسی انسان کے بجائے مردہ حیوان کی ہڈیاں دفن کی جاتی ہیں یا وہ بھی نہیں ہوتیں۔ ایسے مزارات سے لوگوں کی حاجت روائی کی کیا وجوہ ہیں؟

۱۲۔ اہلِ طریقت نے جو باطنی نظام مقرر کر کے غوث، قطب، ابدال، اوتاد وغیرہ کے مناصب کی تعیین کر رکھی ہے اور ایک بڑا ولی، چھوٹے ولی کی پل بھر میں ولایت ختم کر دیتا ہے اور کسی نئے شخص کو آنِ واحد میں ولایت عطا کر بھی دیتا ہے۔ ان باتوں کا عہدِ نبوی میں کہیں سراغ ملتا ہے؟

۱۳۔ کیا وجہ ہے کہ علمائے تصوف، آغازِ تصوف سے ہی علمائے شریعت کو یہ یقین دہانی کراتے چلے

---

[1] ان میں سے بھی بعض واقعات محلِ نظر ہیں۔ اور آٹھویں باب میں ان پر مفصل تبصرہ گزر چکا ہے۔

آئے ہیں کہ طریقت یا تصوف شریعت ہی سے ماخوذ ہے اور شریعت کے اتباع کے بغیر چارہ نہیں مگر علمائے شریعت نے کسی دور میں بھی ان کی اس بات کا اعتبار نہیں کیا۔ اور ہمیشہ گرفت کرتے چلے آئے ہیں؟

۱۴۔ جن "اولیاء اللہ" کے متعلق تذکرہ نگاروں کی یہ شہادت موجود ہے کہ وہ خلاف شریعت کام کیا کرتے تھے۔ ان کو عزت و تکریم کا مستحق کیوں سمجھا جاتا ہے؟ ان کو قدس سرہ کیوں لکھا جاتا ہے؟ اور انہیں اولیاء اللہ کی فہرست سے خارج کیوں نہیں کیا جاتا؟

۱۵۔ کیا ایسے صوفی جو لا مذہب تھے ان کو مسلمان کہنا یا اولیاء اللہ سمجھنا درست ہے؟

محترم قارئین! آپ نے ساری کتاب کا بغور مطالعہ کیا۔ محترم والد صاحب نے یہاں مشائخ عظام سے 15 سوالات کئے ہیں۔ ان کے جوابات آج تک نہ ہی کسی رسالے کی معرفت اور نہ بالمشافہ ہمیں موصول ہوئے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب فضولیات آج بھی اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر ہو رہی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں رسول اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ایک آدمی نے دوران گفتگو عرض کیا کہ "جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں" آپ ﷺ نے سن کر فرمایا "کیا تو نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا ہے؟" (مسند احمد) ایک آدمی نے آپ ﷺ سے بارش کی دعا کرانا چاہی اور عرض کیا کہ "ہم اللہ تعالیٰ کو آپ ﷺ کے ہاں سفارشی بناتے ہیں۔" آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور فرمایا "افسوس تجھے معلوم نہیں۔ اللہ کی شان کتنی بلند ہے اسے کسی کے حضور سفارشی نہیں بنایا جا سکتا۔" (ابو داؤد) آپ ﷺ نے حیات طیبہ کے آخری ایام میں مرض الموت میں جو خطبہ دیا وہ محتاج وضاحت نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے انبیاء (علیہم السلام) کی قبروں کو مساجد بنا لیا۔" (صحیح بخاری)

اس کے بعد یہ مزارات' عرس' اسلام کے نام پر دین خانقاہی اور صوفیاء کی خود ساختہ کرامات' چہ معنی دارد؟ ہماری کسی سے ضد بازی یا عناد نہیں ہے۔ اگر کوئی ایک آدمی بھی اس تحریر سے راہ ہدایت پا جائے تو یہ ہمارے لئے باعث سعادت ہے۔ ورنہ کتاب سے مالی منفعت حاصل کرنا نہ تو محترم والد صاحب کی سوچ تھی اور نہ ہی ہمارا شیوہ۔ اگر والد صاحب کی یہ تصنیف واقعی آپ کے دل کو اپیل کرتی ہے تو میری گزارش ہے کہ ان کے لئے دعائے مغفرت ضرور کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ہم سب پر بھی اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

پروفیسر نجیب الرحمٰن کیلانی

جامع مسجد الایمان' شاہ فرید آباد' ملتان روڈ' لاہور۔ فون: 7844157

کتابیات

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۱	قرآن مجید، تراجم و تفاسیر حسب ضرورت۔		
۲	متفرق کتب احادیث، حسب ضرورت۔		
۳	تعرف، محمد بن ابراہیم کلاباذی، ترجمہ پیر محمد حسن،		المعارف، گنج بخش روڈ، لاہور۔
۴	انسان کامل، عبدالکریم جیلی	" فضل میراں،	نفیس اکیڈمی، کراچی۔
۵	کشف المحجوب، علی ہجویری	"	ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور۔
۶	الفقر والتصوف (عربی)	امام ابن تیمیہؒ	
۷	الفکر الصوفی (عربی)	عبدالرحمٰن عبدالخالق	دارالتراث الاسلامی، کویت۔
۸	فضائح صوفیاء "	"	" "
۹	غایۃ الامانی فی الرد علی النبہانی	محمود شکری آلوسی	(اردو ترجمہ زیر طبع)
۱۰	ذکر الٰہی وابل الصیب	امام ابن قیمؒ	مکتبہ احیاء السنۃ، گھر جاکھ، ضلع گوجرانوالہ
۱۱	البلاغ المبین (فارسی)	شاہ ولی اللہ	مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور
۱۲	دائرہ المعارف الاسلامیہ		پنجاب یونیورسٹی، لاہور
۱۳	تصوف اسلام	عبدالماجد دریابادی	
۱۴	خلاصہ تصوف اسلام	آقا بیدار بخت	تاج بک ڈپو، اردو بازار، لاہور
۱۵	روح تصوف	خورشید احمد گیلانی	فرید بک سٹال، اردو بازار، لاہور
۱۶	دلائل السلوک	مولانا احمد یار خان	ادارہ نقشبندیہ اویسیہ، چکوال
۱۷	تزکیہ نفس	امین احسن اصلاحی	ملک سنز، فیصل آباد
۱۸	سوانح امام ابن تیمیہ	کوکن عمری ایم اے	جامعہ حیدر آباد دکن
۱۹	تاریخ مشائخ چشت	خلیق احمد نظامی	مکتبہ عارفین کراچی
۲۰	" "	شیخ الحدیث مولانا زکریا	مجلس نشریات اسلام، کراچی
۲۱	تاریخ دعوت و عزیمت	ابوالحسن علی ندوی	دائرۃ المعارف، ندوہ
۲۲	مذہب و تجدید مذہب	پروفیسر عبدالحمید صدیقی	البدر پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور
۲۳	توحید خالص	کیپٹن مسعود عثمانی	توحید روڈ، کیماڑی، کراچی
۲۴	الفاروق	شبلی نعمانی	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
۲۵	تلاش حق (اردو ترجمہ)	امام غزالی	
	المنقذ من الضلال	خالد حسن قادری (مترجم)	محکمہ اوقاف، پنجاب، لاہور

۲۶	تجدید تصوف و سلوک	عبد الباری، استاد فلسفہ و دینیات	کتب خانہ الفرقان لکھنؤ
۲۷	اسلامی نظریات میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور
۲۸	سیر الاولیاء،	محمد بن مبارک میر خورد، ترجمہ غلام احمد بریاں	الکتاب، گنج بخش روڈ، لاہور
۲۹	گلزار ابرار،	محمد غوثی شطاری، ترجمہ فضل احمد	اسلامک بک فاؤنڈیشن، سمن آباد، لاہور
۳۰	اختلاف امت کا المیہ	فیض عالم صدیقی	چٹان پرنٹنگ پریس، لاہور۔
۳۱	حضرت مجدد کا نظریہ توحید	برہان احمد فاروقی	مقبول اکیڈمی، لاہور
۳۲	حقیقت وحدت الوجود	خواجہ عبد الحکیم انصاری	قاسم سنز، انارکلی، لاہور
۳۳	نظریہ حلول اور اسلام	فضل الرحمن کلیم	ادارہ دعوت سلفیہ ملتان
۳۴	ریاض السالکین	عبد الغفور عرشی قادری	ادارہ سہروردیہ اعظم مارکیٹ، لاہور۔
۳۵	خزینۃ الاصفیاء،	غلام سرور مفتی، ترجمہ مفتی محمود عالم ہاشمی	المعارف، گنج بخش روڈ، لاہور
۳۶	صوفیائے نقشبند	سید امین الدین	مقبول اکیڈمی، لاہور
۳۷	سیرت غوث الثقلین	ضیاء اللہ قادری	قادری کتب خانہ سیالکوٹ
۳۸	حدیقۃ الاولیاء	غلام سرور مفتی	المعارف گنج بخش روڈ، لاہور
۳۹	مقربان حق (خلاصہ تذکرۃ الاولیاء)	حافظ احمد دین چشتی	قرآن سوسائٹی، لاہور۔ ساہیوال
۴۰	الاویس (تذکرہ اویس قرنی)	ارشد اویسی	اویسیہ پبلشرز، بلال گنج، لاہور
۴۱	سرچشمہ حیات	عبد العزیز قادری	تبلیغ سوسائٹی، قصور پورہ، لاہور
۴۲	تلقین مرشد کامل، اردو ترجمہ حدائق الاخیار	محمد صادق فرغانی	محمد بشیر اینڈ سنز، اردو بازار لاہور
۴۳	معین الہند	ڈاکٹر ظہور الحسن شارب	المعارف، گنج بخش، لاہور
۴۴	نور مبین	اے۔ جے۔ چنارا	اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند بمبئی
۴۵	بریلویت (اردو)	علامہ احسان الٰہی ظہیر	ادارہ ترجمان السنۃ۔ لاہور
۴۶	تاریخ پاک و ہند (ساتواں ایڈیشن)	پروفیسر عبد اللہ ملک	قریشی برادرز۔ اردو بازار، لاہور
۴۷	رضا خانی مذہب	سعید احمد قادری	تنظیم اہل السنۃ والجماعۃ نواں کوٹ لاہور۔
۴۸	تصوف کی حقیقت	غلام احمد پرویز	ادارہ طلوع اسلام۔ لاہور



شریعت وطریقت

اس کتاب میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اسلام میں تصوف کا آغاز کب اور کیسے ہوا اور آج تک اس میں کیا کچھ آمیزشیں ہو چکی ہیں؟

کیا طریقت کے عقائد و نظریات وحدت الوجود، وحدت الشہود اور حلول کا شریعت کے سیدھے سادے عقائد کے ساتھ سمجھوتہ ممکن ہے؟

طریقت کا باطنی نظام کیا چیز ہے؟ اور کیا طریقت شریعت کے تابع ہے یا اس کے متوازی اور اس سے متصادم ایک الگ دین ہے؟

ڈسٹری بیوٹر



دارالسّلام

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

الریاض ہیوسٹن لاہور